فوائد
القرْآن الزكية

سورة الفاتحة

سورة البقرة

أ.د. خالد بن حامد الحازمي

أستاذ الدراسات العليا بالجامعة الإسلامية سابقاً

فوائد

القرآن الزكية

سورة الفاتحة

سورة البقرة

أ.د.خالد بن حامد الحازمي

مقدمہ

الحمد لله ربِّ العالمين، والصَّلاة والسَّلام على نبينا محمَّدٍ وعلى آله وصحابته أجمعين، وبعد:

میں اس اللہ تعالی کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوں جس نے اپنے بندے اور رسول ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کریم کو واضح عربی زبان میں نازل فرما کر اسے مومنوں کے لیے باعث نصیحت، شفاء، ہدایت اور رحمت، اور کفار و منکرین کے لیے ڈرانے کا ذریعہ بنایا اور اس میں کوئی کسر و کجی باقی نہیں چھوڑی، ہر قسم کی تحریف و تبدیلی سے اس کو محفوظ رکھا، اور تمام دنیا والوں کے لیے اسے روشنی، سرچشمۂ علم و معرفت، دلیل اور پیغام بنایا۔

کسی بندے کو ہدایت اور مفید عمل کی توفیق مل جانا اللہ تعالی کا بہت بڑا فضل و احسان ہے جس کی بدولت وہ اپنے زندگی کے قیمتی اوقات ایسے مفید کاموں میں صرف کرے جو خود اس کے اور دوسرے لوگوں کے حق میں نفع بخش ثابت ہوں۔ پہلے اور بعد ہر وقت ہر طرح کا فضل اللہ رب العالمین ہی کا ہے جس نے قرآن سکھایا اور قلم کے ذریعہ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت دی اور اسی نے انسان کو بولنا سکھایا، اور اسے ان تمام چیزوں کا علم دیا جن سے وہ نابلد تھا، اور اللہ تعالی اپنے جس بندے کے لیے چاہتا ہے علم کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اسی اللہ نے بنی نوع انسان کو لکھنا پڑھنا سکھایا، قلم عطا کیا، جو کچھ لکھنا ہے اور جس چیز پر لکھنا ہے ان سبھی چیزوں سے روشناس کرایا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ٱلرَّحۡمَٰنُ ۝١ عَلَّمَ ٱلۡقُرۡءَانَ ۝٢ خَلَقَ ٱلۡإِنسَٰنَ ۝٣ عَلَّمَهُ ٱلۡبَيَانَ ۝٤﴾ [سورۃ الرحمن: ۱-۴]. "رحمن نے قرآن سکھایا۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا۔ اور اسے بولنا سکھایا"۔ نیز فرمایا: ﴿ٱقۡرَأۡ بِٱسۡمِ رَبِّكَ ٱلَّذِي خَلَقَ ۝١ خَلَقَ ٱلۡإِنسَٰنَ مِنۡ عَلَقٍ ۝٢ ٱقۡرَأۡ وَرَبُّكَ ٱلۡأَكۡرَمُ ۝٣ ٱلَّذِي عَلَّمَ بِٱلۡقَلَمِ ۝٤ عَلَّمَ ٱلۡإِنسَٰنَ مَا لَمۡ يَعۡلَمۡ ۝٥﴾ [سورۃ العلق: ۱-۵]. "پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ تو پڑھتا رہ تیرا رب بڑے کرم والا ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ (علم) سکھایا۔ جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا"۔ ہر طرح کی تعریف اور تمام قسم کا شکر صرف اللہ رب العالمین کی ذات کے لیے لائق و زیبا ہے۔

یقیناً یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور کرم اور اس کی توفیق ہے کہ اس نے مجھے یہ عظیم عمل انجام دینے کی ہدایت نصیب فرمائی۔ رب العالمین کے کلام کی جلالت شان اور قرآن مجید کی عظمت کے باعث اس عمل کی انجام دہی سے میں کافی ہیبت میں تھا، لیکن میرے اندر ایک تڑپ اور دلی خواہش تھی کہ قرآن کریم کے علمی خزانوں میں سے کچھ کی معرفت مجھے بھی ہو جائے، اللہ رب العالمین سے ثواب کی رغبت، قرآن کریم کی شیریں بیانی اور خوبصورتی، بلاغت و بیان کی عظمت، اس کے فوائد کا ایک لامتناہی سلسلہ جس کی آخری حد تک کسی بھی انسان کی رسائی ناممکن ہے، انہی تمام وجوہات نے مجھے یہ عمل انجام دینے پر آمادہ کیا، لہذا میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا اور استخارہ کو ضروری سمجھا اور اس کی کے بعد اس عظیم الشان اور جلیل القدر عمل میں مشغول ہونے کے لیے میری تڑپ اور خواہش میں مزید اضافہ ہو گیا، پھر اللہ رب العالمین پر توکل اور اس سے توفیق اور راست روی کی دعا کرکے قرآن کریم کی ہر آیت کے لیے کتب تفسیر کا مطالعہ کرنا شروع کیا، اور کتب تفسیر کی ورق گردانی کرتا رہا تاکہ علم میں رسوخ رکھنے والے ان علماء کے فہم اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جن علمی فیوض و برکات سے نوازا ہے ان علمی فیوض برکات سے مستفید ہو کر اپنی علمی تشنگی کچھ حد تک بجھا سکوں اور فوائد کا استنباط کرکے قرآن کریم کی آیات کے مفاہیم و دلالات کے ساتھ ایک منظم انداز میں پیش کروں تاکہ فوائد کا یہ تسلسل مکمل طور سے برقرار رہے، اور پڑھنے والے کو ان فوائد اور مفاہیم و دلالات کے درمیان کسی خلل کا احساس نہ ہو، اس کتاب میں میں نے کتب تفسیر سے انہی چیزوں کو اخذ کیا ہے جن کا تعلق فوائد سے ہے اور آیات سے مستنبط شرعی احکامات کو میں نے اپنی اس کتاب میں داخل نہیں کیا ہے، کیوں کہ اس کتاب میں شرعی احکامات کا ذکر میرا مقصد نہیں ہے، اور اگر میں نے کہیں سے کوئی اقتباس نقل کیا ہے تو اسے صاحب اقتباس علماء کرام کی طرف منسوب کرکے اس کا حوالہ بھی ذکر کر دیا ہے، چنانچہ اس کتاب کے مذکورہ فوائد ، کتب تفسیر کے صفحات پر کہیں اکٹھا طور سے لکھے نہیں ملیں گے کہ جنہیں اس کتاب میں نقل کر دیا گیا ہو، ہاں کچھ ایسے فوائد ضرور ہیں جو علماء تفسیر کی عظیم کوششوں کا ثمرہ ہیں اور اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں، اور ایسے فوائد کو قید تحریر میں لاتے وقت میں نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ چنانچہ یہ کتاب ایسے مستنبط فوائد کا مجموعہ ہے جسے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے قرآن کریم کی آیات کے مفاہیم و ماحصل کی روشنی میں میں نے از خود مستنبط کیا ہے یا ماہرین علماء

تفسیر کے اقوال سے سمجھا ہے۔ان تمام پر اللہ تعالی کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو،اور اللہ تعالی ان علماء کرام ، مجھے ، ہمارے والدین، گھر والے اور تمام مسلمانوں کو انبیاء کرام ، صدیقین اور شہداء کے ساتھ میدان حشر میں جمع کرے۔

اس عظیم و جلیل عمل کا آغاز میں نے ۱۹/شوال سن ۱۴۳۷ ہجری مطابق ۲۴ جولائی سن ۲۰۱۶ عیسوی میں کیا ہے۔

اللہ رب العالمین سے دعا ہے کہ وہ مجھے ان لوگوں میں سے بنائے جنہیں اس نے قرآن مجید، ذکر حکیم، کتاب مبین کے خدمت کی توفیق عطا فرمائی اور میں بھی ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جنہیں رضائے الہی والے اعمال کی ہدایت نصیب ہوئی۔ اللہ تعالی اس عمل کو نفع بخش اور قیامت تک کے لیے صدقہ جاریہ بنائے،اور مجھے اپنی رضا کے مطابق اس عمل کے تکمیل کی توفیق دے،اور اس میں درستگی اور صواب دید کی راہ دیکھائے،اللہ تعالی مجھ سے اس عمل کو قبول فرمائے اور اس کے ذریعہ علیین میں میرے درجات بلند فرمائے،اور اس عمل کو نفع بخش اور قابل قبول بنائے،یقیناً اللہ تعالی کرم والا اور رحم والا ہے۔

والحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على نبينا محمد وعلى آله وصحابته أجمعين.

مؤلف

أ.د. خالد بن حامد بن مبارک الحازمی

فوائد سورة الفاتحة

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم

﴿بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ۝١ ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ۝٢ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ۝٣ مَٰلِكِ يَوۡمِ ٱلدِّينِ ۝٤ إِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَإِيَّاكَ نَسۡتَعِينُ ۝٥ ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ ۝٦ صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا ٱلضَّآلِّينَ ۝٧﴾

ترجمہ:

"شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے (۱)۔ تمام تعریفیں اللہ تعالی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے (۲)۔ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے (۳)۔ بدلے کے دن (یعنی قیامت) کا مالک ہے (۴)۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں (۵)۔ ہمیں سیدھی (اور سچی) راہ دیکھا (۶)۔ ان لوگوں کی راہ جن پر تونے انعام کیا، ان کی نہیں جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی (۷)"۔

سورہ فاتحہ کا آغاز بسم اللہ سے ہوا ہے اور یہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے، اللہ تعالی نے ﴿بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ﴾ فرمایا تاکہ بسم اللہ قرآن کی پہلی اور عظیم سورہ کی ابتدا بن جائے، بسم اللہ سے ابتداء کرکے، بسم اللہ کی اہمیت وفضیلت اور ہر اہم کام کی ابتدا بسم اللہ سے کرنے کی عظمت بتلانا مقصود ہے، بسم اللہ کے اندر اللہ تعالی کے تین نام: (ٱللَّهِ)، (ٱلرَّحۡمَٰنِ) اور (ٱلرَّحِيمِ) آئے ہیں، جس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی وسیع رحمت ہر چیز کو محیط ہے، جب مسلمان اپنے کام کو بسم اللہ سے شروع کرتا ہے تو وہ اللہ کے ان اسماء کے ذریعے اپنے کام کو شروع کرتا ہے جس کے ذریعے اللہ نے اسے پکارنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ سورہ اعراف میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلِلَّهِ ٱلۡأَسۡمَآءُ ٱلۡحُسۡنَىٰ فَٱدۡعُوهُ بِهَا﴾ "اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں سو ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو"۔ تو جب بندہ اللہ کی کتاب کو شروع کرتا ہے تو وہ اللہ عزوجل سے دعا کررہا ہوتا ہے چنانچہ قاری کے لئے اس کا معنی یہ ہوگا کہ: میں بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والے اللہ کے نام سے شروع کررہا ہوں، اسی بناپر یہ عظیم سورہ، توحید اسماء وصفات کے اثبات پر مشتمل ہے۔

بسم اللہ کے بعد ﴿ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾ ہے جس میں اللہ تعالی کی بزرگی کا ذکر ہے، اللہ کا قول ﴿ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ﴾ اللہ تعالی کی مکمل تعریف اور اللہ کی ذات کو زیبا شکر پر مشتمل ہے، اللہ تعالی ہی تمام تر تعریفات اور شکر گزاری کا مستحق ہے۔ قرآن کریم کی ابتدائی سورہ کا آغاز ﴿ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾ سے ہونا مسلمان کو یہ سکھارہا ہے کہ تمام تر تعریفات صرف اللہ کو زیبا ہیں، اور اللہ تعالی تمام تر تعریفات اور عمدہ حمد و ثنا کا مستحق ہے، بندے پر ضروری ہے کہ وہ اللہ کی ویسی ہی تعریف کرے جیسی اللہ نے خود اپنی تعریف کی ہے اور جیسا اس نے اپنے بندوں کو اپنی کتاب کے ذریعے سکھایا ہے، آیت کریمہ بندوں کے لئے اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ اللہ تعالی ہر چیز کا رب ہے، ہر چیز کو پیدا کرنے والا اور اس میں جو چاہے، جیسے چاہے اور جب چاہے تصرف کرنے والا ہے۔ اللہ کا قول ﴿رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ﴾ اس بات کا فائدہ دے رہا ہے کہ اللہ تعالی پوری کائنات کا رب ہے، جن وانس، فرشتے، حیوانات اور نباتات سب کا رب ہے، آسمانوں اور زمین کا رب ہے، کائنات کی ہر چیز کا رب ہے، اس کے علاوہ کوئی خالق نہیں ہے، چنانچہ سورہ فاتحہ توحید ربوبیت کے اثبات پر مشتمل ہے۔

اس سے یہ فائدہ اخذ ہو رہا ہے کہ مسلمان کے لئے اس مفہوم کا سمجھنا کافی اہمیت کا حامل ہے ساتھ ہی اس کو یہ شعور واحساس بھی ہونا چاہیے کہ یہ ساری بادشاہت اللہ ہی کی ہے اور انسان جن چیزوں کا بھی مالک ہوتا ہے تو وہ محض اللہ کی جانب سے عطا کردہ ہوتی ہیں اور اللہ کی مشیئت کے ماتحت ہوتی ہیں حتی کہ انسان کسی چیز کا مالک ہو تو بھی وہ اس میں اللہ کی منشاء کے بغیر تصرف نہیں کر سکتا ہے، اللہ کی مشیئت کے بغیر نہ وہ اس کی خرید وفروخت کر سکتا ہے نہ ادھر سے ادھر کر سکتا ہے نہ اپنے مقصد کو پا سکتا ہے اور نہ ہی اس میں اللہ تعالی کی مرضی کے خلاف اپنا من مانی حکم چلا سکتا ہے، اس کا سارا اختیار و تصرف اللہ کی مرضی کے ماتحت ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے سورہ کہف میں اس جانب بندوں کی توجہ دلائی ہے، ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَاْيۡءٍ إِنِّي فَاعِلٞ ذَٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ إِلَّآ أَن يَشَآءَ ٱللَّهُ﴾ [سورة الكهف: ٢٣-٢٤]. "اور ہر گز ہر گز کسی کام پر یوں نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا مگر ساتھ ہی ان شاء اللہ کہہ دینا"۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد بندہ کے لئے دعا کی بندگی ثابت ہو جاتی ہے، کہ وہ اس اللہ سے دعا کرے جو

اس چیز کا مالک ہے اور وہ انسان خود مالک نہیں ہے اور یہ چیز اس انسان کی مدد کرتی ہے کہ وہ اپنے ماتحت اشیاء میں تصرف کس طرح سے کرے، یہ چیز اسے دعا اور مالک حقیقی اللہ رب العالمین سے ہر چھوٹی بڑی چیز میں التجا کرنے پر ابھارتی ہے، ﴿رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ﴾ یعنی اللہ ہر ہر چیز خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی اس کا وہ رب ہے اس سے توحید الوہیت کا ثبوت ملتا ہے، چنانچہ رحمت و مغفرت اور مدد اسی سے طلب کی جائے گی جو اس کا رب اس کو پیدا کرنے والا اور اس کی تدبیر کرنے والا ہے۔ اس آیت کے بعد اللہ کی دو صفات ﴿ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ﴾ کا ذکر ہے، یہ اللہ کے ناموں میں سے دو نام ہیں، ان میں عظیم و وسیع رحمت کا معنی پایا ہے، جو مومن کے اندر امید اور آس کی جوت جگاتا ہے، اور اللہ رحمن ور حیم کے لئے محبت کو موجزن کرتا ہے جس نے کہ اپنی عظیم و کریم ذات کو ان اسماء سے متصف کیا ہے، یہ دونوں اسماء بندے کو اللہ کی نعمتوں کا حریص بھی بناتی ہیں اس لئے کہ (الرحیم) ایسا اسم ہے جو اللہ کی صفت رحمت کا معنی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور یہ بات اللہ کی رحمت کے تئیں مومن کی امید کو تقویت بخشتی ہے، امام قرطبیؒ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (اللہ تعالی نے جب خود کو رب العالمین سے متصف کیا تو اس میں ترہیب کا پہلو ہے، اسی لئے اس کے ساتھ (ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ) کا بھی ذکر کیا جس میں کہ ترغیب کا پہلو ہے اور اللہ نے ایسا اس لئے کیا تاکہ اس کی صفات میں خوف ورغبت کی دونوں باتیں شامل رہیں اور یہ طریقہ اطاعت کے لئے معاون ہوتا ہے جیسا کہ سورہ حجر میں ارشاد باری تعالی ہے ﴿نَبِّئْ عِبَادِىٓ أَنِّىٓ أَنَا ٱلْغَفُورُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٤٩﴾ وَأَنَّ عَذَابِى هُوَ ٱلْعَذَابُ ٱلْأَلِيمُ﴾ [سورة الحجر: ٤٩-٥٠]. "میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت ہی بخشنے والا اور بڑا ہی مہربان ہوں. اور ساتھ ہی میرے عذاب بھی نہایت دردناک ہیں"۔ تربیتی ودعوتی امور ہوں یا پھر کسی ادارے کے تنظیمی معاملات ہوں اس میں اس طریقہ ترہیب وترغیب کی افادیت مسلم ہے، دوسروں کے لئے مضبوطی و سختی کے ساتھ رحمت وشفقت بھی کافی اہم ہے، تاکہ قبولیت عمل اور ادائیگی عمل بخوبی انجام پا سکیں، ترغیب و ترہیب کا یہی توازن ہے، جو کہ نفسیاتی اعتدال، کام کاج اور سلوک و معاملات میں توازن کو ممکن بناتے ہیں۔

اسی طرح اس عظیم سورہ میں یہ بھی بیان ہوا ہے آخرت کے دن اللہ ہی کی بادشاہت ہو گی، ارشاد ہے: ﴿مَٰلِكِ يَوْمِ ٱلدِّينِ﴾ "بدلے کے دن (یعنی قیامت) کا مالک ہے"۔ اس آیت میں اللہ کی بزرگی کا

ذکر ہے، بایں طور کہ وہی اللہ قیامت کے دن کا مالک ہے، اور اس میں انسان کے لئے نصیحت بھی ہے کیوں کہ اس دن کوئی کسی کا ذرا بھی مالک نہیں ہو گا جیسا کہ اللہ تعالی نے سورہ انفطار میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ﴾ [سورة الانفطار: ١٩]. "وہ دن ہے جس دن کوئی شخص کسی شخص کے لئے کسی چیز کا مختار نہ ہو گا، اور (تمام تر) احکام اس روز اللہ کے ہی ہوں گے"۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ مسلمان کے لیے اس دن کی یاد دہانی کس قدر اہم ہے، مسلمان اس آیت کی ہر دن دسیوں مرتبہ نماز میں تلاوت کرتا ہے، تاکہ یہ آیت اس کے دھیان میں رچ بس جائے اور اس کے شعور و عمل کو سنوار کر ہر طرح کے خیر کے لئے اسے آمادہ کرے اور ہر برائی سے اسے روکے۔

پھر سیاق قرآنی کا رخ عبادت میں اخلاص کی جانب منتقل ہو رہا ہے یعنی کوئی بھی عبادت صرف ایک اللہ کے لئے بجالایا جائے جس کوئی شریک نہیں ہے ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ "ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں"، کیوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود حقیقی نہیں ہے، اس آیت میں بندہ اپنے رب سے یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کرتا ہے، اور اسی وجہ سے وہ عبادت کے دوسرے لوازمات کو سیکھتا ہے تاکہ اللہ کے لئے عبودیت کا اقرار کرنے کے بعد وہ ساری عبادتوں میں سے کوئی بھی عبادت کسی اور کے لئے نہ بجالائے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ "ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں"۔ بلکہ وہ یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ وہ صرف اللہ سے ہی مدد طلب کرتا ہے اور یہ مدد طلبی بھی صرف اللہ کا حق ہے، ﴿وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ "اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں"۔ اگرچہ مدد طلبی عبادت یعنی ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے اندر شامل ہے تاہم الگ سے اس کا ذکر تنبیہ کے لئے اور اس کی عظمت شان کو خاص طور سے بتانے کے لئے کیا گیا ہے نیز یہ بتانے کے لئے کہ مدد طلبی، دعا، امید، خوف اور محبت جو کہ عبادت کا مغز ہیں ان کا اس سے گہرا رشتہ ہے، جس سے امید کی جاتی ہے تو امید کرنا اس سے مدد مانگنا ہی ہے اسی طرح جس سے ڈرا جاتا ہے تو اس سے اس بات کی مدد طلب کی جاتی ہے کہ وہ اس کو سزا نہ دے، مدد طلبی دعا بھی ہے اس سے حصول نفع یا دفع ضرر کی امید کی جاتی ہے، جس کی مدد کی چاہ ہو اور امید ہو تو اس سے مدد مانگنا اس کی پناہ اختیار کرنا ہے، مدد طلبی مدد طلب کئے جانے والے پر اعتماد کا نام ہے تو اسی لئے یہ ضروری ہے کہ اعتماد صرف اللہ تبارک و تعالی پر ہو۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ اس عظیم سورہ کی باتوں کو جاننا اہم ہے

، نیز اس سورہ میں پیدا کرنے والے رب کی تعظیم بجالانے کی جو باتیں ہیں ان کو بھی جاننا اہم ہے، اس کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ یہ عظیم آیت توحید الوہیت کے بیان پر مشتمل ہے یعنی عبادت صرف اللہ کے لئے بجالائی جائے کیوں کہ وہی معبود ہے اس کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔

اس کے بعد سیاق قرآنی ہدایت کی دعا اور طلب کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور یہ کہ ہدایت اللہ سے طلب کی جائے ﴿ ٱهۡدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلۡمُسۡتَقِيمَ ﴾ "ہمیں سیدھی (اور سچی) راہ دیکھا"۔ بندے کا اپنے رب سے یہ کہنا کہ وہ اسے ہدایت دے، ہدایت کی جستجو میں اس کی مدد کرے اور ہدایت پر اسے ثابت قدم بھی رکھے یہ بڑی ہی عظیم طلب ہے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہدایت پانے کے لئے بندے اللہ تعالی کے محتاج ہیں، پس بندے کے لئے ضروری ہے کہ وہ درست راستے کی ہدایت نیز اس پر ثابت قدم رہنے کے لئے اللہ تعالی سے گریہ وزاری کرے، کیوں کہ راستے اور طریقے مختلف اور متعدد ہیں، یہ مختلف طریقے اور راستے ہمہ دم بندے کو گمراہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں، ہاں مگر ایک ہی راستہ ایسا ہے جو درست ہے اور وہ صراط مستقیم ہے، اور اس سے مراد وہ راستہ ہے جو اللہ کی رضا اور اس کی جنت تک لے جانے والا ہے، اور اس راستے کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے دین، یعنی دین اسلام کو لازم پکڑا جائے جس کے بارے میں اللہ نے کہا ہے ﴿ صِرَٰطَ ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ﴾ "ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا"۔ یعنی نبیوں، شہیدوں، صدیقین اور شہیدوں کا راستہ انہی لوگوں پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی طریقہ درست نہیں اور کوئی راہ سیدھی نہیں ہے کیوں کہ اللہ نے اس راہ کے علاوہ دیگر تمام راستوں کی نفی کی ہے اور غضب شدہ و گم گشتہ راہوں کے طریقے کی بھی نفی کی ہے جیسا کہ ارشاد ہے ﴿ غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ ﴾ "ان کی نہیں جن پر غضب کیا گیا" جن لوگوں نے حق کو جاننے کے بعد اسے چھوڑ دیا وہ یہود ہیں، اسی طرح ﴿ وَلَا ٱلضَّآلِّينَ ﴾ "اور نہ گمراہوں کی" جن لوگوں نے حق کو جہالت و ضلالت کی وجہ سے چھوڑ دیا اور اس سے مراد نصاری اور ان کی جیسی روش اختیار کرنے والے ہیں۔ اس سورہ کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ یہ سورہ رقیہ بھی ہے جس سے مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دوران سفر ایک شخص پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کیا، اللہ نے اس شخص کو شفا دی، لوٹنے کے بعد صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (اسے کیسے

معلوم ہوا کہ یہ رقیہ ہے)[1] ۔ایک صحابی سعید بن معلی سے مروی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:(مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن کی سب سے بڑی سورت میں تمہیں کیوں نہ سکھادوں۔ صحابی کہتے ہیں پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور جب ہم مسجد سے باہر نکلنے لگے تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے ابھی فرمایا تھا کہ مسجد کے باہر نکلنے سے پہلے آپ مجھے قرآن کی سب سے عظیم سورت بتائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں وہ سورت «ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَـٰلَمِينَ» ہے، یہی وہ سات آیات ہیں جو سبع مثانی ہیں جو (ہر نماز میں) بار بار پڑھی جاتی ہیں اور یہی وہ قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے)[2]۔اس سورہ کی ایک فضیلت اس حدیث قدسی میں بیان کی گئی ہے:(اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، آدھا میرے لیے ہے، اور آدھا میرے بندے کے لیے، اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ مانگے''، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بندہ «ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَـٰلَمِينَ» کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «حمدني عبدي ولعبدي ما سأل» میرے بندے نے میری حمد ثنا بیان کی، اور بندے کے لیے وہ ہے جو وہ مانگے، اور جب بندہ «ٱلرَّحْمَـٰنِ ٱلرَّحِيمِ» کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «أثنى علي عبدي ولعبدي ما سأل» میرے بندے نے میری تعریف کی، اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ مانگے، پھر جب بندہ «مَـٰلِكِ يَوْمِ ٱلدِّينِ» کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «مجدني عبدي فهذا لى ، وهذه الآية بيني وبين عبدي نصفين» میرے بندے نے میری عظمت بیان کی یہ سب میرے لیے ہے، اور یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی ہے، یعنی جب بندہ کہتا ہے «إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ» تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «فهذه بيني وبين عبدي ولعبدي ما سأل وآخر السورة لعبدي» یہ آیت میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی ہے، اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ مانگے، اور سورت کی اخیر آیتیں میرے بندے کے لیے ہیں، بندہ کہتا ہے: « ٱهْدِنَا ٱلصِّرَٰطَ ٱلْمُسْتَقِيمَ ۝٦ صِرَٰطَ

---

(۱) صحيح البخارى ۳/ ۳٤۲ حديث نمبر (۵۰۰۷)

(۲) صحيح البخارى ۳٤۲/۳ حديث نمبر (۵۰۰٦)

ٱلَّذِينَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ ٱلۡمَغۡضُوبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا ٱلضَّآلِّينَ » اس پر اللہ فرماتا ہے: «فهذا لعبدي ولعبدي ما سأل» یہ میرے بندہ کے لیے ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ مانگے)[1]۔

(۱) سنن ابن ماجه ۲/ ۱۲۴۳/ ۱۲٤٤حدیث نمبر ۳۷۸٤ ١٤

فوائد سورة البقرة

﴿الٓمٓ ۝١ ذَٰلِكَ ٱلۡكِتَٰبُ لَا رَيۡبَۛ فِيهِۛ هُدٗى لِّلۡمُتَّقِينَ ۝٢ ٱلَّذِينَ يُؤۡمِنُونَ بِٱلۡغَيۡبِ وَيُقِيمُونَ ٱلصَّلَوٰةَ وَمِمَّا رَزَقۡنَٰهُمۡ يُنفِقُونَ ۝٣ وَٱلَّذِينَ يُؤۡمِنُونَ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيۡكَ وَمَآ أُنزِلَ مِن قَبۡلِكَ وَبِٱلۡأٓخِرَةِ هُمۡ يُوقِنُونَ ۝٤ أُوْلَٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدٗى مِّن رَّبِّهِمۡۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُفۡلِحُونَ ۝٥﴾

ترجمہ:

"الم(۱)۔اس کتاب (کے اللہ کی کتاب ہونے) میں کوئی شک نہیں پرہیزگاروں کو راہ دکھانے والی ہے(۲)۔جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے (مال) میں سے خرچ کرتے ہیں(۳)۔اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف اتارا گیااور جو آپ سے پہلے اتارا گیا،اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں(۴) ۔یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں(۵)"۔

قرآن کریم کی دوسری سورہ کی ابتدا تین حروف مقطعات سے ہوئی ہے،ان حروف کی حقیقت کے ادراک سے انسان عاجز ہے،ان حروف کا مقصد یا تو یہ ہے کہ انسان ان تین حروف سے لاعلمی کی بنا پر حیران وششدر رہ جائے یا ایسے اسلوب سے آشنا ہو جو اس سے پہلے اس نے نہیں سنا اور نہ ایسی لفظی بناوٹ اس کے خیال میں آئی، یہ حروف بعد کی آیات کی طرف شوق دلاتے ہیں،ان کے معنی صرف اللہ کو معلوم ہیں، یہ اللہ کی کتاب کے سربستہ رازوں میں سے ایک ہے، ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، یہ جیسے اتری ہے بعینہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، یہ ان آیات میں سے ہے جن کی تفسیر نہیں کی جاسکتی۔اس کے فوائد کی بات کی جائے تو یہ آیت قرآن پر ایمان لانے والوں اور جس طرح وہ نازل ہوئی اسی طرح اس کا اقرار کرنے والوں کے لئے باعث امتحان ہیں۔رہی بات اس کے فوائد سے واقفیت حاصل کرنے کی تو علماء کی ایک بڑی جماعت نے کہا ہے کہ ضروری یہ ہے کہ ہم ان آیات کے بارے میں گفتگو کریں اور ان میں موجود فوائد کی تلاش وجستجو میں رہیں[(۱)]۔اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس میں توجہ مبذول کرائی گئی ہے، قطرب نے عربوں کے بارے میں کہا ہے کہ :(عرب قرآن سنتے وقت متنفر ہوا کرتے تھے،جب انہوں

---

(۱) الجامع لأحكام القرآن ۱/۱۰۹.

نے (الم) اور (المص) سنا تو انہیں یہ لفظ اجنبی لگے پھر جب انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر قرآن کو پیش کیا تاکہ قرآن ان کے ذہن پر نقش ہو جائے اور ان پر حجت تمام ہو جائے[1]۔ جب یہ حروف مقطعات نازل ہوئے تو عرب حیران رہ گئے اس لئے کہ ان کو ایسے لفظوں سے مخاطب کیا گیا تھا جس کو وہ سمجھتے نہیں تھے تاکہ وہ قرآن سننے کی طرف متوجہ ہوں، اس لئے کہ انسانی طبیعت ان باتوں کو جاننے کا شوق رکھتی ہیں جن کے معنی ان کو معلوم نہ ہوں پھر جب وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تو انہیں قابل فہم باتوں کے ذریعے مخاطب کیا گیا، پس یہ الفاظ پیغام رسانی کا ذریعہ بن گئے، ہاں مگر یہ ضروری ہے کہ ان کا معنی بھی مخاطب کے لئے قابل فہم ہوں، یہ بات تمام حروف مقطعات کے لئے عام ہے۔ حروف مقطعات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ان سے تعلیم کا شوق دلانے کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے، نیز یہ کہ مخاطب کو جس کی تعلیم دینا مقصود ہے اس جانب مخاطب کی توجہ مبذول کرانے کی بھی اہمیت ہے، مزید یہ کہ مخاطب کو یہ احساس دلانا بھی اہم ہے کہ جو کچھ وہ سننے جارہا ہے اسے اس کی ضرورت ہے تاکہ وہ باتوں کے پس پردہ جو علم و معرفت، نصیحت اور دوسری چیزیں ہیں ان کو سمجھ لے۔

سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کا فائدہ یہ ہے کہ یہ آیتیں قرآن کریم کے تئیں شکوک و شبہات کی نفی کررہی ہیں ﴿ذَٰلِكَ ٱلْكِتَٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ "اس کتاب (کے اللہ کی کتاب ہونے) میں کوئی شک نہیں"۔ تاکہ اس نفی کے بعد قرآن کے جو عمومی اثبات ہیں اس پر بات کی جائے۔ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾ "پرہیزگاروں کو راہ دکھانے والی ہے" شکوک و شبہات کی نفی کے بعد ہدایت کی باتیں ذہن و دل کو بغور سننے پر ابھارتی ہیں جب آپ اسے سنیں گے تو یقینا اس کی طرف مائل ہو جائیں گے کیوں کہ اس میں حقائق کا بیان، عمدہ اخلاق اور خیر و بھلائی کی باتیں ہیں، نیز لفظی بناوٹ کی خوبصورتی اور انداز کی عمدگی بھی آپ کو مائل کریں گی، ہاں البتہ جس کے دل میں تکبر ہو تو پھر توفیق و ہدایت سے ایسے لوگ محروم ہیں، شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: قرآن کریم سے شکوک و شبہات کی جو نفی کی گئی ہے اس سے اس کی ضد لازم آتی ہے اور وہ ہے یقین، یہ کتاب (قرآن) ایسے علم الیقین پر مشتمل ہے جو شکوک و شبہات کی نفی کرنے

---

(۱) مرجع سابق .

والی ہے اور یہ ایک بہت ہی مفید قاعدہ ہے کہ نفی کا مقصد تعریف وتوصیف بیان کرنا بھی ہوتا ہے(۱) ۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ جو بھی شخص قرآن سیکھنا چاہے یا اس کی طرف متوجہ ہو تو اس سے ابتدا میں ہی شکوک وشبہات دور کردیئے جائیں تاکہ ان کے ذہن ودل خیر وبھلائی اور حقیقت کے لئے صاف وشفاف ہو جائیں۔ان کو تاکیداً یہ بھی بتایا جائے کہ داعی، معلم، ناصح اور رہنما جن باتوں کی تعلیم دیتے اور رہنمائی کرتے ہیں ان کے لئے ان باتوں کا جاننا زیادہ ضروری ہے۔

سورہ کی ابتدا (الم) سے ہوئی ہے جس کی معرفت سے انسان عاجز ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کو جان لے کہ یہ کتاب انسان کی جانب سے نہیں ہے اور نہ ہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے جس پر یہ نازل کی گئی ہے، بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ہے جو حاضر وغائب تمام باتوں کو جاننے والا ہے۔آیت کریمہ عظیم فوائد پر مشتمل، اعجاز وباریکیوں سے پر ہے، عقل جہاں پر حیران اور عاجز رہ جاتی ہے۔قرآن کریم میں وقف کی جو مختلف صورتوں کی بنیاد پر آیت کے مختلف معانی ومفاہیم ہوتے ہیں، اسی طرح وصل کی صورتوں کے بھی خاص مفہوم ہوتے ہیں۔﴿ ذَٰلِكَ ٱلْكِتَٰبُ ﴾پر وقف اور ابتداء ﴿ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴾ سے، اسی طرح ﴿ ذَٰلِكَ ٱلْكِتَٰبُ لَا رَيْبَ ﴾ پر وقف اور ابتداء ﴿فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴾ سے، اسی طرح ﴿ ذَٰلِكَ ٱلْكِتَٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ ﴾ پر وقف اور ابتداء ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴾ سے۔ہر وقف اور وصل کی صورت کا ایک الگ معنی واس کی الگ تفسیر ہے، ان کی معرفت کے لیے کتب تفسی کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔اور یہ قرآن کریم کا اعجاز بیان ہے کہ ہر وقف اور ابتدا میں نص مربوط معنی دیتی ہیں تاکہ معانی ومراد مکمل ہوں، بڑی ہی بزرگی والا ہے وہ رب جو اس بیان کا مالک ہے اور جس نے اسے نازل کیا ہے اور اس کے ذریعے جن وانس کو چیلنج کیا ہے۔اس کے فوائد میں سے یہ ہے کہ اس نے ہدایت کو کسی خاص میدان کے ساتھ مخصوص نہیں کیا ہے بلکہ ہدایت تمام تر دنیوی واخروی فوائد پر مشتمل ہے۔اللہ کا قول﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴾ "پرہیزگاروں کو راہ دکھانے والی ہے"اس میں ہدایت کو اللہ نے متقیوں کے ساتھ خاص کیا ہے کیوں کہ جو اس کو قبول کرے گا وہ اس سے ہدایت بھی پائے گا، جو اس کی طرف بڑھتا ہے اور

(۱) تيسير الكريم الرحمن في تفسير كلام المنان ١/ ٣١.

اسے قبول کرتا ہے، نیز اس میں جو احکامات ہے اسے قبول کرتا ہے اور اس کی ہدایت سے ہدایت پاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اسے تقوی کی دولت حاصل ہوتی ہے، لہذا یہ کتاب متقیوں کے لئے باعث ہدایت ہے جو اسے قبول کرتے ہیں اور اس کی ہدایت سے راہ یاب ہوتے ہیں۔اس کے فوائد میں یہ بھی ہے کہ اس میں اجمال کے بعد تفصیل کا اسلوب ہے، جب ان متقیوں کا جو کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب سے فائدہ اٹھاتے ہیں ذکر تمام ہوا تو اللہ نے تقوی کے اسباب کو تفصیل سے بیان کیا ہے، غیب پر ایمان، نمازوں کا قیام، اللہ کے عطا کردہ رزق میں سے خرچ کرنا اور جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور جو کچھ آپ سے پہلے کے انبیاء پر نازل ہوا اس پر ایمان لانا تقوی کے اہم اسباب ہیں، ارشاد باری تعالی ہے (جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے (مال) میں سے خرچ کرتے ہیں۔اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف اتارا گیا اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا، اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں)۔اجمال کے بعد تفصیل بیان کرنے کے بہت سے عظیم فائدے ہیں، بایں طور کہ اجمال میں اجمالا بیان کئے مضمون کی تفصیل جاننے کا شوق پایا جاتا ہے، تاکہ مخاطب اجمالی طور پر معاملہ کو سمجھ لے نیز یہ زود فہم بھی ہوا کرتا ہے، پھر اس کے بعد تفصیل آتی ہے، یہ اسلوب تعلیم وتدریس کے لئے بھی مفید ہے کہ پہلے اجمالا کوئی بات بتائی جائے پھر اس کے بعد تفصیل ذکر کی جائے، کیوں کہ طالب علم کے سامنے علم ومعرفت کی باتوں کو پیش کرنے میں شوق دلانے کے لئے اس طریقہ کا بڑا اثر ہوتا ہے اسی طرح دعوت وخطابت کے میدان میں بھی۔

غیب پر ایمان لانے کو دیگر امور پر مقدم کیا گیا ہے کیوں کہ غیب پر ایمان کا دوسرے امور ایمان پر اثر ہوتا ہے نیز یہ چیز ارکان ایمان پر عمل کرنے پر بھی موثر ہوتی ہے، ایمان بالغیب میں ہوتا یہ ہے کہ نگاہ سے اوجھل اور ان سنی باتوں کو انسان علمی ناحیے سے مکمل طور پر تسلیم وقبول کرلے۔یہ ایسی نعمت ہے کہ جس مخلوق کو بھی یہ نعمت عطا کردی گئی گویا کہ اس کے ہاتھ خزانہ لگ گیا، کسی بھی نعمت کا درجہ اس کے بعد ہی ہے، نفس کے لئے اس کا قبول کرنا مشکل نہیں ہے، مشکل تو اس پر مکمل عمل پیرا ہونے میں ہے۔

اس آیت کے فوائد میں سے ہے کہ اللہ نے آیت میں رزق کی نسبت اپنی جانب کی ہے ﴿ وَمِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ يُنفِقُونَ ﴾ "اور ہمارے دیئے ہوئے (مال) میں سے خرچ کرتے ہیں"۔اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو وہ

کماتے ہیں اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔تاکہ انسان اس بات کو سمجھ جائے کہ رزق اللہ کا فضل ہے، رزق کے لئے تگ ودو کرنا محض اسباب اختیار کرنے کی قبیل سے ہے، رزق وروزی کے لئے تگ ودو کرنے والے کتنے ہی ایسے ہیں جنہیں کم ہی زرق نصیب ہوتا ہے، اور کتنے ہی خوش نصیب ایسے ہیں جنہیں ان کی تگ ودو سے بڑھ کر ملتا ہے، اس کی تائید سورہ ذاریات میں موجود اللہ کے اس قول سے ہوتی ہے: ﴿وَفِي ٱلسَّمَآءِ رِزۡقُكُمۡ وَمَا تُوعَدُونَ ﴿٢٢﴾﴾ [سورة الذاريات:٢٢]. "اور تمہاری روزی اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے سب آسمان میں ہے"۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: اللہ نے عمومی طور سے ایمان کے تذکرہ کے بعد آخرت کے دن پر ایمان لانے کا خصوصی تذکرہ کیا ہے کیوں کہ آخرت کے دن پر ایمان لانا اللہ سے ڈر و خوف اور امید و عمل کا اہم ذریعہ ہے، جو آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے تو وہ آخرت میں مطلوب چیزوں کی تیاری بھی کرتا ہے۔ بندوں سے جو مطلوب ہے اس کی ترغیب آیت میں عظیم ثواب کے وعدے کے ساتھ دی گئی ہے اور وہ ترغیب یہ ہے کہ ایسا کرنے والے کامیاب ہیں: ﴿وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُفۡلِحُونَ﴾ "اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں"۔اس سے مراد ایسی کامیابی ہے جو مخاطب کا مقصود عین ہے، اسی طرح ڈر اور خوف سے نجات بھی اس میں شامل ہے۔

نجات وکامیابی کے راستوں کا ذکر کرنے کے بعد اللہ نے کفار کی صفات بیان کی ہیں۔

﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَأَنذَرۡتَهُمۡ أَمۡ لَمۡ تُنذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُونَ ﴿٦﴾ خَتَمَ ٱللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ وَعَلَىٰ سَمۡعِهِمۡۖ وَعَلَىٰٓ أَبۡصَٰرِهِمۡ غِشَٰوَةٞۖ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٞ ﴿٧﴾ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَبِٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ وَمَا هُم بِمُؤۡمِنِينَ ﴿٨﴾ يُخَٰدِعُونَ ٱللَّهَ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَمَا يَخۡدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمۡ وَمَا يَشۡعُرُونَ ﴿٩﴾ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٞ فَزَادَهُمُ ٱللَّهُ مَرَضٗاۖ وَلَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمُۢ بِمَا كَانُواْ يَكۡذِبُونَ ﴿١٠﴾﴾

ترجمہ:

"کافروں کو آپ کا ڈرانا، یا نہ ڈرانا برابر ہے، یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے (٦)۔اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے (٧)۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ ایمان والے نہیں ہیں (٨)۔ وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں، لیکن دراصل وہ خود اپنے

آپ کو دھوکا دے رہے ہیں، مگر سمجھتے نہیں(۹)۔ان کے دلوں میں بیماری تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں بیماری میں مزید بڑھادیااوران کے جھوٹ کی وجہ سے ان کے لئے دردناک عذاب ہے(۱۰)"۔

ایمان والوں، متقیوں اور عبادت گزاروں کے اوصاف نیز ان کی کامیابی کو بیان کرنے کے بعد اللہ نے تکبر و عناد اور حق کا انکار کرنے والے کافروں کا ذکر کیا ہے، جن کے کبر و غرور نے انہیں اس مقام پر پہنچادیا تھا کہ محض غرور و عناد کی وجہ سے وہ ایمان نہیں لائے، اور اللہ تعالی کی طرف سے ان کو ڈرانا ان کے لیے مفید ثابت نہ ہو سکا۔اس آیت کے فوائد میں سے ہے کہ بعض لوگ حق کو قبول نہیں کرتے ہیں حالانکہ حق ان کے لئے آسمان میں چمکتے سورج کے مانند واضح اور روشن ہوتا ہے، لہذا ایسی صورت حال میں ایک داعی کو چاہیے کہ دوسروں کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے نہ پڑا رہے، جنہوں نے تکبر و عناد کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کیا جب کہ حق اس کے لئے واضح تھا کیوں کہ ایسے شخص کے دل، سماعت اور بصارت پر اللہ نے تکبر اور صریح حق سے اعراض کرنے کی وجہ سے مہر لگادیا ہے اور یہی لوگ پکے کفار و معاندین ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غرور و تکبر قبول حق کی راہ میں خطرہ ہیں، نیز یہ بندے سے اللہ کی عطا اور اس کے کرم کو بھی روک دیتے ہیں۔ بلکہ اللہ ایسے لوگوں سے علم کے ذرائع سے مستفید ہونے کو بھی روک دیتا ہے، ان علم کے ذرائع میں سے دل ہے جس سے انسان چیزوں کو سمجھتا ہے، کان ہے جس سے باتوں کو سنتا ہے اور نگاہ ہے جس سے قابل دید چیزوں کو دیکھتا ہے: ﴿ خَتَمَ ٱللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ وَعَلَىٰ سَمۡعِهِمۡۖ وَعَلَىٰٓ أَبۡصَٰرِهِمۡ غِشَٰوَةٞۖ ﴾ "اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے"۔ تکبر کبھی کبھی عظیم امور میں ہوا کرتا ہے جیسے اسلام قبول نہ کرنا، ایمان نہ لانا، اور اس حق کو قبول نہ کرنا جس کے حق ہونے میں کوئی شک نہیں، اور کبھی تکبر دوسرے امور میں بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ جو شخص حق کو اس کے اصل مقام و منبع سے قبول کرنے میں تکبر دکھاتا ہے تو اللہ تعالی بھی اس کے تکبر کی وجہ سے اس منبع کو اس سے مستور فرمادیتا ہے، جس طرح اگر کوئی شخص کسی کمزور سے اس کی کمزوری کی بنا پر تکبر سے پیش آتا ہے تو ممکن ہے کہ اللہ تعالی اس شخص کو کمزور شخص کا محتاج بنادے یا کسی دنیوی امور میں کمزور شخص کو اس کا ذمہ دار بنادے۔ اس سے علم کی اہمیت اور تواضع کا مقام سمجھ میں آتا ہے، جو کہ نیک عمل کا باعث، سکینت کی وجہ اور خیر و بھلائی، حق کی قبولیت اور اس پر عمل پیرا ہونے کا

ذریعہ ہے۔ جس طرح مومنین ہی کامیاب ہیں اسی طرح کافر ہی خسارہ اٹھانے والے اور عذاب پانے والے ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ "اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے "۔ جزامومنوں کے لئے ہے اور سزا کافروں کے لئے ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے لوگوں کی اس قسم کا ذکر کیا ہے جنہیں منافق کہا جاتا ہے، جو ظاہر کچھ کرتے ہیں اس کے بر عکس دل میں کچھ اور ہی چھپائے رہتے ہیں: ﴿وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَبِٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ﴾ "بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن در حقیقت وہ ایمان والے نہیں ہیں"۔ اس منافقانہ عمل سے ان کا مقصد دھوکہ دینا ہوتا ہے: ﴿يُخَٰدِعُونَ ٱللَّهَ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾ "وہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں، لیکن دراصل وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں، مگر سمجھتے نہیں"۔ دھوکہ یہ ہے کہ آپ جو چھپائیں اس کے بر عکس دوسروں کو وہم دلائیں (۱)۔ مخلوق کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالی کو دھوکہ دے کیوں کہ اللہ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے، ہر چیز اس پر عیاں ہے تو منافقین کا اللہ کو دھوکہ دینے کا معنی یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو اختیار کرنے میں دھوکہ سے کام لیتے ہیں، اظہار ایمان کا کرتے ہیں اور اس کے بر عکس چھپائے پھرتے ہیں، اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ دینی معاملات میں ان کو دھوکہ میں رکھا جائے، اظہار تو دین کا کیا جائے اور دل میں کفر چھپائے پھرا جائے۔ منافق دھوکہ باز ہوتا ہے، وہ اندر ہی اندر سوچتا ہے کہ اس نے دوسرے کو دھوکہ میں رکھا جب کہ وہ خود کو ہی دھوکہ دیتا ہے، ﴿وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ﴾ "لیکن دراصل وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں". امام قرطبیؒ لکھتے ہیں: دھوکہ کا انجام دھوکہ بازوں کو ہی بھگتنا پڑتا ہے اور دھوکہ ہوتا ہی اس کے ساتھ ہے جو نیتوں سے ناواقف ہو، جو نیتوں کو جانتا ہوا گر کوئی اس کے ساتھ دھوکہ کرنا چاہے تو وہ خود کو ہی دھوکہ دیتا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ منافقین اللہ تعالی کی حقیقی معرفت نہیں تھی اس لئے کہ اگر وہ اللہ کی معرفت ہوتی وہ ان کو یہ بھی شعور ہوتا کہ اللہ کو دھوکہ نہیں دیا

---

(۱) تفسير البيضاوى ۱/ ۲۵.

جاسکتاہے(۱) ۔اس لئے کہ اللہ ان سے اوران کے رازوں سے واقف ہے، بندہ اپنے دل میں جو کچھ چھپاتا ہے یا مستقبل کی زندگی میں جو چال یا عمل وہ چھپائے گا اللہ ان سب سے واقف ہے، اس کے باوجود منافقوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ وہ منافقت کی وجہ سے خود کو ہی دھوکہ دے رہے ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾ "لیکن دراصل وہ خود اپنے آپ کو دھوکادے رہے ہیں، مگر سمجھتے نہیں"۔ منافقت ایک بدترین خصلت ہے، یہ انتہائی درجہ کے سزا والی کرتوت ہے کہ انسان لوگوں کے درمیان چلے پھرے اور وہ اس کو اس کا حساس وشعور بھی نہ ہو کہ لوگ اس کی گھٹیا حرکتوں، غلط عقائد اور برے سلوک وکردار سے آشنا ہیں، وہ سمجھتا ہے کہ نفاق کے لبادے میں لوگ ان کی حقیقت نہ جان سکیں گے جب کہ اس کی کرتوت اور سلوک وکردار سب پر عیاں ہوتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالی لوگوں کے سامنے اس کی حقیقت کو جلد یابدیر ظاہر کرہی دیتا ہے، جیسا کہ سورہ فاطر میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا يَحِيقُ ٱلْمَكْرُ ٱلسَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِۦ﴾ [سورة فاطر:٤٣]. "بری تدبیر کاانجام براہی ہوتاہے اوراس کا وبال بالاخر مکر وحیلہ کرنے والوں پر ہی پڑتا ہے"۔ معاملات کے اعتبار سے لوگوں کی مختلف قسمیں ہیں، کچھ متکبر اور حق کے انکاری ہیں: ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ "ان (کافروں) کو آپ کا ڈرانا، یا نہ ڈرانا برابر ہے، یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے"۔ اور ان میں کچھ دھوکہ باز ہیں: ﴿يُخَٰدِعُونَ ٱللَّهَ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟﴾ "وہ اللہ تعالی کو اور ایمان والوں کو دھوکا دیتے ہیں"۔ ان دونوں قسموں کے انسان ایمان واسلام کے تئیں برابر کے درجہ پر ہیں اگرچہ لوگوں سے معاملات برتنے کے دوران اس سے کچھ کم یا زیادہ برے لگتے ہیں، کیوں کہ بعض وہ ہیں جو کھلے طور پر سخت عناد پرست ہوتے ہیں اور کچھ چاپلوس قسم کے ہوتے ہیں جو دوسروں کو باور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ حق کی قبولیت اور مواقفت کرنے والے ہیں حالانکہ ان کے دل میں ظاہر کے خلاف باتیں ہوتی ہیں، دونوں قسم کے لوگ اخلاقی خرابی اور پستی میں یکساں ہیں۔

حق کو چھوڑنے والا متکبر شخص دنیا وآخرت دونوں میں اللہ کی سزا سے دوچار ہوتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿خَتَمَ ٱللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰٓ أَبْصَٰرِهِمْ غِشَٰوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ "اللہ

---

(١) تفسير القرطبي ١٣٧/١.

تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے"۔ آیات کے فوائد میں یہ بات شامل ہے کہ اس میں دل کے مرض کا بیان ہے: ﴿ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ ٱللَّهُ مَرَضًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌۢ بِمَا كَانُوا۟ يَكْذِبُونَ ﴾ "ان کے دلوں میں بیماری تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں بیماری میں مزید بڑھادیا اور ان کے جھوٹ کی وجہ سے"۔ان کا رسولوں کی تکذیب کرنا ،اور جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس کی تکذیب کرنا، حق کی تردید کرنا اور اس میں شکوک وشبہات پھیلانا ایسی باتیں ہیں جنہوں نے ان کے دلوں کو بیمار کر دیا، اس کی وجہ سے ان کی بیماری میں مزید اضافہ ہوا، اور اللہ کی طرف سے ان کو یہ سزا ملی کہ ان کے دل مزید بیمار ہوگئے۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہورہاہے کہ حق کی تکذیب اور شبہات تک لے جانے والے راستے سے بچنا چاہئے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کے احکامات اور جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا یعنی قرآن کریم اور سنت مطہرہ کو مضبوطی سے تھامے رکھے۔ جس طرح ایک انسان اپنے جسم کو بیماریوں کے اسباب سے بچاتا اور حفاظت کرتا ہے اسی طرح اس پر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے دل کو شبہات کے مرض سے بچائے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس سے آگاہ کیا اور ڈرایا بھی ہے جیسا کہ سورہ صف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَلَمَّا زَاغُوٓا۟ أَزَاغَ ٱللَّهُ قُلُوبَهُمْ ﴾ [سورة الصف:٥]. " پس جب وہ لوگ ٹیڑھے ہی رہے تو اللہ نے ان کے دلوں کو (اور) ٹیڑھا کر دیا"۔ جب انسان ہدایت حاصل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے جیسا کہ اللہ نے سورہ مریم میں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَيَزِيدُ ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ٱهْتَدَوْا۟ هُدًى ﴾ [سورة مريم:٧٦]. "اور ہدایت یافتہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت میں بڑھاتا ہے"۔ اس آیت کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے منع کردہ امور کو حلال کرنے یا اللہ کے احکامات میں خورد برد کرنے کی غرض سے دین میں حیلہ بازی سے گریز کیا جائے کیوں کہ یہ منافقین کا شیوہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نگاہوں کی خیانت اور دلوں کے بھید سے آگاہ ہے، اس سے زمین وآسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ قَالُوٓا۟ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿١١﴾ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ ٱلْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴿١٢﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ءَامِنُوا۟ كَمَآ ءَامَنَ ٱلنَّاسُ قَالُوٓا۟ أَنُؤْمِنُ كَمَآ ءَامَنَ ٱلسُّفَهَآءُ ۗ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ ٱلسُّفَهَآءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾ ﴾

ترجمہ:

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں(۱۱)۔ خبردار ہو! یقیناً یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں، لیکن شعور (سمجھ) نہیں رکھتے(۱۲)۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اور لوگوں (یعنی صحابہ) کی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بیوقوف لائے ہیں، خبردار ہو جاؤ! یقیناً یہی بیوقوف ہیں، لیکن جانتے نہیں(۱۳)"۔

پھر اللہ تعالی حق وفساد کے تئیں منافقین کے غلط خیالات کی حالت کو بیان کر رہا ہے: ﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُواْ فِي ٱلْأَرْضِ قَالُوٓاْ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴾ "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں"۔ منافقین اپنی منافقانہ کارروائیوں کو اصلاحی کاز سمجھتے ہیں، یہ ان کا زعم اور خود سے گھڑا ہوا ایک جھوٹ ہے، اللہ تعالی سات آسمانوں کے اوپر سے ان کے زعم باطل کی تردید فرمارہا ہے: ﴿ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ ٱلْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ ﴾ "خبردار ہو! یقیناً یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں، لیکن شعور (سمجھ) نہیں رکھتے"۔ منافقین فسادی ہیں لیکن کفر وغرور اور حسد کے غلبہ کی وجہ سے انہیں اس بات کا احساس نہیں ہے، اور وہ اپنی ان کارستانیوں کو درست اور بہتر سمجھتے ہیں۔ اس آیت کریمہ کے فوائد میں سے یہ ہے کہ متکبر شخص کبھی بھی موضوع بحث وگفتگو پر سنجیدگی سے غور وفکر نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اس کی ساری کوشش اور فکر اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ گفتگو کرنے والے کی تردید کس طرح سے کرے، ان کے منافقانہ عمل جیسے کفر، گناہ، اور دشمنوں کے سامنے مسلمانوں کے راز افشاء کرنے کی وجہ سے ان سے جب بس اتنا کہا گیا کہ: ﴿لَا تُفْسِدُواْ فِي ٱلْأَرْضِ ﴾ " زمین میں فساد نہ کرو" تو انہوں نے جھٹ کہہ دیا کہ: ﴿إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴾ "ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں"۔ بایں طور کہ وہ اپنے اس باطل پر اچھائی کا لیبل لگاتے تھے۔ اس کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ منافق ومتکبر شخص کبھی بھی اپنے برے عمل کا اعتراف نہیں کرتا بلکہ وہ خود کو پارسا ظاہر کرتا ہے تاکہ اس کے خیال سے لگے کہ دوسرے اس کی بات مان گئے ہیں، حالانکہ وہ اس بات سے ناواقف ہوتا ہے کہ دوسرے اس کے فساد کو اور فساد پھیلانے کو خوب سمجھتے ہیں، وہ اپنے باطل پر اتراتا ہے اور یہ

سمجھتا ہے کہ دوسروں پر اس کا نفاق کھلا نہیں ہے، حالانکہ اس کا فساد نیکوکاروں کے لئے کھلا اور واضح ہوتا ہے۔اس آیت کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ غور سے سننا اور غور وفکر کرنا اصلاح پسندوں کی صفات ہیں جن کا مقصد راجح، حق اور درستگی تک رسائی اور اس کے مطابق عمل ہوتا ہے، ایک مومن اچھائیوں پر تکبر نہیں کرتا بلکہ وہ اچھائی کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے کیوں کہ اسے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فساد، اچھائی کے منافی ہے، فساد خواہ ایمان، عبادات اور اخلاق میں ہو یا پھر معاشرتی، کاروباری اور خاندانی معاملات میں، اچھا شخص خود کو فساد کے سپرد نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ حق کی اتباع کرتے ہوئے بنا کسی تکبر کے فساد سے اجتناب کرتا ہے۔ زمین پر فساد پھیلانے کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ زمین کی مٹی، پانی اور ہوا کو آلودہ کیا جائے بلکہ زمین پر گناہ کے ذریعے بھی فساد ہوتا ہے جو کہ رب تعالی کے غضب کا باعث ہے، فساد اگر گناہ کے ذریعے ہو تو اللہ تعالی ان چیزوں سے لوگوں کو محروم کر دیتا ہے جس پر وہ فساد پھیلاتے تھے، جیسا کہ سورہ اعراف میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ ٱلْقُرَىٰٓ ءَامَنُوا۟ وَٱتَّقَوْا۟ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَـٰتٍ مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ وَلَـٰكِن كَذَّبُوا۟ فَأَخَذْنَـٰهُم بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ﴾ [سورة الأعراف: ٩٦]. "اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا"۔اسی طرح متکبرین و منافقین دوسروں کی اچھائیوں کو جہالت اور بے وقوفی گردانتے ہیں: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ءَامِنُوا۟ كَمَآ ءَامَنَ ٱلنَّاسُ قَالُوٓا۟ أَنُؤْمِنُ كَمَآ ءَامَنَ ٱلسُّفَهَآءُ﴾ "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اور لوگوں (یعنی صحابہ) کی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بیوقوف لائے ہیں"۔انہوں نے نیکوکار اور اصلاح کرنے والے مومنوں کو بے وقوف قرار دیا حالانکہ بے وقوف وہ ہوتا ہے جس کی عقل کم ہوتی ہے جو اچھی طرح تصرف وتدبیر نہ کر سکے بلکہ منافقین اپنے کبر کی وجہ بطور انکار کے یہ سوال کرتے ہیں: ﴿أَنُؤْمِنُ كَمَآ ءَامَنَ ٱلسُّفَهَآءُ﴾ "کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بیوقوف لائے ہیں"۔ان کے نزدیک پیمائش کا معیار ہی بدل گیا یہاں تک کہ ان کے ذہن ودل میں اپنے تئیں نیک ہونے اور مومنوں کے بے وقوف وفسادی ہونے کے گمان نے گھر کر لیا، اس سے معلوم ہوا کہ جس کی عقل پر پردہ پڑا ہوا ہو وہ اپنی برائیوں کو بھی جھوٹے فریبی وجوہات کی بنا پر اچھائی سمجھتا ہے، نیز یہ فائدہ بھی

دے رہا ہے کہ بات چیت میں غور وفکر اور بردباری کی اہمیت ہے تاکہ دوسرا جو کچھ کہہ رہا ہے اس پر گہرائی وگیرائی سے سوچا جاسکے اور منافقوں ومتکبروں کی ڈگر پر چلنے سے بچا جاسکے۔ متکبر ومعاند شخص دوسروں کی درستگی کو بے وقوفی، جہالت اور فساد کا نام دیتا ہے اور اپنی ذات وشعور کے فساد کا احساس نہیں کرتا ہے یہ ان کے غرور وکفر کا نتیجہ ہے۔ اللہ نے بایں طور ان کی تردید فرمائی ہے کہ وہ خود ہی بے وقوف ہیں ﴿أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ ٱلسُّفَهَآءُ﴾ "خبردار ہو! یہی لوگ بیوقوف ہیں"۔ نیز ان کی یہ صفت بھی بیان کی کہ ان کو اپنے بے وقوف ہونے کا علم ہی نہیں ہے ﴿وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ﴾ "لیکن جانتے نہیں"۔ ان کے دھوکہ دہی اور فساد کے بارے میں اللہ نے یہ نہیں کہا کہ وہ جانتے نہیں ہے بلکہ اس چیز کو ان کے عدم شعور کا نتیجہ قرار دیا ہے کہ عدم شعور کی وجہ سے ہی وہ خود کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اسی وجہ سے وہ فساد بھی پھیلا رہے ہیں: ﴿وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ﴾ "لیکن دراصل وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں، مگر سمجھتے نہیں"۔ نیز ارشاد ہے: ﴿أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ ٱلْمُفْسِدُونَ وَلَٰكِن لَّا يَشْعُرُونَ﴾ "خبردار ہو! یقیناً یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں، لیکن شعور (سمجھ) نہیں رکھتے"۔ یہ قرآن کریم کی بلاغت کا ایک باریک پہلو ہے جس میں صفت اور موصوف کی دقیق حقیقت بیان کی گئی ہے، کیوں کہ عدم شعور اور عدم علم میں بہت باریک فرق ہے، کیوں کہ "سفہ" یعنی بیوقوفی کہتے ہیں کم عقلی اور تدبیر وتصرف کی عدم صلاحیت کو، اسی لیے اس کے لیے سب سے دقیق تعبیر یہ بنتی ہے کہ اس کے کاناموں کو عدم علم کا نتیجہ قرار دیا جائے کیوں کہ حصول علم کے سب سے اہم سبب عقل کا اس کے یہاں فقدان ہے اور اس کے سارے تصرفات وکارنامے اس شخص کے مشابہ ہیں جو عقل رشد سے محروم ہے اور یہی اس کے ایمان قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہے اور یہ سب اس کی بے وقوفی کا نتیجہ ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے پاس ادراک کی عقل بھی نہیں جس کی وجہ سے وہ شرعی احکامات وفرائض کا مکلف اور پابند ہوتا ہے، جیسا کہ سورہ ملک میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا۟ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىٓ أَصْحَٰبِ ٱلسَّعِيرِ﴾ [سورة الملك: ١٠]. "اور کہیں گے کہ اگر ہم سنتے ہوتے یا عقل رکھتے ہوتے تو دوزخیوں میں (شریک) نہ ہوتے"۔ معلوم ہوا کہ یہاں جس عقل کے فقدان کی بات کہی گئی ہے اس سے مراد عقل رشد ہے نہ کہ عقل ادراک جو کہ شرعی احکامات کے مکلف ہونے کا سبب ہے۔ اور شعور کہتے ہیں ایسے علم کو جو احساس سے جڑا ہو، انہیں یہ احساس

ہی نہیں کہ وہ اس ذات کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے دھوکہ دہی اور منافقت سے خوب واقف ہے انہیں یہ بھی احساس نہیں کہ وہ فسادی ہیں، پس وہ دھوکہ وفساد میں پڑے رہتے ہیں باوجود اس کے کہ ان کا دھوکہ وفساد ظاہر ہے لیکن انہیں اس کا احساس نہیں ہے، نعوذ باللہ یہ انسان کی بدترین حالت ہے کہ اپنی برائی اور دھوکہ دہی کے تئیں اس کا احساس مر جائے، وہ فساد پھیلاتا رہے، دھوکہ دیتا رہے اور یہ سمجھتا رہے کہ وہ ذہین وفطین ہے، دوسروں کے سامنے اس کا دھوکہ وفساد ظاہر ہو لیکن اسے اپنی دھوکہ وفساد کی حالت کا شعور نہ ہو۔ اگر منافق و معاند، مومنوں کو بے وقوف کہتے ہیں: ﴿أَنُؤْمِنُ كَمَآ ءَامَنَ ٱلسُّفَهَآءُ﴾ "کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بیوقوف لائے ہیں"۔ تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیوں کہ زمانہ قدیم سے ہی اہل حق نیز خیر و بھلائی اور درستگی کی راہ پر گامزن افراد کو تکذیب کرنے والے اور حاسدوں کی جانب سے ان القابات سے ملقب کیا جاتا رہا ہے، چنانچہ مومن خود کو دین کے دشمنوں کی جانب سے کی جانے والی ناپسندیدہ باتوں کو سہن کرنے کا عادی بنالیتا ہے اور ان کے ساتھ حکمت والا معاملہ کرتا ہے اور خیر و بھلائی کے مخالف باطل صداؤں کا خود کو خوگر بنالے اور پوری حکمت ودانائی سے کام لے کیوں کہ یہ خیر وشر کے معاملے میں انسانی مزاجوں کا اختلاف ہے، اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ اللہ ان کو ان کے کفر اور نفاق کی وجہ سے ہلاک کردے لیکن اس کی حکمت و بردباری کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کے تئیں حکمت وبردباری کا معاملہ فرمائے۔

﴿ وَإِذَا لَقُوا۟ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا وَإِذَا خَلَوْا۟ إِلَىٰ شَيَـٰطِينِهِمْ قَالُوٓا۟ إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ﴿١٤﴾ ٱللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِى طُغْيَـٰنِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾ ﴾

ترجمہ:

"اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان والے ہیں اور جب اپنے بڑوں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان سے صرف مذاق کرتے ہیں (۱۴)۔ اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی اور بہکاوے میں اور بڑھا دیتا ہے (۱۵)"۔

اس کے بعد سیاق قرآنی منافقوں کے نفاق کی صورت حال کو بیان کر رہا ہے کہ جب وہ مومنوں سے ملتے ہیں تو انہیں یہ باور کراتے ہیں کہ وہ بھی مومن ہیں: ﴿ وَإِذَا لَقُوا۟ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا ﴾

"اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان والے ہیں"۔اور جب اپنے لیڈروں کے ساتھ ہوتے ہیں تو اس کے بر عکس بات کہتے ہیں: ﴿وَإِذَا خَلَوْاْ إِلَىٰ شَيَٰطِينِهِمْ قَالُوٓاْ إِنَّا مَعَكُمْ﴾ "اور جب اپنے بڑوں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں"۔ جب اپنے شیطاطین کے واپس آتے ہیں اور ان سے تنہائی میں ملتے ہیں تو مومنین سے برات کا اظہار کرتے ہیں اور شیاطین سے اپنی دوستی ثابت کرتے ہیں، شیاطین سے مراد ان کے لیڈر ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد شیاطین جن ہیں، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد کاہن ہیں، لیکن لفظ شیطنت کے معنی ہوتے ہیں ایمان اور بھلائی سے دور ہونا جو کہ اوپر مذکور تمام معانی کے لئے عام ہے واللہ اعلم. یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ اس کے ایک لفظ میں تمام معانی و مراد شامل ہوتے ہیں، (شَيَٰطِينِهِمْ) کے لفظ میں بھی ہر وہ شخص شامل ہے جو شیطانوں جیسا عمل کرتا ہے۔ بڑی ہی بزرگ ہے وہ ذات جس نے اپنی کتاب کے ذریعے اپنی مخلوق کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ بھی قرآن کریم کی بلاغت ہے کہ اس نے مومنوں کے ساتھ کافروں کے ملنے جلنے کو لفظ لقاء یعنی ملاقات سے تعبیر کیا ہے اور شیاطین کے ساتھ ان کے میل ملاپ کو لفظ خلوۃ یعنی تنہائی کی ملاقات سے تعبیر کیا ہے، چنانچہ مومنوں کے تعلق سے ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا لَقُواْ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ﴾ اور یہاں منافقین کے بارے میں کہا: ﴿وَإِذَا خَلَوْاْ إِلَىٰ شَيَٰطِينِهِمْ﴾، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مومن کا معاملہ واضح ہوتا ہے، ان کی ملاقاتیں تنہائیوں اور چالبازیوں سے پر نہیں ہوتیں، اور منافقین سے بھی ان کی ملاقاتیں بالکل علانیہ ہوتی ہیں، لیکن اس کے بر عکس منافقین کی شیطانوں سے ملاقاتیں تنہائی میں ہوتی ہیں اس ڈر سے کہ مبادا ان کے ساتھ کوئی مومن نہ ہو یا کوئی مومن انہیں دیکھ نہ لے، منافقانہ روش کی یہ واضح صورت ہے نیز اس میں قرآن کریم کی بلاغت کا بھی بیان ہے۔ ان آیات کے فوائد میں سے یہ ہے کہ سلوک و معاملات میں منافقین کا اپنا طریقہ ہے یعنی ظاہر میں مومنوں سے اتفاق رکھنا اور باطن میں ان سے اختلاف و دشمنی پالنا اور ان کے دشمنوں کے ساتھ پوشیدہ سانٹھ گانٹھ رکھنا، یہ اس بات کی متقاضی ہے کہ منافقانہ روش رکھنے والوں سے احتیاط برتی جائے کیوں کہ موافقت کے اظہار کے باوجود وہ دھوکہ دہی سے باز نہیں آتے، جو اللہ کو دھوکہ دیتا ہے وہ دوسروں کو بدرجہ اولی دھوکہ دے سکتا ہے۔ یہ طریقہ، شیطانی طریقہ ہے، اللہ نے ان کے بارے میں کہا ہے: ﴿وَإِذَا خَلَوْاْ إِلَىٰ شَيَٰطِينِهِمْ قَالُوٓاْ إِنَّا مَعَكُمْ﴾ "اور جب اپنے بڑوں کے پاس

جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں"۔ انہوں نے جو طریقہ اپنایا ہوا ہے اللہ نے انہیں اسی سے متصف کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان جن طریقوں کو اختیار کرلیتا ہے اسے انہی طریقوں سے متصف کیا جاتا ہے نیز وہ روش اس کی فطرت اور عادت بن جاتی ہیں، اللہ تعالی نے شیاطین کا سہارا لینے والوں کو شیاطین کی صفت سے ہی متصف کیا ہے کیوں کہ ان کا طریقہ شیطانی طریقہ ہے، اور اللہ کا یہ بیان ان کی حقیقت کو عیاں کرنے والا ہے تاکہ مومن اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لے اور ہر اس شخص سے احتراز کرے جس کی روش منافقانہ ہو نیز مومن خود بھی اس شیطانی سلوک سے گریزاں رہے، حدیث میں بھی اس سے تحذیر آئی ہے کہ انسان دورخی اختیار کرے، کسی کے پاس کچھ بن کر آئے اور کسی کے پاس کچھ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لوگوں میں سے بدترین شخص دو چہروں والا ہوتا ہے، جو ان لوگوں کے پاس ایک چہرے سے آتا ہے اور اُن لوگوں کے پاس دوسرے چہرے سے آتا ہے"(١) ۔اور اس سے مراد ایسا شخص ہے جو لوگوں کے ہر گروہ کے پاس اس کو راضی کرنے والی باتیں لے کر آتا ہے۔ اس آیت کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ براءت ظاہر کرنا اور علتیں بیان کرنا ہر انحراف کا وطیرہ ہے تاکہ گمراہ شخص خود کو اور دوسروں کو اس فساد و گمراہی سے بری قرار دے سکے جس پر وہ ہے ﴿وَإِذَا خَلَوْاْ إِلَىٰ شَيَٰطِينِهِمۡ قَالُوٓاْ إِنَّا مَعَكُمۡ إِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُونَ ﴾ "اور جب اپنے بڑوں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان سے صرف مذاق کرتے ہیں"۔ منافقوں نے اپنے شیاطین کے سامنے یہ براءت ظاہر کی کہ مومنوں کے ساتھ ان کے تعلقات محض مذاق و استہزا پر مبنی ہیں، دوستی یاری، مدد اور گروہ بندی میں وہ شیاطین کے ساتھ ہیں لیکن اللہ ان کے حال سے واقف ہے، ان کو عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا ہے کیوں کہ اللہ حلیم ہے وہ ان کو ان کی سرکشی میں چھوڑے رکھتا ہے پھر ان کی شدید پکڑ کرتا ہے، ارشاد ہے: ﴿ ٱللَّهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ وَيَمُدُّهُمۡ فِي طُغۡيَٰنِهِمۡ يَعۡمَهُونَ ﴾ "اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی اور بہکاوے میں اور بڑھا دیتا ہے"، یعنی اللہ ان سے انتقام لیتا ہے، ان کو سزا دیتا ہے اور ان کا مذاق بناتا ہے اور انہوں نے مومنوں کے ساتھ جو استہزا کیا اس پر ان کو سزا دیتا ہے، سزا کو گناہ کے نام سے

(١) صحيح البخاري ٥٠٣/٢ حديث نمبر ٣٤٩٤.

موسوم کیاہے، اور یہ جمہور علماء کا قول ہے[1]۔ یہ بات مسلمانوں کو یہ سکھارہی ہے کہ وہ چوکنا رہیں اور سرکشوں کو اللہ جو مہلت دیتاہے اس سے دھوکہ نہ کھائیں نیز اللہ سے یہ مطالبہ نہ کریں کہ اللہ سرکشوں کو مٹاکر ان کے خلاف مومنوں کی مدد کرے جیساکہ سورہ آل عمران میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ﴾ [سورة آل عمران:۱۹۶-۱۹۷]. "تجھے کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا فریب میں نہ ڈال دے. یہ تو بہت ہی تھوڑا فائدہ ہے، اس کے بعد ان کا ٹھکانہ تو جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے"۔اسی طرح مومن گناہ کے معاملے میں اللہ کے عذاب سے ڈرے اور اللہ کی طرف سے جو مہلت ملتی ہے اس سے دھوکہ نہ کھائے اور نہ اس بناپر گناہ کے معاملات میں گنہگاروں کی اتباع کرنے لگے کہ اللہ ان کو سزا دینے میں جلدی نہیں کررہاہے، اس لئے کہ اللہ حلیم ہے لیکن اس کی پکڑ شدید ہے پس مومن، ظالم وگنہگار شخص کی سزا میں تاخیر اور مہلت سے متاثر نہیں ہوتاہے۔

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِم مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾﴾ [سورة البقرة:۱۶-۲۰].

ترجمہ:

"یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں خرید لیا، پس نہ تو ان کی تجارت نے ان کو فائدہ پہنچایااور نہ یہ ہدایت والے ہوئے(۱۶)۔ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پس آس پاس کی چیزیں روشنی میں آئی ہی تھیں کہ اللہ ان کے نور کو لے گیااور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا، جو نہیں دیکھتے۔ بہرے، گونگے، اندھے ہیں۔ پس وہ نہیں لوٹتے(۱۷)۔یا آسمانی برسات کی طرح

(۱) تفسير القرطبي ۱/ ۱٤٥.

جس میں اندھیریاں اور گرج اور بجلی ہو، موت سے ڈر کر کڑاکے کی وجہ سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں(۱۸)۔اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے(۱۹)۔قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اُچک لے جائے، جب ان کے لئے روشنی کرتی ہے تو اس میں چلتے پھرتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا کرتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو بیکار کردے، یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے(۲۰)"۔ پھر سیاق قرآنی کا رخ ان کی حالت وصفت کے بیان کی طرف مڑ جاتا ہے ﴿ٱلَّذِينَ ٱشۡتَرَوُاْ ٱلضَّلَٰلَةَ بِٱلۡهُدَىٰ مُهۡتَدِينَ﴾ "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں خرید لیا"۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دیا اور گمراہی کو ہدایت کی قیمت خرید بنادیا، منافقین کی روش کو اللہ تعالیٰ نے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے بایں طور کہ اللہ نے ان کے کرتوت کو گمراہی خریدنے سے تعبیر کیا ہے اور انہوں نے ہدایت کو گمراہی کی قیمت خرید بنادیا، اس سے بڑا نقصان کیا ہوگا اور اس سے بڑی بے وقوفی اور کیا ہو سکتی ہے؟ خریدنا، قیمت کی ادائیگی کا تقاضا کرتا ہے، اور قیمت اسی چیز کی ادا کی جاتی ہے جس کو انسان پسند کرتا ہے، اور قیمتادی جانے والی چیز کی قیمت خریدنے والے کے نزدیک خریدی جانے والی چیز سے کم ہوتی ہے، اس میں دنیا و آخرت میں ہلاک کر دینے والے خسارہ کی مقدار کا بیان ہے، پھر اللہ نے اس تجارت کا نتیجہ بیان کیا ہے: ﴿فَمَا رَبِحَت تِّجَٰرَتُهُمۡ﴾ "پس نہ تو ان کی تجارت نے ان کو فائدہ پہنچایا" وہ گھاٹے کا سودا ہے، کیوں کہ ان کے اپنے اس عمل میں ان کو ایمان کی ہدایت نصیب نہ ہو سکی کہ ضلالت کے بجائے ایمان خریدتے، البتہ ان کے برعکس اہل ایمان ہیں جو اللہ کے ساتھ اپنی تجارت میں فائدہ اٹھانے والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم و تعلم اور توجیہ وارشاد کے میدان میں مطلوب و مقصود کا بیان انتہائی گیرائی اور وضاحت کے ساتھ ہونا چاہیے اور مفہوم کی ادائیگی کے لیے ایسی عمدہ اور دقیق تعبیر ہو کہ معنی اور مفہوم کی باریک تصویر کشی ہو جائے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حالت کی ایک مثال بیان کی ہے: ﴿مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ ٱلَّذِى ٱسۡتَوۡقَدَ نَارًا فَلَمَّآ أَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهُۥ ذَهَبَ ٱللَّهُ بِنُورِهِمۡ وَتَرَكَهُمۡ فِى ظُلُمَٰتٍ لَّا يُبۡصِرُونَ﴾ "ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پس آس پاس کی چیزیں روشنی میں آئی ہی تھیں کہ اللہ ان کے نور کو لے گیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا، جو نہیں دیکھتے"۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حالت کی ایک مثال

بیان کی ہے تاکہ ہر وہ شخص جو حق اور ہدایت کا متلاشی ہو وہ عبرت حاصل کرے، اور ضرب المثل مخاطب تک معلومات کی رسائی اور افہام و تفہیم کا اہم ذریعہ ہے جس سے کسی بھی چیز کی تصویر اور کیفیت کھل کر واضح ہو جاتی ہے، بیضاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: مثالیں دل میں زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں اور اس سے مخالفت کو بہتر طریقے سے لاجواب کیا جاسکتا ہے(۱) ۔

ان منافقوں کی مثال جو کفر کی تاریکی میں ہیں اس شخص کی طرح ہے جو شدید تاریکی میں ہو پھر اس نے آگ جلائی تاکہ اس کی روشنی سے رات کی تاریکی جاتی رہے، پھر جس کی وہ خواہش رکھتا تھا اس کو پالیتا ہے اور وہ اللہ کا دین ہے جس سے عقیدہ، اخلاق، اور تمام معاملات زندگی سے کفر کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں، اور وہ منافقین اللہ کے دین سے مستفید ہوئے جس طرح آگ جلانے والا آگ کی روشنی سے مستفید ہوتا ہے اور انہوں نے اس دین کو اس کی روشنی سے پہچان لیا جس طرح آگ کی حقیقت کو اس کی روشنی سے پہچانا تھا، پھر ان پر خواہشات و شبہات کا غلبہ ہوا اور انہوں نے اپنے ایمان کو نفاق سے بدل دیا تو اللہ نے بھی اپنے نور کو ان سے ختم کر دیا جس طرح اس آگ کی لو بجھ جاتی ہے جس کو انہوں نے روشن کیا تھا چنانچہ ان پر پھر سے کفر کی تاریکیاں چھا گئیں اور ان کی حالت یوں ہو گئی: ﴿ صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡيٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُونَ ﴾ "بہرے، گونگے، اندھے ہیں۔ پس وہ نہیں لوٹتے"۔ یعنی وہ بالکل تاریک جگہ میں ہو گئے جس کو کفر کی تاریکی کے لیے بطور مثال استعمال کیا گیا ہے جہاں انہیں کچھ دیکھائی نہیں دیتا، وہ گونگے بھی ہیں کچھ بولتے نہیں کہ کوئی ان کی بات سنے، اور اسی لئے پہلے جس مقام یا ایمان کے جس مرتبہ پر تھے اس کی طرف واپسی بھی ان کے لئے ممکن نہیں ہے، یہ وہ منافقین ہیں جنہوں نے اپنے ایمان کو کفر و نفاق سے بدل لیا اور ان کی محبت کفر اور کفار شیاطین سے وابستہ ہے، ان کی حالت مذکورہ مثال میں بیان کردہ شخص کی حالت جیسی ہے۔ اللہ کے قول: ﴿كَمَثَلِ ٱلَّذِي ٱسۡتَوۡقَدَ نَارٗا﴾ میں استوقد، اَوۡقَدَ کے معنی میں ہے جو آگ جلاتا ہے اس کا ذکر مفرد آیا ہے جب کہ نور کے ختم ہو جانے کا ذکر جمع کے ساتھ آیا ہے: ﴿ذَهَبَ ٱللَّهُ بِنُورِهِمۡ﴾ "اللہ ان کے نور کو لے گیا" اس کی وجہ جیسا کہ امام قرطبیؒ نے ذکر کیا ہے یہ ہے کہ: آگ جلانے والا تو جماعت کا کوئی ایک شخص ہی ہوتا ہے جو لوگوں کے لئے آگ جلاتا ہے، لیکن جب روشنی ختم ہوتی

(۱) تفسير البيضاوي ١/ ٣٠.

ہے تو تاریکی تمام لوگوں پر چھا جاتی ہے(۱)۔ یہ فصاحت وبلاغت کا اعلی معیار ہے حتی کہ جملہ کے نظم و ترتیب میں بھی اس کی رعایت ہے، اور قرآنی الفاظ فصاحت وبلاغت کی پوری گیرائی اور عمدگی کے ساتھ صورت حال کے عین مطابق اور ہم آہنگ ہیں، اللہ کے قول ﴿ذَهَبَ ٱللَّهُ بِنُورِهِمۡ﴾ "اللہ ان کے نور کو لے گیا" کے معانی کی جو باریکیاں پائی جاتی ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ: اللہ نے ان کے فائدے کی چیز یعنی روشنی کو ان سے ختم کر دیا اور اور نقصان دہ چیز یعنی دھواں اور تپش باقی رہنے دیا ﴿وَتَرَكَهُمۡ فِي ظُلُمَٰتٖ﴾ "اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا" اندھیرے سے مراد شک، کفر اور نفاق ہیں جن میں وہ پڑے ہوئے ہیں ﴿لَّا يُبۡصِرُونَ﴾ "جو دیکھتے نہیں" یعنی وہ خیر و بھلائی کے راستے کی ہدایت سے دور اور ناآشنا ہیں، مزید برآں وہ ﴿صُمُّۢ﴾ "بہرے ہیں" کسی کی بھلی بات کو سن نہیں سکتے، ﴿بُكۡمٌ﴾ "گونگے ہیں" بھلی باتیں بول نہیں سکتے، ﴿عُمۡيٞ﴾ "اندھے ہیں" گمراہی میں پڑے، بصیرت سے محروم ہیں۔

اس سے یہ فائدہ اخذ ہوتا ہے کہ ایک مومن جس کو ایمان کی روشنی سے شناسائی ہے اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ اس مثال سے فائدہ اٹھائے وہ اپنے دل، عمل اور اعضاء وجوارح کو عبادت واطاعت کے امور میں لگا کر اس ایمانی نور کی حفاظت کرے اور ان تمام اسباب سے دور رہے جو اس کے ایمان کی کمزوری اور زوال کا باعث ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ انہی منافقوں کی طرح وہ بھی اپنا ایمان کھو بیٹھے۔ اس لئے کہ نور ایمانی کا زوال آگ کی روشنی کے بجھنے جیسا ہے، شیاطین ایمان کو اچک لیتے ہیں، اور یہ متعدد بری خصلتوں والے شیاطین گمراہی کے مختلف اسباب وراستے لوگوں کے سامنے بدل بدل کر پیش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح خود ستائشی سے بچنا بھی ضروری ہے کیوں کہ یہ چیز کبر وغرور کا باعث ہے، مومنوں کو ان کے ایمان اور عبادت میں کمتر جاننا اور ان میں جو نادان وناآشنا ہیں ان کو ان کی نادانی کی وجہ سے حقارت کی نظر سے دیکھنا بھی اسی قبیل سے ہے، بلکہ ایک مومن پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے لیے میسر خوبی پر اللہ کی حمد بیان کرے اور ناواقف افراد کو وعظ ونصیحت، تعلیم اور ہدایت ورہنمائی کرے اور کسی طرح سے ان کی حقارت اور ذلت آمیزی سے پرہیز کرے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ نے اسے دوسروں کے بالمقابل ایمان و

---

(۱) تفسير القرطبي ١/١٤٨.

عبادت یا دوسری نعمتوں سے نوازا ہے تو اس پر وہ غرور نہ کرے، بلکہ زہ یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ نے ہی اسے یہ سب بخشا ہے اور جس بھلائی پر بھی وہ قائم ہے وہ اللہ کی عطا ہے۔ اسی طرح بھلائی کی اس نعمت کو گناہوں سے بدل دینے سے بھی ڈرے کیوں کہ گناہ اللہ کے غضب کا باعث ہے۔

اس کے بعد اللہ نے منافقین کی مزید ایک مثال بیان کی ہے جو حق بات اور اللہ کی آیات کو سننا ناپسند کرتے ہیں: ﴿ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ ٱلسَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمَٰتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَٰبِعَهُمْ فِىٓ ءَاذَانِهِم مِّنَ ٱلصَّوَٰعِقِ حَذَرَ ٱلْمَوْتِ ۚ وَٱللَّهُ مُحِيطٌۢ بِٱلْكَٰفِرِينَ ﴾ "یا آسمانی برسات کی طرح جس میں اندھیریاں اور گرج اور بجلی ہو، موت سے ڈر کر کڑاکے کی وجہ سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے"۔ اللہ کی آیات اور حق کی آواز سننے سے اعراض برتنے میں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے رات کی تاریکی میں بارش، بادل، گھپ اندھیرا اور گھن گرج آن لے اور وہ ان سے ڈر جائے، اسی طرح منافق جب اللہ کی آیات سنتا ہے تو وہ ڈر جاتا ہے، جیسے بارش اور گھن گرج سے ڈرا ہوا شخص اپنے کانوں میں موت کے خوف سے انگلیاں ٹھونس لیتا ہے[1]، اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَٱللَّهُ مُحِيطٌۢ بِٱلْكَٰفِرِينَ ﴾ "اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے"، چنانچہ اللہ تعالیٰ سے کوئی منافق بچ نہیں سکتا، اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان سب کو جمع کرنے والا ہے۔ (إحاطة) کے معنی ہلاک کرنے کے بھی ہوتے ہیں، ﴿وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ﴾ [سورة الكهف:٤٢]. "اور اس کے (سارے) پھل گھیر لئے گئے"۔ اسی طرح اس کا معنی ہر جانب سے ان پر قدرت پانا بھی ہوتا ہے پس وہ کبھی بھی اللہ سے بچ نہیں سکتے، اسی طرح اس میں علم اور سزا اور جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ چاہے ان تمام کے احاطے کا معنی اس آیت میں شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حق اور روشنی کی باتوں کو سننے کے سلسلے میں ان کی حالت کو نہایت باریک انداز میں بیان کیا ہے نیز وعید و تہدید بھی اس مثال میں بڑی عمدگی سے واضح کر دی گئی ہے، تو وہ حق کے تئیں ویسا ہی احساس رکھتے ہیں جیسا کہ ڈرا دینے بجلی کے تئیں، کیوں کہ ان کے اعمال بھی کفریہ ہی ہیں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کافروں کو وعیدیں سنائی گئی ہیں۔

---

(١) تفسير ابن السعدى ١/٤١.

اس سے یہ فائدہ بھی حاصل ہورہاہے کہ نعمت ایمان، نیز سماعت وبصارت اور دیگر دوسری نعمتیں جن کا انسان محتاج ہے ان تمام کا احساس وعلم ایک انسان ہو ہونا چاہئے اور اس کو ہمہ وقت ان کے کھو جانے کا خوف دامن گیر رہنا چاہئے، اوران نعمتوں کی حفاظت اس طرح سے ہوسکتی ہے کہ انہیں انہی کاموں میں لگایا جائے جن کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں، نعمتوں کے کھو جانے سے صرف ان کا ظاہری طور پر کھو جانا مراد نہیں ہے بلکہ حق سے لاعلمی اور اعراض برتنے کی وجہ سے وہ نعمتیں کھو جاتی ہیں، جیساکہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰٓ أَبْصَٰرَهُمْ﴾ [سورة محمد:٢٣]. "اور جن کی سماعت اور آنکھوں کی روشنی چھین لی ہے"۔ نیز فرمایا: ﴿أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ طَبَعَ ٱللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَٰرِهِمْۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْغَٰفِلُونَ﴾ [سورة النحل:١٠٨]. "یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور جن کے کانوں پر اور جن کی آنکھوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے اور یہی لوگ غافل ہیں"۔ مزید ارشاد باری ہے: ﴿وَنُقَلِّبُ أَفْـِٔدَتَهُمْ وَأَبْصَٰرَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُواْ بِهِۦٓ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِى طُغْيَٰنِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ [سورة الأنعام:١١٠]. "اور ہم بھی ان کے دلوں کو اور ان کی نگاہوں کو پھیر دیں گے جیساکہ یہ لوگ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں حیران رہنے دیں گے"۔ لہذا ایک مومن ہمیشہ خود کو استقامت کی راہ پر لگانے کے لئے کوشش کرتا اور اللہ سے ثابت قدمی کی دعا کرتا ہے، ام سلمہ رضی عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے: (يا مقلب القلوب ثبت قلبي على دينك)(١).

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعْبُدُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُمْ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ فِرَٰشًا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقًا لَّكُمْۖ فَلَا تَجْعَلُواْ لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٢﴾ وَإِن كُنتُمْ فِى رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُواْ بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِۦ وَٱدْعُواْ شُهَدَآءَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٢٣﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ وَلَن تَفْعَلُواْ فَٱتَّقُواْ ٱلنَّارَ ٱلَّتِى وَقُودُهَا ٱلنَّاسُ وَٱلْحِجَارَةُۖ أُعِدَّتْ لِلْكَٰفِرِينَ ﴿٢٤﴾ وَبَشِّرِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّٰتٍ

---

(١) جامع الترمذي٥/٥٠٣حديث نمبر ٣٥٢٢.

تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُۖ كُلَّمَا رُزِقُواْ مِنۡهَا مِن ثَمَرَةٖ رِّزۡقٗا قَالُواْ هَٰذَا ٱلَّذِي رُزِقۡنَا مِن قَبۡلُۖ وَأُتُواْ بِهِۦ مُتَشَٰبِهٗاۖ وَلَهُمۡ فِيهَآ أَزۡوَٰجٞ مُّطَهَّرَةٞۖ وَهُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٥﴾ ﴾

ترجمہ:

"اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا، یہی تمہارا بچاؤ ہے (۲۱)۔ جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتار کر اس سے پھل پیدا کرکے تمہیں روزی دی، خبر دار باوجود جاننے کے اللہ کے شریک مقرر نہ کرو (۲۲)۔ ہم نے جو کچھ اپنے بندے پر اتارا ہے اس میں اگر تمہیں شک ہو اور تم سچے ہو تو اس جیسی ایک سورت تو بنالاؤ، تمہیں اختیار ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلالو (۲۳)۔ پس اگر تم نے نہ کیا اور تم ہرگز نہیں کر سکتے تو (اسے سچا مان کر) اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے (۲۴)۔ اور ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ان جنتوں کی خوشخبریاں دو، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، جب کبھی وہ پھلوں کا رزق دیئے جائیں گے اور ہم شکل لائے جائیں گے تو کہیں گے یہ وہی ہے جو ہم اس سے پہلے دیئے گئے تھے اور ان کے لئے بیویاں ہیں صاف ستھری اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں (۲۵)۔

اس کے بعد سیاق قرآنی میں اللہ تعالی نے تمام بنی نوع انسان کو ندا دیتے ہوئے یہ حکم دیا کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں، فرمایا: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعۡبُدُواْ رَبَّكُمُ ٱلَّذِي خَلَقَكُمۡ ﴾ "اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا"۔ آیت کی ابتدا اس طرح سے ہوئی ہے کہ اللہ تمام انسانوں کو ندا کے صیغہ کے ساتھ مخاطب کر رہا ہے ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ﴾ "اے لوگو!" اس ندا کے ذریعہ ایک عظیم کام کی طرف ذہنوں کو متوجہ کیا جا رہا ہے اور وہ عظیم کام اللہ کی عبادت ہے ﴿ ٱعۡبُدُواْ رَبَّكُمُ ﴾ "اپنے رب کی عبادت کرو" اس سے ندا کے اسلوب کی اہمیت ظاہر ہو رہی ہے جو کہ متنبہ کرنے کا فائدہ دیتا ہے، اور مخاطب کی تعیین کرتا ہے بایں طور کہ اس میں اللہ تعالی نے تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کیا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس آیت میں اللہ نے صرف کافروں کو خطاب کیا ہے، جس نے یہ کہا ہے کہ اللہ نے تمام لوگوں سے خطاب کیا ہے تو مومنوں کو خطاب کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی

کی عبادت پر ہمیشہ قائم رہیں اور کافروں کو مخاطب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عبادت کا آغاز کریں(۱)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس خطاب کو عام مان لینے میں کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ عام ماننے کی صورت میں جو اہم ہے وہ بھی اس خطاب میں شامل ہوگا اور اس طرح سے اس خطاب سے اصل مقصود لوگوں کے ساتھ دوسرے بھی شامل ہو جائیں گے دوسروں کو بھی اصل مخاطبین کو دی گئی ہدایات اور ڈراوے کا علم ہو جائے گا اور یہ چیز ایک طرف ان کے لیے ثابت قدمی، اطمینان قلب، علم و معرفت اور اس کی اہمیت کے احساس کا سبب ہوگی اور دوسری طرف اصل مخاطب کے لیے توجیہ وارشاد اور انذار و تخویف۔

من جملہ اسلوب بیان میں سے ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ کسی چیز کا حکم دینے کے بعد اس کا سبب بھی بیان کر دیا جائے اور اس آیت میں وہی اسلوب استعمال کیا گیا ہے بایں طور کہ جب اللہ نے تمام لوگوں کو اپنی عبادت کا حکم دے دیا: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعۡبُدُواْ رَبَّكُمُ﴾ "اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو" تو غیر اللہ کو چھوڑ کر صرف اس اللہ کی عبادت کئے جانے کا حقیقی سبب یہ بیان کیا کہ وہی ہے جس نے نعمتیں دے کر تمہاری پالنہاری کی ہے، نیز وہی ہے جس نے تمہیں عدم سے وجود بخشا، بلکہ اللہ تعالی نے حکم کی علت کو ربوبیت کے ساتھ جوڑا ہے، ارشاد ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعۡبُدُواْ رَبَّكُمُ﴾ "اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو"۔ بایں طور کہ اگر قاری لفظ (اعبدوا) پر رک جائے تو (ربکم) کا لفظ ادا کئے بغیر حکم کا مفہوم مکمل نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح آیت کریمہ حکم کے مقصد کو بھی بیان کر رہی ہے کہ اے لوگو! حکم کا مقصد تمہاری مصلحت سے وابستہ ہے اور وہ مصلحت ہے﴿لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ﴾ "یہی تمہارا بچاؤ ہے" کیوں کہ جسے تقوی کی دولت نصیب ہو گئی وہ دونوں جہاں میں کامیاب ہو گیا، جیسا کہ اللہ نے سورہ نبأمیں ارشاد فرمایا ہے: ﴿إِنَّ لِلۡمُتَّقِينَ مَفَازًا ٣١﴾ [سورة النبأ: ٣١]. "یقیناً پرہیزگار لوگوں کے لئے کامیابی ہے"۔ اس میں تربیتی، تعلیمی اور دعوتی فائدہ بھی ہے وہ یہ کہ انسان جو کچھ سیکھتا یا جن باتوں کو بجالانے کا اس سے مطالبہ کیا جاتا ہے اس کے بہترین نتائج اور اچھائیوں کو بیان کرنا کافی اہم ہے تاکہ یہ چیز انسان کے لئے باعث مہمیز ہو اس لئے انسانی طبیعت منافع کی خواہشمند ہوتی ہے۔ مذکورہ تعلیلات کی درج ذیل سات حیثیتیں ہیں: اول یہ

---

(۱) تفسير القرطبي ١/١٥٧.

کہ :﴿رَبَّكُمُ﴾ وہ تمہارا رب ہے جس نے اپنی نعمتوں کے ذریعے تمہاری پالنہاری کی ہے۔ دوسری یہ کہ :﴿ٱلَّذِى خَلَقَكُمْ﴾ اسی نے تمہیں پیدا کیا ہے یعنی عدم سے وجود میں لایا ہے۔ تیسری یہ کہ :﴿وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ﴾ اس نے تم سے پہلے والوں کو بھی پیدا کیا ہے، انہیں بھی عدم سے وجود بخشا ہے۔ چوتھی یہ کہ : اس نے زمین کو تمہارے تابع کر دیا کہ تم اس پر بیٹھتے ہو، سوتے ہو اور چلتے ہو﴿ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ فِرَٰشًا﴾۔ پانچویں یہ کہ : اس نے آسمان کو تمہارے اوپر بطور گنبد کے بنایا ہے﴿وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً﴾۔ چھٹی یہ کہ : اس نے بارش برسایا ہے جس میں کہ زمین کے لئے زندگی ہے، اسی سے کھیتیاں ہوتی ہیں جسے انسان، حیوان اور چوپائے کھاتے ہیں ﴿وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾۔ ساتویں یہ کہ : اس نے پھلوں کو تمہارے لئے رزق بنادیا ہے :﴿فَأَخْرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ﴾۔

اگرچہ زمین میں اگنے والی چیزوں کو انسان کے ساتھ حیوان اور چوپائے بھی کھاتے ہیں لیکن انسان کا ذکر بطور خاص اس لئے ہوا کہ یہ چیزیں اصلا تو ہیں ہی انسان کے لئے اور دوسری مخلوقات جو زمین کے نباتات کو کھاتی ہیں وہ انسان کے ہی تابع ہیں کیوں کہ اللہ نے انسان کے لئے اسے مسخر کر دیا ہے، جیسا کہ سورہ لقمان میں ارشاد باری تعالی ہے :﴿أَلَمْ تَرَوْا۟ أَنَّ ٱللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِى ٱلْأَرْضِ﴾ [سورة لقمان: ٢٠]. "کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی ہر چیز کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے"

ان سات وجوہات کی وجہ سے تم پر یہ لازم ہے کہ تم صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، یہ تمام بڑی اور عظیم نعمتیں ہیں، ان کی عظمت واضح ہے، جو بھی ان نعمتوں پر غور کرے گا تو یہ نعمتیں حیران کر دیں گی، اگر کوئی شخص اپنی تخلیق اور اپنی جسمانی بناوٹ پر، اپنی آنکھ، کان، عقل و شعور اور اعضاء و جوارح کی حرکتوں پر اور اللہ کی دوسری عظیم کاریگری پر غور کرے تو وہ حیران رہ جائے، اگر وہ عوام الناس کے نسل در نسل بڑھتے سلسلہ پر غور کرے تو یہ تعجب خیز سلسلہ نسل اسے حیران کردے گا کہ سلسلہ نسل تب ہی منقطع ہوتا ہے جب اللہ چاہے، اگر وہ زمین کی کشادگی، پھیلاؤ اور

پہاڑوں کے درمیان اس کے دروں وراستوں نیز اس کی گھاٹیوں و گزرگاہوں پر غور کرے کہ کس طرح پہاڑوں میں ایسی گھاٹیاں اور گزرگاہ بنے ہوئے ہیں کہ پانی ان سے بہتے ہوئے سمندر کا رخ ہی اختیار کرتا ہے یہ بات اسے حیران کردے گی، اگر وہ آسمان پر، بادلوں کے گزرنے اور بارش کے نازل ہونے پر غور کرے تو اس خالق کی عظمت کا ادراک کرلے گا جس کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اگر وہ بارش کے نزول اور زمین کی پیداوار کے درمیان تال میل ہے پر غور وفکر کرے تو یہ غور وفکر اسے عاجز کردے، یہ غور وفکر اس بات کی تائید کرتی ہے کہ اللہ تعالی ہی خالق ہے اور اس کے علاوہ کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، اگر وہ طوالت، جسامت اور شکل وصورت میں نباتات کی رنگارنگی پر غور کرے تو یہ چیز اسے حیران وششدر کردے گی، بلکہ اگر وہ صرف ایک پھل کی متعدد شکلوں پر غور کرے تو اس کا ذہن ودل ایمان کے لئے، زبان شکر کے لئے اور اعضاء وجوارح اطاعت کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

اس ظاہر وواضح توجیہ کے بعد جو کہ اللہ کی عظیم تخلیق کی طرف توجہ مبذول کرا رہی ہے اللہ تعالی انسانوں کو یہ حکم دے رہا ہے کہ وہ اللہ کے کوئی ہمسر نہ ٹھہرائیں اور نہ اس کے لیے کوئی عبادت کریں کیوں کہ عبادتیں صرف اللہ تعالی کے لئے ہیں: ﴿فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ "خبردار باوجود جاننے کے اللہ کے شریک مقرر نہ کرو"۔

اس قائل کردینے والی تعلیل کے بعد جو کہ اللہ تعالی کے لئے عبودیت کو ثابت کر رہی ہے اور اس کی وجہ سے ہر قسم کی جہالت ورکاوٹ دور ہو رہی ہیں بالتدریج اللہ کا خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ باتوں کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس سے مراد قرآن کریم ہے، اس کا مقصود یہ ہے کہ قرآن سننے، قبول کرنے اور سمجھنے میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان کو دور کیا جاسکے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾ "ہم نے جو کچھ اپنے بندے پر اتارا ہے اس میں اگر تمہیں شک ہو اور تم سچے ہو تو اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ"۔

اس آیت کریمہ میں اس شخص کو مخاطب کیا گیا ہے جس کے دل میں قرآن کے تئیں شک وشبہ ہے کہ وہ قرآن جیسی کوئی سورہ لے آئے، اور اس سے مراد نظم ونثر میں عرب کے چوٹی کے فصحاء وبلغاء ہیں مزید ان کو یہ اختیار دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے حلیفوں میں سے جس سے چاہیں مدد لے لیں تا کہ وہ ان کے

فصاحت وبلاغت کی گواہی دیں، ارشاد ہے: ﴿وَٱدۡعُواْ شُهَدَآءَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ﴾ "تمہیں اختیار ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلالو"۔

پھر اگر وہ اس بات میں سچے ہیں کہ وہ قرآن کریم کو اللہ کی کتاب اس لیے نہیں مانتے کہ وہ اس کے بارے میں شک کا شکار ہیں تو وہ قرآن جیسی ایک سورہ ہی لے آئیں تاکہ شک وشبہ دور ہو سکے اور وہ ایمان لاسکیں لیکن اگر رکاوٹ بننے والی چیز تکبر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حقیقت سے آشنا ہیں لیکن متکبر کا عناد قبول حق کی راہ میں رکاوٹ ہے۔اس سے یہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ عقیدہ وعبادت اور تعلیمی و دعوتی امور کو قبول کرنے میں یا تو تکبر رکاوٹ ڈالتا ہے یا جہالت۔ معلومات کی صحت میں شک وشبہ بھی اسی قبیل سے ہے یا جہل بسیط یا جہل مرکب۔اسی لئے مربی وداعی کو چاہئے کہ وہ رکاوٹوں کے بارے میں غور وفکر سے کام لے کہ آیا رکاوٹ جہالت اور عاجزی کا نتیجہ ہے یا غرور و تکبر کا تاکہ وہ حق کو قبول نہ کر سکنے والوں کے ساتھ مناسب طریقہ سے معاملہ کر سکے۔

اس ربانی بیان کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ باتوں کو سننے والے کے ذہن سے شک کو دور کرنا کافی اہم ہے، مدعو کے پاس شک وشبہ کا ہونا متوقع ہے اس لئے داعی کو متوقع شکوک وشبہات کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اس سے اس بات کی تاکید ہو رہی ہے کہ جو تعلیم ودعوت کا کاز کرنا چاہے اس کے لئے علم اہم ہے نیز مدعو کی حالت سے واقفیت بھی اہمیت رکھتی ہے۔

فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ چیلنج دو زمانوں کو شامل ہے کوئی تیسرا زمانہ اس میں نہیں پایا جارہا ہے، ایک زمانہ حاضر ہے جسے ﴿فَإِن لَّمۡ تَفۡعَلُواْ﴾ میں بیان کیا گیا ہے یعنی "پس اگر تم نے نہ کیا"۔اور دوسرا زمانہ مستقبل ہے جسے: ﴿وَلَن تَفۡعَلُواْ﴾ میں بیان کیا گیا ہے، یعنی "تم ہرگز نہیں کر سکتے"۔یہ چیلنج اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ وہ قرآن کے جیسی ایک سورہ بھی نہیں لا سکتے۔﴿فَإِن لَّمۡ تَفۡعَلُواْ وَلَن تَفۡعَلُواْ﴾ "پس اگر تم نے نہ کیا اور تم ہرگز نہیں کر سکتے"اس میں یہ بیان ہے کہ وہ زمانہ حال اور مستقبل دونوں میں ایسا نہیں کر سکتے۔ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: لن مستقبل ہمیشگی کی نفی کے لئے استعمال ہوتا ہے یعنی تم

کبھی بھی ایسا نہیں کر سکتے، یہ بھی ایک طرح کا معجزہ ہے کہ اللہ نے بلاخوف وخطر پیشگی یہ حتمی خبر دے دی ہے کہ اس قرآن کے جیسا رہتی دنیا تک کسی زمانے میں پیش نہیں کیا جا سکتا(۱)۔

اللہ نے مکہ و مدینہ میں متعدد دفعہ ان کو یہ چیلنج دیا باوجود یہ کہ وہ قرآن سے شدید دشمنی رکھتے تھے اور اس کے تئیں بغض کا شکار تھے پھر بھی وہ قرآن کے مثل پیش کرنے سے عاجز رہے اسی لئے اللہ نے فرمایا:﴿ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ وَلَن تَفْعَلُواْ ﴾ "پس اگر تم نے نہ کیا اور تم ہر گز نہیں کر سکتے "(۲)۔

اس چیلنج کے بعد انجام سے ڈرایا گیا ہے: ﴿ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ وَلَن تَفْعَلُواْ فَٱتَّقُواْ ٱلنَّارَ ٱلَّتِي وَقُودُهَا ٱلنَّاسُ وَٱلْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَـٰفِرِينَ ﴾ "پس اگر تم نے نہ کیا اور تم ہر گز نہیں کر سکتے تو (اسے سچا مان کر) اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے)"۔

اس کا تربیتی ودعوتی فائدہ یہ ہے کہ ڈراوا مکمل بیان کے بعد ہی ہو، تاکہ جو شخص جہالت و سستی کی وجہ سے حق سے منحرف ہو وہ ڈر جائے۔

اس کے فوائد میں سے یہ ہے کہ آیت میں ترغیب و ترہیب کے درمیان توازن ہے، کیوں کہ اللہ نے کافروں کے انجام نیز ان کے لئے تیار کردہ عذاب کا ذکر کرنے کے بعد مومنوں کے تیار شدہ نعمتوں کا ذکر کیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَبَشِّرِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّـٰلِحَـٰتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّـٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَـٰرُ كُلَّمَا رُزِقُواْ مِنْهَا مِن ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُواْ هَـٰذَا ٱلَّذِي رُزِقْنَا مِن قَبْلُ وَأُتُواْ بِهِۦ مُتَشَـٰبِهًا وَلَهُمْ فِيهَآ أَزْوَٰجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَهُمْ فِيهَا خَـٰلِدُونَ ﴾ "اور ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ان جنتوں کی خوشخبریاں دو، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ جب کبھی وہ پھلوں کا رزق دیئے جائیں گے اور ہم شکل لائے جائیں گے تو کہیں گے یہ وہی ہے جو ہم اس سے پہلے دیئے گئے تھے اور ان کے لئے بیویاں ہیں صاف ستھری اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں"۔

آیت کریمہ کی ابتداء مومنوں کی بشارت سے ہوئی ہے، جس سے اس بات کی تائید ہو رہی ہے کہ لفظ بشارت اور جیسے دیگر الفاظ کو ترغیب کے لئے نیز سامنے والے کے ذہنی و فکری خوشگواری کے لئے

---

(۱) تفسير ابن كثير ١/٦٣.

(۲) مرجع سابق.

استعمال کرنا اہمیت کا حامل ہے، اس لئے لفظ بشارت اپنے اندر خوشخبری کا معنی سموئے ہوئے ہے اسی بنا پر ذہن پر اس کا بڑا خوشگوار اثر ہوتا ہے۔

آیت کے عظیم فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ جنت، اس کے پھل، اس کی نہروں، ایمان کے مراتب اور عمل صالح کی قسموں کا طول طویل ذکر کرنے کی بجائے اختصار سے کام لیا گیا ہے، ہاں مگر آیت کو پڑھنے والا ہر تفصیل کو محسوس کر لیتا ہے، یہ قرآن کریم کے بلاغت کے اعجاز میں سے ہے، اسی طرح آیت میں ایمان و عمل صالح کا مقام بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایمان و عمل اللہ کے رحم و کرم اور جود و سخا کی بنا پر ایک مومن کے لیے جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے۔

آیت کریمہ کا مضمون شوق دلانے والا ہے، اس کا آغاز لفظ بشارت سے ہو رہا ہے، اس کے بعد جنت، جنت کے باغات جن کے نیچے بہتی نہروں اور جنت کے پھلوں کا تذکرہ ہے اور وہ پھل بھی ایسے کہ جب بھی جنتیوں کو جنت کے وہ پھل دیئے جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ یہ تو دنیا کے پھل جیسا ہے لیکن وہ نہیں ہے، رنگ میں تو دنیا کے پھل کے مشابہ ہے لیکن ذائقہ مختلف ہے، اسی طرح جب وہ کوئی پھل کھائیں گے اور دوبارہ انہیں پھل دیا جائے گا تو وہ کہیں گے یہ تو پہلے والے پھل کے جیسا ہے تو ان سے فرشتے کہیں گے کہ کھاو، رنگ بس یکساں ہے ذائقہ مختلف ہے[1]۔ نیز جنت میں جنتیوں کے لئے ہر طرح کے عیوب سے پاک بیویاں ہوں گی، پھر انسان کے لئے اس اہم حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ ﴿ وَهُمْ فِيهَا خَـٰلِدُونَ ﴾ "وہ جنتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں" یعنی ایسی ہیشگی ہو گی کہ اس کے بعد موت نہیں ہے۔

اس کے فوائد میں سے یہ ہے کہ ایمان اور عمل کا تذکرہ ایک ایک ساتھ کیا گیا ہے اور یہ بات کافی اہم ہے اسی کے ذریعہ تاکہ اللہ کی جنت تک رسائی ممکن ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَبَشِّرِ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّـٰلِحَـٰتِ أَنَّ لَهُمْ جَنَّـٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَـٰرُ ﴾ "اور ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ان جنتوں کی خوشخبریاں دو، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں"۔

---

(١) تفسير ابن كثير ٦٦/١.

﴿إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَسۡتَحۡيِۦٓ أَن يَضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوۡقَهَاۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ
ءَامَنُواْ فَيَعۡلَمُونَ أَنَّهُ ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّهِمۡۖ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ فَيَقُولُونَ مَاذَآ أَرَادَ ٱللَّهُ
بِهَٰذَا مَثَلٗاۘ يُضِلُّ بِهِۦ كَثِيرٗا وَيَهۡدِي بِهِۦ كَثِيرٗاۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِۦٓ إِلَّا ٱلۡفَٰسِقِينَ
٢٦ ٱلَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهۡدَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ مِيثَٰقِهِۦ وَيَقۡطَعُونَ مَآ أَمَرَ ٱللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ
وَيُفۡسِدُونَ فِي ٱلۡأَرۡضِۚ أُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡخَٰسِرُونَ ٢٧﴾

ترجمہ:

"یقیناًاللہ تعالیٰ کسی مثال کے بیان کرنے سے نہیں شرماتا، خواہ مچھر کی ہو، یااس سے بھی ہلکی چیز کی۔ایمان والے تواسے اپنے رب کی جانب سے صحیح سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ نے کیامراد لی ہے؟اس کے ذریعے بیشتر کو گمراہ کرتاہے اور اکثر لوگوں کو راہ راست پر لاتاہے اور گمراہ تو صرف فاسقوں کو ہی کرتاہے(۲۶)۔جولوگ اللہ تعالیٰ کے مضبوط عہد کو توڑدیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیاہے،انہیں کاٹتے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں،یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں(۲۷)"۔

حضرت سعید حضرت قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ :اللہ تعالیٰ حق بات کو خواہ وہ کم ہو یا زیادہ ذکر کرنے سے نہیں شرماتاہے،اللہ تعالیٰ نے جب اپنی کتاب میں مکھی اور مکڑی کا ذکر کیاتو گمراہوں نے کہا کہ ان چیزوں کے ذکر کرنے سے اللہ کی کیامراد ہے ؟تواللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَسۡتَحۡيِۦٓ أَن يَضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوۡقَهَا﴾ "یقیناًاللہ تعالیٰ کسی مثال کے بیان کرنے سے نہیں شرماتا، خواہ مچھر کی ہو، یااس سے بھی ہلکی چیز کی"۔اس سے معلوم ہواکہ مثالیں بیان کرنے کی کافی اہمیت ہے،تاکہ سامنے والے تک معلومات بہم پہنچائی جاسکے، نیز یہ کہ انسان کو مثال بیان کرنے سے نہیں شرمانا چاہئے ، متعلم کے نزدیک اس مثال کی حیثیت خواہ چھوٹی ہو یا بڑی،اس لئے مقصود علم و معرفت کو پہنچاناہے،اسی طرح انسان دوسروں کو درست اور مختلف اسلوب میں جو کہ مقصد تک پہنچانے والی ہو حق کی باتیں کہنے سے نہ شرمائے۔اس کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ متکبر حقارت اور ناقص

تعریف کے ذریعے حق اور اس کے اسلوب و مضامین کا مذاق اڑاتا ہے تاکہ وہ خود کو مطمئن کر سکے اور دوسروں سے اس کو بیان کر سکے، ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ حق کا مذاق اڑانے اور اسے کمتر جاننے کی وجہ سے ان کے اندر شک و شبہ کا بیج جڑ پکڑ لیتا ہے۔ اور اس میں ان باتوں کا بیان ہے جو بندوں تک حق پہنچانے میں اللہ کی عنایت کو بیان کر رہی ہے اس میں اس بات کا بیان بھی ہے کہ اللہ تعالی بندوں تک اپنا پیغام پوری عنایت کے ساتھ مختلف اسالیب سے بیان کرتا ہے، جیسے انبیاء کو بھیج کر، معجزات نازل کرکے اور بیان وتوضیح کے ذریعہ اور مختلف اسالیب کا استعمال کرکے تاکہ کسی بھی طرح سے اصل مقصد اور ہدف حاصل ہو سکے، اسی طرح اس میں یہ بات بھی ہے کہ قرآن کے تعلیمی ودعوتی منہج پر غور کرنے نیز وضاحت اور قائل کرنے کے لئے متعدد اسلوب کو اختیار کرنے کی بھی اہمیت ہے۔

آیت کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ حق کے تئیں لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک گروہ حق کو قبول کرتا ہے اور دوسرا گروہ تکبر و عناد کی روش اختیار کرتا ہے﴿ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ فَيَعۡلَمُونَ أَنَّهُ ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّهِمۡۖ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ فَيَقُولُونَ مَاذَآ أَرَادَ ٱللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلٗاۘ ﴾ "ایمان والے تو اسے اپنے رب کی جانب سے صحیح سمجھتے ہیں اور کفار کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ نے کیا مراد لی ہے"۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ قبول حق کے متعلق ایک داعی، مصلح، عالم اور معلم خود کو اس اختلاف اور تنوع کے لیے تیار رکھے کیوں کہ جب یہ اختلاف اس عظیم معاملے یعنی اسلام کی قبولیت میں پیش آیا جو کہ اللہ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تو آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں کے ساتھ اور لوگوں کی مصلحت سے وابستہ امور نیز مختلف دنیاوی امور میں کیسے نہیں ہو سکتا۔

اس سے یہ فائدہ بھی مستنبط ہو رہا ہے کہ مومن جب حق اور درست بات کو جان لیتا ہے تو اس کے تئیں تکبر کی روش اختیار نہیں کرتا ہے، بلکہ پہلے وہ فکر و سمجھ کی جس غلطی پر تھا اسے ترک کرکے حق کو اختیار کر لیتا ہے، اس لئے کہ حق کی تردید کرنا کفار و عناد پرست لوگوں کی روش ہے۔ ہدایت یافتہ لوگ حق کو قبول کرتے اور اس سے ہدایت پاتے ہیں۔ البتہ فاسق لوگ جن کی یہ صفت ہے کہ وہ اللہ سے کئے ہوئے عہد کو توڑتے ہیں نیز جن رشتوں کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو چھوڑتے ہیں اور زمین میں

فساد پھیلاتے ہیں تو ایسے لوگ حق کے انکاری ہیں، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يُضِلُّ بِهِۦ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِۦ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِۦٓ إِلَّا ٱلْفَـٰسِقِينَ ﴿٢٦﴾ ٱلَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعْدِ مِيثَـٰقِهِۦ وَيَقْطَعُونَ مَآ أَمَرَ ٱللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ ۚ أُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَـٰسِرُونَ﴾ "اس کے ذریعے بیشتر کو گمراہ کرتا ہے اور اکثر لوگوں کو راہ راست پر لاتا ہے اور گمراہ تو صرف فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مضبوط عہد کو توڑ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں کاٹتے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں"۔

یہ آیت اس بات کا بھی فائدہ دے رہی ہے کہ حق کے تئیں لوگوں کی دو قسم ہے: ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو اللہ کی آیات اور اس کے انبیاء پر نازل حق سے ہدایت پاتے ہیں، اور دوسری قسم متکبر فاسق کی ہے، چنانچہ فاسقوں کی روش یہ ہے کہ وہ عہد وپیمان کو توڑتے ہیں اور اللہ نے جن رشتہ داریوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو توڑتے اور ختم کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور رشتہ داری اس کا ایک حصہ ہے(١)۔ اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ زمین میں کفر وگناہ اور لوگوں کو کفر کی طرف بلا کر فساد پھیلانا فاسقوں کی روش ہے(٢)، اور یہی لوگ اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اپنی آخرت کو خسارے میں ڈال دیا، وہ آخرت جو کہ ہمیشگی والی زندگی ہے مومنوں کے لئے نعمتوں کے ساتھ اور کافروں کے لئے عذاب کے ساتھ۔

﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِٱللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَٰتًا فَأَحْيَـٰكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾ هُوَ ٱلَّذِى خَلَقَ لَكُم مَّا فِى ٱلْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ ٱسْتَوَىٰٓ إِلَى ٱلسَّمَآءِ فَسَوَّىٰهُنَّ سَبْعَ سَمَـٰوَٰتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾﴾

ترجمہ:

---

(١) تفسير القرطبي ١/١٧١.

(٢) زاد المسير ١/٤٤.

"تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں مار ڈالے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ وہ اللہ جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا، پھر آسمان کی طرف قصد کیا اور ان کو ٹھیک ٹھاک سات آسمان بنایا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے"۔

آیت کا آغاز سوال برائے اثبات سے ہو رہا ہے اور اللہ تعالی کے انکار کے متعلق یہ سوال کفار سے برائے انکار بھی ہے کیوں کہ یہ بات تو ان میں سے ہر شخص کے یہاں تسلیم شدہ ہے کہ وہ پہلے موجود نہیں تھا، بلکہ وہ معدوم تھا، پھر اللہ تعالی نے اس کو وجود بخشا، پہلے وہ بچے کی شکل میں پیدا ہوا، پھر اللہ تعالی کی مشیئت کے مطابق جتنا اس کو زندہ رہنا ہے وہ زندہ رہے گا اور بالآخر دوسروں کی طرح اسے بھی مر جانا ہے ، یہ سوال انکار پر مشتمل ہے جو ایک ایسی حقیقت کا اعتراف کرا رہا ہے جس کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ہے ،اور پھر اس حقیقت کے اعتراف کے بعد جس سے کہ ہر کافر آشنا اور ہر جاہل آگاہ ہے اللہ تعالی نے ایک دوسری حقیقت کو بیان کیا ہے اور وہ حقیقت ہے موت کے بعد دوبارہ اٹھایا جانا، اور عدم سے وجود پھر موت کی ان سابقہ حقیقتوں کے اعتراف کا تقاضا ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر بھی ایمان لائے کیوں کہ جو ذات انسان کو عدم سے وجود بخشتی ہے، پھر اسے ایک مدت تک زندگی عطا کرتی ہے ،اور پھر اسے موت سے دوچار کرتی ہے وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ وہ اسے دوبارہ زندگی دے، جس نے پہلی بار اپنی مخلوقات کو عدم سے وجود بخشا اس کے لئے دوبارہ اٹھانا کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔

اس آیت میں ایک تعلیمی اور تقریری اسلوب ہے جس میں مخاطب کو ایک ایسی حقیقت کا اعتراف کرایا گیا ہے جس کو وہ خود تسلیم کرتا ہے اور اس کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا، نیز یہ اسلوب عقل مندوں کے لئے ایک ایسا مکالمہ ہے جس میں مخاطب سے جواب طلب کیا جا رہا ہے تاکہ وہ جن چیزوں سے غافل تھا یا دانستہ غفلت اور لاپرواہی برت رہا تھا اس سے متنبہ اور آگاہ ہو جائے، گویا مخاطب زبان حال سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ : ہاں میں تو دنیا میں موجود نہیں تھا، پھر میرے پیدا کرنے والے نے مجھے وجود بخشا پھر جس طرح دوسروں کو موت دیتا ہے وہ مجھے بھی موت دے گا، لہذا جو مجھے ایک بار پیدا کرنے پر قادر تھا وہ مجھے دوبارہ اٹھانے پر بھی قدرت رکھتا ہے ،اور یہی چیز اس کو ایک اللہ وحدہ لا شریک لہ پر ایمان لانے

اور صرف اس کی عبادت کرنے کو واجب کرتی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾ "تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں مار ڈالے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے"

یہ انکاری سوال جو کہ ایک دوسرے امر کے اثبات پر مشتمل ہے ایک ایسا سوال ہے جو ذہن کو غور وفکر پر آمادہ کرتا ہے، اسی طرح دل کو بھی یہ سوچنے پر آمادہ کرتا ہے کہ کس طرح ایک صاحب عقل وشعور سے اتنا واضح معاملہ مختلف دلائل کے باوجود چوک سکتا ہے، اس سے اس بات کی تائید ہو رہی ہے کہ ذہنی علاج میں اس اسلوب کو اختیار کرنے کی اہمیت ہے، پہلے مخاطب کو ان حقیقتوں سے روشناس کرایا جائے جن کو وہ جانتا ہے اور اقرار کرایا جائے پھر بتدریج اس سے متعلق دوسری باتیں اخذ کی جائیں تاکہ جن باتوں سے واقف کرانا مقصود ہو اس تک پہنچا جا سکے۔

اس کے بعد کی آیت میں زندگی دینے اور وجود بخشنے کی حقیقت کی مزید تاکید کے طور پر ہے نیز اس عظیم قدرت کا بیان ہے جس کی بدولت اللہ تعالی پر کوئی چیز مشکل نہیں، جس سے ایمان باللہ کے وجوب اور کفر سے اجتناب کی تاکید ہو رہی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ﴾ "وہ اللہ جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا"۔ یعنی زمین کی تمام چیزوں کو اسی نے پیدا کیا اور وجود بخشا ہے جس نے تم کو پیدا کیا، یہیں پر عبرت کا پہلو ہے کہ کیسے عدم سے زندگی اور پھر زندگی سے موت آجاتی ہے، اسی طرح زمین کے اوپر اور زمین کے اندر پائی جانے والی نعمتوں کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ اے لوگو! یہ تمہارے لئے ہی ہیں، تاکہ انسان اپنے وجود اور زمین کے اندر اپنی ضروریات کی چیزوں کے درمیان موازنہ کر سکے اور وہ اس مماثلت کا ادراک کر سکے، اس کی ضروریات نیز زمین کی نعمتوں کا اس کی وجہ سے موجود ہونا بہترین یکسانیت ہے، تو وہ کون ہے جس نے اس یکسانیت کو بنایا، اور زمین میں موجود نعمتوں اور انسان کی ضروریات کو یکساں کیا، یہاں تک کہ انسان کی ترفیہی اور کمالیات زندگی کا سامان کیا، جیسے کہ ایک ہی کھانے کی مختلف قسم بنائی۔ اللہ نے بڑی باریکی سے چیزوں کو وجود بخشا ہے، مثلا کھجور کی دسیوں قسم ہے، اور ہر قسم کی کھجور اپنے ذائقہ اور مٹھاس میں مختلف

ہے، اسی طرح ان کے رنگ ان کی جسامت اور ان کی شکلیں بھی مختلف ہیں، یہاں تک کہ کھجور کے ایک درخت کی ایک ہی ڈالی کے پھل میں تفاوت ہے تو متعدد درختوں کا کیا حال ہوگا۔ زمین اپنے اندر جن نعمتوں کو سموئے ہوئے ہے آیت میں ان ذکر تفصیل سے نہیں بلکہ مجمل آیا ہے، کیوں کہ مقتضائے حال کے لیے یہی مناسب ہے کہ ان عظیم حقائق کا اجمالا ذکر کیا جائے، دوسری آیتوں میں اللہ نے جو تفصیل ذکر کیا ہے وہ اس میں آیت میں تفصیلی ذکر سے بے نیاز کرتی ہیں۔

آیت کریمہ میں قرآن کریم کا ایسا اسلوب پیش کیا گیا ہے جس سے مخاطب کی سماعت اور انہماک اس کی طرف کھنچتی چلی جاتی ہے، اور یہ اسلوب تفصیل کی بجائے اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے، تفصیل میں جانے کی بجائے کلی امور و قواعد پر اکتفا کیا گیا ہے، جس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ عظیم حقائق کے لئے عقل کو مخاطب کرنے کا یہ متاثر کن اسلوب ہے، زمین کی بناوٹ اور اس پر پائی جانے والی تفصیل نیز کس طرح اس پر چارہ اگتا ہے، پھر خشک ہوتا ہے پھر وہ ختم ہو جاتا ہے پھر بارش ہونے سے خشک ہونے کے بعد زمین لہلہا جاتی ہے، ان ساری تفاصیل میں ذہن کو مشغول نہیں کیا گیا ہے۔ جس سے اس بات کی تائید ہو رہی ہے کہ حوار اور مناقشہ کے وقت اجمال اور اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے قواعد کلیہ پر اعتماد کا اہتمام کرنا چاہئے، کیوں کہ ایسے وقت میں تفصیل کی ضرورت نہیں ہوتی، تاکہ ذہن تاکہ ذہن عظیم کلی حقائق کو چھوڑ کر تفصیل میں الجھ کر نہ رہ جائے۔

جب مخاطب نے مشاہدہ اور غور و فکر سے حقیقت کو پالیا تو اس کے بعد اس کو ایک عظیم اور بڑی حقیقت کی طرف منتقل کیا جا رہا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ ثُمَّ ٱسۡتَوَىٰٓ إِلَى ٱلسَّمَآءِ فَسَوَّىٰهُنَّ سَبۡعَ سَمَٰوَٰتٖۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٞ ﴾ "پھر آسمان کی طرف قصد کیا اور ان کو ٹھیک ٹھاک سات آسمان بنایا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے"۔ اللہ نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ اس نے جب آسمان کی تخلیق کا ارادہ کی تو ٹھیک ٹھاک سات آسمان بنائے۔ اس خطاب اور توجیہ میں تدریج سے کام لیا گیا ہے، تاکہ ان حقائق کے ذریعہ دھیرے دھیرے ایمان باللہ کی راہ ہموار ہو، چنانچہ جب اللہ تعالی نے یہ بیان کر دیا کہ انسان تھا ہی نہیں پھر اللہ نے اسے وجود بخشا پھر وہ اسے موت دے گا جیسا کہ وہ دوسری مخلوقات کو دیتا ہے اور عنقریب وہ مردوں کو زندہ کرے گا پھر وہ سب اس کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ ان حقائق کے بعد اس

بات کو بیان کیا کہ اس نے زمین کو اور زمین میں پائی جانے والی چیزوں کو پیدا کیا ہے، اور زمین پر پائی جانے نعمتوں کو انسان کے لئے نفع بخش بنادیا بایں طور کہ یہ نعمتیں اس کی ضروریات سے ہم آہنگ ہیں، عنقریب انسان اس بات کا اقرار کرے گا کہ جس نے زمین اور اس کے اندر و باہر پائی جانے والی نعمتوں کو پیدا کیا اسی نے آسمان کو بھی پیدا کیا، اور عنقریب وہ اس بات پر ایمان لے آئے گا کہ آسمان سات ہیں، جیسا کہ اللہ علیم وخبیر نے اس کی خبر دی ہے۔ پھر آیت کا اختتام اللہ کے اس قول سے ہوا ہے ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ " وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے"۔ اللہ تعالی نے اس آیت میں تخلیقی امر کو بیان کرنے نیز مطلق طور تمام تر عبادتوں کا خود کو مستحق ٹھہرانے کے بعد یہ خبر دی ہے کہ وہ وسیع علم والا ہے، اس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

یہ آیت کریمہ اس بات کا فائدہ دے رہی ہے کہ انسان کا اپنے عدم سے وجود نیز زندگی کے بعد موت اور اسی طرح زمین پر پائی جانے والی مخلوقات پر غور وفکر کرنا خالق کائنات اللہ تبارک وتعالی پر ایمان لانے کا موجب ہے۔ اسی طرح اس آیت سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو رہا ہے کہ اللہ تعالی پر ایمان اور اس کی عبادت کی کافی اہمیت ہے، اور یہ کہ عبادتیں صرف اللہ عزوجل کے لئے بجالائی جائیں، اسی طرح غور وفکر نیز قائل کر دینے والے اسلوب، تدریج اور مدعو کے حال سے واقفیت اور عظیم حقیقت تک ان کو منتقل کرنے کی خاطر ان کی توجہ مبذول کرانے کی بھی اہمیت ہے۔

یہ آیت کریمہ مخلوق کے تئیں اللہ کی رحمت پر دلالت کر رہی ہے بایں طور کہ اللہ نے انہیں بہترین اور موثر اسلوب کے ساتھ مخاطب کیا، اور ان کی خاطر زمین اور زمین کے اندر و باہر پائی جانے والی چیزوں کو بنایا اور زمین کو ان کے لئے مسخر کر دیا، نیز زمین کی نعمتوں اور انسان کی ضروریات کے درمیان ہم آہنگی پیدا فرمادی، انسانی ضروریات کی تمام نعمتیں اس سرزمین میں اس کو بآسانی دستیاب ہیں اور خالق کائنات اللہ تبارک وتعالی کے وجود پر دلالت کرنے والی بے شمار نشانیاں بھی اس روئے زمین پر میسر ہیں، لہذا تمام شکر اور تعریف اسی اللہ کے لئے ہے، اے اللہ! ہم تجھ سے توفیق اور حق پر ثابت قدمی کے خواستگار ہیں۔

﴿وَإِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٞ فِي ٱلۡأَرۡضِ خَلِيفَةٗۖ قَالُوٓاْ أَتَجۡعَلُ فِيهَا مَن يُفۡسِدُ فِيهَا وَيَسۡفِكُ ٱلدِّمَآءَ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُونَ ٣٠ وَعَلَّمَ ءَادَمَ ٱلۡأَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى ٱلۡمَلَٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنۢبِـُٔونِي بِأَسۡمَآءِ هَٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمۡ صَٰدِقِينَ ٣١ قَالُواْ سُبۡحَٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَآۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلۡعَلِيمُ ٱلۡحَكِيمُ ٣٢ قَالَ يَٰٓـَٔادَمُ أَنۢبِئۡهُم بِأَسۡمَآئِهِمۡۖ فَلَمَّآ أَنۢبَأَهُم بِأَسۡمَآئِهِمۡ قَالَ أَلَمۡ أَقُل لَّكُمۡ إِنِّيٓ أَعۡلَمُ غَيۡبَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَأَعۡلَمُ مَا تُبۡدُونَ وَمَا كُنتُمۡ تَكۡتُمُونَ ٣٣﴾

ترجمہ:

"اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں، توانہوں نے کہا ایسے شخص کو کیوں پیدا کرتا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے؟ اور ہم تیری تسبیح، حمد اور پاکیزگی بیان کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے(۳۰)۔اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا، اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ(۳۱)۔ان سب نے کہا اے اللہ! تیری ذات پاک ہے ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا رکھا ہے، پورے علم و حکمت والا تو تو ہی ہے(۳۲)۔اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم علیہ السلام سے فرمایا تم ان کے نام بتادو۔ جب انہوں نے بتادیئے تو فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں (پہلے ہی) نہ کہا تھا کہ زمین اور آسمانوں کا غیب میں ہی جانتا ہوں اور میرے علم میں ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو تم چھپاتے تھے(۳۳)"۔

یہ آیتیں تخلیق آدم کے ابتدائی مراحل کو بیان کر رہی ہیں تاکہ قرآن کے مشمولات میں وہ غیبی حقیقتیں شامل ہو جائیں جن کو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے اور انسان کے لئے اس کی تخلیق کی ابتدا ظاہر ہو جائے، اور یہ بھی ظاہر ہو جائے کہ جب اللہ نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام اور ان کی نسل کی تخلیق کی خبر دی تو کون سا واقعہ پیش آیا، یہ اولاد آدم پر اللہ کا احسان ہے کہ اللہ نے ان کو وجود بخشنے سے قبل ہی فرشتوں کو اس بارے میں خبر دی: ﴿وَإِذۡ قَالَ رَبُّكَ لِلۡمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٞ فِي ٱلۡأَرۡضِ

خَلِيفَةً﴾ "اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں"۔ اس احسان کا ذکر ابن کثیر نے رحمہ اللہ نے کیا ہے(۱)، وہ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي ٱلْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ کا معنی یہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: خلیفہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایک دوسرے کے بعد زمانہ در زمانہ اور نسل در نسل جانشیں ہوں گے۔

ان عظیم آیتوں سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ فرشتوں کو ان ہی باتوں کا علم ہے جن کے بارے میں اللہ نے انہیں باخبر کیا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ "جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے" نیز اس کی دلیل فرشتوں کا اپنے محدود علم کے متعلق یہ کہنا بھی ہے کہ ﴿سُبْحَٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ﴾ "اے اللہ! تیری ذات پاک ہے ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا رکھا ہے"۔

یہ آیتیں اس بات کا فائدہ دے رہی ہے کہ اللہ اپنی مخلوقات میں سے جس کو جیسے اور جو خصوصیت دینا چاہے عطا کرتا ہے چنانچہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو چیزوں کے نام سیکھا کر علم کی خصیوصیت عطا فرمائی اور یہ خصوصیت فرشتوں کو عطا نہیں کی، یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے اپنے فضل سے نوازتا ہے:

﴿وَعَلَّمَ ءَادَمَ ٱلْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنۢبِـُٔونِى بِأَسْمَآءِ هَٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٣١﴾ قَالُوا۟ سُبْحَٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلْعَلِيمُ ٱلْحَكِيمُ ﴿٣٢﴾ قَالَ يَٰٓـَٔادَمُ أَنۢبِئْهُم بِأَسْمَآئِهِمْ ۖ فَلَمَّآ أَنۢبَأَهُم بِأَسْمَآئِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّيٓ أَعْلَمُ غَيْبَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ "اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا، اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ ان سب نے کہا اے اللہ! تیری ذات پاک ہے ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا رکھا ہے، پورے علم و حکمت والا تو تو ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم علیہ السلام سے فرمایا تم ان کے نام بتا دو۔ جب انہوں

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۷۲/۱.

نے بتادیئے تو فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں (پہلے ہی) نہ کہا تھا کہ زمین اور آسمانوں کا غیب میں ہی جانتا ہوں اور میرے علم میں ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو تم چھپاتے تھے"۔

آدم علیہ السلام اور ان کی نسل کو اسماء کی معرفت دے کر خصوصیت عطا کرنا یہ محض اللہ کا کرم اور انسان کے لئے باعث فضیلت ہے، ﴿ وَعَلَّمَ ءَادَمَ ٱلْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ﴾ "اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھایا"، یعنی تمام چیزوں کے نام اور ان کے مسمی کا علم اللہ نے آدم علیہ السلام کو عطا کیا یعنی چیزوں کے الفاظ و معنی یہاں تک کہ اسم کبیر و اسم صغیر کا بھی علم دیا ہے جیسے قَصْعَة و قُصَيْعَة(۱)۔

یہ چیز انسان سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ زندگی اور علم کی نعمت پر اللہ کا شکر گزار رہے، اور چونکہ علم کی دولت اسے اللہ نے بخشی ہے اسی لئے وہ اپنے علم پر غرور و تکبر نہ کرے، کیوں کہ علم و فہم، حفظ و استنباط اور ایجاد کی خاصیت اللہ ہی نے اسے عطا کی ہے، اگر اللہ انسان کو یہ خصوصیت عطا نہ کرتا تو انسان آج جس علمی ترقی اور مختلف فیلڈ میں کامیابی کے درجے پر ہے اس پر نہ ہوتا۔

ان آیات کے مفاہیم میں سے یہ ہے کہ فرشتے اللہ کی تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں، اس کی نافرمانی نہیں کرتے ہیں اور انسان کی طرح ان سے فساد کا صدور نہیں ہوتا، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ قَالُوٓاْ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ ٱلدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّىٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ "تو انہوں نے کہا ایسے شخص کو کیوں پیدا کرتا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے؟ اور ہم تیری تسبیح، حمد اور پاکیزگی بیان کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے"۔ فرشتوں نے اپنے علم کی بساط کے مطابق موازنہ کیا تھا مگر اللہ نے ان سے یہ بیان کر دیا کہ جو کچھ اللہ کو معلوم ہے اور اللہ نے اپنے علم کی بنا پر جن چیزوں کا احاطہ کر رکھا وہ ان فرشتوں کے احاطہ علم میں نہیں ہے: ﴿ إِنِّىٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ "جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے"۔

یہ آیتیں اس بات کا فائدہ دے رہی ہیں کہ تخلیق آدم سے پہلے ہی فرشتوں کو اللہ تعالی کی طرف سے یہ جانکاری مل گئی تھی کہ بنی آدم میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو فساد پھیلائیں گے اور ان سے قتل

---

(۱) تفسیر ابن السعدی ۱/ ۵۱.

وغارت گری، لوٹ مار، ظلم وزیادتی اور کفر وشرک جیسے فسادات سرزد ہوں گے، مگر اللہ کو یہ بات معلوم تھی کہ انہی نبی آدم میں انبیاء، نیکوکار، سچے، عبادت گزار مجاہدین اور محسنین بھی ہوں گے۔

ان آیات سے اللہ کے ساتھ ہم کلام ہونے میں فرشتوں کا ادب ظاہر ہو رہا ہے بایں طور کہ انہوں نے کہا ﴿لَا عِلْمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَآ﴾ "ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھار کھا ہے" انہوں نے اپنے علم کے دائرے کی وضاحت کے بعد انہوں نے اللہ کی بزرگی ان الفاظ میں بیان کی: ﴿إِنَّكَ أَنتَ ٱلْعَلِيمُ ٱلْحَكِيمُ﴾ "پورے علم وحکمت والا تو تو ہی ہے"۔

اس سے اس بات کی اہمیت ظاہر ہو رہی ہے کہ انسان جن باتوں سے لاعلم ہے ان کے بارے میں یوں کہے کہ: اللہ تعالی بہتر جانتا ہے، اور جن باتوں سے وہ ناآشنا ہو اس میں زیادہ کھینچ تان نہ کرے، ایسا کرنے سے وہ فرشتوں کے اخلاق سے آراستہ ہو جائے گا۔ اسی طرح حصول علم اور جہالت کے احساس کے وقت اللہ کی تعظیم بجالانے کی اہمیت ہے۔

ان آیات سے اس بات کی تائید ہو رہی ہے کہ زمین آسمان کی جن چیزوں کا علم مخلوقات کو نہیں ان سب کا بخوبی علم اللہ کو ہوتا ہے، بلکہ انسان اپنے ضمیر میں جو باتیں مخفی اور پوشیدہ رکھتا یا ظاہر کرتا ہے ان سب کو اللہ تعالی جانتا ہے، ارشاد ہے: ﴿أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّىٓ أَعْلَمُ غَيْبَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ "کیا میں نے تمہیں (پہلے ہی) نہ کہا تھا کہ زمین اور آسمانوں کا غیب میں ہی جانتا ہوں اور میرے علم میں ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو تم چھپاتے تھے"۔ اللہ تعالی کے علم کی معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ سے ڈرا جائے اور اپنی ذات کے تئیں اللہ تعالی کی نگرانی کا احساس ہو اور ہر چھوٹی بڑی چیز میں حصول منفعت اور دفع ضرر کے لئے اسی کا سہارا لیا جائے۔

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُوا۟ لِءَادَمَ فَسَجَدُوٓا۟ إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَٱسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٣٤﴾ وَقُلْنَا يَٰٓـَٔادَمُ ٱسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ ٱلْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٣٥﴾ فَأَزَلَّهُمَا ٱلشَّيْطَٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا ٱهْبِطُوا۟ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِى ٱلْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَٰعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾ فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن

رَبِّهِۦ كَلِمَٰتٖ فَتَابَ عَلَيۡهِۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾ قُلۡنَا ٱهۡبِطُواْ مِنۡهَا جَمِيعٗاۖ فَإِمَّا يَأۡتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدٗى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ﴿٣٨﴾ وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَكَذَّبُواْ بِـَٔايَٰتِنَآ أُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِۖ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٣٩﴾

ترجمہ:

"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں ہو گیا (۳۴)۔ اور ہم نے کہہ دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو، لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے (۳۵)۔ لیکن شیطان نے ان کو بہکا کر وہاں سے نکلوا ہی دیا اور ہم نے کہہ دیا کہ اتر جاؤ! تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور ایک وقت مقرر تک تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے (۳۶)۔ آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے (۳۷)۔ ہم نے کہا تم سب یہاں سے چلے جاؤ، جب کبھی تمہارے پاس میری ہدایت پہنچے تو اس کی تابعداری کرنے والوں پر کوئی خوف و غم نہیں (۳۸)۔ اور جو انکار کر کے ہماری آیتوں کو جھٹلائیں، وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے (۳۹)"۔

ان آیات میں اللہ کے نزدیک انسان کے مقام کا بیان ہے یعنی کہ اللہ نے فرشتوں کو یہ حکم دیا کہ وہ انسانوں کے باپ آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں، یہ سجدہ آدم علیہ السلام کی تکریم کے لیے اور اللہ کی اطاعت وعبادت کے لیے تھا کیوں کہ اللہ کی اطاعت، اس کی عبادت ہے، اسی طرح یہ آیت اس بات کا فائدہ دے رہی ہے کہ فرشتوں نے اس حکم الہی کو بلاچوں وچرا تسلیم کر لیا، کیوں کہ فرشتوں کی صفت ہی یہ ہے کہ انہیں جن کاموں کا حکم دیا جاتا ہے اسے وہ فورا بجالاتے ہیں۔ اس سے اس بات کی تائید ہو رہی ہے کہ بغیر عقلی حجت بازیوں کے اللہ کی اطاعت ضروری ہے، اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ نصوص کتاب وسنت کو ہمیشہ عقل ہر مقدم رکھا جائے گا کیوں کہ اللہ کی جانب سے نازل شدہ نصوص کتاب وسنت کمال درجے کی ہوتی ہیں جب کہ انسانی عقل میں نقص پایا جاتا ہے۔ ان آیات سے یہ بات واضح ہے کہ ابلیس نے محض تکبر کی وجہ سے سجدہ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کافروں میں سے ہو گیا، جب کہ

دوسرے فرشتوں نے اپنے رب کی اطاعت کی تو وہ عزت وتکریم سے سرفراز ہوئے: ﴿ وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَٰٓئِكَةِ ٱسْجُدُواْ لِءَادَمَ فَسَجَدُوٓاْ إِلَّآ إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَٱسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴾ "اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں ہو گیا"۔

غرور و تکبر بھلائی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے، غرور انسان کو مصلحتوں اور کامیابی و کامرانی سے روک دیتا ہے، جس غرور نے بعض ان لوگوں کو بھی ایمان سے روک دیا جنہوں نے رسول کو دیکھا تھا اور ان پر حجت تمام ہو گئی تھی، اسی طرح وہ کفار و مشرکین بھی جنہوں نے حق کو جان لینے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لینے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے پہلے اور بعثت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات تھیں جس اخلاق اور تواضع کے مقام پر آپ فائز تھے ان کی حقیقت جان لینے کے بعد تکبر کیا۔

ان آیات میں اللہ کے صفت کلام کا اثبات ہے، اور اس بات کا بھی اثبات ہے کہ حکم دینے اور منع کرنے کا اختیار اللہ کے پاس ہے، اللہ جو کچھ کرتا ہے اس بارے میں اس سے پوچھ گچھ نہیں ہو گی لیکن بندوں سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھ گچھ بھی ہو گی اور ان کا محاسبہ بھی ہو گا، اور اللہ تعالی جن باتوں کا حکم دیتا ہے یا جن چیزوں سے روکتا ہے ان میں اللہ کی بلیغ حکمتیں پوشیدہ ہے۔ اسی طرح ان آیات سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مخلوقات کا علم کافی ناقص ہے۔

آیات سے یہ بھی مستفاد ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کا اصل ٹھکانہ جنت ہے، جس سے اس بات کی تائید ہو رہی ہے کہ جو شخص ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اللہ کی اطاعت کرے تو وہ موت کے بعد جنت میں جائے گا: ﴿ وَقُلْنَا يَٰٓـَٔادَمُ ٱسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ ٱلْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ﴾ "اور ہم نے کہہ دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو"۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں کھانا پینا ہو گا اور وہ جنت کافی وسیع ہے، نیز جنت میں کھانے پینے میں پوری فراخی ہو گی، نیز جنت میں نقل و حرکت کی اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے

کی مکمل آزادی ہے: ﴿وَكُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا﴾ "اور جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو۔

ان آیات میں اس بات کا بیان ہے کہ بندوں کی ابتلاء اور آزمائش اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے، اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو شجر ممنوعہ سے کھانے کو روک کر آزمایا: ﴿وَلَا تَقۡرَبَا هَٰذِهِ ٱلشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ "لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے"۔ آیت میں آزمائش کا انجام اور اس کی جزا کا عمومی بیان ہے: ﴿فَتَكُونَا مِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ "ورنہ ظالم ہو جاؤ گے" یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بندہ اگر رب کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ خود پر ہی ظلم کرتا ہے، لہذا اس پر اطاعت بجالانا اور معصیت سے اجتناب کرنا واجب ہے، اگر انسان اللہ کے کسی نہی کی حکمت اور سبب نہ جان سکے تو اس پر سوال نہ اٹھائے کیوں کہ اللہ کی حکمت بہت اعلی ہے۔

آیات میں اس بات کا بیان ہے کہ جب سے اللہ نے ہمارے باپ آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تبھی سے شیطان انسان کا دشمن ہے، ارشاد ہے: ﴿فَأَزَلَّهُمَا ٱلشَّيۡطَٰنُ عَنۡهَا فَأَخۡرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ﴾ "لیکن شیطان نے ان کو بہکا کر وہاں سے نکلوا ہی دیا"۔ آیت میں بعد میں آنے والی اولاد آدم کے لیے یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ شیطان کو دشمن اپنا سمجھیں اور اس کے وسوسوں اور اس کی گمراہیوں سے بچ کر رہیں کیوں کہ اس کا مقصد ہی بنی نوع انسان کو جنت سے نکلوانا اور دور کرنا ہے۔

اللہ تعالی نے اس نافرمانی کی یہ سزا بیان کی: ﴿وَقُلۡنَا ٱهۡبِطُواْ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوّٞ﴾ "اور ہم نے کہہ دیا کہ اتر جاؤ! تم ایک دوسرے کے دشمن ہو"۔ اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جنت، بغض و عداوت کی جگہ نہیں ہے بلکہ راحتوں بھرا ٹھکانہ ہے، عداوت و دشمنی کی جگہ زمین ہے۔ انہی آیات کے ذریعے انسان پر یہ حجت قائم ہو رہی ہے کہ شیطان مردود ان کا پہلا دشمن ہے، انسانوں کو گمراہ کرنا، گناہ کو ان کے لئے مزین کرنا اور گناہ کروانے کے لئے طرح طرح کے حیلے گڑھنا شیطان کی شیطانی طاقت ہے، بنا بریں اس سے بچنا ضروری ہے تاکہ وہ انسان کو جنت سے دور نہ کر دے جس طرح اس نے آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال دیا تھا۔

اللہ کے قول: ﴿وَلَكُمْ فِي ٱلْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَٰعٌ إِلَىٰ حِينٍ﴾ "اور ایک وقت مقرر تک تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے" میں اس بات کی دلیل ہے کہ زمین، انسان اور شیطان دونوں کے لئے ایک محدود مدت تک کے لیے بطور ٹھکانہ ہے اور وہ مدت ہر فرد کی موت سے پہلے تک کی زندگی ہے، انسانی زندگی روئے زمین پر قیامت تک رہے گی اور قیامت سے ہی زمین پر زندگی کا خاتمہ ہوگا، لہذا زمین محدود مدت تک کے لئے وقتی ٹھکانہ ہے اور وہ مدت اللہ کو ہی معلوم ہے، اللہ تعالی نے زمین کو ﴿وَمَتَٰعٌ إِلَىٰ حِينٍ﴾ بنایا ہے یعنی "ایک وقت مقرر تک فائدہ اٹھانا ہے"، اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس سے انسان مستفید ہوتا ہے یعنی کھان پان، زندگی اور اس کے علاوہ دوسری چیزیں(۱)۔

اس کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ انسان یہ جان لے کہ زندگی ایک مقرر مدت تک مستفید ہونے کا نام ہے، اور جب اس کی یہی حقیقت ہے تو انسان پر ضروری ہے کہ وہ اس سے اس طرح فائدہ اٹھائے کہ بعد کی زندگی کے لئے یہ دنیاوی زندگی اس کے حق میں مفید ثابت ہو اور دنیا کی ہر نعمت اسے جنت کی نعمت تک پہنچانے والی ہو۔ نیز یہ دنیا ایک راستہ ہو جسے پار کر کے آخرت کے گھر تک پہنچ جائے۔ اس لئے کہ دنیفنا کا گھر ہے اور یہ محض ایک مقررہ مدت کے لیے ہے۔ (إِلَىٰ حِينٍ) کا یہ لفظ انسانی ذہن کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ دنیا فائدے کی چیز ہے مگر بس ایک مدت تک، دنیا جائے عمل ہے مگر بس ایک مدت تک کے لئے، شیطان دشمن بھی اس کے ساتھ لگا ہے مگر ایک مدت تک، تو بس اسے چاہئے کہ وہ شیطان کو ایک مدت تک کے لئے دشمن بنالے، اور ایک مدت تک صبر کرے، نیز ایک مدت تک اللہ کی اطاعت پر جمارہے۔ اللہ کا یہ قول (إِلَىٰ حِينٍ) ایک طاقت، امید اور ایک ایسی راہ ہے کہ اس پر چل کر جنت کی راہ میں حائل ساری دشواریاں دور ہو جاتی ہیں: ﴿وَلَكُمْ فِي ٱلْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَٰعٌ إِلَىٰ حِينٍ﴾ "اور ایک وقت مقرر تک تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے"۔

نیز اللہ کی رحمت اور کی عنایت انسان کو ہر چہار سو گھیرے ہوئے ہے: ﴿فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن رَّبِّهِۦ كَلِمَٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ﴾ "آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں اور

(۱) تفسير قرطبي ۲۱۹/۱.

اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔ آدم علیہ السلام کی خطا کے باوجود اللہ تعالی اس انسان کے ساتھ لطف و مہربانی کا معاملہ فرمانے والا ہے: ﴿فَتَلَقَّىٰٓ ءَادَمُ مِن رَّبِّهِۦ كَلِمَٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ﴾ "آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔ آدم علیہ السلام نے اللہ کی جانب سے چند کلمات کی تلقین پائی اور وہ کلمات تھے: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٢٣﴾﴾ [سورة الأعراف:٢٣]. "اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے"۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اللہ سے مغفرت طلب کیا تو اللہ نے آدم علیہ السلام کو بخش دیا(١) : ﴿فَتَابَ عَلَيْهِۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ﴾ "اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔ انسانوں پر اللہ تعالی کے فضل و تکریم کا یہ تقاضا ہے کہ بندہ اس خالق کائنات سے محبت کرے جس نے انعام و اکرام کر کے اس کو فضیلت بخشی اور اس کے ساتھ انتہائی احسان و تکریم والا معاملہ کیا۔

آیت کے اختتام میں اللہ نے اپنی دو عظیم صفات کو بیان کیا ہے: ﴿إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ﴾ "بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے"۔ اس آیت میں اللہ نے اس بات کی خبر دی ہے کہ جو شخص توبہ کرے اور اللہ کی طرف رجوع کرے تو اللہ ایسے شخص کو بخشنے والا اور اس پر رحم کرنے والا ہے۔ جس کی یہ صفات ہوں تو پھر بندے پر یہ ضروری ہے کہ وہ اسی سے معافی مانگے، اسی کی طرف رجوع کرے، اس سے رحمت کی امید رکھے، اس کی محبت و کرم کی خواہش نیز اس کی سزا اور نعمت کے زوال کے ڈر سے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

یہ آیات اس بات کا فائدہ دے رہی ہیں کہ حکم اوپر سے نیچے یعنی جنت سے زمین پر اترنے کا ہوا تھا تاکہ زمین پر اتر کر انسان و جنات دونوں مخلوقات انسان اس زمین میں بود و باش کریں اور یہ سب شیطان

---

(١) تفسير ابن السعدى ١/٥٣.

کے ذریعہ آدم علیہ السلام کو بہکانے اور اس کی وجہ سے آدم علیہ السلام کے شجرہ ممنوعہ کے کھالینے کے سبب وقوع پذیر ہوا: ﴿قُلْنَا ٱهْبِطُواْ مِنْهَا جَمِيعًا﴾ "ہم نے کہا تم سب یہاں سے چلے جاؤ"۔

اس دنیا میں آنے کے بعد اللہ کی رحمت اس کے بندوں کے شامل حال ہے بایں طور کہ اللہ تعالی کا ان سے وعدہ ہے اور اللہ تعالی کا وعدہ برحق ہے اس کا وعدہ یہ ہے کہ وہ ان کی طرف رسولوں اور کتابوں کی شکل میں ہدایتیں بھیجتا رہے گا جو انہیں درست اور سیدھے راستے کی رہنمائی کریں گے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّى هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٨﴾ وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَكَذَّبُواْ بِـَٔايَـٰتِنَآ أُوْلَـٰٓئِكَ أَصْحَـٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَـٰلِدُونَ﴾ "جب کبھی تمہارے پاس میری ہدایت پہنچے تو اس کی تابعداری کرنے والوں پر کوئی خوف و غم نہیں۔ اور جو انکار کر کے ہماری آیتوں کو جھٹلائیں، وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے"۔

پھر یہ اللہ کی رحمت ہی ہے کہ اس نے اس کی ہدایت کی اتباع کرنے والے کے حال اور ان کے انجام کو ذکر کیا ہے کہ ایسے لوگ نہ خوفزدہ ہوں گے اور نہ غمگیں ہوں گے، نہ حال و مستقبل کا انہیں خوف ہو گا اور نہ گزری ہوئی اور ختم ہو چکی چیز پر غم ہو گا کہ ان کی زندگی مکدر ہو جائے اس لئے کہ خوف و غم، سراسر پریشانی تکلیف اور بے قراری کا سبب ہیں خواہ ان کا تعلق حال سے ہو یا مستقبل کے امور سے۔ (حزن) کا تعلق گزری ہوئی کسی چیز سے ہوتا ہے جس پر انسان کو حسرت یا ندامت ہوتی ہے، اور (خوف) کا تعلق حاضر اور مستقبل کے ایسے معاملے سے ہوتا ہے جس کے تئیں انسان کو خوف لگا رہتا ہے۔

اللہ کی شریعت، وہ ہدایت ہے جو انسانیت سے ہر طرح کے شر سے محفوظ رکھتی ہے اور ان کے لئے ہر قسم کے حصول خیر کا باعث ہے بشرط کہ لوگ اللہ کی اطاعت اس کی ہدایت کی اتباع کریں، ہاں البتہ جو شخص کفر کرے اور اللہ کی ہدایت اور اس کی آیات کو جھٹلائے تو ایسے شخص کا ٹھکانہ جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہے گا۔

لہذا اللہ خالق و مالک تبارک و تعالی ہی ہے جو اپنے بندوں کے لئے باتوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے اور ہدایت کی جانب ان کی رہنمائی کرتا ہے، اور جو توبہ کرتے ہوئے اللہ تعالی کی فرمانبرداری کرے تو

اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے اور اس کے ساتھ عفو و در گزر کا معاملہ فرماتا ہے، اپنے فضل واحسان سے ان پر رحم کرتا ہے وہی تمام بندوں کا اور ان کی ساری املاک کا مالک ہے، لہذا ایک ماتحت بندے کو بھی چاہیے کہ وہ بھی اپنے جیسے دوسرے بندوں کے ساتھ رحم و کرم اور عفو و در گزر کا معاملہ کرے کیوں کہ وہ تو ان کا مالک بھی نہیں ہے بلکہ ان ہی کی طرح اللہ کا بندہ اور غلام ہے۔

ان آیات کا اختتام کفر کرنے والوں کو عذاب کی دھمکی کے ساتھ ہو رہا ہے: ﴿ وَٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَكَذَّبُواْ بِـَٔايَٰتِنَآ أُوْلَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴾ "اور جو انکار کرکے ہماری آیتوں کو جھٹلائیں، وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے" یہ اس اللہ کی طرف سے وعید اور دھمکی ہے جو اپنے وعدے کی کبھی خلاف ورزی نہیں کرتا مقصد یہ کہ انسان کفر سے بچ کر رہے جس کا انجام کافی خطرناک اور حد درجہ نقصان دہ ہے جو اسے ہیشگی کی آگ کی شکل میں بھگتنا پڑ سکتا ہے۔

﴿ يَٰبَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُواْ نِعْمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُواْ بِعَهْدِيٓ أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّٰيَ فَٱرْهَبُونِ ﴿٤٠﴾ وَءَامِنُواْ بِمَآ أَنزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوٓاْ أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦۖ وَلَا تَشْتَرُواْ بِـَٔايَٰتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّٰيَ فَٱتَّقُونِ ﴿٤١﴾ وَلَا تَلْبِسُواْ ٱلْحَقَّ بِٱلْبَٰطِلِ وَتَكْتُمُواْ ٱلْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾ وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ وَٱرْكَعُواْ مَعَ ٱلرَّٰكِعِينَ ﴿٤٣﴾ أَتَأْمُرُونَ ٱلنَّاسَ بِٱلْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ تَتْلُونَ ٱلْكِتَٰبَۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾ وَٱسْتَعِينُواْ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى ٱلْخَٰشِعِينَ ﴿٤٥﴾ ٱلَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَٰقُواْ رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ ﴿٤٦﴾ ﴾

ترجمہ:

"اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو (۴۰)۔ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے تمہاری کتابوں کی تصدیق میں نازل فرمائی ہے اور اس کے ساتھ تم ہی پہلے کافر نہ بنو اور میری آیتوں کو تھوڑی تھوڑی قیمت پر نہ فروخت کرو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو (۴۱)۔ اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ، تمہیں تو خود اس کا علم ہے (۴۲)۔ اور نمازوں کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رکوع کرنے

والوں کے ساتھ رکوع کرو(۴۳)۔ کیا لوگوں کو بھلائیوں کا حکم کرتے ہو؟ اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو باوجودیکہ تم کتاب پڑھتے ہو، کیا اتنی بھی تم میں سمجھ نہیں؟(۴۴) اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو یہ چیز شاق ہے، مگر ڈر رکھنے والوں پر(۴۵)۔ جو جانتے ہیں کہ بے شک وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے اور یقیناً وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں(۴۶)"۔

پھر سیاق قرآنی کارخ بنی اسرائیل کی طرف منتقل ہو رہا ہے جن میں اللہ تعالی بنی اسرائیل سے متعلق اپنی رحمتوں کا بیان کر رہا ہے، اور ان آیات میں ڈائرکٹ نبی اسرائیل کو مخاطب کیا جارہا ہے تاکہ ان کو اللہ تعالی کی ان نعمتوں کی یاد دہانی کرا ہی جائے جو ان پر اللہ تعالی نے نازل فرمائی ساتھ ہی مومنوں اور دیگر لوگوں سے بھی بنی اسرئیل پر ہونے والے عظیم احسانات کا بیان ہے۔ اسرائیل سے مراد یعقوب علیہ السلام ہیں۔ اس سیاق میں اللہ نے بنی اسرائیل پر کیے جانے والے نعمتوں کا عمومی تذکرہ کیا ہے اور ان سے ایفائے عہد کا مطالبہ کیا جارہا ہے، تاکہ اس کے بدلے میں کسی کمی کے بغیر انہیں پورا پورا بدلہ دیا جائے : ﴿يَٰبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ ٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَأَوۡفُواْ بِعَهۡدِيٓ أُوفِ بِعَهۡدِكُمۡ وَإِيَّٰيَ فَٱرۡهَبُونِ﴾ "اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور مجھ ہی سے ڈرو" ان کو حرف ندا (یا) سے خطاب کیا گیا ہے، یہ ایک طرح سے ان کو متوجہ ہونے اور اس پکار پر کان لگانے کے دعوت دی جارہی ہے۔ نیز ان نسبت ان کے نبی یعقوب علیہ السلام یعنی اسرائیل کی کی گئی ہے: (يَٰبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ) اور یہ محض اللہ کا احسان ہے کہ انہیں اتنی عزت سے مخاطب کر رہا ہے، اور ان پر جو انعامات کیے ان کی یاد دہانی کرا رہا ہے جن انعامات سے وہ مکمل طور پر آگاہ ہیں، ان انعامات کا ذکر آنے والی آیات میاں شاءاللہ آرہا ہے۔

اللہ کی نعمتیں جن سے کہ وہ آشنا ہیں ان کی یاد دہانی کرانے کے بعد اللہ ان سے یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ اللہ کیے ہوے عہد کو پورا کریں: ﴿وَأَوۡفُواْ بِعَهۡدِيٓ﴾ "تم میرے عہد کو پورا کرو" تاکہ اللہ اپنے وعدے کے مطابق انہیں جزا سے نوازے: ﴿وَأَوۡفُواْ بِعَهۡدِيٓ أُوفِ بِعَهۡدِكُمۡ﴾ "تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا" ان کو خطاب کرنے اور نعمتوں کی یاد دہانی میں اللہ کی مہربانی عیاں ہو رہی ہے کہ اللہ نے انہیں بالتدریج خطاب کیا، جس کا کہ بہت اثر ہوتا ہے، پہلے حرف ندا سے ابتداء کی پھر

ان کو ان کے نبی یعقوب علیہ السّلام کی طرف منسوب کیا، پھر ان کو عہد پورا کرنے کا حکم دیا جس کا بدلہ یہ ہے کہ اللہ بھی ان سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کرے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم، خطابت ودعوت نیز وعظ ونصیحت اور فکری اصلاح کے میدان میں تدریج اور ترتیت کی بڑی اہمیت ہے اس سے غافل اپنی غفلت سے بیدار ہوتا ہے، اسی طرح دیکھیں تو اللہ نے ان کو جو خطاب کیا ہے اس میں ان کو برا بھلا نہیں کہا گیا ہے، اس سے یہ بات مستفید ہو رہی ہے کہ ایک ناصح اور واعظ وعظ ونصیحت کی ابتداء عار دلا کر یا برا بھلا کہہ کر نہ کرے بلکہ اچھے انداز میں پہلے اس میں آمادگی کی قوتوں کو اجاگر کرتے ہوئے سننے اور قبول کرنے پر آمادہ کرے، اسی طرح لوگوں کو ندا دینے میں سب سے نرم لہجہ اور عمدہ وپسندیدہ اسلوب اختیار کرنا چاہیے، کیوں کہ جب اللہ اس نرم طریقے سے بندوں کو مخاطب کر رہا ہے تو بندوں کیلیے یہ زیادہ مناسب تر ہے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو نرمی سے مخاطب کرے۔

اس آیت کریمہ کے فوائد میں سے یہ ہے کہ اس میں مجمل توجیہ پائی جاتی ہے، تفصیل اس کے بعد آئیگی، کیوں کہ کسی چیز کی عمومی جانکاری کے بعد سامع ومخاطب اس کی تفصیل جاننے کا خواہاں رہتا ہے، غور وفکر اور قابل عمل حقیقت کی طرف ذہن کو متوجہ کرنے کیلیے یہ ایک نہایت اہم سلوب ہے۔ اسی طرح نعمتوں کی یاد دہانی عقل مند کے اندر نعمت عطا کرنے والے سے حیا کی صفت پیدا کرتی ہے اور وہ توجیہ وارشاد کی اتباع اور اطاعت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ہاں مگر جس کے دل میں بیماری اور عناد تو اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

بنی اسرائیل کے تفصیلی ذکر میں پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوکی واضح دلیل ہے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی ساری زندگی مکہ میں گزری اور آپ امی تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے حتی کہ اللہ تعالی نے آپ کے متعلق خود اس گمان کی نفی کی ہے کہ آپ کو ان حقائق کا جن کو بنی اسرائیل جانتے تھے ان کے اس تفصیلی بیان کا سابقہ کوئی علم رہا ہو۔ اسی طرح ان آیات سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ سابقہ ادیان کے پیروکاروں سے یہ توجیہی خطاب اس بات کی دلیل ہے یہ دین اور قرآن کریم

تمام انسانوں کے لیے ہے حتی کہ جن کے پاس پہلے سے رسول آچکے تھے ان کے لیے بھی ہے جیسے کہ بنی اسرائیل۔

آیت کریمہ ان کے عام نعمتوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اور اس میں ان سے ایفائے عہد کا مطالبہ کیا گیا ہے جس کا پیمان اللہ تعالی نے ان سے لیا تھا، یعنی اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان شریعت الٰہی کے قیام کا عہد تاکہ وہ اللہ سے پورا پورا بدلہ پاسکیں اس کے بعد اللہ نے انہیں یہ حکم دیا ہے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور خوف کھائیں کیوں کہ یہی خوف ان کے لیے موجب اطاعت ہے: ﴿وَإِيَّىَ فَٱرۡهَبُونِ﴾ "اور مجھ ہی سے ڈرو"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان سے کہہ رہا ہے کہ: ﴿وَءَامِنُواْ بِمَآ أَنزَلۡتُ مُصَدِّقٗا لِّمَا مَعَكُمۡ وَلَا تَكُونُوٓاْ أَوَّلَ كَافِرِۭ بِهِۦۖ وَلَا تَشۡتَرُواْ بِـَٔايَٰتِي ثَمَنٗا قَلِيلٗا وَإِيَّٰيَ فَٱتَّقُونِ﴾ "اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے تمہاری کتابوں کی تصدیق میں نازل فرمائی ہے اور اس کے ساتھ تم ہی پہلے کافر نہ بنو اور میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ فروخت کرو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو"۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو نازل کردہ کتاب قرآن کریم پر ایمان لانے کا حکم دے رہا ہے جس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ: ﴿مُصَدِّقٗا لِّمَا مَعَكُمۡ﴾ "تمہاری کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے یعنی تمہاری کتابوں کی تاکید اور تائید کرنے والی ہے اور ان کے مخالف نہیں ہے، یہ آیت اس بات کا فائدہ دے رہی ہے کہ اہل کتاب اپنے گزشتہ آسمانی کتابوں کی بنیاد پر قرآن کی سچائی کو جانتے تھے، اور یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی بھی علامت تھی کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

بنی اسرائیل کے لیے اس واضح حقیقت بیانی اور تاکید و تائید کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں کفر کرنے سے منع کر رہا ہے: ﴿وَلَا تَكُونُوٓاْ أَوَّلَ كَافِرِۭ بِهِۦ﴾ "اور اس کے ساتھ تم ہی پہلے کافر نہ بنو" اس بیان اور اثبات میں تدریج کا پہلو کارفرما ہے، پھر بتدریج اللہ ان سے مخاطب ہو کر انہیں اس بات سے منع کر رہا ہے کہ وہ دنیا کے عارضی اور وہمی فائدے کو اللہ کی آیات پر ترجیح نہ دیں کیوں کہ اللہ کی آیات ہی ان کی دنیا و آخرت کی بھلائی کا باعث ہیں: ﴿وَلَا تَشۡتَرُواْ بِـَٔايَٰتِي ثَمَنٗا قَلِيلٗا وَإِيَّٰيَ فَٱتَّقُونِ﴾ "اور میری آیتوں کو

تھوڑی تھوڑی قیمت پر نہ فروخت کرو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ انہیں معمولی قیمت کے عوض اللہ کی آیات کو بیچنے سے منع کر رہا ہے، اور اللہ تعالی کی آیات کی خواہ جتنی بھی قیمت لگا دی جائے پھر بھی وہ اللہ تعالی کی آیات کے مقابلہ میں بہت معمولی ہے کیوں کہ اللہ تعالی کی آیات سب سے زیادہ قیمتی اور اعلی شئ ہے۔

اس سے اسلوب خطاب کی متعدد شکلیں ظاہر ہو رہی ہیں، بایں طور کہ انہیں نعمتوں کی یاد دہانی کرائی گئی، عہد کو پورا کرنے تقوی اختیار کرنے اور جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اس پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا اور یہ سب اس دلیل قطعی کے ساتھ کہا گیا کہ یہ تمام باتیں تمہارے پاس جو کتابیں ہیں ان کے منافی نہیں ہیں، بلکہ ان کی تصدیق کرنے والی ہیں، اور اس حقیقت شناسی کے بعد اللہ نے انہیں اللہ کی آیات کو معمولی قیمت پر بیچنے سے منع کیا اور انہیں یہ مثال دی کہ: اللہ کی آیات اور اس کے دلائل پر وہ ان چیزوں کو مقدم کرنے کی سوچ رکھتے ہیں تو اس کی مثال اس جیسی ہے جو اللہ کی آیات کے بدلے کوئی بالکل گھٹیا چیز خریدتا ہے، اپنی خواہشات نفس کو مقدم کرنا نیز ہر وہ چیز جس تک ان کی وہم وگمان کی رسائی ہو سکتی ہے وہ تمام چیزیں اللہ کی آیات اور اس کے احکام کے سامنے نہایت کم قیمت کے ہیں، اس سے اس بات کی تائید ہو رہی ہے کہ اللہ کے پاس کی چیزیں کافی مہنگی اور قیمتی ہیں لہٰذا ایک مؤمن تجاوز کرتے ہوئے اس کے کسی حکم کی مخالفت نہ کرے یہ تصور کرتے ہوئے کہ اس میں اس کا فائدہ ہے کیوں کہ اللہ کی آیات اس سے عظیم تر ہے کہ اسے معمولی قیمت میں بیچ دیا جائے، اللہ تعالی کی آیات، وعدو عید اور دائمی جنتوں کے بالمقابل دوسری ساری چیزیں معمولی، کمتر اور کم قیمت کی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ انہیں نہایت اہم معاملے کا حکم دے رہا ہے: ﴿وَإِيَّـٰىَ فَٱتَّقُونِ﴾ "اور صرف مجھ ہی سے ڈرو" کیوں کہ تقوی اطاعت کی موجب ہے نیز یہ کم قیمت چیزوں پر اللہ کی آیات کو مقدم رکھنے کا بھی باعث ہے، اور اگر اللہ کے آیات کے مقابلے میں کم قیمت چیز اختیار کر لی جائے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دل سے تقوی نکل چکا ہے۔

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ تقوی اطاعت کی موجب ہے، اگر تقوی نہ ہو تو گناہوں کا صدور ہوتا ہے، انسان اللہ کی اطاعت اور گناہوں کے خوف نیز رحمت الہی کی حرص سے اپنے تقوی کا پیمانہ متعین کر رسکتا ہے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل کو حق کو باطل سے خلط ملط کرنے نیز حق کو چھپانے سے منع کیا جارہا ہے: ﴿ وَلَا تَلْبِسُواْ ٱلْحَقَّ بِٱلْبَٰطِلِ وَتَكْتُمُواْ ٱلْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾ "اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ، تمہیں تو خود اس کا علم ہے"۔ آیت کریمہ اس بات کا فائدہ دے رہی ہے کہ بنی اسرائیل حق کو جانتے تھے اور حق کے تئیں انہیں علم یقین حاصل تھا اس لیے کہ حق و باطل کے درمیان گڈ مڈ اسی وقت ممکن ہے جب حق و باطل دونوں کی حقیقی معرفت حاصل ہو۔ اس میں ان کی حالت زار سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ وہ حقیقت حال سے خوب واقف تھے اور ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کی صداقت کا خوب پتہ تھا بلکہ وہ آپ کو ویسے ہی جانتے **تھے جیسے** وہ اپنے آپ کو جانتے تھے، کیوں کہ ان کے پاس بھی وہ سارے حقائق موجود پہلے سے موجود تھے جن کو ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔

اس سے یہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ حق کو جاننے والے پر ضروری ہے کہ اپنے مزعومہ نفع کے حصول کے لیے وہ حق و باطل کو خلط ملط کرنے نیز لوگوں سے اسے چھپانے سے بچے اور دور رہے۔

اس کے بعد بالتدریج عبادتوں کو بجالانے کا حکم دیا جارہا ہے: ﴿ وَأَقِيمُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُواْ ٱلزَّكَوٰةَ وَٱرْكَعُواْ مَعَ ٱلرَّٰكِعِينَ ﴾ "اور نمازوں کو قائم کرو اور زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو"۔ ایک بار نماز کا ذکر اور پھر رکوع کا ذکر کر کے دوبارہ نماز کی طرف اشارہ کرنا بطور تاکید اور عمومی طور پر نماز کی اہمیت بیان کرنے کے لیے ہے نیز نماز پڑھنے والوں کے ساتھ مل کر باجماعت اس کی ادائیگی کا خصوصی طور پر ذکر ہے، یہ ایک ایسا اچھوتا اسلوب ہے کہ اس میں لفظ کا تکرار نہیں اور جماعت کے ساتھ اس کی ادائیگی کا ایک اضافی معنی بھی حاصل ہو جارہا ہے، اسی طرح اس اسلوب بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جزء بول کر کل کی طرف اشارہ میں اس کل کے تمام اجزاء اس میں شامل ہوتے ہیں، کیوں کہ اس واجب کی ادائیگی اس کے تمام اجزاء کی ادائیگی کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے، صرف جزء کی ادائیگی سے کل کی

ادائیگی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ جب جزء بول کر کوئی چیز بیان کی جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کہ اس کے بقیہ تمام دیگر اجزاء کو چھوڑ دیا جائے، یہی معاملہ اس وقت بھی ہے جب نماز کو صرف سجدہ سے تعبیر کیا جائے، اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نماز کو چھوڑ دیا جائے اور اس کے بدلے میں صرف سجدے پر اکتفاء کر لیا جائے جیسا کہ اللہ نے سورہ فرقان میں ارشاد فرمایا: ﴿ وَٱلَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدٗا وَقِيَٰمٗا ﴾ [سورة الفرقان: ٦٤]. "اور جو اپنے رب کے سامنے سجدے اور قیام کرتے ہوئے راتیں گزار دیتے ہیں"۔

اس کے بعد دوبارہ انکاری سیاق میں بات ہو رہی ہے اس بات کو لے کر کہ وہ اہل کتاب دوسروں کو تو بھلائی کا حکم دیتے تھے لیکن خود اس کو نہیں بجالاتے اور اسی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شریعت کی پیروی نہ کرنا بھی اس میں شامل ہے، فرمایا: ﴿أَتَأۡمُرُونَ ٱلنَّاسَ بِٱلۡبِرِّ وَتَنسَوۡنَ أَنفُسَكُمۡ ﴾ "کیا لوگوں کو بھلائیوں کا حکم کرتے ہو؟ اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو" اس لئے کہ نیکی تو یہی ہے کہ وہ لوگ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے لائے ہوئے دین میں داخل ہو جائیں۔ مدینہ کے یہود مدینہ کے ان مسلمانوں سے جن سے ان کے تعلقات تھے یہ کہتے تھے کہ تم جس عقیدے پر ہو اور یہ شخص تمہیں جن باتوں کا حکم دے رہا ہے اس پر ثابت قدم رہو کیوں کہ وہ حق پر ہے، اس شخص سے ان کی مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ یہود لوگوں کو آپ پر ایمان لانے کا حکم دیتے تھے مگر خود ایمان نہیں لاتے تھے(١)۔

اس آیت سے یہ اس بات کی اہم تنبیہ ہے کہ آدمی دوسروں کو بھلائی کا حکم دے لیکن اسے نہ بجا لائے یا کوئی دوسرا شخص اس کو بھلائی کا حکم دے لیکن کبر وغرور کی بنا پر اس عمل خیر سے پہلو تہی اختیار کرے، ایسا کرنے والوں کو اللہ تعالی نے بے عقل قرار دیا ہے: ﴿أَفَلَا تَعۡقِلُونَ ﴾ "کیا اتنی بھی تم میں سمجھ نہیں" گویا کہ وہ عقل سے بے بہرا ہیں اور انہوں نے اپنی عقل کا استعمال نہیں کیا۔

معلوم یہ ہوا کہ صاحب بصیرت ہونا اور حق کے سامنے سر نگوں ہونا اور نفسانی خواہشات کو شکست دینا ضروری ہے۔ نیز جو شخص حق اور بھلائی کو جانتا ہے لیکن اسے اختیار نہیں کرتا یا صرف

---

(١) تفسير القرطبي ١/٢٤٨.

دوسروں کواس کا حکم دیتا ہے اور خود اس پر عمل کرتا ہے تو وہ بے عقل لوگوں کے مانند ہے کیوں کہ وہ اپنی عقل سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھاتا۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے ایک ایسے خیر کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جو حق اور بھلائی کی ادائیگی میں معاون ہے اور وہ ہے صبر اور نماز قائم کرنا، ارشاد ہے: ﴿ وَٱسۡتَعِينُواْ بِٱلصَّبۡرِ وَٱلصَّلَوٰةِۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى ٱلۡخَٰشِعِينَ ﴾ "اور نمازوں کو قائم کرو اور زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو"۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صبر استقامت، قبول حق، ثابت قدمی اور حق پر برقرار رہنے کا ایک اہم ذریعہ ہے کیوں کہ خواہش نفس پر غلبہ پانے کیلئے نفس کو صبر کی ضرورت ہے، اسی طرح اطاعت گذاری اور معصیت سے اجتناب کے لیے صبر ہی سے جن وانس میں موجود شیاطین پر غلبہ پایا جاسکتا ہے، نیز نماز ادا کرنے والوں کیلئے اللہ کی مدد کے حصول، جلب منفعت اور دفع شر میں نماز کا بڑا اثر ہے۔ ہاں یہ بات بھی ہے کہ نماز خشوع نہ رکھنے والوں کے لیے بہت دشوار اور شاق عبادت ہے، البتہ خشوع رکھنے والوں کے لیے بالکل سہل اور غیر دشوار ہے، اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ تعالی کی جناب میں جھکے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ خشوعنہ رکھنے والے اس کی ادائیگی میں کافی بوجھ محسوس کرتے ہیں اور یہ ان پر کافی دشوار ہوتی ہے۔

خشوع کہتے ہیں خوف، سکون اور اللہ کے سامنے دل کے جھک جانے اور عاجزی اختیار کرنے کو، اس سے یہ مستفاد ہوا کہ اللہ کے بعد سب سے بہتر چیز جس کے ذریعے مسلمان مدد کا طالب ہوتا ہے وہ صبر اور نماز ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ جب بھی آپ کو کوئی مشکل پیش آتی تو فورا نماز کی جانب دوڑ پڑتے، حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی دشوار معاملہ پیش آتا تو آپ نماز پڑتے (۱)۔

﴿ يَٰبَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ ٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَأَنِّي فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿٤٧﴾ وَٱتَّقُواْ يَوۡمٗا لَّا تَجۡزِي نَفۡسٌ عَن نَّفۡسٖ شَيۡـٔٗا وَلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَٰعَةٞ وَلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٞ وَلَا هُمۡ يُنصَرُونَ

(۱) مسند أحمد ۳۸/۳۳۰ حديث نمبر ۲۳۲۹۹.

﴿٤٨﴾ وَإِذْ نَجَّيْنَٰكُم مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ ٱلْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ
وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِى ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ ٱلْبَحْرَ
فَأَنجَيْنَٰكُمْ وَأَغْرَقْنَآ ءَالَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿٥٠﴾

ترجمہ:

"اے اولاد یعقوب! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی (۴۷)۔اس دن سے ڈرتے رہو جب کوئی کسی کو نفع نہ دے سکے گا اور نہ ہی اس کی بابت کوئی سفارش قبول ہو گی اور نہ کوئی بدلہ اس کے عوض لیا جائے گا اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے (۴۸)۔ اور جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی جو تمہیں بد ترین عذاب دیتے تھے، جو تمہارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے، اس نجات دینے میں تمہارے رب کی بڑی مہربانی تھی (۴۹)۔اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا چیر (پھاڑ) دیا اور تمہیں اس سے پار کر دیا اور فرعونیوں کو تمہاری نظروں کے سامنے اس میں ڈبو دیا (۵۰)"۔

ان آیتوں میں صیغہ ندا کے ساتھ دوبار بنی اسرائیل کو نعمتوں کی یاد دہانی کرائی گئی ہے اور اللہ نے ان پر جو انعامات کئے ان کی طرف ان کی توجہ دلائی گئی ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ گزشتہ قوموں کے حالات کی بابت مومنوں کو تعلیم دی جارہی ہے اور انہیں میں سے بنی اسرائیل کو ان کے دور کے تمام لوگوں پر فضیلت دیا جاتا ہے: ﴿وَأَنِّى فَضَّلْتُكُمْ عَلَى ٱلْعَٰلَمِينَ﴾ "اور میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی "۔بنی اسرائیل کی اس فضیلت سے ایک دوسری حقیقت بھی عیاں ہو رہی ہے جو کہ اس فضیلت کی حقیقت سے مستنبط ہے وہ یہ کہ یہ قرآن کریم اگر غیر اللہ کا کلام ہوتا تو کبھی اس میں یہ بات نہ ہوتی کہ: اللہ نے تم کو جہان والوں پر فضیلت دی، کیوں کہ کوئی دوسرا اپنے کلام میں ان کی ایسی تعریف وتوصیف ہر گز بیان نہیں کر سکتا اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے، اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی ہیں اور وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے، بلکہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ نازل شدہ وحی ہوا کرتی ہے، اور اس وحی کو آپ ہو بہو لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔

قرآن کریم کا یہ سیاق یہ فائدہ دے رہا ہے کہ بار بار وعظ وتذکیر اور گناہوں کی تاریکی اور قبول حق سے کبر وغرور اور عار کی بابت ڈرانے کی اہمیت ہے۔

اللہ تعالی نبی اسرائیل پر اپنے مزید فضل واحسان کا تذکرہ بایں طور کر رہا ہے کہ اللہ نے ان کو ان کے زمانے والوں پر فضیلت بخشی تھی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فضیلت ان کو تمام جہان والوں بخشی گئی تھی کیوں کہ ان میں بہت سارے انبیاء بھی بنائے گئے تھے (۱) ۔اس کے بعد آیت میں انہیں تقوی کا حکم دیا جارہا ہے اور تقوی کے لازمی عناصر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ان پر اور ان پر نازل شدہ وحی پر ایمان لانا شامل ہے۔

تقوی کا یہ حکم اللہ کی طرف لوٹنے کی تذکیر کے ساتھ آیا ہے، ارشاد ہے: ﴿ وَٱتَّقُواْ يَوۡمًا لَّا تَجۡزِي نَفۡسٌ عَن نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا ﴾ "اس دن سے ڈرتے رہو جب کوئی کسی کو نفع نہ دے سکے گا"۔ قیامت کا دن جن امور کی وجہ سے اور دنوں سے الگ ہوگا اللہ نے ان کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی ایسے انجام جن کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

اس اسلوب میں اس دن کی شدت کو بیان کیا گیا ہے کہ اس دن کسی کو بھی اس کے عمل کے علاوہ کوئی چیز فائدہ نہیں پہنچا سکتی ہے، خواہ کوئی دوست ہو، یا کوئی قریبی، کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے عمل سے کم یا زیادہ کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا، اور ہر شخص کا انجام اس کے عمل کے مطابق ہوگا سوائے اس کے جس کے بارے میں اللہ چاہے۔

اس دن کے تعلق سے اللہ نے ایک دوسرے امر کو بیان کر رہا ہے، ارشاد ہے: ﴿ وَلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَٰعَةٞ ﴾ "اور نہ ہی اس کی بابت کوئی سفارش قبول ہوگی"۔ چنانچہ اس دن کسی کے لیے کسی کی سفارش قبول نہیں کی جائے گی اور اس سے مراد وہ کافر لوگ ہیں جنہوں نے اپنے عظیم کافرانہ جرم کی وجہ سے اللہ کی معافی اور شفاعت کی قبولیت کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ آگے ارشاد ہے: ﴿ وَلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٞ ﴾ "اور نہ کوئی بدلہ اس کے عوض لیا جائے گا"۔ عدل سے مراد فدیہ ہے۔ مزید ارشاد ہے: ﴿ وَلَا

---

(۱) تفسير القرطبي ۱/۲۵٦.

هُمْ يُنصَرُونَ ﴾ "اور نہ وہ مدد کئے جائیں گے"۔ یعنی کوئی کسی کی نصرت ومدد کی پیش کش نہیں کر سکے گا۔ یہ بدلہ اس شخص کے کفر کی دلیل ہو گی جس نے اللہ کے نبی اور آپ کی لائی ہوئی شریعت پر ایمان نہیں لایا، اس میں سابقہ ادیان کو ماننے والے بھی شامل ہیں جن پر آسمانی کتابوں کا نزول ہوا۔ شفاعت اور اس کے انواع واقسام کے متعلق تفصیلی باتیں عقیدہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

آخرت کے متعلق بتدریج اس دن کی خاص باتوں کو ہر فرد کے عمل سے جوڑ کر بیان کیا گیا ہے جس میں کسی کی مدد کرنا یا کسی سے مدد پانا دونوں کی نفی ہے اپنی طرف سے ممکنہ حد تک اپنی جان کو بطور فدیہ دینے کی بھی نفی ہے جس کا تقاضا ہے کہ بندے اس دن سے خوف کھائے اور اپنا محاسبہ کرے اور اس بات کو یاد رکھے کہ غیر اللہ سے تعلقات استوار نہ رکھنا اس کا عین فرض ہے نیز اس دن کی ہولناکی سے بچنے اور نجات پانے کے لیے اللہ تعالی کے علاوہ کسی پر اعتماد اور بھروسہ نہ رکھے، خواہ وہ کسی بھی باحیثیت قبیلہ سے یا باعزت حسب ونسب سے ہو خواہ اس کے آباء واجداد نیکوکار رہے ہوں حتی کہ کسی نبی کی نسل کا کیوں نہ ہو یا ان کے علاوہ کسی نسل کا ہو۔ لہذا آدمی کے سامنے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہو گا کہ اللہ کے علاوہ ہر ایک سے اعتماد منقطع کر لے۔

اس کا تربیتی ودعوتی فائدہ ہے کہ نعمتوں کی یاددہانی سے باتوں کو شروع کرنے کی اہمیت ہے کیوں کہ نعمتوں کی یاددہانی سلیم الطبع لوگوں کے لیے انعام واکرام کرنے والے سے حیا کرنے کا موجب ہے ۔ پھر بھلائی، قبول حق اور اخلاص کی یاددہانی ہو، اور اس کے بعد اسلوب کے اخیر میں تخویف کا پہلو ہو۔

اس تخویف کے بعد اللہ نے دوبارہ نعمتوں کی یاددہانی کروائی ہے جو کہ اللہ کی رحمت ومحبت کی دلیل ہے تاکہ انسان اللہ سے ہدایت پائے اور اللہ کی طرف رجوع کرے، اللہ نے انہیں متعدد اور مختلف اسلوب میں دعوت دی ہے اور تذکیر فرمائی ہے، یہ اسلوب ایسے ہیں جو نہ طوالت کے باعث اکتادینے والے ہیں اور نہ اختصار کے باعث باتوں کو سمجھنے میں رکاوٹ ہیں، تو اللہ کی اس رحمت سے بڑی کون سی رحمت ہو سکتی ہے جو اللہ کے اسماء حسنی اور اس کی صفات علیا پر دلالت کرنے والی ہیں۔

پھر اللہ نے انہیں فرعون سے نجات پانے کی نعمت کی تذکیر فرمائی ہے، بایں طور کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو فرعون کی پکڑ اور اس کی طرف سے دی جانے والی ذلت سے نجات عطا کی، ارشاد باری تعالی

ہے:﴿وَإِذْ نَجَّيْنَاكُم مِّنْ ءَالِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ ٱلْعَذَابِ﴾ "اور جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی جو تمہیں بدترین عذاب دیتے تھے"۔ فرعونی بنی اسرائیل کو ذلیل و خوار کیا کرتے تھے اور ان کو کمتر سمجھتے تھے اور مشکل ترین کاموں میں ان سے خدمت لیا کرتے تھے تاکہ انہیں سخت سزا دے سکے (۱)۔

فرعون کی جانب سے ان کو ملنے والی مصیبتوں کا یہ اجمالی تذکرہ ہے تاکہ وہ معاملہ کو عمومی طور سے سمجھ جائیں۔

پھر اس کے بعد تفصیل آئی ہے اور اس تفصیل کی وجہ سے ان پر ان کی مدد کرنے والے اور ان کو فرعون کے مظالم سے نجات دلانے والے کا شکر ادا کرنا واجب ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ﴾

"وہ تمہارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے"۔ بھلا اس مصیبت سے بڑی اور کون سی مصیبت ہو سکتی ہے جس سے اللہ نے تمہیں بچا لیا ہے بلکہ فرعون ایسا بھی کرتے تھے کہ ﴿وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ﴾ "تمہاری لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے"۔ یعنی فرعون بنی اسرائیل کی عورتوں کو خدمت گزاری اور ذلیل کاموں کے لیے زندہ باقی رکھتے تھے (۲) ۔ پس اللہ تعالی نے فرعون سے نجات دلانے کی نعمت کی انہیں یاد دہانی کرائی، جس نے کہ انہیں ذلیل و خوار کیا تھا، سزائیں دی تھی اور ان کی نرینہ اولاد کو قتل کیا تھا، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَفِي ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ﴾ "اس نجات دلانے میں تمہارے رب کی بڑی مہربانی تھی"۔ بنی اسرائیل کی نجات اللہ کی جانب سے احسان عظیم تھا۔

ایک اسلوب سے دوسرے اسلوب کی طرف منتقل ہونا، مختلف انداز میں بات کو بیان کرنا اور کسی بات کو دوہرانا یہ سارے امور عقل اور فکر و نظر کو جلا بخشتے ہیں اور ترغیب و ترہیب کے ان تمام توجیہ وارشادات میں نصیحت کا پہلو ہوتا ہے، مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ انسان ہدایت کی طرف لوٹ آئے۔

---

(۱) زاد المسير ٦٥/١.

(۲) مرجع سابق.

یہاں پر یہ بات بھی واضح ہے کہ انسان وہ خود کی نصیحت میں یا کسی دوسرے کو نصیحت کرنے میں نعمتوں کی یاد کرے اور نعمتوں کی یاددہانی کا محتاج ہوتا ہے، چنانچہ وہ خود نعمتوں کو یاد کرے اور دوسروں کو بھی نعمتوں کی یاددہانی کرائے وہ یاد کرے کہ کتنے ایسے مواقع آئے جن میں اللہ تعالی نے اس کو مصیبتوں، بیماریوں اور آزمائشوں سے نجات دلائی، اس کا کتنا پردہ رکھا، دشمنوں کی نگاہوں سے کتنی بار بچائے رکھا، کس قدر اس کے امن وامان، عزت ودولت اور دین کی حفاظت کی ہے۔ وہ خود اس دن کو یاد کرے اور دوسروں کو بھی یاد دلائے جس دن کسی کو کسی کا عمل فائدہ نہیں پہنچائے گا اور کسی کی مدد کا کوئی ذریعہ نہیں ہوگا۔ بمشیئت الہی تذکیر کے تمام پہلو اور نعمتوں کی مختلف جہتیں نفس کو حق کی طرف لوٹانے کا ذریعہ ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی مزید ان عظیم آیات میں مزید دیگر نعمتوں کا ذکر فرمارہا ہے:، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ ٱلْبَحْرَ فَأَنجَيْنَـٰكُمْ وَأَغْرَقْنَآ ءَالَ فِرْعَوْنَ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴾ "اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا کو چیر دیا اور تمہیں اس سے پار کردیا اور فرعونیوں کو تمہاری نظروں کے سامنے اس میں ڈبو دیا"۔ پہلی نعمت یہ ہے کہ: سمندر کو چیر پھاڑ کر اس میں راستہ بنادینا۔ دوسری واضح قرآنی نعمت ہے: سمندر کے دونوں حصوں کے درمیان ان کا چلنا۔ تیسری نعمت ہے: کہ اللہ نے انہیں فرعون سے نجات عطا کی۔ چوتھی نعمت ہے کہ فرعون کو غرق آب کردیا۔ پانچویں نعمت یہ ہے کہ: انہوں نے خود اس نعمت کو دیکھا کہ سمندر کے دو حصے ہوگئے اور ان کا دشمن ان کے سامنے غرق ہوگیا نیز انہوں نے اپنی نجات، سلامتی اور مدد کا مشاہدہ کیا۔

ان عظیم آیات میں اللہ تعالی کی نعمتوں نیز اس کی اس عظیم قدرت کا بیان ہے جس کے سامنے کبھی بھی کوئی مخلوق ٹک نہیں سکتی ہے، یقینا اللہ تعالی ظالم وجابر ومتکبر شخص کو ملیامیٹ کردینے پر قادر ہے اور اللہ تعالی ایسے لوگوں کی گھات میں ہے، اس کی پکڑ قدرت والے غالب رب کی پکڑ ہے، لہذا لازم ہے کہ اللہ کی قدرت کے سامنے تکبر اور ظلم وجبر کی تاریکی سے احتراز کیا جائے ایک ایسی طاقت کہ جس کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت کبھی بھی ٹک نہیں سکتی ہے۔ اس آیت سے یہ بھ مستفاد ہے کہ اللہ تعالی مظلوم کی مدد کرنے پر قادر ہے اسی لیے ایک مظلوم کا مکمل بھروسہ صرف اللہ قوی وعزیز پر ہونا چاہئے۔ اس سے

یہ ظاہر ہورہاہے کہ قوت وقدرت مدداور رحمت اللہ کی اعلی صفات ہیں اور اللہ تعالی اس بات پر قادر ہے کہ وہ کائنات کے عام قوانین کے برخلاف کوئی چیز جاری کردے کیوں کہ ان قوانین کا بنانے والا بھی اللہ قوی وعزیز ہی ہے۔ نیز اللہ تعالی قادر ہے کہ دشمنوں کو ہلاک کرکے کمزوروں کو غلبہ عطا کردے، یہ تمام امور اللہ کی محبت ورجاء اور خوف الہی کا موجب ہیں۔ اور یقیناً اللہ تعالی کی ذات کو زمین وآسمان کی کوئی چیز عاجز نہیں کرسکتی ہے۔

﴿وَإِذْ وَٰعَدْنَا مُوسَىٰٓ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ ٱتَّخَذْتُمُ ٱلْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَنتُمْ ظَٰلِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذْ ءَاتَيْنَا مُوسَى ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾﴾

ترجمہ:

"اور ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر تم نے اس کے بعد بچھڑا پوجنا شروع کردیا اور ظالم بن گئے (۵۱)۔ لیکن ہم نے باوجود اس کے پھر بھی تمہیں معاف کردیا، تاکہ تم شکر کرو (۵۲)۔ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تمہاری ہدایت کے لئے کتاب اور معجزے عطا فرمائے (۵۳)"۔

اب یہاں سے ایک دوسری چیز کا بیان ہے وہ کہ بنی اسرائیل پر پے درپے نعمتوں کے باوجود ان سے یہ بڑی گھناؤنی حرکت کر بیٹھے بایں طور کہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر ایک بچھڑے کو پوجنا شروع کردیا، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَإِذْ وَٰعَدْنَا مُوسَىٰٓ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ ٱتَّخَذْتُمُ ٱلْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَنتُمْ ظَٰلِمُونَ﴾ "اور ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر تم نے اس کے بعد بچھڑا پوجنا شروع کردیا اور ظالم بن گئے"۔

اس آیت کریمہ میں اس بات کا بیان ہے کہ کس طرح اطاعت پر صبر نہ کرنے، دین میں غیروں کی تقلید کرنے یا شیطان کے بہکاوے میں آئے ہوئے شخص کی پیروی کرنے سے معاشرہ یا معاشرہ کے بعض افراد گمراہی کا شکار ہوجاتے ہیں جیسے کہ اللہ نے موسی علیہ السلام سے تورات نازل کرنے کے لیے چالیس راتوں کا وعدہ کیا، ان کی قوم وقت مقررہ تک صبر نہ کرسکی اور تورات نازل ہونے کی نعمت کے

انتظار کے دوران ہی انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر بچھڑے کو پوجنا شروع کردیا۔ معلوم ہوا کہ بندہ اپنے مطلب ومراد کو پانے کے لیے ایسا طریقہ اختیار کر کے جلدی نہ مچائے جو اللہ کے طریقہ کے منافی ومخالف ہو مثلا حصول رزق کے حرام ذرائع، دھوکہ اور رشوت وغیرہ کا استعمال کر کے رزق کے حصول میں جلد بازی کا کا مظاہرہ نہ کرے کیوں کہ ایسا کرنا انسان کا خود پر ظلم کرنے کے مترادف ہے، اس کی دلیل آیت کا آخری ٹکڑا ہے جس میں اس بات کی تاکید ہے کہ ان کا یہ عمل اپنے آپ پر ظلم کرنا تھا: ﴿ثُمَّ ٱتَّخَذۡتُمُ ٱلۡعِجۡلَ مِنۢ بَعۡدِهِۦ وَأَنتُمۡ ظَٰلِمُونَ﴾ "پھر تم نے اس کے بعد بچھڑا پوجنا شروع کردیا اور ظالم بن گئے"۔

بچھڑے سے مراد وہی بچھڑا ہے جس کو سامری نے اپنے ہاتھوں سونے کا ان کے لیے بنایا تھا۔

ان سب کے باوجود اللہ نے ان کو معاف کردیا تھا: ﴿ثُمَّ عَفَوۡنَا عَنكُم مِّنۢ بَعۡدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُونَ﴾ "لیکن ہم نے باوجود اس کے پھر بھی تمہیں معاف کردیا، تاکہ تم شکر کرو"۔

یہ بات اللہ کی عظیم معافی پر دلالت کر رہی ہے تاکہ انسان اس معاف کرنے والے اللہ کا شکر بجالائے اور ان کے لیے استغفار کا دروازہ کھولے رکھا جس کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ کا شکر ادا کرے، اور شکر کا لازمی تقاضا ہے کہ اعتقادی وعملی ہر دو طرح سے اللہ کی اطاعت کی جائے اور زبان بھی اللہ کی حمد وثنا میں لگی رہے کیوں کہ اللہ ہی ہے جس نے نعمتیں عطا کی اور وہی اس پر شکر کا مستحق بھی ہے۔

اللہ کی مزید نعمت یہ ہے کہ اس نے نبی اسرائیل کی ہدایت کے لیے موسی علیہ السلام کو کتاب اور معجزے عطا کیے تاکہ وہ اس ہدایت پر چل کر رضائے الہی تک رسائی پا سکیں: ﴿وَإِذۡ ءَاتَيۡنَا مُوسَى ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡفُرۡقَانَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُونَ﴾ "اور ہم نے موسیٰ کو تمہاری ہدایت کے لئے کتاب اور معجزے عطا فرمائے"۔

اللہ کی جانب سے نبیوں پر کتابوں کا نزول بڑی ہی عظیم اور جلیل القدر نعمتیں ہیں، انہی کتابوں میں سے ایک کتاب تورات ہے اور اس کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ موسی علیہ السلام کے پیروکار اس کے ذریعے ہدایت یاب ہو سکیں، اس لیے مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ گذشتہ امتوں سے عبرت حاصل

کریں اور ان کو قرآن جیسی جو نعمت میسر ہوئی ہے اس پر اللہ کا شکر بجالائیں جس قرآن کو اللہ نے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦ يَٰقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِٱتِّخَاذِكُمُ ٱلْعِجْلَ فَتُوبُوٓا۟ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَٱقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ ٱلصَّٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنَٰكُم مِّنۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٦﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ ٱلْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ ٱلْمَنَّ وَٱلسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾﴾

ترجمہ:

"جب (حضرت موسیٰ) علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو، اپنے کو آپس میں قتل کرو، تمہاری بہتری اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسی میں ہے، تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی، وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم و کرم کرنے والا ہے (۵۴)۔ اور (تم اسے بھی یاد کرو) تم نے (حضرت) موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ جب تک ہم اپنے رب کو سامنے نہ دیکھ لیں ہر گز ایمان نہ لائیں گے (جس گستاخی کی سزا میں) تم پر تمہارے دیکھتے ہوئے بجلی گری (۵۵)۔ لیکن پھر اس لئے کہ تم شکر گزاری کرو، اس موت کے بعد بھی ہم نے تمہیں زندہ کر دیا (۵۶)۔ اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا (اور کہہ دیا) کہ ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا، البتہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے (۵۷)"۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ موسی علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان کے معاملات نیز موسی علیہ السلام نے انہیں جو حکم دیا تھا اور موسی علیہ السلام کے جواب میں ان کے رد عمل کو بیان کیا ہے بایں طور کہ موسی علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس بات کی خبر دی کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم عظیم کیا اس ظلم کی

وضاحت یوں کی کہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر بچھڑے کو معبود بنالیا ، فرمان الہی ہے : ﴿ وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦ يَٰقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِٱتِّخَاذِكُمُ ٱلْعِجْلَ ﴾ "جب (حضرت موسیٰ) علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم! بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے"۔ آیت کریمہ کی تلاوت کرنے والے کو ان کے احوال اور ان احوال کے حکم کا اشارہ ملتا ہے : ﴿ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم ﴾ "تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے"۔ اور اس ظلم کا سبب اور تفسیر یوں بیان فرمائی کہ : ﴿ بِٱتِّخَاذِكُمُ ٱلْعِجْلَ ﴾ "تم نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔

پہلے حکم کو ذکر کیا تاکہ اولاً ذہن سبب کی معرفت کے لیے اچھی طرح متوجہ ہو جائے اور پھر دل حکم کی علت کو جاننے کے لیے متوجہ ہو، اس میں بیانی، توجیہ، ناصحانہ اور تعلیمی بلاغت ہے۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ نصیحت، نصوص، علم و معرفت، مضمون اور مطلوب کی متابعت کے لیے ذہن کو آمادہ کرنے کے لیے اختلاف اسالیب کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے اس عظیم گناہ کا حل اور اس سے نجات کا طریقہ اور حل ان کو یہ بتایا کہ وہ اللہ سے توبہ کریں جس نے ان کو پیدا کیا اور انہیں عدم سے وجود بخشا، ارشاد ہے : ﴿ فَتُوبُوٓاْ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ ﴾ "اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو"۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اللہ کے قول (إِلَىٰ بَارِئِكُمْ) کے متعلق لکھا ہے کہ : "اس آیت میں ان کے جرم عظیم کے تئیں تنبیہ پائی جاتی ہے، یعنی تم اس سے توبہ کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اس کے باوجود تم نے اس کے ساتھ اوروں کی پرستش کی"(۱)۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شرک کرنا بڑا ہی عظیم گناہ ہے کیوں کہ اس گناہ عظیم کی پاداش میں اللہ نے انہیں اپنے آپ کو قتل کر دینے کا حکم دیا، ارشاد ہے : ﴿ فَٱقْتُلُوٓاْ أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ ﴾ "اپنے کو آپس میں قتل کرو، تمہاری بہتری اللہ کے نزدیک اسی میں ہے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اس کو اس کا پورا اختیار حاصل ہے اور کوئی اس کے حکم پر اس کا مواخذہ کرنے والا نہیں ہے وہ ایسا بادشاہ ہے جو پوچھ سکتا ہے مگر اس سے پوچھ گچھ نہیں ہوگی جیسا کہ سورہ انبیاء

---

(۱) تفسير ابن كثير ١/٩٦.

میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُونَ﴾ [سورة الأنبياء:٢٣]. "وہ اپنے کاموں کے لئے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں اور سب (اس کے آگے) جواب دہ ہیں"۔ اس آیت کریمہ سے اس امت اسلامیہ کے تئیں اللہ کی رحمت کا پتہ چلتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالی نے اس امت کو شرک کے گناہ سے کفارہ کے طور پر خود کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ ان کو صرف توبہ واستغفار اور شرک سے باز آجانے کا ہی حکم دیا۔ اس کے بعد اللہ نے خود کو معافی اور رحمت کی صفت سے متصف کیا ہے اور وہی اس کا اہل بھی ہے، ارشاد ہے: ﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ﴾ "تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی اور وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم وکرم کرنے والا ہے"۔ تواب اور رحیم اللہ تعالی کی دو صفتیں ہیں، اور توبہ اور رحمت الہی دو ایسی عظیم نعمت ہے جس پر اللہ تعالی کی اس طرح حمد وثنا اور شکر بجالانا واجب ہے جو اس کی شان کے لائق ہے، اسی عظیم صفت کی بدولت اللہ تعالی نے ان کے جرم عظیم کے باوجود ان کی توبہ قبول فرمائی۔

پھر اللہ تعالی نے بنی اسرائیل سے صادر ہونے والی انسانی سرکشی کو بیان کیا ہے ، ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَـٰمُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهْرَةً﴾ "اور (تم اسے بھی یاد کرو) تم نے (حضرت) موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ جب تک ہم اپنے رب کو سامنے نہ دیکھ لیں ہر گز ایمان نہ لائیں گے"۔ وہ اپنی شرائط اور سرکشی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے کیوں کہ انہوں نے ایمان لانے کے لیے یہ شرط لگادی کہ وہ اللہ کو واضح طور سے دیکھنے کے بعد ہی ایمان لائیں گے۔ اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ سرکشی اور باطل پر اصرار کرنے سے بچنا ضروری ہے، اس لیے کہ یہ سرکشی اور حد سے تجاوز کر جانا انسانوں میں اکثر پایا جاتا ہے اس لیے اس سے خود کو بچانا ضروری ہے کیوں کہ اللہ کا عذاب جب کسی قوم پر آتا ہے تو وہ بہت سخت اور دردناک ہوا کرتا ہے اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کی سزا کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: ﴿فَأَخَذَتْكُمُ ٱلصَّـٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ﴾ "تم پر تمہارے دیکھتے ہوئے بجلی گری"۔ پھر اللہ تعالی نے اپنی قدرت اور رحمت سے انہیں دوبارہ زندہ کر دیا تاکہ وہ اپنی مدت عمر کو مکمل کر لیں، ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ بَعَثْنَـٰكُم مِّنۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ "لیکن پھر اس لئے کہ تم شکر گزاری کرو، اس موت کے بعد بھی ہم نے تمہیں زندہ کر دیا"۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالی عظمت والا اور ہر چیز پر قادر ہے، کوئی

بھی چیز اسے عاجز نہیں کرسکتی چنانچہ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ سے خوف کھایا جائے اس کی اطاعت کی جائے اور اس کی رضا کی تلاش میں رہا جائے۔ پھر اللہ تعالی نے اپنا شکر یہ ادا کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے: ﴿لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُونَ﴾ "تاکہ تم شکر گزاری کرو"۔ یعنی تاکہ موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کی وجہ سے تم اللہ کا شکر ادا کرو یہاں تک کہ تم اپنی مدت عمر کو مکمل کرلو۔ اس آیت میں شکر ادا کرنے کی اہمیت اور عظمت پر تنبیہ پائی جارہی ہے خاص کر اس وقت جب کہ گناہ ، کمی اور کوتاہی کے باوجود نعمت حاصل ہو رہی ہو۔ کیوں کہ اللہ تعالی اپنے حلم و کرم کے مطابق بندوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے نہ کہ ان کے گناہ اور کوتاہیوں کے مطابق۔

اس کے بعد اللہ تعالی مومنوں کے لیے بطور بیان اور بنی اسرائیل سے ان کے پیش رووں پر اللہ کی رحمت نیز ان کی طرف سے سرزد ہونے والے اعمال کی یاددہانی کرارہا ہے نیز اس بات کی بھی یاددہانی کرا رہا ہے کہ اللہ نے اپنی رحمت و حکمت کی بنا پر کیسا معاملہ کیا تاکہ وہ اللہ کی نعمت کا ادراک کرلیں اور اس بات کو جان لیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت برحق ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا پیغام بھی برحق ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَظَلَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ ٱلۡغَمَامَ وَأَنزَلۡنَا عَلَيۡكُمُ ٱلۡمَنَّ وَٱلسَّلۡوَىٰ﴾ "اور ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من و سلوی اتارا"۔ بنی اسرائیل کے پیش رووں کی سرکشی و عناد کے باوجود انہیں جو نعمتیں حاصل تھیں اللہ بنی اسرائیل کو ان کی یاددہانی کروا رہا ہے، چنانچہ اللہ نے اپنی حکمت و رحمت کے تقاضے کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا یعنی ان پر بادلوں سے سایہ اور من و سلوی نازل کیا۔ المن: سے مراد شہد جیسی کوئی میٹھی چیز ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر وہ رزق جو کسی مشقت کے بغیر حاصل ہو جائے وہ المن ہے۔ سلوی: سے مراد چھوٹا پرندہ ہے جسے بٹیر کہا جاتا ہے[1]۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ المن سے مراد ترنجبین یعنی کوئی لیس دار مادہ ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ (الكمأة) کھمبی نامی سبزی من کے جنس سے ہے جس کو اللہ تعالی نے بنی اسرئیل پر نازل کیا تھا۔ اس میں بنی اسرائیل اور دوسرے لوگوں کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہے بایں طور کہ قرآن ان کو

---

(١) تفسير ابن السعدي ١/ ٦٠.

ایسے معاملے کی خبر دے رہا ہے جس کو وہ تو پہلے سے جانتے تھے جب کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کو نازل ہونے کے بعد جانا۔

اس کے فوائد میں سے ہے کہ اللہ رزق دینے والا ہے، جب وہ اپنے بندوں کو رزق دینے کا ارادہ کرلیتا ہے تو اسے بہت سے ذرائع سے بآسانی عطا کر دیتا ہے، نیز وہ بارش کے ذریعے بندوں پر انعام کرنے والا ہے ، بادل اسی کے حکم سے ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ گردش کرتے ہیں اور وہی مخلوق کی ضرورت کے بقدر بارش نازل کرتا ہے۔ وہ بارش اللہ کی تقدیر کے مطابق بغیر غرق کیے ہوئے اور بغیر فساد پھیلائے زمین پر اتر جاتی ہے اس کے بعد اللہ کی مرضی کے مطابق وہ سارے بادل ادھر ادھر منتشر ہو جاتے ہیں، پاک ہے وہ پیدا کرنے والا جس نے بادل کی مقدار، وقت، جگہ اور نقل و حرکت کو متعین کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالی بیان کر رہا ہے کہ وہ لوگ اپنی گناہوں کی بدولت خود پر ظلم کرتے ہیں، فرمایا: ﴿وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوٓا۟ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ "اور انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا، البتہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے"۔ معلوم ہوا کہ انسان کو جو بھی مصیبت اور آفت لاحق ہوتی ہے وہ اس کی خود پر ظالمانہ رویے کا نتیجہ ہوتی ہے۔

﴿وَإِذْ قُلْنَا ٱدْخُلُوا۟ هَٰذِهِ ٱلْقَرْيَةَ فَكُلُوا۟ مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَٱدْخُلُوا۟ ٱلْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا۟ حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطَٰيَٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ قَوْلًا غَيْرَ ٱلَّذِى قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ رِجْزًا مِّنَ ٱلسَّمَآءِ بِمَا كَانُوا۟ يَفْسُقُونَ ﴿٥٩﴾ وَإِذِ ٱسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦ فَقُلْنَا ٱضْرِب بِّعَصَاكَ ٱلْحَجَرَ ۖ فَٱنفَجَرَتْ مِنْهُ ٱثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ مِن رِّزْقِ ٱللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا۟ فِى ٱلْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَٰحِدٍ فَٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنۢبِتُ ٱلْأَرْضُ مِنۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ ٱلَّذِى هُوَ أَدْنَىٰ بِٱلَّذِى هُوَ خَيْرٌ ۚ ٱهْبِطُوا۟ مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ ۗ

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ ٱلذِّلَّةُ وَٱلْمَسْكَنَةُ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ ٱللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا۟ يَكْفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَيَقْتُلُونَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا۟ وَّكَانُوا۟ يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

ترجمہ:

"اور ہم نے تم سے کہا کہ اس بستی میں جاؤاور جو کچھ جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو، اور دروازے میں سجدے کرتے ہوئے گزرو، اور زبان سے حطہ کہو ہم تمہاری خطائیں معاف فرمادیں گے، اور نیکی کرنے والوں کو اور زیادہ دیں گے (۵۸)۔ پھر ان ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی بدل ڈالی، ہم نے بھی ان ظالموں پر ان کے فسق ونافرمانی کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل کیا(۵۹)۔ اور جب موسی (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو، جس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنا چشمہ پہچان لیا(اور ہم نے کہہ دیا کہ)اللہ تعالی کا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو(۶۰)۔ اور جب تم نے کہا اے موسی! ہم سے ایک ہی قسم کے کھانے پر ہر گز صبر نہ ہوسکے گا، اس لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں زمین کی پیداوار، ساگ ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز دے، آپ نے فرمایا: بہتر چیز کے بدلے ادنی چیز کیوں طلب کرتے ہو! اچھا شہر میں جاؤ، وہاں تمہاری چاہت کی سب چیزیں ملیں گی۔ ان پر ذلت اور مسکینی ڈال دی گئی اور اللہ کا غضب لے کر وہ لوٹے، یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے، اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا نتیجہ ہے(۶۱)"۔

آیات کا سیاق ابھی بھی اہل کتاب کے لیے ان کے اگلے آباء واجداد کے رویوں کے ذریعہ اللہ تعالی کی طرف سے ذکر ونصیحت پر مشتمل ہے ، مقصد یہ کہ ان کو اس قرآن کریم کے واسطے سے ان کے تئیں دانستہ حقائق کی مزید تاکید کی جائے۔ اس سے یہ مستفاد ہوا کہ دلیل وبرہان کی کافی اہمیت ہے اور خیر وبھلائی کی رہنمائی میں یاد دہانی ایک اہم چیز ہے ، کیوں کہ حقائق کی یاد دہانی سے آدمی کے شعور و جذبات دونوں ایک ساتھ ان نعمتوں کے عوض فرائض کی ادائیگی پر آمادہ ہوتے ہیں ۔

اللہ تعالی یہود کو ان کے اسلاف کی کارستانیاں یاد دلاتے ہوئے مومنوں اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی ان پر اپنے فضل واحسانات کی خبر دے رہا ہے ، انہی احسانات میں سے ایک احسان یہ ہے کہ جہاد نہ کرنے کی پاداش میں بطور سزا وادی تیہ میں بھٹکنے کی مدت جب ختم ہوگئی تو اللہ تعالی نے ان کو حکم دیا کہ وہ بستی میں داخل ہوں اور اس بستی سے مراد ابن کثیر رحمہ اللہ کی ترجیح کے مطابق بیت المقدس ہے(۱)۔ اللہ تعالی میدان تیہ میں ان کی سزا سے نجات کے بعد ان پر اپنے رحم وکرم کو بیان کر رہا ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے ان کو بستی میں داخل ہونے کا حکم دیا تاکہ وہ امن وامان اور مکمل بھلائی سے ہم کنار ہوسکیں ، ارشاد باری تعالی ہے : ﴿وَإِذْ قُلْنَا ٱدْخُلُوا۟ هَٰذِهِ ٱلْقَرْيَةَ فَكُلُوا۟ مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا﴾ "اور ہم نے تم سے کہا کہ اس بستی میں جاؤاور جو کچھ جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو"۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس بستی میں ان کو ہر طرح کے کشادہ رزق کی ہر طرف فراوانی اور نعمت میسر ہوئی ، نیز اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بستی کافی با برکت ہے جہاں ان کے لیے معیشت کی فراوانی تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالی ان کو اس بستی میں داخل ہونے کی کیفیت کا حکم دے رہا ہے : ﴿وَٱدْخُلُوا۟ ٱلْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا۟ حِطَّةٌ﴾ "اور دروازے میں سجدے کرتے ہوئے گزرو، اور زبان سے حطہ کہو"۔ سجدے کا لفظ خضوع اور فرمابرداری اور اطاعت و عبادت کا فائدہ دیتا ہے کیوں کی سجدے میں انکساری پائی جاتی ہے ، اور حطہ کے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی سے اپنی گناہوں کی بخشش طلب کریں۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کی شریعت اور احکامات کی بجا آوری میں تذلل اور انکساری ضروری ہے اور نعمتوں کی فراوانی اور آسودگی اللہ تعالی کی اطاعت وشکر اور استغفار سے حاصل ہوتی ہے اور کبر وغرور عناد وسرکشی کا انجام دنیا وآخرت کی ہلاکت وبربادی ہے ۔ اس آیت میں خطاب

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۱۰۲.

اگرچہ بنی اسرئیل کے متعلق ہے لیکن ان کے ساتھ ہونے والے واقعات میں مومنوں کے لیے نصیحت ہے تاکہ وہ ان واقعات سے نصیحت حاصل کرتے ہوئے ان امور سے اجتناب کریں جن میں گزشتہ قومیں پھسل گئیں۔

اللہ تعالی اس بات کی تاکید کر رہا ہے کہ اگر وہ اللہ تعالی کے حکم کے مطابق بستی میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالی ان کی بخشش کردے گا اور نیکو کار کو مزید خیر وبھلائی سے نوازے گا: ﴿نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطَٰيَٰكُمۡۚ وَسَنَزِيدُ ٱلۡمُحۡسِنِينَ﴾ "ہم تمہاری خطائیں معاف فرمادیں گے،اور نیکی کرنے والوں کواور زیادہ دیں گے "۔

لیکن اس کے باوجود وہاں ایسے لوگ تھے جنہوں نے اللہ تعالی کی نعمت کو ناشکری اور کفر سے بدل ڈالا ، اس لیے ایسے لوگوں سے اور ان کی کرتوتوں سے خود کو بچائے رکھنا ضروری ہے ، ان کے متعلق اللہ کا ارشاد ہے: ﴿فَبَدَّلَ ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ قَوۡلًا غَيۡرَ ٱلَّذِي قِيلَ لَهُمۡ﴾"پھران ظالموں نےاس بات کوجوان سے کہی گئی تھی بدل ڈالی"۔ یعنی ان تمام ہدایات اور نعتوں کے باوجود ان یہود نے اللہ تعالی کی کہی ہوئی بات کو بدل ڈالا اور اطاعت وفرمابرداری کے بجائے نافرمانی پر اتر آئے ، ہر وقت اور ہر زمانے میں ظالم لوگوں سے ایسے ہی افعال کا صدور ہوتا ہے ، چنانچہ ایسے لوگ مال ودولت کی فراوانی ہوتو اس کے بدلے فضول خرچی کی روش اختیار کرلیتے ہیں ، صحت وتندرستی کی نعمت حاصل ہوتو معصیت اور گناہوں سے اس کو تبدیل کرتے ہیں ، اولاد کی نعمت ملے تو ان کو اطاعت سے بہکا کر یا ان کو معصیت میں لگا کر اس نعمت کو بدل ڈالتے ہیں ، اسی طرح مشروع عبادات کی نعمت کو تحریف اور مقصد الہی کے خلاف اجتہادات سے بدل دیتے ہیں ، چنانچہ اللہ تعالی کے قول کو بدل دینے والے ایسے ہی لوگوں پر اللہ تعالی کا عذاب نازل ہوتا ہے ، ارشاد ربانی ہے: ﴿فَبَدَّلَ ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ قَوۡلًا غَيۡرَ ٱلَّذِي قِيلَ لَهُمۡ فَأَنزَلۡنَا عَلَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ رِجۡزًا مِّنَ ٱلسَّمَآءِ بِمَا كَانُواْ يَفۡسُقُونَ﴾"پھران ظالموں نےاس بات کوجوان سے کہی گئی تھی بدل ڈالی،ہم نے بھی ان ظالموں پر ان کے فسق ونافرمانی کی وجہ سے آسمانی

عذاب نازل کیا "۔ یعنی اللہ تعالی نے ان کے فسق کی بنیاد پر ان کو عذاب سے دوچار کیا ۔ اس سے مستفاد ہوا کہ اللہ تعالی کی معصیت اور اس کے احکامات واوامر میں تبدیلی سے بہت دور رہنا چاہیے ، کیوں کہ آسمان وزمین کا لشکر سب اللہ تعالی ہی کے لیے ہے اور اس کا عذاب مختلف شکلوں میں نازل ہوتا ہے ، کبھی صحت میں کبھی رزق میں اور کبھی ہموم وغموم اور ذلت کی شکل میں ، اس کے علاوہ بھی اس کے عذاب کی مختلف قسمیں ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان یہود کے اسلاف پر اپنی نعمتوں کا مزید تذکرہ کرر ہا ہے ، جب کہ موسی علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی سیرابی کے لیے اللہ تعالی سے پانی کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالی نے ان کو بغیر کسی محنت ومشقت کے خوب وافر مقدار میں پانی فراہم کیا ، ارشاد ہے: ﴿ وَإِذِ ٱسۡتَسۡقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوۡمِهِۦ فَقُلۡنَا ٱضۡرِب بِّعَصَاكَ ٱلۡحَجَرَۖ فَٱنفَجَرَتۡ مِنۡهُ ٱثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنًا ﴾ "اور جب موسی (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو، جس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے "۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کی نوازشیں کافی عظیم ہیں اور اللہ تعالی جن پر اپنی نوازش کرنا چاہتا ہے تو اس کو اس کی محنت اور مشقت کے بغیر پوری سہولت اور آسانی کے ساتھ عطا کرتا ہے ، چنانچہ دیکھ سکتے ہیں کہ پتھر پر محض ایک ضرب سے پانی کے چشمے رواں ہوگئے ، اور یہ ان کے سامنے ایک معجزہ کے طور پر تھا۔

اللہ تعالی کا فرمان : ﴿ وَإِذِ ٱسۡتَسۡقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوۡمِهِۦ ﴾ "اور جب موسی (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا"، سے یہ فائدہ اخذ ہو رہا ہے کہ اسباب اختیار کرنے سے پہلے اللہ تعالی کی طرف رجوع کرنا چاہیے ، کیوں کہ (استسقی) کے لفظ میں طلب کا معنی پایا جاتا ہے ، اور اس لیے بھی کہ تمام اسباب کا مالک اور ان اسباب کو مسخر کرنے والی ایک اللہ کی ذات ہے جس کے حکم کے سامنے تمام مخلوقات مقہور ومغلوب ہیں ، لہذا جس چیز کو اللہ تعالی آسان کر دے وہی چیز آسان ہوتی ہے ۔ اور یہ بھی اللہ تعالی کا فضل و

احسان ہے کہ اس نے بنی اسرائیل کی تعداد کے مطابق بارہ چشمے جاری کیے تاکہ ہر قبیلہ اپنے چشمے سے پانی پی سکے جس کے تعلق سے اس کو پتہ ہے کہ وہ اسی کے قبیلہ کا چشمہ ہے ، اور ان سب کے پیچھے اللہ تعالی کا فضل وکرم ، علم وحکمت اور قدرت کاملہ کار فرما تھی: ﴿فَانفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ﴾"جس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنا چشمہ پہچان لیا"۔ اس کے بعد اللہ تعالی اس نعمت کے استعمال کی کیفیت اور طریقہ کو بیان کر رہا ہے : ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴾"(اور ہم نے کہہ دیا کہ)اللہ تعالی کا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو "۔ آیت میں اللہ تعالی نے رزق کی نسبت اپنی ذات جل جلالہ کی طرف کی ہے "﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ﴾" اللہ تعالی کا رزق کھاؤ پیو"۔ اس واضح ہے کہ مخلوقات کے پاس جتنی قسم کی بھی اشیائے خورد ونوش ہیں سب اللہ تعالی کا رزق ہیں ، اس لیے ضروری ہے کہ لوگ ان تمام چیزوں کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کریں اور ان اشیاء کو اپنی ذاتی محنت اور کوشش کا نتیجہ نہ سمجھیں بلکہ ان تمام اشیاء کو اللہ تعالی کی ذات اور اس کے فضل و کرم اور جود و احسان سے مربوط رکھیں ، کیوں کہ چاہے ان کو وجود میں لانا ہو یا ان کی تسخیر کا معاملہ ہو سب میں اصل نوازش اور فضل اللہ تعالی ہی کی طرف سے ہے ۔

آیت کریمہ میں فساد سے ممانعت اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالی نے جن نعمتوں سے نوازا ہے اس کا لازمی ہدف ومقصد اور طریقہ کار یہ ہے کہ ان کا استعمال ہرگز اللہ تعالی کی معصیت اور زمین اور زمین پر بسنے والی مخلوقات میں فساد پھیلانے کے لیے نہ کیا جائے۔

بنی اسرائیل جب من وسلوی کی نعمت سے اکتا گئے تو انہیں شہر کی پرانی طرز زندگی یاد آئی اور انہوں نے موسی علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ وہ اللہ تعالی سے دعا کریں کہ وہ ان کے لیے وہی سابقہ کھانے کی اشیاء زمین سے پیدا کرے ، ارشاد الہی ہے :

﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَـٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَٰحِدٍ فَٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنۢبِتُ ٱلْأَرْضُ مِنۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ﴾ "اور جب تم نے کہااے موسی! ہم سے ایک ہی قسم کے کھانے پر ہر گز صبر نہ ہوسکے گا،اس لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں زمین کی پیداوار، ساگ ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز دے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی طبیعت بہت جلد اکتاہٹ کا شکار ہوجاتی ہے چاہے اس کو روئے زمین کی سب سے عمدہ اور اچھی چیز ہی کیوں نہ میسر ہو ، جیساکہ بنی اسرئیل کو من وسلوی سے نوازا گیا لیکن اس کے باوجود انہوں نے زمین کی پیداوار کا مطالبہ کیا ۔ اس سے یہ فائدہ مل رہا ہے کہ موجودہ نعمتوں اور اچھائیوں پر صبر اور اپنے نفس کو ان نعمتوں کے احساس کا عادی بنانا بہت اہم ہے ، تاکہ انسان تنوع پسندی کا شکار ہوکر عظیم اور بھلی نعمت کو فراموش نہ کرے ، بلکہ تزکیہ نفس کے ساتھ خود کو بلندیوں تک پہنچائے ، اور وہ اس حقیقت سے آگاہ رہے کہ اس کی طبیعت میں ملال پایا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ ایسی چیز کی خواہش کرتا ہے جو اس کے پاس نہیں رہتی لیکن جب وہ اس چیز کو حاصل کر لیتا ہے تو پھر دوسری کی خواہش کرتا ہے اور خواہشات کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جس سے نجات اسی وقت ممکن ہے جب کہ انسان اپنے نفس کو قناعت کا عادی بنائے اور اس کی تربیت وتہذیب پر دھیان دے۔

اسی لیے جب انسان اس بے صبری اور انسانی طبیعت سے جس کا خاصہ یہ ہے کہ وہ غیر موجود چیزوں کی خواہش مند رہتی ہے واقف ہو تو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ خود پر کنڑول رکھے اور اس کی وجہ سے خود کو پستی اور گری ہوئی طبیعت کی طرف ڈھکیل کر اعلی اور بہتر چیز کے بدلے ادنی اور گھٹیا چیز کا مطالبہ نہ کرے ، بلکہ اس کی تربیت اور تزکیے کے ذریعہ خود کو بلند مقام دے ، اور ہر نئی چیز کے پیچھے دوڑ نہ لگائے ، کیوں کہ اس سے آسودگی کے بعد جلد ہی اس سے بھی اکتاہٹ کا شکار ہوجائے گا ۔ اگر انسان اس حقیقت کو سمجھ لے تو ہمیشہ اپنی طبیعت سے حسن تعامل کا مطالبہ کرے گا ، اور عقل مند تو وہی ہے جس کے نفس کو اللہ تعالی استحکام عطا فرمائے جیساکہ اللہ تعالی

نے موسی علیہ السلام کی طبیعت میں استحکام پیدا کیا اور انہوں نے انتہائی تعجب کے ساتھ ان کے مطالبہ کی تردید کی ، ارشاد باری تعالی ہے : ﴿قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ ٱلَّذِى هُوَ أَدْنَىٰ بِٱلَّذِى هُوَ خَيْرٌ﴾ "آپ نے فرمایا: بہتر چیز کے بدلے ادنی چیز کیوں طلب کرتے ہو!". یہ اس مطالبہ پر تعجب کا اظہار ہے اور بات ہے ہی تعجب کی کہ اللہ تعالی نے جب افضل ترین اور بہترین نعمت سے نوازا تو اس کے بعد ادنی اور کمتر چیز کا مطالبہ کیا جائے۔ اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جو قوم کا ذمہ دار ہو اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ لوگوں کے لیے معاملات کی وضاحت کرے نیز لوگوں سے پوچھ تاچھ اور ان کی باتوں پر نکیر کرنے کا اس کو حق حاصل ہے ۔ اس کے بعد موسی علیہ السلام نے ان سے کہا: ﴿ٱهْبِطُوا۟ مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ﴾ "اچھا شہر میں جاؤ، وہاں تمہاری چاہت کی سب چیزیں ملیں گی " ۔ جب انہوں نے ادنی چیز کی خواہش کی تو موسی علیہ السلام نے ان کو مصر چلے جانے کی ہدایت کی ، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مصر سے مراد عام شہر ہے یعنی وہ کسی بھی شہر میں چلے جائیں کیوں کہ تم نے جن چیزوں کا مطالبہ کیا ہے وہ روئے زمین کے کسی بھی شہر میں دستیاب ہے(۱)۔

ان نعمتوں کی تسخیر ، سابقہ ذلت ورسوائی سے نجات ، معجزات کے مشاہدے ، عدم صبر ، عناد اور نافرمانیوں کی کثرت کے بعد اللہ تعالی نے ان پر ذلت ورسوائی مسلط کر دی ، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ ٱلذِّلَّةُ وَٱلْمَسْكَنَةُ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ ٱللَّهِ﴾ "ان پر ذلت اور مسکینی ڈال دی گئی اور اللہ کا غضب لے کر وہ لوٹے"۔ یہاں اللہ تعالی نے ان کے اوپر آنے والے مختلف عذابوں کو بیان کیا کہ ان کے ظاہری جسموں پر ذلت کی مار پڑی اور ان کے دلوں میں مسکینی ڈال دی گئی اور مزید یہ کہ ان پر اللہ تعالی کا غضب نازل ہوا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ذلت سے مراد حقارت اور فقیری ہے ، لہذا یہی وجہ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۱۰۵-۱۰۶.

ہے کہ ہر یہودی اگرچہ وہ مالدار ہی کیوں نہ ہو اس پر حقارت وفقیری اور رسوائی کی چھاپ ہوتی ہے اور یہ چیز ان کے لباس وپوشاک سے بھی ظاہر ہے جسے دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پھٹے ہوئے ہیں ، حالانکہ وہ نئے ہوتے ہیں ، اس لیے تقاضا اس بات کا ہے کہ مومن ان کی تقلید اور نقالی کرنے سے آگاہ رہیں جن پر مالداری میں بھی فقیری کے آثار نمایاں ہیں ،جن لوگوں نے اللہ تعالی کی نعمت اور رحمت کے مقابلہ میں جس کبر وغرور ، عناد ، نعمت سے اکتاہٹ ، نعمتوں کی ناشکری ، گھٹیا طبیعت کی ترجیح کی روش اختیار کی ان کی اس روش سے بچیں ، بلکہ ایک مومن کے لیے لازم ہے کہ وہ بلندیٔ نفس اور طبیعت کے ارتقاء کو فروغ دے کر ایک عبادت گزار اور شکر گزار اوراللہ تعالی کی طرف سے اپنے لیےمقدر نعمتوں کا اعتراف کرنے والابندہ بن کر رہے ، اور یاد رکھے کہ اللہ تعالی کا عذاب بہت بھیانک ہے ۔ (وَبَآءُو) یعنی اللہ تعالی کا غضب لے کر لوٹے۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان پر ذلت ورسوائی ، مسکینی اور اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹنے والے عذاب نازل کرنے کی وجہ بیان کر رہا ہے : ﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا۟ يَكْفُرُونَ بِـَٔايَـٰتِ ٱللَّهِ وَيَقْتُلُونَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا۟ وَّكَانُوا۟ يَعْتَدُونَ﴾" یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے،اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا نتیجہ ہے "۔ یہ وہ گناہ ہیں جس کی وجہ سے ان پر اللہ تعالی کا عذاب نازل ہوا ، اس لیے نافرمانیوں سے پرہیز لازمی ہے کیوں کہ نافرمانیاں اللہ تعالی کے غضب کو دعوت دیتی ہیں ، اور اللہ تعالی بڑا کریم ورحیم ہے ، وہ فرمابردار ، شکر گزار اور اللہ تعالی کی جناب میں استغفار و توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ، جو اللہ تعالی کی نعمتوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اسراف وفضول خرچی کرتے ہوئے اللہ تعالی کی نعمتوں کو ذلت وحقارت کی نظر سے نہیں دیکھتے ۔ ایک مومن ہمیشہ اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا خواہاں اور پیروی کی کوشش میں لگا رہتا ہے ۔

﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَٱلَّذِينَ هَادُواْ وَٱلنَّصَٰرَىٰ وَٱلصَّٰبِـِٔينَ مَنۡ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ وَعَمِلَ صَٰلِحٗا فَلَهُمۡ أَجۡرُهُمۡ عِندَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ﴿٦٢﴾﴾

ترجمہ:

" مسلمان ہوں ، یہودی ہوں ، نصاری ہوں ، یا صابی ہوں ، جو کوئی بھی اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے ان کے اجر ان کے رب کے پاس ہیں اور ان پر نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ اداسی(٦٢)"۔

اللہ تعالی کے اوامر کی مخالفت کرنے والے اور اس کی وعیدوں کا ارتکاب کرنے والے اور اس کی پاداش میں ان پر آنے والے عذاب کے احوال بیان کرنے کے بعد اللہ تعالی گزشتہ امتوں میں نیکو کار لوگوں کے ثواب واجر کو بیان کر رہا ہے جو اللہ تعالی کی اطاعت کرتے ہوئے پہلے کے نبیوں پر ایمان لائے اسی طرح یہود ونصاری میں سے مومن لوگ اور صابئین جو کہ یہود یا نصاری ہی کا ایک گروہ ہے ان تمام کے اجر وثواب کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَٱلَّذِينَ هَادُواْ وَٱلنَّصَٰرَىٰ وَٱلصَّٰبِـِٔينَ مَنۡ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ وَعَمِلَ صَٰلِحٗا فَلَهُمۡ أَجۡرُهُمۡ عِندَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ﴾" مسلمان ہوں ، یہودی ہوں ، نصاری ہوں ، یا صابی ہوں ، جو کوئی بھی اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے ان کے اجر ان کے رب کے پاس ہیں اور ان پر نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ اداسی"۔ یعنی ایسے لوگوں کے لیے بہترین بدلہ ہے ، اور یہی اجر وثواب قیامت تک کے لیے ہے ، چنانچہ جو کوئی بھی رسول امی محمد صلی اللہ علیہ کی اتباع کرے گا تو اس کے لیے ابدی سعادت ہے ، اس کو نہ تو مستقبل کا خوف ہوگا اور نہ ماضی میں کیے اعمال پر غم اور اداسی ۔اس آیت سے اللہ تعالی کے عدل کا پتہ چلتا ہے کیوں کہ اللہ تعالی ایسے لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا جو اپنی طرف بھیجے گئے اللہ تعالی کے انبیاء اور

رسولوں کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں اور اللہ تعالی اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوئے نیک اعمال انجام دیتے ہیں ۔

ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ تعالی نے آپ کے ذریعہ تمام ادیان منسوخ کردیئے ، لہذا آپ کے بعد اب اسلام کے علاوہ کسی سے کوئی دوسرا دین قبول نہیں کیا جائے گا ، اس کی صراحت اللہ تعالی نے سورہ آل عمران میں یوں فرمائی ہے: ﴿ وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ ٱلْإِسْلَـٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى ٱلْـَٔاخِرَةِ مِنَ ٱلْخَـٰسِرِينَ ﴾ [سورة آل عمران:٨٥]. "جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے ، اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا"۔

﴿ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَـٰقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ ٱلطُّورَ خُذُوا۟ مَآ ءَاتَيْنَـٰكُم بِقُوَّةٍ وَٱذْكُرُوا۟ مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ ۖ فَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ لَكُنتُم مِّنَ ٱلْخَـٰسِرِينَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ ٱلَّذِينَ ٱعْتَدَوْا۟ مِنكُمْ فِى ٱلسَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا۟ قِرَدَةً خَـٰسِـِٔينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَـٰهَا نَكَـٰلًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾ ﴾

ترجمہ:

" اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا اور تم پر طور پہاڑ لا کھڑا کر دیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے ، اسے مضبوطی سے تھام لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد کرو تاکہ تم بچ سکو(۶۳)۔لیکن تم اس کے بعد بھی پھر گئے ، پھر اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم نقصان والے ہو جاتے(۶۴)۔ اور یقینا تمہیں ان لوگوں کا علم بھی ہے جو تم میں سے ہفتہ کے بارے میں حد سے بڑھ گئے اور ہم نے بھی کہہ دیا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ(۶۵)۔ اسے ہم نے اگلوں پچھلوں کے لیے عبرت کا سبب بنا دیا اور پرہیزگاروں کے لیے وعظ ونصیحت کا(٦٦)"۔

آیات کریمہ میں پھر سے بنی اسرائیل کے احوال بیان ہو رہے ہیں ، جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے ان کے اوپر طور پہاڑ لا کھڑا کر دیا اور ان سے نہایت پختہ

قسم کا عہد وپیمان لیا کہ وہ تورات کو اپنا کر اس کی تلاوت کرتے ہوئے اس میں بیان کردہ احکامات الہیہ پر پوری جد وجہد اور صبر کے ساتھ عمل پیرا ہوں ، تاکہ وہ اللہ تعالی کے عذاب سے بچ سکیں اور ان کا شمار متقی لوگوں میں ہو ، ارشاد الہی ہے : ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَـٰقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ ٱلطُّورَ خُذُوا۟ مَآ ءَاتَيْنَـٰكُم بِقُوَّةٍ وَٱذْكُرُوا۟ مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾" اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا اور تم پرطور پہاڑ لا کھڑا کر دیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو دیا ہے ، اسے مضبوطی سے تھام لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد کرو تاکہ تم بچ سکو "۔

یہ آیات بنی اسرائیل کے لیے یاد دہانی کے طور پر ہے اور دوسروں کے لیے ان کے احوال میں درس ہے تاکہ لوگ سابقہ امتوں سے عبرت حاصل کر سکیں ۔ اس سے مستفاد ہوا کہ دعوتی اور تربیتی میدان میں یاددہانی اور تذکیر کے طریقہ کار کی کافی اہمیت ہے ، اسی طرح حقیقت بیانی کی بھی کافی اہمیت ہے تاکہ آدمی ان امور کو جان سکے جو اس کو اطاعت الہی کے لیے آمادہ کرتے ، ابھارتے اور برائیوں سے دور رکھتے ہیں۔

عہد وپیمان لینے میں اس کی اہمیت کی دلیل ہے ، بالخصوص جب یہ عہد وپیمان اس ذات باری تعالی سے ہو جو ہر چیز کا خالق ومالک ہے ۔ اسی طرح پہاڑ کا اٹھا نا اللہ تعالی کے عظیم قدرت کی دلیل ہے ، اور یہ اللہ تعالی کی رحمت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو حواس باختہ کر دینے والی چیزوں سے خوف دلاتا ہے جیساکہ اللہ تعالی نے پہاڑ ہی کو ان کے اوپر لا کھڑا کر دیا ، اور اگر اللہ تعالی کی رحمت نہ ہوتی تو وہ اس کے ذریعہ ان تمام لوگوں کو نیست ونابود کر دیتا۔ آیت کریمہ کے اس بیان سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ اللہ تعالی کے دین کو پورے جد واجتہاد سے اپنانا ضروری ہے ، اسی طرح اس دین کو خود سیکھنا ، دوسروں کو سیکھانا اور لوگوں کے درمیان اس کی نشرو اشاعت بھی لازمی ہے ، تاکہ ایک مسلم اس دین پر عمل پیرا ہو کر اللہ تعالی کے غضب سے بچ سکے اور تقوی جیسی صفت سے ہمکنار ہو جو کہ دنیا وآخرت کی ساری بھلائیوں کا موجب ہے ۔

اس عہد وپیمان اور اپنے اوپر پہاڑ کو دیکھ لینے کے باوجود بنی اسرائیل نے روگردانی کا مظاہرہ کیا ، جیساکہ ان کے متعلق اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ﴾" لیکن تم اس کے بعد بھی پھر گیے "۔ لیکن اس روگردانی کے بعد بھی تمہارے ساتھ اللہ تعالی کا عظیم فضل رہا: ﴿فَلَوْلَا فَضْلُ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ لَكُنتُم مِّنَ ٱلْخَٰسِرِينَ﴾" پھر اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم نقصان والے ہو جاتے "۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کا اپنے بندوں کے ساتھ فضل اور رحم وکرم انتہائی عظیم ہے اور اگر یہ رحمت الہی اور فضل وکرم نہ ہوتا تو لوگ نقصان سے دوچار ہوتے اور گنہگار کو توبہ کرنے کی مہلت نہ ملتی ۔ نیز اللہ تعالی کا فضل اور رحم وکرم یہ بھی ہے کہ اس نے رسولوں کو بھیجا جن میں سے سب سے آخری رسول ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

پہاڑ کے اٹھانے کا یہ عظیم واقعہ اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ کائنات میں وقوع پذیر زلزلے ، آتش فشاں پہاڑوں کا پھٹنا ، سیلاب ، سورج وچاند گرہن ، مختلف حادثات اور جنگیں سب دنیا والوں کے لیے نشانیاں ہیں ۔

بعد کی آیات میں ایک ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کے یہاں ثابت شدہ تھا جس میں بنی اسرائیل کے ان لوگوں کے احوال بیان کیے گئے ہیں جنہوں نے سنیچر کے دن کے متعلق زیادتی کی جس کے سبب ان پر اللہ تعالی کا غضب نازل ہوا اور اللہ تعالی نے ان سب کو بندر بنا ڈالا ، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے : ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ ٱلَّذِينَ ٱعْتَدَوْا۟ مِنكُمْ فِى ٱلسَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا۟ قِرَدَةً خَٰسِـِٔينَ﴾" اور یقینا تمہیں ان لوگوں کا علم بھی ہے جو تم میں سے ہفتہ کے بارے میں حد سے بڑھ گئے اور ہم نے بھی کہہ دیا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ "۔ یہ یہی لوگ ہیں جن کا قصہ قدرے تفصیل سے اللہ تعالی نے سورہ اعراف میں بیان کیا ہے ، یہاں اس قصہ کا اجمالا ذکر کیا گیا ہے ، اور اس کے اجمالی طور پر ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے تاکہ اس قصہ کی

مزید تفیصل جاننے کا شوق پیدا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اجمال کے بعد تفصیل کا یہ اسلوب کافی اہمیت رکھتا ہے اور اس سے آیات کے تتبع کی مزید رغبت پیدا ہوتی ہے تاکہ اس کی مزید تفصیل جانی جا سکے ۔ نیز اس واقعہ سے یہ بھی مستفاد ہے کہ معصیت کا انجام انتہائی خطرناک ہوتا ہے اور کسی بھی گناہ کی سزا دینا اللہ تعالی کے لیے بالکل آسان ہے ، اور بسا اوقات اللہ تعالی ایسا عذاب بھی دیتا ہے جو نافرمان سوچ بھی نہیں سکتا ، جیسا کہ اللہ تعالی نے ان کے متعلق صرف یہ کہا کہ : ﴿كُونُواْ قِرَدَةً خَٰسِـِٔينَ﴾ "تم ذلیل بندر بن جاؤ" اور وہ اسی وقت ذلیل وحقیر بندر میں تبدیل ہوگئے۔

چنانچہ گناہ ایک گنہگار کی ذلت کا سبب ہوتی ہیں ، لہذا ایک مومن کو چاہئے کہ وہ معصیت کے برے نتائج سے بچ کر رہے اور اللہ تعالی سے توفیق ومدد اور درستگی کی دعا کرتا رہے ۔

اس کے بعد اللہ تعالی بیان کر رہا ہے کہ سنیچر کے دن والوں کی یہ سزا دوسروں کے لیے بطور عبرت ہے : ﴿فَجَعَلْنَٰهَا نَكَٰلًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ﴾ " اسے ہم نے اگلوں پچھلوں کے لیے عبرت کا سبب بنا دیا اور پرہیزگاروں کے لیے وعظ ونصیحت کا "۔ اس سے یہ مستفاد ہوا کہ دوسروں کو پہنچنے والا عذاب یا کسی حد کا نفاذ گناہ کرنے والے کے حق میں بطور سزا اور دوسروں کے لیے بطور عبرت ہے ، تاکہ وہ دین کی حقیقت اور اللہ تعالی کے نافرمان اور عناد پرست کی سزاؤوں سے آشنا ہوسکیں۔ نیز یہ ﴿وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ﴾ " پرہیزگاروں کے لیے وعظ ونصیحت کا سبب بنایا"۔ تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں ، اور یہ ان کے ایمان میں زیادتی ، معصیت سے دوری اور بچاؤ کا سبب ہو۔

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦٓ إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُواْ بَقَرَةً ۖ قَالُوٓاْ أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ بِٱللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْجَٰهِلِينَ ﴿٦٧﴾ قَالُواْ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ ۚ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ

إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا۟ مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا
رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ
ٱلنَّٰظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ إِنَّ ٱلْبَقَرَ تَشَٰبَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّآ إِن شَآءَ ٱللَّهُ
لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ ٱلْأَرْضَ وَلَا تَسْقِى ٱلْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا
شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا۟ ٱلْـَٰٔنَ جِئْتَ بِٱلْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا۟ يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا
فَٱدَّٰرَْٰٔتُمْ فِيهَا ۖ وَٱللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ فَقُلْنَا ٱضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَٰلِكَ يُحْىِ ٱللَّهُ
ٱلْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

ترجمہ:

"اور (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے، تو انہوں نے کہا ہم سے مذاق کیوں کرتے ہو؟ آپ نے جواب دیا کہ میں ایسا جاہل ہونے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑتا ہوں (٦٧)۔ انہوں نے کہا اے موسیٰ! دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لیے اس کی ماہیت بیان کردے، آپ نے فرمایا سنو! وہ گائے نہ تو بالکل بڑھیا ہو، نہ بچہ، بلکہ درمیانی عمر کی جوان ہو، اب جو تمہیں حکم دیا گیا ہے بجالاؤ (٦٨)۔ پھر کہنے لگے کہ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ بیان کرے کہ اس کا رنگ کیا ہے؟ فرمایا وہ کہتا ہے کہ وہ گائے زرد رنگ کی ہے، چمکیلا اور دیکھنے والوں کو بھلا لگنے والا اس کا رنگ ہے (٦٩)۔ وہ کہنے لگے کہ اپنے رب سے اور دعا کیجیے کہ ہمیں اس کی مزید ماہیت بتلائے، اس قسم کی گائے تو بہت ہیں پتہ نہیں چلتا، اگر اللہ نے چاہا تو ہم ہدایت والے ہو جائیں گے (٧٠)۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ گائے کام کرنے والی، زمین میں ہل جوتنے والی اور کھیتوں کو پانی پلانے والی نہیں، وہ تندرست اور بے داغ ہے، انہوں نے کہا: اب آپ نے حق واضح کردیا گو وہ حکم برداری کے قریب نہ تھے، لیکن اسے مانا اور وہ گائے ذبح کردی (٧١)۔ جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، پھر اس میں اختلاف کرنے لگے اور تمہاری پوشیدگی کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا (٧٢)۔ ہم نے کہا کہ اس گائے کا ایک

ٹکڑا مقتول کے جسم پر لگادو، (وہ جی اٹھے گا) اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرکے تمہیں تمہاری عقلمندی کے لیے اپنی نشانیاں دیکھاتا ہے (۷۳)"۔

ان آیات میں موسی علیہ السلام کا اپنی قوم کے ساتھ ایک واقعہ کا بیان ہے جس میں بنی اسرئیل کے ایک فرد کا قتل ہو گیا تھا اور وہ لوگ اس کے قاتل کی تعیین کے بارے میں آپس میں اختلاف وجھگڑے کا شکار ہو گئے اور معاملہ کافی طول پکڑ گیا اوراگر اللہ تعالی ان کے ان اختلافات کی وضاحت نہ کرتا تو قریب تھا کہ لوگوں میں اس کی وجہ سے کافی فساد برپا ہوجاتا، چنانچہ اس قاتل کی جانکاری کے لیے موسی علیہ السلام نے ان کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا [(۱)]۔ ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦٓ إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُوا۟ بَقَرَةً﴾ "اور (حضرت) موسی (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالی تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے"۔

اس کے بعد ان لوگوں کے موقف کی تفصیل بیان کی جارہی ہے کہ جب موسی علیہ السلام اللہ تعالی کے اس حکم کے ذریعہ ان سے مخاطب اور ہم کلام ہوئے توانہوں نے اپنے نبی پر ہی اعتراض کیا : ﴿قَالُوٓا۟ أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا﴾" تو انہوں نے کہا ہم سے مذاق کیوں کرتے ہو"، حالانکہ ان پر موسی علیہ السلام کے حکم کی تعمیل واجب تھی کیوں کہ وہ اللہ تعالی کی طرف سے ان کی جانب بھیجے گئے رسول اور نبی تھے، اور ہرگز یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ان سے جھوٹ بولتے یا مذاق کرتے، ایک نبی کے بارے میں ایسا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا، بالخصوص جب کہ انہوں نے صراحتا کہا تھا کہ یہ اللہ تعالی کا حکم ہے : ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تَذْبَحُوا۟ بَقَرَةً﴾ "اللہ تعالی تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے"۔ موسی علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہوں، بلکہ صراحت کی کہ یہ اللہ تعالی کا حکم ہے۔اس میں اس بات کی تاکید ہے کہ انبیاء کے ساتھ حسن ظن رکھنا اور

---

(۱) تفسير ابن السعدى ١/٦٦.

ان کی اطاعت کرنا ضروری ہے اور ان کے احکامات میں اپنی عقلی قیاس آرائی نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالی کے احکامات کے تسلیم کرنے کا دار ومدار عقلی قیاس آرائی اور خواہشات پر نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالی کی اطاعت وفرمابرداری میں تمام احکامات کو تسلیم کرنا واجب ہے خواہ ان احکامات کی حکمت معلوم ہو یا نا معلوم اور سمجھ سے ورے ہو۔ موسی علیہ السلام نے ان کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ: ﴿أَعُوذُ بِٱللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْجَٰهِلِينَ﴾ "میں ایسا جاہل ہونے سے اللہ تعالی کی پناہ پکڑتا ہوں"۔ موسی علیہ السلام کے اس جواب میں بد ظنی کو دور کرنے کی بنیاد بڑی ہی عمدہ عبارت میں بیان کی گئی ہے، اور اس سے یہ فائدہ اخذ ہوتا ہے کہ ایک عقل مند کسی کے جواب میں جاہلوں والے قول وفعل کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ وہ ہمیشہ حق بات کہتا اور باطل کی تردید کرتا ہے، لیکن ایک جاہل اہم حالات اور تاریک ترین مقامات پر بھی استہزاء اور مذاق کرتا ہے۔ اس میں اس بات کی تاکید ہے کہ سنجیدہ معاملات وحالات میں جہالت واستہزاء کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح موسی علیہ السلام کے قول: ﴿أَعُوذُ بِٱللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْجَٰهِلِينَ﴾ میں خود سے ظلم وزیادتی کے دفاع کے لیے، یا ان صفات سے بری ہونے کی صورت میں خود کو ان تہمتوں سے بچاؤ کے لیے اللہ تعالی کی پناہ طلب کرنے کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے، کیوں کہ استعاذہ یعنی اللہ تعالی کی پناہ میں آنا بندہ مومن کی ایک ایسی طاقت ہے جس سے وہ مستفید ہوتا ہے۔

اور جب موسی علیہ السلام نے ان سے یہ بات کہی تو وہ موسی علیہ السلام سے گویا ہوئے: ﴿قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ﴾ "انہوں نے کہا اے موسی! دعا کیجیے کہ اللہ تعالی ہمارے لیے اس کی ماہیت بیان کر دے"، چنانچہ انہوں نے اس بات پر اکتفاء نہیں کیا کہ وہ ایک عام گائے ذبح کر دیں بلکہ انہوں نے تشدد کی راہ اپناتے ہوئے اس کی باریک صفات کی جانکاری کے پیچھے لگ گئے پس موسی علیہ السلام نے ان سے کہا: ﴿إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَٱفْعَلُوا۟ مَا تُؤْمَرُونَ﴾ "سنو! وہ گائے نہ تو بالکل بڑھیا ہو، نہ بچہ، بلکہ درمیانی عمر کی جوان ہو، اب جو تمہیں حکم دیا گیا ہے بجالاؤ"۔ یعنی نہ بہت عمر دراز ہو اور نہ بہت چھوٹی بلکہ ان دونوں کے درمیان کی ہو (عوان) سے مراد متوسط ہے، ساتھ ہی موسی علیہ السلام نے ان کو تاکید بھی کی کہ جو حکم دیا ہے اب اس کی تعمیل

کرو: ﴿فَٱفۡعَلُواْ مَا تُؤۡمَرُونَ ﴾ "اب جو تمہیں حکم دیا گیا ہے بجالاؤ"۔اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ حکم کی بجاآوری میں جلدی کریں اور تشدد برتتے ہوئے بے جا سوالات نہ کریں کیوں کہ بے جا سوالوں سے مطلوبہ حکم کے بجاآوری میں مشکل پیش آسکی ہے ،اس سے یہ مستفاد ہوا کہ تشدد اور مبالغہ آرائی عاجزی اور بے بسی کا سبب ہے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اللہ کے نبی موسی علیہ السلام کے حکم کا پاس ولحاظ نہیں رکھا: ﴿ قَالُواْ ٱدۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوۡنُهَاۚ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٞ صَفۡرَآءُ فَاقِعٞ لَّوۡنُهَا تَسُرُّ ٱلنَّٰظِرِينَ ﴾ "پھر کہنے لگے کہ دعا کیجیے کہ اللہ تعالی بیان کرے کہ اس کا رنگ کیا ہے؟ فرمایا وہ کہتا ہے کہ وہ گائے زرد رنگ کی ہے، چمکیلا اور دیکھنے والوں کو بھلا لگنے والا اس کا رنگ ہے"۔مزید انہوں نے تشدد برتا: ﴿قَالُواْ ٱدۡعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ ٱلۡبَقَرَ تَشَٰبَهَ عَلَيۡنَا وَإِنَّآ إِن شَآءَ ٱللَّهُ لَمُهۡتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٞ لَّا ذَلُولٞ تُثِيرُ ٱلۡأَرۡضَ وَلَا تَسۡقِي ٱلۡحَرۡثَ مُسَلَّمَةٞ لَّا شِيَةَ فِيهَا﴾ "وہ کہنے لگے کہ اپنے رب سے اور دعا کیجیے کہ ہمیں اس کی مزید ماہیت بتلائے، اس قسم کی گائے تو بہت ہیں پتہ نہیں چلتا، اگر اللہ نے چاہا تو ہم ہدایت والے ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ وہ گائے کام کرنے والی، زمین میں ہل جوتنے والی اور کھیتوں کو پانی پلانے والی نہیں، وہ تندرست اور بے داغ ہے"۔یعنی موسی علیہ السلام نے ان کو بتلایا کہ وہ ایسی گائے ہے جو زمین کی جوتائی بوائی نہیں کرتی اور نہ ہی اس کا شمار پانی نکالنے والی گایوں میں ہوتا ہے، نیز وہ ہر طرح کے عیب سے صحیح سالم ہے۔اب جاکر انہوں نے کہا: ﴿ قَالُواْ ٱلۡـَٰٔنَ جِئۡتَ بِٱلۡحَقِّۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُواْ يَفۡعَلُونَ ﴾ "انہوں نے کہا: اب آپ نے حق واضح کردیا گو وہ حکم برداری کے قریب نہ تھے، لیکن اسے مانا اور وہ گائے ذبح کردی"۔ان کا یہ کہنا کہ "اب آپ نے حق واضح کردیا" گویا کہ اب تک اس سے پہلے جو کچھ بتلایا وہ حق نہیں تھا۔ یہ ان کے کبر وغرور اور سرکشی کی دلیل ہے۔اس سے مستفاد ہوا کہ سہولت اور آسانی کی کافی اہمیت ہے اور یہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا منہج اور طریقہ کار تھا لہذا ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ہمیشہ ان دونوں میں سے زیادہ آسان کو اختیار کرتے، اور آپ کا یہ طرز عمل ہر مسلمان کی زندگی میں بھی ایک نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد موسی علیہ السلام نے اس گائے کی ایک ہدی لے کر اس سے مقتول کو مارنے کا حکم دیا، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ایسا کرنے پر اس مقتول کی روح واپس لوٹ آئی اور اس نے قاتل کو نامزد کیا اور پھر دوبارہ وہ مردہ حالت میں لوٹ گیا(۱)۔ اس طرح سے اللہ تعالی نے قاتل کے متعلق ان کی خفیہ پلاننگ کا پردہ فاش کر دیا، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَءْتُمْ فِيهَا وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ﴾ "جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، پھر اس میں اختلاف کرنے لگے اور تمہاری پوشید گی کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا"۔ اس میں ان کے لیے اور ان کے علاوہ دوسروں کے لیے اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالی ہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور اس کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی، اور اللہ تعالی جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے، چنانچہ اسی نے ایسا کیا کہ گائے کی ہڈی سے مقتول کو مارنے کے سبب اس کی روح لوٹ آئی، اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اسباب کو اختیار کرنا اللہ تعالی کی سنت ہے، کیوں کہ اللہ تعالی تو اس بات بھی قادر تھا کہ صرف کلمہ کن کے ذریعہ اس مقتول کی روح کو لوٹا دیتا اور وہ زندہ ہو جاتا۔ پس پاک ہے وہ اللہ جو بلند اور قدرت والا ہے۔ اس میں اہل کتاب کے لیے اس بات کی تاکید و وضاحت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور اسی طرح یہ قرآن کریم برحق ہے، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قرآن کے واسطے سے ان کے سابقہ احوال کی خبر دی حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے اور پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔

اس آیات کے فوائد میں سے ہے کہ اسی خارق العادت عظیم واقعہ کی مناسبت سے اس سورہ کا نام سورۃ البقرۃ رکھا گیا ہے، یقینا یہ واقعہ اللہ تعالی کی عظیم نشانی ہے جو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور مردہ کو زندہ کر کے اس کو بولوانے، اس کی عقل کو لوٹانے تاکہ وہ سابقہ تمام واقعات کو یاد کرے ان تمام امور پر قدرت الہی کی دلیل ہے۔ اس سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوا کہ حکم صرف اللہ تعالی کا چلتا ہے اور وہ جو چاہئے اور جیسے چاہے حکم کرتا ہے، چنانچہ اس نے مردہ کو زندہ کرنے کے لیے گائے کی ہڈی کو سبب دیا تاکہ اس سے اس مردہ کو مارا جائے اور اس میں روح لوٹ آئے۔ لہذا اس سورہ کا نام سورۃ البقرۃ رکھنا یقینا بالکل مناسب ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی اختیار اللہ تعالی ہی کا ہے۔

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۱۱۲.

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَٱلْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَإِنَّ مِنَ ٱلْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ ٱلْأَنْهَٰرُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ ٱلْمَآءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ ٱللَّهِ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٧٤﴾﴾

ترجمہ:

"پھر اس کے بعد تمہارے دل پتھر جیسے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، بعض پتھر سے تو نہریں بہہ نکلتی ہیں، اور بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے، اور بعض اللہ تعالی کے ڈر سے گر گر پڑتے ہیں، اور تم اللہ تعالی کو اپنے اعمال سے غافل نہ جانو (۷۴)"۔

اس آیت کریمہ میں بنی اسرئیل میں پیدا ہونے والی دل کی سختی کا بیان ہے کیوں کہ ایسی زبردست نشانیوں کے مشاہدے کے باوجود بھی ان پر کچھ اثر نہیں ہوا جن سے دل کانپ اور تھرّا جاتے ہیں اور انسان ایسی آیات دیکھ لینے کے بعد اللہ تعالی کے احکامات وارشادات کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل پر من وسلوی کا نزول، فرعونیوں سے نجات، دریا کو پھاڑ کر راستہ بنادینا اور ان کے دشمن فرعون اور فرعونیوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے غرق آب کرنا، ان کو مقدس سرزمین میں داخل کرنا، طور پھاڑ کو ان کے اوپر لا کھڑا کرنا، مقتول کو ان کے سامنے زندہ کرنا ان تمام چیزوں کا تقاضا تھا کہ وہ اللہ تعالی سے خوف کھاتے ہوئے اس سے محبت اور اس کے احکامات کی پابندی اور اطاعت کرتے، لیکن اطاعت وفرما برداری کے متقاضی ان تمام دلائل کے ہونے کے باوجود ان کے دل کافی سخت ہو گئے، ارشاد الہی ہے: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَٱلْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً﴾ "پھر اس کے بعد تمہارے دل پتھر جیسے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض ذہن ودماغ چاہے جس قدر بھی دلائل وبراہین دیکھ سن لیں کسی صورت میں بھی حق کو قبول نہیں کرتے، اسی طرح کچھ دلوں پر احسان وانعام کرنے والے اور ڈرانے والے کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور ایسے لوگ اگر وہ کچھ فرمابرداری کر بھی لیں تو یہ محض اپنے بچاؤ کی حد تک ہوتی ہے اور پھر وہ اپنے سابقہ انحرافات کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اور اللہ تعالی کا یہ فضل ہے کہ اس نے مومنوں کو صرف اس بات کا مکلف کیا ہے کہ وہ دوسروں کو خیر وبھلائی کی طرف ہدایت ورہنمائی کے

فرائض انجام دیتے رہیں، اور کسی کو ہدایت توفیق کا مکلف نہیں کیا کہ وہ اپنے اختیار سے کسی کو اپنا مطیع اور فرمابردار بنا سکیں بلکہ یہ خصوصیت صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے سورہ القصص میں ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ [سورة القصص: ٥٦]. "آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے بلکہ اللہ تعالی ہی جسے چاہے ہدایت کرتا ہے"۔

آیت کریمہ سے یہ مستفاد ہوا کہ جب دل سخت ہو جائے اور اس کی سختی میں شدت آجائے تو پھر وہ حق کو قبول نہیں کرتا، بلکہ اس کی سختی پتھر کی سختی سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے، کیوں کہ ان پتھروں میں بھی انسانی دل کے مقابلے میں قبولیت کی خاصیت زیادہ پائی جاتی ہے جب وہ انسانی دل بالکل سخت ہو جائیں: ﴿وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ ۚ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ "بعض پتھر سے تو نہریں بہہ نکلتی ہیں، اور بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے، اور بعض اللہ تعالی کے ڈر سے گر گر پڑتے ہیں"۔ چنانچہ بعض پتھروں سے نہریں اور چشمے بہہ نکلتے ہیں، اور بعض پتھر اللہ تعالی کے خوف سے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں جیسا کہ طور پہاڑ اللہ تعالی کی تجلی کے وقت ریزہ ریزہ ہو گیا اور اسی طرح ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب احد پہاڑ پر چڑھے تو وہ ہلنے اور حرکت کرنے لگا۔ اس سے مستفاد ہوا کہ جمادات بھی اللہ تعالی کی آیات کے خوف سے متاثر ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالی نے پتھروں کے متعلق فرمایا: ﴿وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ "اور بعض اللہ تعالی کے ڈر سے گر گر پڑتے ہیں"۔ اسی طرح سورۃ الحشر میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾ [سورة الحشر: ٢١]. "اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تو دیکھتا کہ خوف الہی سے وہ پست ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا"۔ اسی طرح جب اللہ تعالی نے جبل طور پر تجلی فرمائی تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا: ﴿فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا﴾ [سورة الأعراف: ١٤٣]. "پس جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو تجلی نے اس کے پرخچے اڑا دیئے"۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبل احد پر چڑھنے کے وقت حرکت کرنا، اور اسی طرح لکڑی کے تنے

کا رونا۔ اسی سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ بعض پتھر بعض ایسے انسانوں کے دل سے افضل ہیں جو حق کی معرفت کے بعد بھی اللہ تعالی پر ایمان نہیں لاتے۔

اس کے بعد آیت کے اختتام پر اللہ تعالی سے غفلت کی نفی کر کے اس کے علم کی تاکید کی گئی ہے کیوں کہ غفلت انسانوں کا خاصہ ہے، فرمایا: ﴿وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُونَ﴾ "اور تم اللہ تعالی کو اپنے اعمال سے غافل نہ جانو"۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالی نے اپنی ذات سے غفلت کی نفی کی جو کہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے اور نفی کے بر عکس کے اسلوب سے تعریف اور مدح میں بلاغت کا پہلو ہے کیوں کہ صفت نقص کی نفی سے مکمل طور سے صفت کمال کا استیعاب ہو گیا اور اس میں اللہ تعالی کی مدح کا بیان ایک ایسے اسلوب کے ذریعہ ہے جس میں نقص کی نفی کی گئی ہے، پس اللہ تعالی کامل اور صاحب کمال ہے اور انسان کا کوئی راز اور ان کے دلوں کی پوشیدہ نیتیں اس کے علم سے مخفی نہیں، چہ جائیکہ لوگوں کے ظاہری امور اس سے مخفی ہوں، ہر چیز اللہ تعالی کے نزدیک بالکل علانیہ اور ظاہر ہے۔

﴿أَفَتَطۡمَعُونَ أَن يُؤۡمِنُواْ لَكُمۡ وَقَدۡ كَانَ فَرِيقٞ مِّنۡهُمۡ يَسۡمَعُونَ كَلَٰمَ ٱللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُۥ مِنۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُونَ ﴿٧٥﴾ وَإِذَا لَقُواْ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ قَالُوٓاْ ءَامَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعۡضُهُمۡ إِلَىٰ بَعۡضٖ قَالُوٓاْ أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ ٱللَّهُ عَلَيۡكُمۡ لِيُحَآجُّوكُم بِهِۦ عِندَ رَبِّكُمۡۚ أَفَلَا تَعۡقِلُونَ ﴿٧٦﴾ أَوَلَا يَعۡلَمُونَ أَنَّ ٱللَّهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعۡلِنُونَ ﴿٧٧﴾﴾

ترجمہ:

"(مسلمانو!) کیا تمہاری خواہش ہے کہ یہ لوگ ایمان دار بن جائیں، حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کلام اللہ کو سن کر، عقل و علم والے ہوتے ہوئے، پھر بھی بدل ڈالا کرتے ہیں (۷۵)۔ جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو اپنی ایمان داری ظاہر کرتے ہیں، اور جب آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو کیوں وہ باتیں پہنچاتے ہو جو اللہ تعالی نے تمہیں سکھائی ہیں، کیا جانتے نہیں کہ یہ تو اللہ تعالی کے پاس تم پر ان کی حجت ہو جائے گی (۷۶)۔ کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالی ان کی پوشیدگی اور ظاہر داری سب کو جانتا ہے (۷۷)"۔

اس کے بعد خطاب کارخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منتقل ہو رہاہے ، جس میں سوالیہ اسلوب ہے اور وہ سوال بطور انکار ہے اور اس سوال میں تعجب کا پہلو بھی ہے کہ مدینہ کے یہود کی اس جماعت سے اسلام قبول کرنے کی خواہش اور توقع رکھی جائے : ﴿أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا۟ لَكُمْ﴾ "(مسلمانو!) کیا تمہاری خواہش ہے کہ یہ لوگ ایمان دار بن جائیں "۔اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان ان یہودیوں کے اسلام قبول کرنے خواہش مند تھے ،اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کاان کے اسلام کی خواہش کرنا یہ فائدہ دیتاہے کہ کافر کو جہنم سے نجات کی خواہش اس بات پر مقدم ہونی چاہئے کہ ان کو بالکل چھوڑ دیا جائے اور ان کو اسلام کی دعوت دینا ترک کردیا جائے ، بالخصوص ایسے کفار جو مسلمانوں کے آس پاس اور ارد گرد رہتے ہیں ، کیوں کہ ایسے لوگ دعوت الی اللہ کے زیادہ حق دار ہیں ،اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر مسلموں کے حق میں اسلام کے بھلائی کی محبت کو اولین مقام دیا جائے بجائے اس کے کہ ان کو کفر کی حالت میں باقی رہنے کی خواہش رکھی جائے۔اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ اگر اللہ تعالی مسلمانوں سے یہود مدینہ کے اس گروہ کی حقیقت بیان نہ کرتا تو مسلمان ان کی اصل حقیقت نہیں جان پاتے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ عمومی طور دوسروں کے ہدایت کی خواہش رکھنی چاہیے ، چنانچہ انصار مدینہ رضی اللہ عنہم کو خواہش تھی کہ یہود اسلام قبول کرلیں کیوں کہ وہ ان کے پڑوسی اور حلیف تھے(۱)۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انصار نے پڑوسی کے حق اور معاہدے کی پوری وفاداری کی ، لیکن اللہ تعالی بہت سارے ایسے حقائق سے واقف ہے جنہیں انسان نہیں جان سکتا، الا یہ کہ اللہ تعالی اس سے باخبر کرے۔

آیت کریمہ میں بالکل واضح طور پر بتادیا گیا کہ ان سے قبول اسلام کی امید ختم کرلیں ، فرمان الہی ہے: ﴿أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا۟ لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَـٰمَ ٱللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُۥ مِنۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ﴾ "(مسلمانو!) کیا تمہاری خواہش ہے کہ یہ لوگ ایمان دار بن جائیں ، حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کلام اللہ کو سن کر، عقل و علم والے ہوتے ہوئے ، پھر بھی بدل ڈالا کرتے ہیں "۔آیت کریمہ میں ان کی ایمان سے دوری کی وجہ بیان کی گئی ہے وہ یہ

(۱) تفسير القرطبي ۲/۳.

کہ ان کے اسلاف کے ایک گروہ کی حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ وہ اللہ تعالی کا کلام سنتے اور جاننے سمجھنے کے بعد اس کو بدل ڈالتے تھے، یعنی ان کے اسلاف میں ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے حق جان پہچان کر عناد اور سرکشی کی تو پھر تم کیسے ان لوگوں کے اسلام کی خواہش اور توقع رکھتے ہو کہ اس لاریب حق کی معرفت کے بعد وہ ایمان لائیں گے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ جو حق کو تسلیم نہیں کرتا ضروری نہیں کہ ایسا حق سے ناواقفیت کی بنیاد پر ہو، بلکہ بعض ایسے لوگ بھی حق کے منکر ہوتے ہیں جو حق کو یقین کے ساتھ جانتے بوجھتے ہیں، بلکہ بعض تو یقینی علم کے بعد عمدا حق میں تحریف اور تبدیلی کے مرتکب ہوتے ہیں، اس سے پتہ چلا کہ ہوا وہوس، کینہ اور کبر وغرور سے بچنا ضروری ہے کیوں کہ یہ وہ امور ہیں جو انسان کو قبول حق سے روکے رکھتے ہیں، اور جب یہ امور سب سے اہم اور عظیم چیز جس کا تعلق انسان کے انجام سے ہے اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں تو اس سے معمولی دنیاوی امور میں حق کے قبول میں کیوں کر رکاوٹ نہیں بن سکتے، جیسے تجارتی اور دیگر پیشہ وارانہ اور عام اداری امور بالخصوص ایسے امور جن سے عام لوگوں کی مصلحتیں وابستہ ہوں، اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے جوانب اور مجالات میں۔ اس لیے ضروری ہے کہ کبر وحسد اور ہوا وہوس جیسی خرابیوں سے بچا جائے کیوں کہ یہ سارے امور انسانی اور جناتی شیاطین کے ہتھیار ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی منافقین کی اس روش کو بیان کر رہا ہے جو وہ مومنوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں نیز ان کے باہمی احوال کو بھی بیان کر رہا ہے: ﴿ وَإِذَا لَقُوا۟ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوٓا۟ أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ ٱللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوكُم بِهِۦ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴾ "جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو اپنی ایمان داری ظاہر کرتے ہیں، اور جب آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو کیوں وہ باتیں پہنچاتے ہو جو اللہ تعالی نے تمہیں سکھائی ہیں، کیا جانتے نہیں کہ یہ تو اللہ تعالی کے پاس تم پر ان کی حجت ہو جائے گی"۔ اللہ تعالی ان منافقین کے احوال کی پول کھول رہا ہے کہ وہ مومنوں کے سامنے تو اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور جب اپنے بعض ساتھیوں سے اکیلے میں ملتے ہیں تو ان میں کا بعض بعض دوسرے مسلمانوں سے کہی ہوئی ان باتوں پر نکیر کرتا ہے، جو بظاہر مومنوں کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کی تصدیق اور دین اسلام کے صحیح ہونے کی بات کرتے ہیں کیوں

کہ سابقہ آسمانی کتابوں کے واسطے سے ان کو اس کا بخوبی علم ہے، اپنے اس نکیر اور اعتراض کی دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے خود ان کے خلاف حجت قائم ہو جائے گی اور اس کی وجہ سے مسلمان اللہ تعالی کے سامنے حجت پکڑیں گے کہ کیسے تم کفر کرتے رہے حالانکہ تم تو اسلام کا اظہار کیا کرتے تھے اور تم کو اسلام کی حقانیت کا بھی خوب پتہ تھا، اور تم اس دین کو صحیح اور نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا کہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ناواقف اور نابلد نہیں تھے بلکہ جان بوجھ کر ناواقفیت کا اظہار کرتے تھے تاکہ لگے کہ وہ کچھ جانتے نہیں ہیں، ان ہی کے بارے میں اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ﴾ "کیا یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالی ان کی پوشیدگی اور ظاہر داری سب کو جانتا ہے"۔ یہ سوالیہ جملہ ان کے یہاں ثابت شدہ حقیقت کے تئیں نکیر کے طور پر ہے اور ایک طرح سے اس میں ان کے لیے توبیخ اور ڈانٹ ہے۔

اس میں اللہ تعالی کے عظیم علم کا بیان ہے کہ آدمی جو کچھ ظاہر یا پوشیدہ کرتا کہتا ہے ان سب پر اللہ تعالی مطلع ہے اس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ سابقہ آیات سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ اسلام کا اظہار اور کفر کو چھپائے رکھنا منافقوں کی علامت ہے، اس لیے ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ کافروں کی دھوکہ دہی سے ہوشیار رہے اور عام معاملات میں ان کے مسلمانوں جیسے اخلاق سے بھی ہوشیار رہے، کیوں کہ یہ ایک منافقانہ رویہ اور شیطانی انداز ہے۔

﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ ٱلْكِتَٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ
لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ ٱلْكِتَٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ ٱللَّهِ لِيَشْتَرُوا۟ بِهِۦ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ
فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾ وَقَالُوا۟ لَن تَمَسَّنَا
ٱلنَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُودَةً ۚ قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ ٱللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ ٱللَّهُ عَهْدَهُۥٓ ۖ أَمْ
تَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَٰطَتْ بِهِۦ خَطِيٓـَٔتُهُۥ
فَأُو۟لَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٨١﴾ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ
أُو۟لَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٨٢﴾﴾

ترجمہ:

"ان میں سے بعض ان پڑھ ایسے بھی ہیں کہ جو کتاب کے صرف ظاہری الفاظ کو ہی جانتے ہیں اور صرف گمان اور اٹکل ہی پر ہیں (۷۸)۔ ان لوگوں کے لیے "ویل" ہے جو اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کتاب کو اللہ تعالی کی طرف کی کہتے ہیں اور اس طرح دنیا کماتے ہیں، ان کے ہاتھوں کی لکھائی کو اور ان کی کمائی کو ویل (ہلاکت) اور افسوس ہے (۷۹)۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف چند روز جہنم میں رہیں گے، ان سے کہو کہ کیا تمہارے پاس اللہ تعالی کا کوئی پروانہ ہے ؟ اگر ہے تو یقیناً اللہ تعالی اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرے گا، (ہر گز نہیں) بلکہ تم تو اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے (۸۰)۔ یقیناً جس نے بھی برے کام کئے اور اس کی نافرمانیوں نے اسے گھیر لیا، وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہے (۸۱)۔ اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں وہ جنتی ہیں جو جنت میں ہمیشہ رہیں گے (۸۲)"۔

اللہ تعالی بیان کر رہا ہے کہ بعض اہل کتاب ان پڑھ ہیں وہ لکھنا نہیں جانتے اور ان کو یہ بھی پتہ نہیں کہ جو کتاب اللہ تعالی نے ان پر اتاری ہے اس میں کیا لکھا ہوا ہے، اور وہ اللہ تعالی سے ایسی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں جن کے وہ مستحق نہیں ہیں اور ان کا سارا علم گمان اور اٹکل پر منحصر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کی کتاب میں بغیر علم کے آدمی کا کچھ بولنا کافی خطرناک عمل ہے، مثلاً یہ کہے: ایسا ناممکن ہے، فلاں چیز درست نہیں ہو سکتی، یہ جائز ہے، اور یہ ناجائز ہے یا اسی طرح کی دیگر باتیں بغیر علم کے کہنا، صرف اس لیے کہ وہ خود کو کافی سمجھ دار گمان کرتا ہے اور سوچتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے درست ہے۔

اس مذمت کے مخالف مفہوم میں علم کی مدح ہے، اسی طرح پورے علم کے ساتھ بات کہنے کی اہمیت ہے، نیز اس میں علماء اور ربانی اہل علم کے فضیلت کی دلیل بھی ہے جو کہ ہر بات علم و معرفت کی بنیاد پر کہتے ہیں نہ کہ اپنے تئیں ظن اور گمان کی بنیاد پر۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بعض لوگ اللہ تعالی کے دین کے بارے میں بھی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس لیے ایسی روش اختیار کرنے سے دور رہنا ضروری ہے اور ایک مسلمان کو بغیر علم کے کچھ کہنے یا بغیر علم کے فتوی دینے یا ایسے لوگوں کی ہدایات و توجیہات کے سننے سے جن کو دینی امور کا علم نہیں اللہ تعالی کی پناہ مانگنا چاہئے۔ اللہ تعالی کے فرمان:

﴿وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ﴾" اور وہ صرف گمان اور اٹکل ہی پر ہیں" سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ ظن علم نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایک وہم و گمان ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ بالکل یقینی علم سے ثبوت نہ فراہم ہو، اور علم کسی چیز کی اصل حقیقت کے مکمل اور پختہ ادراک کا نام ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان لوگوں کو وعید سنا رہا ہے جو اللہ تعالی کی کتاب میں تحریف کرتے ہیں اور اپنی طرف سے ایسی باتیں لکھ کر جو اللہ تعالی نے نازل نہیں فرمائی جھوٹے اور بہتان کے طور پر اللہ تعالی کی طرف منسوب کرتے ہیں اور یہ دعوی کرتے ہیں کہ یہ سب اللہ تعالی کی طرف سے ہیں اور اللہ تعالی کی مراد ہیں: ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ "ان لوگوں کے لیے "ویل" ہے جو اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کتاب کو اللہ تعالی کی طرف کی کہتے ہیں اور اس طرح دنیا کماتے ہیں"۔ ابن کثیر رحمہ اللہ آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ: یہ یہود کی ایک دوسری قسم کی جماعت ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالی پر جھوٹ باندھ کر لوگوں کو گمراہی کی دعوت دیتے ہیں اور ان کے مال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں(۱)۔ اگرچہ آیت بنی اسرائیل کے بارے میں ہے لیکن ان کے اس قصے میں ہمارے لیے نصیحت اور اس روش کے اختیار کرنے سے ڈرایا گیا ہے، کیوں کہ اب بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو انہیں لوگوں کی راہ پر گامزن ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان کے بارے میں اپنی وعید بیان کر رہا ہے، فرمایا: ﴿فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ﴾" ان کے ہاتھوں کی لکھائی کو اور ان کی کمائی کو ویل (ہلاکت) اور افسوس ہے"۔ ویل کہتے ہیں ہلاکت و بربادی کو، اور بعض اہل علم کا قول ہے کہ اس سے مراد وہ پیپ ہے جو جہنم کے بالکل نچلے حصے میں ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ جہنم کی ایک ایسی وادی کا نام ہے کہ اگر اس میں پہاڑ بھی ڈال دیے جائیں تو اس کی گرمی سے پگھل جائیں۔ اور حدیث میں وارد

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۱۲۱.

ہے: "ویل" جہنم کی ایک وادی ہے جس میں کافر اس کی گہرائی تک پہنچنے سے پہلے چالیس سال تک لڑھکتا رہے گا(۱)۔

اس آیت کریمہ میں ان کی دو کرتوت کے عذاب اور خطرناکی کا ذکر ہے جس کے وہ مرتکب ہوئے اور اللہ تعالی نے اس کی تردید کی۔ اول: ﴿ فَوَيۡلٞ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتۡ أَيۡدِيهِمۡ ﴾ " ان کے ہاتھوں کی لکھائی کو ویل (ہلاکت) اور افسوس ہے"۔ دوم: ﴿ وَوَيۡلٞ لَّهُم مِّمَّا يَكۡسِبُونَ ﴾ "ان کی کمائی کو ویل (ہلاکت) اور افسوس ہے"۔ اس میں دو سنگینی ہے ایک تو اللہ تعالی پر جھوٹ باندھنے کی الگ سنگینی اور دوسری ان آیات کے ذریعہ کمائی کرنے کی سنگینی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک عالم دین پر بہت عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اسی عظیم ذمہ داری کے عوض میں اس کا مرتبہ بھی اللہ تعالی کے یہاں عظیم ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کے حکم سے ذمہ داری کے بقدر اجر وثواب بھی زیادہ ہوتا ہے، اللہ تعالی بے نیاز اور کریم ہے وہ اس شخص کے اجر وثواب اور درجات کو ضائع نہیں کرتا جس کے کندھوں پر کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت اور حصول علم کی ذمہ داری ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان لوگوں کے اللہ تعالی کی کتاب کی توہین وتذلیل اور حقارت کا سبب اور وجہ جواز کو بیان کر رہا ہے جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالی کی آیات کے ساتھ کھلواڑ کی راہ اپنا رہے ہیں اور اس سے کمائی کر رہے ہیں، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ وَقَالُواْ لَن تَمَسَّنَا ٱلنَّارُ إِلَّآ أَيَّامٗا مَّعۡدُودَةٗ ﴾ "وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف چند روز جہنم میں رہیں گے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اپنے لیے ایسی وجہ جواز تلاش کرتا ہے جو اس کو اپنے مقاصد کو بروے کار لانے میں حوصلہ فراہم کرے اور یہ وجہ جواز بھی جھوٹ اور فریب پر مبنی ہوتی ہیں۔ غور کریں! اگر مان لیا جائے کہ ان کے لیے جہنم کا عذاب صرف چند دنوں کے لیے ہے تو کیا آدمی چند روز بھی جہنم کا عذاب برداشت کر سکتا ہے؟

---

(۱) سنن ترمذي ٥/٢٢٩-٣٠٠ حديث نمبر ٣١٦٤ یہ حديث ضعيف ہے (ضعيف الجامع حديث نمبر ٦١٤٨) اور ترغيب وترہيب کے باب مين ضعيف حديث قبول کی جاسکتی ہے۔

لیکن پھر بھی اللہ تعالی ان کے اس بہانے کی تردید کر رہا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللَّهِ عَهْدًا فَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ عَهْدَهُ ۖ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٨٠﴾ بَلَىٰ مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ "ان سے کہو کہ کیا تمہارے پاس اللہ تعالی کا کوئی پروانہ ہے؟ اگر ہے تو یقینا اللہ تعالی اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرے گا، (ہرگز نہیں) بلکہ تم تو اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے۔ یقینا جس نے بھی برے کام کئے اور اس کی نافرمانیوں نے اسے گھیر لیا، وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہے"۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ انسان بغیر علم کے کوئی بات نہ کہے اور حرام چیز کو جائز کرنے کے لیے اپنی خاطر بے جا بہانے اور وجہ جواز نہ تلاش کرے تاکہ اللہ تعالی کی آیتوں کو معمولی مفاد کے عوض فروخت کر بیٹھے، اس لیے کہ اللہ تعالی کا سامان بہت قیمتی ہے اور اس کی قیمت جنت ہے اور یہ اسی کو حاصل ہوگی جو اللہ تعالی کے اوامر واحکامات کے مطابق اسے حاصل کرنے کی کوشش کرے گا جیسا کہ اللہ تعالی پر جھوٹ باندھنے والوں کی سزا کے بیان کے بعد اللہ تعالی کا راشاد ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ " اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں وہ جنتی ہیں جو جنت میں ہمیشہ رہیں گے"۔ یہ ایک بندۂ مومن کا بدلہ ہے جو ایسے نیک اعمال انجام دیتا ہے جن کا حکم دیا گیا ہے، وہ اللہ تعالی کے احکامات کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو اپنی کمائی کا ذریعہ نہیں بناتا جس کے لیے اس کو اللہ تعالی پر جھوٹ بولنے کی ضرورت پڑے اور وہ اللہ تعالی کے عذاب کو معمولی بھی نہیں سمجھتا۔ اے اللہ تو ہمیں اپنے عذاب اور سزا سے نجات دے اور ہمیں محفوظ رکھ اس عمل سے کہ تیرے دین اور کتاب میں بغیر علم کے کوئی بات کہیں۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾﴾

ترجمہ:

"اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا کہ تم اللہ تعالی کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اسی طرح قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور لوگوں کو اچھی باتیں کہنا، نمازیں قائم رکھنا اور زکاۃ دیتے رہا کرنا، لیکن تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ تم سب پھر گئے اور منہ موڑ لیا(۸۳)"۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان ہے کہ اللہ تعالی نے بنی اسرائیل سے صرف اپنی عبادت کا اور شرک نہ کرنے کا پکا وعدہ لیا، اسی طرح والدین، قرابت دار، یتیم اور مسکین سب کے ساتھ احسان کرنے کا بھی وعدہ لیا اور یہ بھی کہ لوگوں سے بھلی بات کہیں یعنی نیکی کا حکم کریں اور برائی سے روکیں ان کے ساتھ نرمی اور بھلے انداز میں گفتگو کریں، نیز نماز کی پابندی اور زکاۃ کی ادائیگی کریں، اس آیت میں ان تمام امور کا بیان ہے۔ اس آیت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کے احکامات دین کے تمام اصولوں کو شامل ہیں جن کی بنیاد اللہ تعالی کی عبادت، توحید خالص اور شرک کی نفی پر ہے: ﴿لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا ٱللَّهَ﴾ "تم اللہ تعالی کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کرنا"۔ یہ بالکل صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ تمام عبادات صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کے لیے انجام دی جائیں۔ اسی طرح اس آیت میں حسن اخلاق اور دوسروں کے ساتھ احسان کی بھی تعلیم ہے: ﴿وَبِٱلْوَٰلِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَقُولُوا۟ لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ "اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، اسی طرح قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور لوگوں کو اچھی باتیں کہنا"، نیز یہ آیت عبادات کو بھی شامل ہے جن میں سے نماز اور زکاۃ کا بطور خاص ذکر ہے: ﴿وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ﴾ "نمازیں قائم رکھنا اور زکاۃ دیتے رہا کرنا"۔

اس آیت میں حقوق اللہ یعنی توحید کا بیان ہے جو کہ اسی وقت متحقق ہو سکتی ہے جب تمام عبادتوں کو صرف اسی ایک اللہ کے لیے انجام دیا جائے جس کا کوئی شریک نہیں اور اللہ تعالی پر ایمان کا تقاضا ہے کہ رسولوں اور نبیوں پر بھی ایمان لایا جائے، جو کتابیں دے کر بھیجے گئے ان پر بھی ایمان لایا جائے اور کتابوں پر ایمان کا تقاضا ہے کہ جو ان کتابوں کو لے کر نازل ہوئے ان پر بھی ایمان ہو اور وہ اللہ تعالی کے مکرم فرشتے ہیں۔ اس طرح سے اللہ تعالی کی خالص اور صحیح عبادت سے لازمی طور پر ایمان کے دیگر ارکان کو

بھی ماننا پڑتا ہے اگر چہ الگ سے اس کا ذکر نہیں کیا گیا کیوں کہ یہ ارکان، توحید اور عبادت کا لازمی حصہ اور ان کی دلیل ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں توحید کی ضد شرک کی سنگینی کا بیان ہے اور یہ کہ عبادت صرف اس اللہ کے لیے خالص ہونا چاہیے جس کا کوئی شریک نہیں: ﴿لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا ٱللَّهَ﴾ " تم اللہ تعالی کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کرنا"۔ اور جو کوئی اللہ تعالی کے ساتھ کچھ بھی شریک ٹھہرائے اس نے وہ توحید نہیں مانی جس کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے۔

پھر آیت میں والدین کا حق واضح کیا گیا ہے جس میں ان کے ساتھ عمومی طور پر احسان کرنے کا حکم ہے اور اس میں احسان کے تمام انواع واقسام اور کیفیات شامل ہیں، چنانچہ احسان کے ایک لفظ سے احسان کی من جملہ ساری تفصیلات سے بے نیازی ہو گئی اور ایسے تمام امور سے اجتناب بھی لازم ٹھہرا جو احسان کے منافی ہیں چاہے ان کا تعلق قول سے ہو یا فعل سے یا احسان کی کسی صورت کو چھوڑنا ہو۔ اور یہ طرز بیان کی باریکی ہے کہ احسان کا لفظ انعام سے زیادہ عام ہے اور یہ عدل سے اوپر کا درجہ ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عزت واکرام میں مبالغہ کا نام ہے، کیوں کہ عدل تو واجب ہے ہی، البتہ احسان عدل سے آگے بڑھ کر فضل وکرم میں مبالغہ کا نام ہے اور یہ احسان والدین کے حق میں واجب ہے، بایں طور کہ یہ احسان، فضل واستحباب سے نکل کر واجب کے درجے میں داخل ہو گیا کیوں کہ یہ اللہ تعالی کا حکم ہے، اس لیے اولاد کو ممکن حد تک ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنی چاہیے۔ اس سے واضح ہوا کہ والدین کے حقوق کافی حد تک بلند ہیں اور بڑھ چڑھ کر ان حقوق کی مکمل ادائیگی کرنی ہے اور اس کے کمال کی کوئی حد نہیں ہے، بالخصوص اس لیے کہ اس کا حکم دینے والا اللہ تعالی ہے جو خالق اور فضل وکرم والا ہے۔ اس حکم الہی میں اللہ تعالی کی طرف سے والدین کی عزت وتکریم اور ان کے ساتھ اس کی خاص عنایت ہے، اس میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کے تعلق سے اسلامی اخلاقیات اور عظیم ہدایات کا بیان ہے اور یہ اس دین اور اس کی اخلاقی تعلیمات کے مکمل ہونے کی دلیل ہے، نیز اللہ تعالی کی رحمت، برکت اور فضل کا ثبوت بھی۔ اس میں قرآن مجید کی بلاغت اور بیان کا اعجاز ہے، بلکہ اس آیت کا ہر ہر لفظ اپنے لفظی دلالت ومفہوم کے اعتبار سے ایک معجزہ ہے بایں طور کہ مختصر الفاظ وعبارت کے ذریعہ ڈھیر سارے عظیم مفاہیم کو تعبیر کر دیا گیا۔ اس آیت کریمہ سے حقوق والدین کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کیوں کہ اللہ تعالی نے من جملہ

قرابت داروں میں سے والدین کا الگ سے خصوصی طور پر ذکر کیا ہے جب کہ قرابت دار میں والدین بھی شامل ہیں ، نیز حقوق والدین کی اہمیت اور حق اولیت کی ترتیب کے پیش نظر ان کو قرابت دار اور دیگر لوگوں کے حقوق سے پہلے ذکر کیا۔

آیت کریمہ میں قرابت داروں کے حقوق کا اجمالا بیان ہے اور صاحب عقل و خرد سے یہ مخفی نہیں کہ قرابت دار کے درجات کی بھی ترتیب ہے اس لیے اس کے عمومی بیان پر اکتفاء کیا گیا اور تفصیل کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے بعد اخلاقی تعلیمات کا دائرہ یتیموں اور مسکینوں تک دراز ہوتا ہے ، پھر تمام انسانوں تک: ﴿وَقُولُواْ لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ " اور لوگوں کو اچھی باتیں کہنا"۔ لازمی طور پر اس میں تمام مکارم اخلاق شامل اور نازیبا اخلاقیات کی نفی ہو جاتی ہے ، اس میں دوسرے کے حقوق کی حفاظت کا حکم بھی ہے کیوں کہ حقوق کی حفاظت احسان کا حصہ ہے اور حقوق کی پامالی یا اس میں ظلم و زیادتی احسان کے منافی ہے۔ اور عام لوگوں میں سے یتیموں اور مسکینوں کا بالخصوص اور ان عام لوگوں سے پہلے ذکر کرنا ان کے اہم ہونے اور ان کے ساتھ عنایت کی دلیل ہے ، کیوں کہ شریعت نے ان کا خصوصی ذکر کر کے لوگوں کو ان کی توجہ دلائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے خصوصی ذکر سے اس چیز کے تئیں مزید عنایت برتنے پر آگاہی مقصود ہوتی ہے۔ نیز ان کا خصوصی ذکر اس لیے بھی کیا گیا ہے کیوں کہ ایک اچھی زندگی کی ضروریات کے حصول سے وہ عاجز و مجبور ہوتے ہیں ، مثلا: اشیائے خورد و نوش کی فراہمی ، توجیہ وارشاد اور حفظ رعایت وغیرہ۔ یہ آیت کریمہ اپنے لفظی طرز بیان اور مختصر الفاظ میں مختلف قسم کے تشریعی احکامات و مفاہیم کے شمول کے اعتبار سے ایک معجزہ ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اس شریعت کے اصولوں کی تطبیق کے متعلق بنی اسرائیل کا رویہ بیان کر رہا ہے: ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ﴾ " لیکن تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ تم سب پھر گئے اور منہ موڑ لیا"۔ یعنی ان میں سے کچھ لوگوں کو چھوڑ کر سب نے ان واجبات کی ادائیگی سے اعراض کیا۔ اس میں بعد والوں کے لیے وارننگ ہے کہ تم بھی ان کے جیسے نہ ہو جانا ، اسی طرح یہ ایک نصیحتی پیغام بھی ہے جو ڈائرکٹ تو نہیں بیان کیا گیا ہے لیکن آدمی اسے محض اس آیت کے سننے یا پڑھنے سے سمجھ جاتا ہے۔

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَٰقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَٰرِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ أَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَٰرِهِمْ تَظَٰهَرُونَ عَلَيْهِم بِٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَٰرَىٰ تُفَٰدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ ٱلْكِتَٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْىٌ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰٓ أَشَدِّ ٱلْعَذَابِ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٨٥﴾ أُو۟لَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشْتَرَوُا۟ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا بِٱلْءَاخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ ٱلْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٨٦﴾﴾

ترجمہ:

"اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا کہ آپس میں خون نہ بہانا (قتل نہ کرنا) اور آپس والوں کو جلاوطن نہ کرنا، تم نے اقرار کیا اور تم اس کے شاہد بنے (۸۴)۔ لیکن پھر بھی تم نے آپس میں قتل کیا اور آپس کے ایک فرقے کو جلاوطن بھی کیا اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ان کے خلاف دوسروں کی طرفداری کی، ہاں جب وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئے تو تم نے ان کے فدیے دیئے، لیکن ان کا نکالنا جو تم پر حرام تھا (اس کا کچھ خیال نہ کیا) کیا بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ تم میں سے جو بھی ایسا کرے، اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو کہ دنیا میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی مار، اور اللہ تعالی تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں (۸۵)۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے خرید لیا ہے، ان کے نہ تو عذاب ہلکے ہوں گے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی (۸٦)"۔

آیت کریمہ میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ تعالی نے بنی اسرائیل سے آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانے اور ایک دوسرے کو ان کے وطن سے نہ نکالنے کا پکا وعدہ لیا، اور پھر ان لوگوں نے اس وعدہ کی معرفت کا اقرار کر کے قبول بھی کیا اور خود پر اس کے گواہ بھی بنے، اور یہی ان کے دین کی بنیادی تعلیم تھی۔

چنانچہ اللہ تعالی نے رسول صلی اللہ علیہ سلم کے زمانے کے مدینہ میں موجود یہود کی حالت بیان کرتے ہوئے ان پر نکیر کی ہے کیوں کہ وہ اپنی کتاب کی مخالفت میں قتل وجدال کے ارتکاب کرتے ہوئے ہمیشہ اوس اور خزرج دو قبیلوں سے برسرپیکار رہے ،اور یہی دو قبیلے والے قبول اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کے بعد انصار کہلائے ، واقعہ یوں ہے کہ اوس اور خزرج زمانہ جاہلیت میں بت سرست تھے اور ان دو قبیلوں کے بیچ کافی جنگیں ہوتی رہتی تھیں ، اور یہود مدینہ کے اس وقت تین قبیلے تھے : بنی قینقاع اور بنی نضیر اور یہ دونوں قبیلے خزرج کے حلیف تھے ،اور تیسرا قبیلہ بنی قریظہ اوس کا حلیف تھا، جب ان کے بیچ جنگ چھڑتی تو ہر فریق اپنے حلیف کے ساتھ جنگ کرتا اور پھر بسا اوقات ایسا ہوتا کہ ایک یہودی اپنی ہی مذہب کے دوسرے یہودی کو جو کہ دوسرے گروہ میں ہوتا قتل کرتا ، جب کہ ان کے دین اور کتاب کی نصوص کی رو سے ایسا کرنا ان کے لیے حرام تھا، نیز وہ دوسرے یہود کو ان کے گھروں سے نکال بھی دیتے اور ان کے گھروں کا سارا اثاثہ لوٹ لیتے۔اسی سلسلے میں اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَٰقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَٰرِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ﴾ "اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا کہ آپس میں خون نہ بہانا(قتل نہ کرنا)اور آپس والوں کو جلاوطن نہ کرنا، تم نے اقرار کیا اور تم اس کے شاہد بنے"۔ پھر جب جنگ ختم ہو جاتی تو تورات کے حکم پر عمل کرتے ہوئے قیدیوں کو چھڑا لیتے(١) ۔اور اس طرح سے قیدیوں کے بدلے فدیہ کی ادائیگی میں تو وہ تورات کی موافقت کرتے اور قتال وخونریزی اور آپس میں ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نکالنے میں توارات کی مخالفت کرتے ، فرمایا: ﴿ثُمَّ أَنتُمْ هَٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُونَ أَنفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم مِّن دِيَٰرِهِمْ تَظَٰهَرُونَ عَلَيْهِم بِٱلْإِثْمِ وَٱلْعُدْوَٰنِ وَإِن يَأْتُوكُمْ أُسَٰرَىٰ تُفَٰدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ﴾ "لیکن پھر بھی تم نے آپس میں قتل کیا اور آپس کے ایک فرقے کو جلاوطن بھی کیا اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ان کے خلاف دوسروں کی طرفداری کی ،ہاں جب وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئے تو تم نے ان کے فدیے دیئے، لیکن ان کا نکالنا جو تم پر حرام تھا(اس کا کچھ

---

(١) تفسير ابن كثير ١/١٢٥.

خیال نہ کیا)"۔اس میں جنگ کے بعد قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانے پر نکیر اور ڈانٹ پلائی گئی ہے کیوں کہ ان کو گھروں سے نکالنااور آپس میں قتل وخونریزی کرناہی سرے سے ان پر حرام تھا۔

اس سے شریعت الٰہی کی عظمت کا پتہ چلتا ہے جس میں جان کی حفاظت کے ساتھ، ناحق طور پر خوں ریزی، سماج میں فساد، کمزروں پر طاقتور بن کر ظلم وزیادتی کی ترویج، مال ضبطی، گھروں سے اخراج، کمزور اور اس کے گھر والوں سے کھلواڑ ان تمام امور سے ممانعت ہے، اور اکثر ان امور سے سماج اور معاشرے کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ اللہ تعالی کے دین کے بعض احکامات پر عمل اور بعض سے اعراض کرکے دین کے ساتھ کھلواڑ کرنا کافی سنگین گناہ ہے، یعنی اپنی مرضی سے جس پر چاہیں عمل کریں اور جسے چاہیں چھوڑ دیں، یقینا ایسا کرنا جاہل یہودیوں کی روش ہے: ﴿أَفَتُؤۡمِنُونَ بِبَعۡضِ ٱلۡكِتَٰبِ وَتَكۡفُرُونَ بِبَعۡضٍ﴾ "کیا بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟"۔

﴿تَقۡتُلُونَ أَنفُسَكُمۡ﴾ کے لفظ سے قرآن کریم کی یہ تعبیر تلاوت کرنے والے اور سننے والے کے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے، گویا انسان خود اپنے کو قتل کر رہا ہو، یہاں پر (يَقْتُلُ بَعْضكم بَعْضًا) کی تعبیر نہیں استعمال کی گئی بلکہ ﴿تَقۡتُلُونَ أَنفُسَكُمۡ﴾ کہا گیا، تاکہ انسان میں یہ احساس پیدا ہو کہ اگر وہ کسی کا ناحق طور پر قتل کرتا ہے تو اندوہناک طریقے سے ایک بے قصور جان برباد کرکے گویا خود کو قتل کرتا ہے، ایک ایسی جان جس کو بلاوجہ ناحق قتل کرنا حرام ہے۔ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ایسا اس لیے کہا گیا ہے کیوں کہ کسی ایک ملت کے تمام افراد کی حیثیت ایک جان کی طرح ہوتی ہے(١)۔ جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "تمام مومن باہمی رحم وکرم، محبت اور ہمدردی میں ایک جسم وجان کے مانند ہیں، جب جسم کے کسی ایک حصے کو تکلیف ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے پورا جسم شب بیداری اور بخار سے مبتلا ہو جاتا ہے"(٢) ۔

---

(١) مرجع سابق.

(٢) صحيح بخاري ٩٣/٤ حديث نمبر ٦٠١١.

﴿تَقۡتُلُونَ أَنفُسَكُمۡ﴾ کے لفظ میں بہت ہی مؤثر اشاریہ ہے، چنانچہ ایک ملت کے سبھی افراد جسد واحد کے مانند ہیں، ان میں جب کوئی فرد ناحق قتل ہوتا ہے تو گویا قتل کرنے والے نے اپنے جسم کا کوئی حصہ کاٹ دیا ہو، اور ظاہر ہے ایسا کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں، اس لیے تمام مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ آپس میں خود کو اسی نظریے سے دیکھیں کہ گویا وہ ایک ہی جسم کا حصہ ہیں جس کے کسی حصہ کو کاٹنا یا برباد کرنا اس کو اپاہج بنا دینا ہے اور ایسا کرنا انسان کے لیے کافی اندوہناک عمل ہے، یا اس جسم کے مانند ایک متحد ملت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوشش کرنا تاکہ وہ سب کٹ کر الگ الگ ہو جائیں اور پھر ہر کوئی ایک دوسرے پر ظلم وستم کی راہ کھول دے اور آپسی قتل وخوں ریزی اور مال وعزت کی پامالی تک نوبت پہنچ جائے۔

یہاں پر قرآن کریم کی تلاوت کرنے والے کو یہ اشارہ ملتا ہے کہ انتشار پیدا کرنے کے جرم کی خطرناکی کے لیے قرآن میں کتنی باریک اور عمدہ تعبیر وتوصیف کی ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَتُخۡرِجُونَ فَرِيقًا مِّنكُم﴾ "اور آپس کے ایک فرقے کو جلاوطن بھی کیا"۔ (منکم) کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کل سے جزء کو جدا کیا گیا ہے، گویا انہوں نے گروہ سے ان کو کاٹ کر پہلے الگ کیا اور پھر مجموعے سے کاٹے ہوئے اس جزء کے خلاف ظلم وزیادتی اور گناہ میں دوسروں کی طرف داری بھی کی، حالانکہ اس حصے کے ساتھ ایسا کرنا حرام ہے۔ چنانچہ دل کو جوش دلانے کے لیے اس وصف سے بلیغ اور کون سی تعبیر ہو سکتی ہے جس کے مفاہیم ومعانی دل میں جا کر جاگزیں اور پیوست ہو جائیں۔

یہود کے پاس موجود تورات کے احکامات کے متعلق اللہ تعالی کا یہ خبر دینا ان یہود کے لیے اور ان کے علاوہ دوسروں کے لیے قرآن کریم کے اللہ تعالی کا کلام ہونے کی دلیل اور ثبوت ہے، اور یہ کہ اس کو لانے والا اللہ کا رسول ہے، لہذا محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقینا ہمارے رب تبارک وتعالی کے پاس سے بھیجے ہوئے رسول اور نبی ہیں، کیوں کہ اگر وہ اللہ تعالی کے نبی اور رسول نہ ہوتے تو ان کی کتابوں میں موجود تفاصیل کی اتنی باریکی کے ساتھ کیسے خبر دیتے۔

آیت کے من جملہ فوائد میں سے ہے کہ مخالف کا مقابلہ اس کے تئیں تسلیم شدہ ومعروف حقائق سے کرنا چاہیے جس کا وہ انکار نہ کر سکے، حجت قائم کرنے کا یہ انتہائی مضبوط طریقہ ہے اور یہ طریقہ قرآن

کریم میں موجودہ صورت حال کو پیش کرکے اس عمل کی نکیر کے سیاق میں استعمال ہوا ہے :
﴿أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ ٱلْكِتَٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ﴾ "کیا بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟"۔تاکہ اس سیاق کے فورا بعد وہ سزا سنائی جائے جن کا سامنا ہر اس شخص کو کرنا ہوگا جو ان گھناؤنی نافرمانیوں کا ارتکاب کرتا ہے ،اور اس سزا کا بیان بھی ابھارنے والے استفہامیہ اسلوب سے شروع کیا گیا ہے ، فرمایا: ﴿فَمَا جَزَآءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰٓ أَشَدِّ ٱلْعَذَابِ﴾ "تم میں سے جو بھی ایسا کرے،اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو کہ دنیا میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی مار"۔چنانچہ سزا کا بیان پہلے استفہامیہ پیرائے میں ہوا اور پھر اس کے بعد اس کا جواب دیا گیا تاکہ عقل وشعور بگڑی روش کے سدھار پر آمادہ ہو۔﴿فَمَا جَزَآءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰٓ أَشَدِّ ٱلْعَذَابِ﴾ "تم میں سے جو بھی ایسا کرے ، اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو کہ دنیا میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذاب کی مار"۔یعنی دنیاوی زندگی کی سزا یہ ہے کہ ان کو ذلت ورسوائی ہاتھ لگتی ہے اور یہ تو لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔رہا قیامت کا دن تو وہاں پر بھی ان کو سخت عذاب ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں ذلت ورسوائی ایک طرح کا عذاب ہے کیوں کہ آدمی کو اس کی وجہ سے کافی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے اور بہت کچھ برا بھلا سننا پڑتا ہے جس سے وہ لوگوں کے بیچ کافی تکلیف محسوس کرتا ہے۔اس سے اس بات کی تاکید ہوتی ہے کہ دونوں طرح کے عذاب الٰہی سے بچ بچاؤ انتہائی ضروری ہے: ایک تو دنیا میں ذلت ورسوائی کا عذاب اور دوسرے آخرت میں جہنم کا شدید عذاب۔اللہ تعالی نافرمان کو دنیا میں انتہائی برے طریقے سے عار دلاکر رسوا کرتا ہے اور پھر اس کی زندگی اجیرن اور بد مزہ بنا دیتا ہے،اور دنیاوی سعادت سے اس کو محروم کرکے آخرت کے عذاب کا مستحق قرار دیتا ہے۔اس کے بعد آیت کا اختتام اللہ تعالی کے اس فرمان سے ہو رہا ہے: ﴿وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ "اور اللہ تعالی تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں"۔چنانچہ اللہ تعالی نے اپنی ذات سے غفلت کی نفی کی ہے جو غفلت کہ انسان کا خاصہ ہے۔یہ نفی اللہ تعالی کی مدح وثنا کا فائدہ دیتی ہے، کیوں کہ غفلت کی نفی اس کے

کمال ضد کی دلیل ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿لَا تَأۡخُذُهُۥ سِنَةٞ وَلَا نَوۡمٞ﴾ " جسے نہ اونگھ آئے نہ نیند"۔ کیا ہی خوبصورت ہے اللہ کی کتاب!

اس کے بعد اللہ تعالی ایسی کرتوت والوں کی صفت بیان کر رہا ہے: ﴿أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشۡتَرَوُاْ ٱلۡحَيَوٰةَ ٱلدُّنۡيَا بِٱلۡأٓخِرَةِ﴾ "یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے خرید لیا ہے"۔ یعنی ان اعمال کا ارتکاب کرنے والوں کی صفت ان کی ہے جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور آخرت کے بدلے دنیا خرید لیتے ہیں، گویا کہ وہ دنیا کے حصول اور آخرت پر ترجیح کے لیے ایک قیمت ادا کرتے ہیں اور وہ قیمت آخرت کی حیات جاویدانی کی شکل میں چکانی پڑتی ہے اور بدلے میں ایک ناپائیدار دنیا ہاتھ آتی ہے، تو بھلا اس سے بڑا خسارہ اور نقصان اور کیا ہو سکتا ہے جس کی قیمت ایک جانتا بوجھتا شخص ادا کرتا ہے جس کو اس دنیا کی بے ثباتی کا بخوبی علم ہے اور اس خسارہ کی حقیقت بالکل ڈھکی چھپی نہیں۔ آیت کریمہ اس وصف بیانی کے ذریعہ صاحب عقل و خرد کے شعور کو بیدار کر رہی ہے کہ وہ ایسے عمل کا ارتکاب نہ کریں۔ اور اس کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ایک مومن گناہوں کے تئیں بیدار رہے کیوں کہ یہ گناہ قیمت ہے جسے دنیا کے حصول کے لیے آخرت کے حصے میں سے چکانی پڑتی ہے، لہذا اس سے بڑا خسارہ اور کیا ہو سکتا ہے، خاص طور سے جب سیاق خرید و فروخت کی صورت میں ہو، پس یہ دنیا آخرت کے لیے تجارت گاہ ہے جس میں فائدے مند اور نقصان اٹھانے والے دونوں طرح کے لوگ ہیں۔ اس کے بعد آیت کے اختتام میں اللہ تعالی اس کرتوت کے مرتکب کا انجام بیان کر رہا ہے، فرمان الہی ہے: ﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ ٱلۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنصَرُونَ﴾ "ان کے نہ تو عذاب ہلکے ہوں گے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی"۔ یہ شدید قسم کی وعید ہے کہ ﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ ٱلۡعَذَابُ﴾ "نہ تو ان کے عذاب ہلکے ہوں گے"۔ اور کوئی شخص نہ ان کی مدد کرے گا اور نہ ان کو اس رسوا کن عذاب سے نجات دلا سکے گا: ﴿وَلَا هُمۡ يُنصَرُونَ﴾ " اور نہ ان کی مدد کی جائے گی"۔

﴿وَلَقَدۡ ءَاتَيۡنَا مُوسَى ٱلۡكِتَٰبَ وَقَفَّيۡنَا مِنۢ بَعۡدِهِۦ بِٱلرُّسُلِۖ وَءَاتَيۡنَا عِيسَى ٱبۡنَ مَرۡيَمَ ٱلۡبَيِّنَٰتِ وَأَيَّدۡنَٰهُ بِرُوحِ ٱلۡقُدُسِۗ أَفَكُلَّمَا جَآءَكُمۡ رَسُولُۢ بِمَا لَا تَهۡوَىٰٓ أَنفُسُكُمُ ٱسۡتَكۡبَرۡتُمۡ فَفَرِيقٗا

كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾ وَقَالُوا۟ قُلُوبُنَا غُلْفٌۢ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ ٱللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ
﴿٨٨﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَٰبٌ مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا۟ مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى
ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوا۟ كَفَرُوا۟ بِهِۦ ۚ فَلَعْنَةُ ٱللَّهِ عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٨٩﴾
بِئْسَمَا ٱشْتَرَوْا۟ بِهِۦٓ أَنفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُوا۟ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ
عَلَىٰ مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ ۖ فَبَآءُو بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ ۚ وَلِلْكَٰفِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٩٠﴾ وَإِذَا
قِيلَ لَهُمْ ءَامِنُوا۟ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُوا۟ نُؤْمِنُ بِمَآ أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَآءَهُۥ وَهُوَ
ٱلْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنۢبِيَآءَ ٱللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾
وَلَقَدْ جَآءَكُم مُّوسَىٰ بِٱلْبَيِّنَٰتِ ثُمَّ ٱتَّخَذْتُمُ ٱلْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَنتُمْ ظَٰلِمُونَ
﴿٩٢﴾ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَٰقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ ٱلطُّورَ خُذُوا۟ مَآ ءَاتَيْنَٰكُم بِقُوَّةٍ
وَٱسْمَعُوا۟ ۖ قَالُوا۟ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا۟ فِى قُلُوبِهِمُ ٱلْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ
بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِۦٓ إِيمَٰنُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾

ترجمہ:

"ہم نے (حضرت) موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے پیچھے اور رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روشن دلیلیں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کروائی۔ لیکن جب کبھی تمہارے پاس رسول وہ چیز لائے جو تمہاری طبیعتوں کے خلاف تھی، تم نے جھٹ سے تکبر کیا، پس بعض کو تو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل بھی کر ڈالا (۸۷)۔ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف والے ہیں، نہیں نہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں اللہ تعالیٰ نے ملعون کر دیا ہے، ان کا ایمان بہت ہی تھوڑا ہے (۸۸)۔ اور ان کے پاس جب اللہ تعالیٰ کی کتاب ان کی کتاب کو سچا کرنے والی آئی، حالانکہ پہلے یہ خود (اس کے ذریعہ) کافروں پر فتح چاہتے تھے تو باوجود آ جانے اور باوجود پہچان لینے کے پھر کفر کرنے لگے، اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کافروں پر (۸۹)۔ بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا، وہ ان کا کفر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ چیز کے ساتھ محض اس بات سے جل کر کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل اپنے جس بندے پر چاہا نازل

فرمایا،اس کے باعث یہ غضب پر غضب کے مستحق ہوگئے اور ان کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے (۹۰)۔اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالی کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لاؤ تو کہہ دیتے ہیں کہ جو ہم پر اتاری گئی اس پر ہمارا ایمان ہے۔ حالانکہ اس کے بعد والی کے ساتھ جو ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے، کفر کرتے ہیں، اچھا ان سے یہ تو دریافت کریں کہ اگر تمہارا ایمان پہلی کتابوں پر ہے تو پھر تم نے اگلے انبیاء کو کیوں قتل کیا(۹۱)؟۔ تمہارے پاس تو موسی یہی دلیلیں لے کر آئے لیکن تم نے پھر بھی بچھڑا پوجا، تم ہو ہی ظالم (۹۲)۔جب ہم نے تم سے وعدہ لیا اور تم پر طور کو کھڑا کر دیا(اور کہہ دیا) کہ ہماری دی ہوئی چیز کو مضبوط تھامو اور سنو۔ تو انہوں نے کہا، ہم نے سنا اور نافرمانی کی، اور ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت (گویا) پلادی گئی بسبب ان کے کفر کے۔ان سے کہہ دیجیے کہ تمہارا ایمان تمہیں برا حکم دے رہا ہے، اگر تم مومن ہو(۹۳)"۔

اللہ تعالی بنی اسرائیل پر اس بات کا احسان جتلا رہا ہے کہ اس نے کلیم اللہ موسی علیہ السلام کو ان کے لیے رسول بنا کر بھیجا اور پھر ان کے بعد مسلسل رسول آتے رہے یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے آخری نبی حضرت عیسی علیہ السلام آئے جن کی اللہ تعالی نے روح القدس جبریل علیہ السلام سے تائید فرمائی(۱): ﴿وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا مُوسَى ٱلْكِتَٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنۢ بَعْدِهِۦ بِٱلرُّسُلِ ۖ وَءَاتَيْنَا عِيسَى ٱبْنَ مَرْيَمَ ٱلْبَيِّنَٰتِ وَأَيَّدْنَٰهُ بِرُوحِ ٱلْقُدُسِ﴾ "ہم نے (حضرت) موسی کو کتاب دی اور ان کے پیچھے اور رسول بھیجے اور ہم نے عیسی ابن مریم کو روشن دلیلیں دیں اور روح القدس سے ان کی تائید کروائی"۔

یہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالی کا فضل واحسان ہے کہ اس نے موسی علیہ السلام کو ان کا نبی بنا کر بھیجا اور پھر ان کے پاس پے درپے رسول آتے رہے اور ان رسولوں کا یہ سلسلہ حضرت عیسی علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے۔اس آیت کریمہ سے یہ مستفاد ہوا کہ اللہ تعالی جس کو چاہتا ہے اپنی تائید وعنایت سے تقویت دیتا ہے، اور تائید کی انہی صورتوں میں سے ہے کہ اللہ تعالی نے حضرت عیسی علیہ السلام کی جبریل علیہ السلام جیسے فرشتے کے ذریعہ تائید کی۔

---

(۱) تفسير ابن السعدی ۱/۷۵.

پھر اللہ تعالی ان معزز رسولوں کے ساتھ بنی اسرائیل کے رویے کو بیان کر رہا ہے: ﴿أَفَكُلَّمَا جَآءَكُمۡ رَسُولُۢ بِمَا لَا تَهۡوَىٰٓ أَنفُسُكُمُ ٱسۡتَكۡبَرۡتُمۡ فَفَرِيقٗا كَذَّبۡتُمۡ وَفَرِيقٗا تَقۡتُلُونَ﴾ "لیکن جب کبھی تمہارے پاس رسول وہ چیز لائے جو تمہاری طبیعتوں کے خلاف تھی، تم نے جھٹ سے تکبر کیا، پس بعض کو تو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل بھی کر ڈالا"۔

معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل میں رسولوں کی تکذیب کرنے والے لوگ بھی تھے اتنا ہی نہیں بلکہ ان میں ایسے بھی تھے جنھوں نے غرور نفس اور ہدایت لانے والوں پر اپنی برتری کے زعم میں نبیوں کو قتل کیا اور یہ محض اس لیے کہ وہ ہدایات ان کی خواہشات نفسانی کے خلاف تھیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہوا پرستی کبر و غرور کا سبب ہے اور یہی کبر و غرور قبول حق کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔اس بیان میں لوگوں کے لیے ہوا پرستی کی سنگینی کے متعلق ایک وارننگ ہے جو انسان کو اللہ کے رسول خاتم النبیین والمرسلین محمد بن عبد اللہ کی اتباع اور پیروی سے روک دیتی ہے۔

اس کے بعد مزید ان کے اس کفر و معصیت اور انحراف کا سبب بیان کیا جا رہا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَقَالُواْ قُلُوبُنَا غُلۡفُۢ﴾ "یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف والے ہیں"۔یعنی ان کے دل ڈھکے ہوئے ہیں جو کچھ سمجھ نہیں سکتے (۱) ۔یعنی ہم نہ تو ہم کچھ سمجھتے ہیں اور نہ ہی ہمارے ذہن میں باتیں محفوظ رہتی ہیں (۲)۔یہ ان کے جھوٹے اور خود ساختہ بہانوں کی خطرناکی کا بیان ہے اور ایسے بہانے انسان اسی وقت تلاش کرتا ہے جب وہ اپنی خواہش نفس کے ساتھ چل پڑتا ہے، اللہ تعالی ان کے لیے بطور سزا ارشاد فرماتا ہے: ﴿بَل لَّعَنَهُمُ ٱللَّهُ بِكُفۡرِهِمۡ فَقَلِيلٗا مَّا يُؤۡمِنُونَ﴾ "نہیں نہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں اللہ تعالی نے ملعون کر دیا ہے، ان کا ایمان بہت ہی تھوڑا ہے"۔یعنی اللہ تعالی نے ان کے کفر کی وجہ سے انہیں اپنی رحمت اور خیر و بھلائی سے بہت دور کر دیا ہے، اس لیے ان میں بہت کم لوگ ایمان لانے والے ہیں (۳)۔اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ ان کا ایمان بہت کم ہے (۱)۔

---

(۱) تفسیر جلالین ۱۳.

(۲)تفسیر ابن کثیر ۱۲۸/۱.

(۳) مرجع سابق.

بنی اسرائیل کے رویے کے متعلق اس قرآنی تبصرے سے لوگوں کو ڈرانا مقصد ہے تاکہ وہ بھی کہیں یہی روش نہ اختیار کریں جس کا انجام اور نتیجہ اللہ تعالی کی رحمت سے دوری ہے اور پھر اللہ تعالی کے علاوہ ان کے لیے کوئی جائے پناہ بھی نہ ہوگی۔

نبیوں کے ساتھ بنی اسرائیل کے رویے کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالی قرآن کریم کے ساتھ ان کے رویے کو بیان کر رہا ہے جس قرآن کو اللہ تعالی نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتَٰبٌ مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ "اور ان کے پاس جب اللہ تعالی کی کتاب ان کی کتاب کو سچا کرنے والی آئی"۔ آیت کریمہ کے اس ٹکڑے میں اس بات کی تاکید ہے کہ جس قرآن کریم کو اللہ تعالی نے اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا وہ قرآن کریم ان کے پاس کی کتاب تورات کی تصدیق کرنے والا ہے اور اس کے مخالف نہیں ہے، اس میں ان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کی صداقت کا ثبوت ہے اور اس کتاب کی صداقت کا بھی جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے پاس سے لائے، اللہ تعالی اس قرآن میں ان سے وہ سارے حقائق بیان کر رہا ہے جو کہ تورات میں پہلے سے موجود تھے اور جن سے وہ بخوبی واقف تھے، بالخصوص جب کہ وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے آپ کے آنے کو لے کر اپنے دشمنوں پر غالب ہونے کے دعوے کیا کرتے تھے، اور اپنے ساتھ قتال کرنے والوں سے کہا کرتے تھے کہ عنقریب آخری زمانے میں ایک نبی بھیجے جائیں گے جن کے ساتھ مل کر ہم تم کو قوم عاد اور قوم ارم کی طرح قتل کریں گے(٢)۔ اللہ تعالی کے فرمان: ﴿وَكَانُواْ مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ﴾ " حالانکہ پہلے یہ خود (اس کے ذریعہ) کافروں پر فتح چاہتے تھے"، کا یہی مفہوم ہے۔ لیکن جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو انکار کر بیٹھے: ﴿فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُواْ كَفَرُواْ بِهِۦ﴾ "تو باوجود آجانے اور باوجود پہچان لینے کے پھر کفر کرنے لگے"۔ چنانچہ ان کے اس کرتوت کی سزا ارشاد باری تعالی کے بموجب یوں ملی: ﴿فَلَعْنَةُ ٱللَّهِ

---

(١)تفسير جلالين ١٣.

(٢) مرجع سابق.

عَلَى ٱلْكَٰفِرِينَ ﴾ "اللہ تعالی کی لعنت ہو کافروں پر"۔ لعنت کا مطلب ہے رحمت الہی سے دھتکار دینا، اور یہ لعنت ان کے کفر کی سزا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے ان کے اس روش کی حیثیت لفظ (بئس) کے ذریعہ بیان کی جس کا استعمال کسی چیز کی ہر طرح سے مذمت بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے، اور اس کے برعکس لفظ (نِعْمَ) ہے جو کسی کی مدح وتعریف میں بولا جاتا ہے[1]، ارشاد الہی ہے: ﴿بِئْسَمَا ٱشْتَرَوْاْ بِهِۦٓ أَنفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُواْ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ﴾ "بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا، وہ ان کا کفر کرنا ہے، اللہ تعالی کی طرف سے نازل شدہ چیز کے ساتھ"۔ یہ ایسی ترجمانی ہے جس میں ان کے کردار کی مکمل مذمت ہے، انہوں نے اپنے لیے جو چیز اختیار اور پسند کیا وہ انتہائی بری چیز ہے، اور بجائے اس کے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق، تائید اور مدد کرتے انہوں نے آپ پر نازل شدہ چیز کے ساتھ کفر کی راہ اپنائی[2]۔ چنانچہ محض اس بات سے جل کر کہ اس دین اور قرآن کریم کو اللہ تعالی نے ان کے علاوہ پر نازل کر دیا وہ لوگ اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے، ارشاد ہے: ﴿بِئْسَمَا ٱشْتَرَوْاْ بِهِۦٓ أَنفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُواْ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ عَلَىٰ مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ﴾ "بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا، وہ ان کا کفر کرنا ہے، اللہ تعالی کی طرف سے نازل شدہ چیز کے ساتھ محض اس بات سے جل کر کہ اللہ تعالی نے اپنا فضل اپنے جس بندے پر چاہا نازل فرمایا"۔ اس آیت سے یہ فائدہ اخذ ہوتا ہے کہ عام امور میں بھی جب اللہ تعالی کوئی رتبہ یا معاملہ کسی دوسرے کو دے دے تو اس پر راضی ہو جانا چاہیے، چاہے اس کا تعلق کسی پیشہ، ادارتی امور، مجلس یا زندگی کے کسی پہلو سے ہو، کوئی ذی شعور اس کو صرف اپنا حق نہ سمجھے کہ وہ حق اسی کو ملنا چاہئے تھا کسی غیر کو نہیں، بلکہ اللہ تعالی کسی چیز کو جو مقام دے دے اس کے لیے وہی مقام مناسب سمجھے تاکہ کسی کو حقیر وذلیل سمجھنے اور دوسروں پر برتری جیسی تاریکیوں میں نہ بھٹکتا پھرے

(١) تفسير قرطبي ٢/ ٢٠.

(٢) تفسير ابن كثير ١/ ١٢٩.

اس کی وجہ سے قوم وملت اور سماج ومعاشرہ کینہ پروری، گروہ بندی، باہمی خوں ریزی اور بربادی جیسے امراض سے دوچار ہو جاتا ہے، حقیقت میں یہ بڑی مذموم خصلت ہے اور اس کا اثر جب عبادت واطاعت کے امور میں ہو سکتا ہے تو زندگی کے دیگر معمولی امور میں کیوں کر نہیں ہو سکتا۔ لہذا ضروری ہے اس مذموم خصلت سے بچنا ، جو دینی اور دنیاوی دونوں کے امور خیر کی راہ میں رکاوٹ اور امور شر کو لانے کا سبب ہے۔

اور اسی لیے جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا ان کی آخرت برباہو کر رہ گئی کیوں کہ ان کو اس بات کی جلن اور کبر وغرور تھا کہ یہ رسالت ان میں نہیں تھی اور وہ اس حقیقت سے انجانے بنے رہے کہ یہ تو محض اللہ تعالی کی مرضی ہے وہ اس منصب رسالت کو اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عنایت کرتا ہے۔ آگے اللہ تعالی ان کے خسارہ اور نقصان کی مقدار بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: ﴿فَبَآءُو بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍۚ وَلِلۡكَٰفِرِينَ عَذَابٞ مُّهِينٞ﴾ " اس کے باعث یہ غضب پر غضب کے مستحق ہوگئے اور ان کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے"، چنانچہ اولا وہ لوگ تورات کے ضیاع کے بموجب غضب الہی کے مستحق ٹھہرے۔ اور دوسرا غضب ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالی کی جانب سے نازل شدہ چیز کے کفر کی وجہ سے ہوا۔ اور اسی طرح ان کے لیے ذلت ورسوائی بھرا اور حقارت آمیز عذاب ہے۔

اس آیت میں اس بات کی تاکید ہے کہ اللہ تعالی اپنی حکمت سے جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے سربلندی دیتا یا پیچھے کرتا ہے اور یہ چیز اس بات کی متقاضی ہے کہ آدمی زندگی کے تمام معاملات میں اللہ تعالی کی جناب میں تواضع اختیار کرے، لہذا کسی خطیب، امام، قائد، اور حقدار سربراہ کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھے بلکہ تواضع کے ساتھ خیر کے کاموں میں اس کا ممد ومعاون اور شر سے بچاؤ کرنے والا، نیز دوسروں سے حق بیانی کرکے حق کا دفاع کرنے والا ہو اور اللہ تعالی کے اختیار اور رتبہ نوازی کی حکمت پر راضی برضا ہو جائے۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان کے برتاؤ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمۡ ءَامِنُواْ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُواْ نُؤۡمِنُ بِمَآ أُنزِلَ عَلَيۡنَا وَيَكۡفُرُونَ بِمَا وَرَآءَهُۥ وَهُوَ ٱلۡحَقُّ

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالی کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لاؤ تو کہہ دیتے ہیں کہ جو ہم پر اتاری گئی اس پر ہمارا ایمان ہے۔ حالانکہ اس کے بعد والی کے ساتھ جو ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے، کفر کرتے ہیں"۔

آدمی میں جب عناد پرستی ہوتی ہے تو مختلف بہانے بناتا اور چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے۔ چنانچہ جب یہود اور ان جیسے لوگوں سے اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ چیز پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا تو وہ جھٹ بول پڑے کہ اللہ تعالی نے ہمارے لیے تورات اور انجیل میں جو کچھ نازل کیا ہے وہی ہمارے لیے کافی ہے اور ہم اسی کو مانتے ہیں ﴿ وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَآءَهُۥ ﴾ " حالانکہ اس کے بعد والی کے ساتھ کفر کرتے ہیں "یعنی وہ اس کے علاوہ بعد والی کتاب کا انکار کرتے ہیں، باوجود اس کے کہ یہ کتاب ان کے کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جس میں اس نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت کی خبریں ہیں۔

اس کے بعد ایسی منہ توڑ دلیل پیش کی گئی ہے جس کے بعد ان کے لیے نکل کر بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں بچا : ﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنۢبِيَآءَ ٱللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾ "اچھا ان سے یہ تو دریافت کریں کہ اگر تمہارا ایمان پہلی کتابوں پر ہے تو پھر تم نے اگلے انبیاء کو کیوں قتل کیا"۔ یعنی اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ تمہارا اپنے پاس کی نازل شدہ چیز پر ایمان ہے تو پھر تم نے ان انبیاء کرام کو قتل کیوں کیا جو تمہارے پاس تورات کی تصدیق کے لیے آئے۔

اس سے انکار کرنے والے پر اقامت حجت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے اور ان ایسے علم کی اہمیت کا بھی جس کے ذریعہ ایک داعی انکار کرنے والے سے بحث ومباحثہ کرتے ہوئے اس کو درست اور صحیح بات کا قائل کر سکے۔ اسی طرح مدعوین کے احوال اور ان کے غلط مفاہیم ودلائل کی معرفت بھی کافی اہم ہے تاکہ ایک داعی ان کے دلائل کا صحیح طریقے سے جواب اور مغالطات کا رد کر سکے۔

پھر دوبارہ ان کو موسی علیہ السلام کے ساتھ ان کے رویے کی یاد دہانی کرائی جارہی ہے، جس وقت کہ موسی علیہ السلام ان کے پاس روشن دلائل لے کر آئے لیکن انہوں نے اللہ تعالی کو چھوڑ کر بچھڑے کی عبادت شروع کردی، فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ جَآءَكُم مُّوسَىٰ بِٱلْبَيِّنَٰتِ ثُمَّ ٱتَّخَذْتُمُ ٱلْعِجْلَ مِنۢ

بَعۡدِهِۦ وَأَنتُمۡ ظَٰلِمُونَ ﴾"تمہارے پاس تو موسی یہی دلیلیں لے کر آئے لیکن تم نے پھر بھی بچھڑا پوجا، تم ہو ہی ظالم"۔

منکر کے مختلف مواقف کے بار بار ذکر سے منکر کو دلائل کے ذریعہ لاجواب کرنا مقصود ہوتا ہے تاکہ وہ خوب اچھی طرح جان لے کہ یہ ساری دلیلیں اس تک پہنچ گئی ہیں اور اس پر حجت کا اتمام ہو چکا ہے اور اب اس کے بچنے کا کوئی راستہ نہیں، اور تاکہ اس کے سارے حیلے بہانے کے چور دروازے بند کر دیئے جائیں، اور پھر یا تو وہ باز آجائے یا اسی طرح اپنی پرانی معاندانہ روش میں رواں دواں رہے۔

اس کے بعد ان کو پیش آنے والی خوف ناک سزا کی پھر سے یاد دہانی کرائی جا رہی ہے جس میں طور پہاڑ کو ان کے اوپر لا کھڑا کر دیا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود بھی نہ ماننے اور بچھڑے کی عبادت کو ترجیح دی، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ وَإِذۡ أَخَذۡنَا مِيثَٰقَكُمۡ وَرَفَعۡنَا فَوۡقَكُمُ ٱلطُّورَ خُذُواْ مَآ ءَاتَيۡنَٰكُم بِقُوَّةٖ وَٱسۡمَعُواْۖ قَالُواْ سَمِعۡنَا وَعَصَيۡنَا وَأُشۡرِبُواْ فِي قُلُوبِهِمُ ٱلۡعِجۡلَ بِكُفۡرِهِمۡۚ قُلۡ بِئۡسَمَا يَأۡمُرُكُم بِهِۦٓ إِيمَٰنُكُمۡ إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ ﴾ "جب ہم نے تم سے وعدہ لیا اور تم پر طور کو کھڑا کر دیا (اور کہہ دیا) کہ ہماری دی ہوئی چیز کو مضبوط تھامو اور سنو۔ تو انہوں نے کہا، ہم نے سنا اور نافرمانی کی، اور ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت (گویا) پلا دی گئی بسبب ان کے کفر کے۔ ان سے کہہ دیجیے کہ تمہارا ایمان تمہیں برا حکم دے رہا ہے، اگر تم مومن ہو"۔ چنانچہ آیت کا اختتام ان کے ایمان کے جھوٹے دعووں پر ان کو ڈانٹ پلا کر ہو رہا ہے، کیا ہی برا ہے ان کے ایمان کا یہ دعوی جس ایمان نے تم کو اس جھوٹ اور دھوکہ بازیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

اس سے واضح ہوا کہ بعض لوگ جھوٹے ایمان کے دعویدار ہوتے ہیں اور اسی بنیاد پر بزعم خویش اپنے جھوٹ کو سچ اور حق ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس میں اس بات کی تاکید بھی ہے کہ اطاعت وفرمابرداری ضروری ہے اور اللہ تعالی کے احکامات کی نافرمانی اور ان کو حقیر سمجھنا سنگین جرم ہے۔ آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ بعض لوگوں کو آیات وخوف دلانے والے دلائل کچھ نفع نہیں دیتے، ایک داعی چاہے جتنی کوشش کر لے لیکن بسا اوقات بعض لوگوں کو خیر وبھلائی اختیار کرانے کے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا، اس لیے داعی کو دعوت الی اللہ کے میدان میں لوگوں کی طرف سے اس طرح کے

درپیش اندیشوں کے لیے خود کو تیار رکھنا اور عادی بنانا ضروری ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے اس کے اوپر دعوت کے جس فریضے کو واجب کیا ہے اس کو بخوبی ادا کرے اور لوگوں کے اعراض اور روگردانی کے سبب دعوت کا یہ کام بند نہ کرے، کیوں کہ معاشرے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اس کی دعوت کو قبول کریں گے، اس کا نمونہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور ان کے بعد کے لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کی دعوت کو قبول کیا، ہاں ایسے لوگ بھی ضرور ملیں گے جو دعوت کو قبول نہیں کریں گے، جس طرح کے لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے جنہوں نے آپ کا انکار کیا اور کبر وغرور میں پڑے رہ گئے۔

﴿قُلۡ إِن كَانَتۡ لَكُمُ ٱلدَّارُ ٱلۡأٓخِرَةُ عِندَ ٱللَّهِ خَالِصَةٗ مِّن دُونِ ٱلنَّاسِ فَتَمَنَّوُاْ ٱلۡمَوۡتَ إِن كُنتُمۡ صَٰدِقِينَ ﴿٩٤﴾ وَلَن يَتَمَنَّوۡهُ أَبَدَۢا بِمَا قَدَّمَتۡ أَيۡدِيهِمۡۗ وَٱللَّهُ عَلِيمُۢ بِٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٩٥﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمۡ أَحۡرَصَ ٱلنَّاسِ عَلَىٰ حَيَوٰةٖ وَمِنَ ٱلَّذِينَ أَشۡرَكُواْۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمۡ لَوۡ يُعَمَّرُ أَلۡفَ سَنَةٖ وَمَا هُوَ بِمُزَحۡزِحِهِۦ مِنَ ٱلۡعَذَابِ أَن يُعَمَّرَۗ وَٱللَّهُ بَصِيرُۢ بِمَا يَعۡمَلُونَ ﴿٩٦﴾﴾

ترجمہ:

"آپ کہہ دیجئے اگر آخرت کا گھر صرف تمہارے ہی لئے ہے، اللہ کے نزدیک اور کسی کے لئے نہیں، تو آؤ اپنی سچائی کے ثبوت میں موت طلب کرو۔ لیکن اپنی کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے کبھی بھی موت نہیں مانگیں گے، اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ دنیا کی زندگی کا حریص اے نبی، آپ انہیں کو پائیں گے، یہ حرص زندگی میں مشرکوں سے بھی زیادہ ہیں، ان میں سے تو ہر شخص ایک ایک ہزار سال کی عمر چاہتا ہے، گو یہ عمر دیا جانا بھی انہیں عذاب سے نہیں چھڑا سکتا، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو بخوبی دیکھ رہا ہے"۔

ان آیات کریمہ کا سیاق بھی یہودیوں سے متعلق ہے، جن میں ان پر حجت قائم کی گئی ہے تاکہ دوسرے لوگ ان کے اس طرز عمل سے نصیحت حاصل کریں اور ایمان کے باب میں سبق لیں، نیز اللہ اور اس کے رسول کے دین کے ساتھ ان کے لیے ایک صحیح طرز تعامل ہو، اور اللہ کے نازل کردہ امور میں رحمت الٰہی اور نافرمانوں کے ساتھ اس کی بردباری کا ادراک ہو سکے، کیوں کہ اللہ تعالی نے انسان کو اپنی

نافرمانیوں سے باز آجانے کا ایک موقع دے رکھا ہے تاکہ وہ اپنی ہوا پرستی سے اوپر اٹھ کر حق کی طرف لوٹ آئے، اور کتاب وسنت کا دامن تھام لے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں یہود کے جھوٹے ایمانی دعووں کو بیان کیا گیا ہے، اور دلائل کے ذریعہ ان کے بزعم خویش ان باطل دعووں کو توڑ دیا گیا ہے، فرمایا:﴿قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ ٱلدَّارُ ٱلْءَاخِرَةُ عِندَ ٱللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ ٱلنَّاسِ فَتَمَنَّوُا۟ ٱلْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ﴾ "آپ کہہ دیجئے اگر آخرت کا گھر صرف تمہارے ہی لئے ہے، اللہ کے نزدیک اور کسی کے لئے نہیں، تو آؤ اپنی سچائی کے ثبوت میں موت طلب کرو "۔

یعنی اگر جنت خالص تمہارے ہی لیے ہے اور کسی کے لیے نہیں ہے جیسا کہ تم گمان کرتے ہو کہ اس میں سوائے یہود اور نصاری کوئی دوسرا نہیں جائے گا، اور جہنم کی آگ تم کو بس چند دنوں کے لیے لگے گی "تو آؤ اپنی سچائی کے ثبوت میں موت طلب کرو"۔ یہ ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیچ ایک طرح سے مباہلہ کی دعوت ہے، اب اس مجبوری میں دو ہی راستے ہیں: یا تو وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئیں، یا پھر اس موت کی تمنا کریں جو ان کو جنت میں پہونچادے جیسا کہ ان کا گمان ہے۔

ان کا اپنے لیے موت کی تمنا نہ کرنا ان کے جھوٹ کی دلیل ہے، کیوں کہ اگر وہ اپنے دعوے میں سچے ہوتے تو ضرور موت کی تمنا رکھتے تاکہ اپنی سچائی ثابت کر سکیں لیکن ان لوگوں نے ایسا نہیں کیا جس کے بعد ہر کسی کو معلوم ہو گیا کہ ان لوگوں کی اللہ اور اس کے رسول سے انتہائی درجہ کی عداوت ودشمنی ہے(۱)۔ اور اللہ تعالی نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ ان کی اپنی سابقہ بداعمالیوں اور غلط عقائد کی بنا پر ان کو خود اس بات کا علم ہے کہ وہ باطل راہ پر ہیں، اس لیے وہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے، جیسا کہ اللہ تبارک وتعالی نے فرمایا: ﴿وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌۢ بِٱلظَّٰلِمِينَ﴾ "لیکن اپنی کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے کبھی بھی موت نہیں مانگیں گے، اللہ تعالی ظالموں کو خوب جانتا ہے"۔

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو دانستہ طور پر غلطی پر ہوتے ہوئے بھی دین کے معاملے میں عناد ودشمنی کا شکار ہیں، اس لیے ان کی یہ دشمنی دنیاوی

---

(۱) تفسير ابن سعدي ۸۷/۱.

معاملات میں بھی ناگزیر ہے، کیوں کہ دنیاوی امور دینی امور کے بالمقابل معمولی ہیں، اور ایسا بہت ہوتا ہے۔ لہذا ایک عالم اور داعی کو چاہیے کہ وہ مخالفین کو پورے اتقان کے ساتھ بحسن وخوبی ایسے سر توڑ دلائل پیش کرے جس سے مخالف بھاگ نہ پائے، اور دینی ودنیاوی امور میں ان کے کبر وعناد کی حقیقت دوسروں پر آشکارا ہو اور وہ اپنے مکر وفریب کے ذریعہ دوسروں کو دھوکے میں نہ ڈالیں نیز لوگ ایسے لوگوں سے آگاہ رہیں جو محض کبر وغرور کی وجہ سے حق اور سچائی کا انکار کرتے ہیں۔

آگے اللہ تعالی بیان کر رہا ہے کہ بات محض یہ نہیں ہے کہ وہ موت کی تمنا نہیں کریں گے، بلکہ وہ زندگی کے حد درجہ حریص ہیں: ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ ٱلنَّاسِ عَلَىٰ حَيَوٰةٍ وَمِنَ ٱلَّذِينَ أَشْرَكُوا۟ ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ "بلکہ سب سے زیادہ دنیا کی زندگی کا حریص اے نبی، آپ انہیں کو پائیں گے، یہ حرص زندگی میں مشرکوں سے بھی زیادہ ہیں، ان میں سے تو ہر شخص ایک ایک ہزار سال کی عمر چاہتا ہے"۔ آیت کریمہ میں ان کی موت سے شدید ناپسندیدگی کا بیان ہے اور حالت یہ ہے کہ مشرکین کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ اس دنیا میں خوب لمبی عمر کے خواہاں ہیں اور ان میں کا ہر شخص اپنی بری کرتوت اور مرنے کے بعد کے انجام بد کے علم کی وجہ سے ہزار سال جینے کی آرزو رکھتا ہے، اسی لیے تو یہ ہر گز کبھی بھی مرنے کی تمنا نہیں کریں گے، فرمایا: ﴿وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ﴾ یعنی یہ لوگ آخرت کے لیے خود کردہ بداعمالیوں کی وجہ سے کبھی بھی موت نہیں چاہیں گے، لیکن پھر بھی یہ عمر دراز ان کو عذاب سے نہیں بچا سکتی، جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِۦ مِنَ ٱلْعَذَابِ أَن يُعَمَّرَ ۗ وَٱللَّهُ بَصِيرٌۢ بِمَا يَعْمَلُونَ﴾۔ "گو یہ عمر دیا جانا بھی انہیں عذاب سے نہیں چھڑا سکتا، اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو بخوبی دیکھ رہا ہے"۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجرم موت سے خوف زدہ اور عذاب کے ڈر سے زندگی کا خواہاں رہتا ہے، اور آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ عمر چاہے جتنی بھی دراز ہو جائے ایک دن ختم ہو جاتی ہے، اور لمبی عمر مل جانے سے حساب وجزاء سے ہر گز چھٹکارا نہیں مل سکتا، اسی سے یہ بات بھی بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ ایک مومن کی زندگی سے محبت اس لیے ہوتی تاکہ زیادہ سے زیادہ عمل صالح، اور بکثرت اللہ تعالی کی اطاعت اور استغفار کے ذریعہ اللہ سے ملاقات کی تیاری کر سکے۔

اس سے صداقت قرآن کی تاکید بھی ہوتی ہے جس نے کہ ان کے دلوں کی پوشیدہ حقیقتوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے ان کے جھوٹ ، کبر وغرور ، حق کی معرفت کے باوجود حق کا انکار اور حق کی راہ میں روڑے ڈالنا وغیرہ تمام امور کو بڑی ہی ٹھوس عملی دلیلوں کے ذریعہ بیان کر دیا، ساتھ ہی ساتھ اس میں نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صداقت کی دلیل بھی ہے کیوں کہ آپ کے پاس یہ قرآن بطور معجزہ ہے۔

﴿قُلْ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُۥ نَزَّلَهُۥ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٧﴾ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَىٰلَ فَإِنَّ ٱللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَٰفِرِينَ ﴿٩٨﴾﴾

ترجمہ:

"(اے نبی) آپ کہہ دیجئے کہ جو جبرائیل کا دشمن ہو جس نے آپ کے دل پر پیغام باری تعالیٰ اتارا ہے جو پیغام ان کے پاس کی کتاب کی تصدیق کرنے والا اور مومنوں کو ہدایت اور خوشخبری دینے والا ہے (۹۷) ۔(تو اللہ بھی اس کا دشمن ہے) جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں اور رسولوں کا اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہو، ایسے کافروں کا دشمن خود اللہ ہے"۔

آیت کا سیاق یہود ہی کے بارے میں ہے ، آیت کریمہ میں اس بات کا بیان ہے کہ ان یہود میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بعض فرشتوں سے دشمنی رکھتے ہیں، امام ابو جعفر بن جریر طبری رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں: "تمام مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے یہود کے بارے میں نازل ہوئی جن کا گمان تھا کہ جبریل علیہ السلام ان کے دشمن اور میکائیل علیہ السلام ان کے دوست ہیں (۱)۔

اس آیت کے سبب نزول میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوالات پوچھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر وہ ان سوالوں کا جواب دے دیتے ہیں تو وہ لوگ اسلام قبول کریں گے ؟ ان لوگوں نے کہا: ہاں، لہذا جب ان لوگوں نے سولات

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۱۳۳.

پوچھے اور آپ نے ان کا جواب دے دیا اور ان کے سامنے سوائے ایمان لانے کے اور کوئی چارہ نہ رہا، تو کہنے لگے: فرشتوں میں سے تمہارا دوست کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے دوست جبریل علیہ السلام ہیں، اور اللہ تعالی نے جن نبیوں کو بھی مبعوث فرمایا سب کے ولی اور دوست جبریل علیہ السلام تھے"، کہنے لگے: تب تو ہم تم سے الگ ہوتے ہیں، اگر فرشتوں میں سے جبریل کے سوا کوئی دوسرا تمہارا دوست ہوتا تو ہم تمہاری تابعداری اور تصدیق کرتے (۱)۔ مزید انہوں نے کہا: یہ جبریل تو ہم پر جنگ اور قتال نازل کرتا ہے، یہ تو ہمارا دشمن ہے (۲)۔

چنانچہ جبریل علیہ السلام جیسا عظیم فرشتہ بھی ان کی ناپسندیدگی سے محفوظ نہ رہ سکا، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر حد سے آگے بڑھے ہوئے تھے، نیز ان کا کفر وعناد حقیقت کے یقین کے باوجود انتہا کو پہونچا ہوا تھا، اسی طرح یہ آیت کریمہ ان یہودیوں کی بداخلاقی کو بے نقاب کرتی ہے۔ اللہ تعالی نے ان کی حقیقت اور ان کے اخلاق کی حقیقت اور عادات خبیثہ کو بالکل واضح کردیا۔ ان کے اخلاق کی پردہ فاشی کا فائدہ یہ ہے کہ مسلمان ان سے دھوکے میں آکر ان پر بھروسہ نہ کر بیٹھیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی نزول قرآن کے تعلق سے ایک بہت ہی عظیم بات بیان کر رہا ہے، فرمایا: ﴿فَإِنَّهُۥ نَزَّلَهُۥ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾ " جس نے آپ کے دل پر پیغام باری تعالیٰ اتارا ہے " اس آیت سے یہ واضح ہے کہ جبریل علیہ السلام قرآن کریم لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اس میں جبریل علیہ السلام کے شرف ومنزلت کی دلیل ہے بایں حیثیت کہ جبریل ہی وہ فرشتہ ہیں جو قرآن کریم لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر نازل ہوئے، اور "قلب" یعنی دل کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا کیوں کہ دل جسم کے جملہ تمام اعضاء میں سب سے زیادہ فضیلت کا حامل ہے، اور انسانی جسم کا یہی وہ عظیم حصہ ہے جس کے درست رہنے سے جسم کے سارے اعضاء درست رہتے ہیں، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ اور امام قرطبیؒ رحمہ اللہ کے بقول اس کو بطور خاص اس لیے ذکر کیا کیوں کہ عقل

---

(۱) مرجع سابق ۱/۱۳٤.

(۲) تفسير قرطبي ۲/۲٦.

وعلم اور معرفت قبول کرنے کی جگہ دل ہی ہے(۱)۔ اور قرآن کریم کا بلا واسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر نازل ہونا قرآن کی عظمت اور اس کے بلند مرتبہ پر دلالت کرتا ہے، اسی طرح جس ذات (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قرآن کریم نازل ہوا اس کے رفعت شان میں بھی چنداں شک نہیں۔

اللہ تعالی کا فرمان: ﴿نَزَّلَهُۥ عَلَىٰ قَلۡبِكَ بِإِذۡنِ ٱللَّهِ﴾ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی بھی چیز اللہ تعالی کی اجازت کے بغیر نازل نہیں ہوتی، اور اس کائنات میں کوئی بھی شئ بغیر اللہ کی اجازت کے وجود میں نہیں آسکتی، وہی تنہا ساری بادشاہت والا ہے، اس کی بادشاہت، امر، قدرت اور تصرف میں اس کا کوئی ساجھے دار نہیں، لہذا ساری مخلوقات اپنے تمام معاملات وضروریات میں اسی خالق کے حاجت مند ہیں، اسی سے طلب کیا جاتا ہے، اور وہی عطا کرنے والا ہے۔

اس کے بعد آیت کریمہ میں قرآن کریم کی چند خصوصیتوں کا بیان ہے، پہلی خصوصیت: (مُصَدِّقٗا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ) یعنی یہ قرآن ان کے پاس کی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والا ہے اور اس کے مخالف نہیں ہے۔ دوسری خصوصیت: (وَهُدٗى) یعنی یہ قرآن کتاب ہدایت ہے، جو کوئی اس کے ذریعہ ہدایت حاصل کرتا ہے اس کو یہ کتاب سعادت دارین تک لے جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ نعمتوں والی جنت تک رسائی حاصل کر سکے۔ تیسری خصوصیت (وَبُشۡرَىٰ لِلۡمُؤۡمِنِينَ) یعنی یہ قرآن مومنین کو جنت کی خوش خبری سناتی ہے، تو پھر کون سی کتاب قرآن کریم سے زیادہ عظمت والی ہے جو خیر وبھلائی کی طرف رہنمائی کرتی ہو، اور اللہ کے حکم سے جنت کی بشارت سنا کر مومنوں میں فرحت وسرور پیدا کرے۔

﴿مَن كَانَ عَدُوّٗا لِّلَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَرُسُلِهِۦ وَجِبۡرِيلَ وَمِيكَىٰلَ فَإِنَّ ٱللَّهَ عَدُوّٞ لِّلۡكَٰفِرِينَ﴾" جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں اور رسولوں کا اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہو، ایسے کافروں کا دشمن خود اللہ ہے "مذکورہ آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے پہلے فرشتوں کا عمومی طور پر ذکر کیا، اس کے بعد جبریل اور میکائیل علیہما السلام کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا، یہ "عطف الخاص علی

(۱) مرجع سابق ٢/٢٦.

العام" کے قبیل سے ہے، ایسا اس لیے ہے کیوں کہ آیت ان ہی دو فرشتوں کی تائید کے سیاق میں ہے، کیوں کہ یہودیوں نے کہا تھا: جبریل ہمارا دشمن ہے، وہ ہم پر جنگ اور قتال لے کر نازل ہوتا ہے، اور میکائیل ہمارا دوست ہے، وہ سبزہ زار اور بارش کا وکیل ہے، جب کہ در حقیقت جبریل بھی ان پر ہدایت لے نازل ہوتے اور تمام نبیوں کے پاس کتابیں لے کر آتے تھے، ان ہی کتابوں میں سے ایک کتاب قرآن کریم بھی ہے، اللہ تعالی نے اس آیت کریمہ کے ذریعہ ان کی تردید کی جس میں اس بات کی وضاحت ہے کہ جو بھی اللہ، اس کے فرشتوں، رسولوں، جبریل اور میکائیل کا دشمن ہوگا تو بلاشبہ اس کا دشمن خود اللہ ہوگا۔ اسی طرح آیت کریمہ میں ان کے کفر کا بھی ثبوت ہے جیسا کہ فرمایا: (فَإِنَّ ٱللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَٰفِرِينَ) " ایسے کافروں کا دشمن خود اللہ ہے "، اور پھر یہی حکم ہر اس شخص پر لاگو ہوگا جو ان کی راہ اختیار کرے گا۔

آیت کریمہ میں بالعموم تمام فرشتوں اور بالخصوص جبریل و میکائیل اور تمام رسولوں کی فضیلت کی دلیل ہے، اور یہ کہ ان میں سے کسی سے عداوت رکھنا کفر ہے، اور ان تمام پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح ہوا پرستی، بلا علم اللہ پر جھوٹ اور کبر و غرور کی خطرناکی پر بھی یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

﴿وَلَقَدْ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ءَايَٰتٍۭ بَيِّنَٰتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ إِلَّا ٱلْفَٰسِقُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَكُلَّمَا
عَٰهَدُوا۟ عَهْدًا نَّبَذَهُۥ فَرِيقٌ مِّنْهُم ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ
مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ كِتَٰبَ ٱللَّهِ وَرَآءَ
ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾ وَٱتَّبَعُوا۟ مَا تَتْلُوا۟ ٱلشَّيَٰطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَٰنَ ۖ وَمَا
كَفَرَ سُلَيْمَٰنُ وَلَٰكِنَّ ٱلشَّيَٰطِينَ كَفَرُوا۟ يُعَلِّمُونَ ٱلنَّاسَ ٱلسِّحْرَ وَمَآ أُنزِلَ عَلَى
ٱلْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَٰرُوتَ وَمَٰرُوتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَآ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا
تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِۦ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَزَوْجِهِۦ ۚ وَمَا هُم بِضَآرِّينَ بِهِۦ
مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا۟ لَمَنِ
ٱشْتَرَىٰهُ مَا لَهُۥ فِى ٱلْءَاخِرَةِ مِنْ خَلَٰقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا۟ بِهِۦٓ أَنفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا۟

يَعۡلَمُونَ ١٠٢ وَلَوۡ أَنَّهُمۡ ءَامَنُواْ وَٱتَّقَوۡاْ لَمَثُوبَةٞ مِّنۡ عِندِ ٱللَّهِ خَيۡرٞۚ لَّوۡ كَانُواْ
يَعۡلَمُونَ ١٠٣﴾

ترجمہ:

"اور یقیناً ہم نے آپ کی طرف روشن دلیلیں بھیجی ہیں جن کا انکار سوائے بدکاروں کے کوئی نہیں کرتا۔ (۹۹) یہ لوگ جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کی ایک نہ ایک جماعت اسے توڑ دیتی ہے، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے خالی ہیں (۱۰۰)۔ جب کبھی ان کے پاس اللہ کا کوئی رسول ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والا آیا، ان اہل کتاب کے ایک فرقہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے ڈال دیا کہ جانتے ہی نہ تھے۔ (۱۰۱)۔ اور اس چیز کے پیچھے لگ گئے جسے شیاطین (حضرت) سلیمان کی حکومت میں پڑھتے تھے۔ سلیمان نے تو کفر نہ کیا تھا، بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے ، اور بابل میں ہاروت ماروت دو فرشتوں پر جادو اتارا گیا تھا ،وہ دونوں بھی کسی شخص کو اس وقت تک نہیں سکھاتے تھے، جب تک یہ نہ کہہ دیں کہ ہم تو ایک آزمائش ہیں ، تو کفر نہ کر۔ پھر لوگ ان سے وہ سیکھتے جس سے خاوند و بیوی میں جدائی ڈال دیں ، اور دراصل وہ بغیر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے، یہ لوگ وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان پہنچائے اور نہ نفع پہنچا سکے، اور وہ جانتے ہیں کہ اس کے لینے والے کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور وہ بدترین چیز ہے جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو فروخت کر رہے ہیں، کاش کہ یہ جانتے ہوتے (۱۰۲)۔ اگر یہ لوگ صاحب ایمان متقی بن جاتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہترین ثواب انہیں ملتا، اگر یہ جانتے ہوتے (۱۰۳)"۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمارہا ہے: ﴿وَلَقَدۡ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ءَايَٰتِۭ بَيِّنَٰتٖۖ وَمَا يَكۡفُرُ بِهَآ إِلَّا ٱلۡفَٰسِقُونَ﴾ "اور یقیناً ہم نے آپ کی طرف روشن دلیلیں بھیجی ہیں جن کا انکار سوائے بدکاروں کے کوئی نہیں کرتا"۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی کتاب قرآن کریم کا تزکیہ ہے کہ یہ قرآن کی بالکل واضح اور کھلی ہوئی آیات ہیں جن کے ذریعہ ہر اس شخص پر حجت قائم ہو جاتی ہے جس نے ان کو سنا، یا خود پڑھا، یا اس کو ان کی خبر ہوئی، اس لیے کہ حق ان آیات میں بالکل واضح ہے، جن میں

امر ونہی، شرعی احکامات ،حکمت کی باتیں ،اور جزاء وسزا کا بیان ہے، نیز اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کے دلائل ،گذشتہ قوموں کے بالکل واضح قصے، نبیوں کے ساتھ ان کے حالات اور برتاؤ، اور ان قوموں کا انجام ،اور اس کے علاوہ دیگر بہت سارے کھلم کھلا اور واضح دلائل بیان کئے گئے ہیں، نیز یہ کتاب اپنے سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں سے متعارض بھی نہیں ہے بلکہ ان تصدیق کرنے والی ہے، بالآخر یہ سارے امور اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ بلاشبہ جو اس کتاب کو لے کر آیا ہے وہ اللہ کا نبی اور اس کا رسول ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) چنانچہ اس کی اطاعت، حمایت، مدد، پیروی اور محبت واجب ہے، اور جو کوئی اس واضح اور روشن حق کا انکار کرے اور اپنے فسق وفجور کی وجہ سے اس فرض منصبی سے خروج کی راہ اپنائے وہ کافر ہے۔

اللہ تعالی کے فرمان: (أَوَكُلَّمَا عَٰهَدُواْ عَهۡدٗا نَّبَذَهُۥ فَرِيقٞ مِّنۡهُم) " یہ لوگ جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کی ایک نہ ایک جماعت اسے توڑ دیتی ہے "اس میں یہود کی طرف سے بار بار عہد وپیمان کے توڑے جانے کا بیان ہے، آیت میں لفظ "کُلَّمَا" کسی کام کے بار بار ہونے پر دلالت کرتا ہے، یعنی کہ یہود سے بار بار عہد کئے گئے پھر انہوں نے ان عہود کی ہر بار خلاف ورزی کی تو اللہ تعالی نے ان کی حقیقت کی پول کھولی کہ ان میں سے اکثریت ایمان ہی نہیں رکھتی، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی وجہ سے ایک مومن اپنے عہد کا پاس رکھتا ہے کیوں کہ اس کو اللہ کا خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے، اور وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے، اس کے برخلاف عدم ایمان آدمی کو موقع ملتے ہی عہد شکنی اور وعدہ خلافی بر آمادہ کرتا ہے، کیوں کہ ایمان عہد شکنی کے لیے رکاوٹ اور معصیت سے دوری کا سبب ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی یہود کا ایک اور وصف بیان کر رہا ہے اور وہ ہے معرفت حق کے بعد حق کا انکار اور اللہ تعالی کی کتاب اور اس میں بیان کردہ حقائق سے خود کی دوری ،ایسا لگتا ہے کہ کچھ جانتے ہی نہ ہوں، فرمایا: ﴿ وَلَمَّا جَآءَهُمۡ رَسُولٞ مِّنۡ عِندِ ٱللَّهِ مُصَدِّقٞ لِّمَا مَعَهُمۡ نَبَذَ فَرِيقٞ مِّنَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ كِتَٰبَ ٱللَّهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمۡ كَأَنَّهُمۡ لَا يَعۡلَمُونَ ﴾ "جب کبھی ان کے پاس اللہ کا کوئی رسول ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والا آیا، ان اہل کتاب کے ایک فرقہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے ڈال دیا کہ جانتے ہی نہ تھے"۔

آیت کریمہ کے مختلف دلائل میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم ان کے پاس کی کتاب (تورات) کے مخالف نہیں بلکہ اس کی تصدیق کرتا ہے، اس کے باوجود ان یہودیوں نے اپنی ہی کتاب کو پس پشت ڈال کر ترک کر دیا، کیوں کہ اس میں نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت موجود تھی، گویا کہ جیسے ان کو اس میں موجود حقائق کا علم ہی نہیں، پھر جادوگروں کے پیچھے لگ گئے جس کا بیان عنقریب اس کے بعد والی آیت میں آرہا ہے۔

مذکورہ آیت میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ یہود محض عہد شکنی ہی نہیں کرتے تھے بلکہ دانستہ طور پر حق کو چھپاتے بھی تھے، اس سیاق میں یہ بھی معلوم ہوتا کہ جو لوگ کتاب اللہ سے اپنے من مانی احکام کو اپناتے ہیں اور جن سے چاہتے ہیں غفلت برتتے ہوئے کتاب کے کچھ حصے پر ایمان رکھتے اور کچھ کا انکار کرتے ہیں وہ ان کا یہ عمل یا تو تجاہل کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہے یا حق کو چھپانے کی غرض سے، اور ان کا یہ عمل انتہائی خطرناک ہے، اللہ تعالی بیان کر رہا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے پاس کی کتاب کو چھوڑ دیا اور جادو اور جادوگروں کے پیچھے لگ گئے، یہی ہر انسان کا حال ہے جب وہ حق کو چھوڑ دیتا ہے تو پھر باطل کی راہ اختیار کرتا ہے، اسی طرح جب سنت سے الگ ہوتا ہے تو بدعت کے پیچھے لگتا ہے، سچ چھوڑتا ہے تو جھوٹ اپناتا ہے۔

اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ مُلْكِ سُلَيْمَانَ﴾ " اور اس چیز کے پیچھے لگ گئے جسے شیاطین (حضرت) سلیمان کی حکومت میں پڑھتے تھے"۔ ہوا یوں کہ ان شیاطین نے لوگوں کے لیے جادو نکالا اور یہ دعوی کیا کہ سلیمان علیہ السلام جادو کرتے تھے اور اسی کی کے زور پر ان کو اتنی عظیم بادشاہت ملی، حالاں کہ وہ اپنے دعوے میں سراسر جھوٹے تھے، بلکہ اللہ تعالی نے سلیمان علیہ السلام کو اس الزام سے پاک قرار دیا اور فرمایا: ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ "سلیمان نے تو کفر نہ کیا تھا، بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے" اس سے معلوم ہوا کافر ہمیشہ دوسروں کو کفر اور اس کے وسائل وطریقے سکھلانے کا حریص رہتا ہے جیسا کہ شیاطین کا شیوہ ہے نیز شیطان ہمہ وقت انسان کو گمراہ کرنے اور جھوٹ پھیلانے کا حریص رہتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیروں کی ایذارسانی اور افتراپردازی سے

کوئی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا، یہاں تک کہ اللہ کے نبی سلیمان علیہ السلام پر بھی یہ جھوٹ باندھا گیا کہ ان کی بادشاہت کا سارا زور ان کے جادو کے سبب ہے۔اس سے یہ بھی پتہ چلتاہے کہ ہر صاحب نعمت جھوٹے حاسدین کے حسد کا شکار ہوتا ہے جن کا شیوہ ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر نعمت وفضل کو اس کا صحیح رخ دینے کی بجائے غلط رخ دیتے ہیں۔

آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے سلیمان علیہ السلام کو کفر اور جادو گری سے پاک قرار دیا، نیز قول باری تعالی: (وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ) سے یہ دلیل ملتی ہے کہ جادو کا عمل کفر ہے، اور یہ اللہ کے نبی سلیمان علیہ السلام کی اعلی ترین تعریف ہے، کیوں کہ جب اللہ تعالی نے ان سے یکسر کفر کی نفی کی تو ان کی ذات پاک سے کفر کی تمام خصلتوں کی نفی خود بخود ہو گئی، رہی بات ان کے کافر ہونے کی تو حاشا وکلا۔ بلکہ وہ تو ایک سچے اللہ کے بھیجے ہوئے نبی تھے۔ اسی طرح اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی جادو، شاعری اور کہانت جیسی افترا پردازیاں کی گئی (ان ساری افترا پردازیوں سے اللہ کی پناہ)، تو پھر علماء وصالحین اور دیگر بزرگان دین کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں جن کا مقام ومرتبہ انبیاء کے بعد ہے۔

آیت سے یہ بھی واضح ہے کہ شیاطین جادو سیکھایا کرتے تھے، فرمایا: ﴿ وَلَٰكِنَّ ٱلشَّيَٰطِينَ كَفَرُواْ يُعَلِّمُونَ ٱلنَّاسَ ٱلسِّحْرَ ﴾ "بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے"۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر میں اللہ تعالی کے فرمان ﴿ وَمَآ أُنزِلَ عَلَى ٱلْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَٰرُوتَ وَمَٰرُوتَ ﴾ کے تحت رقم طراز ہیں کہ: آیت میں حرف (ما) نفی کے لیے ہے، اور (واو) کا عطف (وَمَا كَفَر سُلَيمانُ) پر ہے، اور کلام میں تقدیم وتاخیر کا اسلوب ہے، چنانچہ تقدیری عبارت یوں ہے: (وما كفر سيلمان ، وما أنزل على الملكين، ولكن الشياطين كفروا ، يعلمون الناس السحر ببابل هاروت وماروت) ، لہذا ہاروت وماروت شیاطین سے بدل واقع ہے، آیت کی تفسیر میں جتنے اقوال ہیں ان میں سب سے بہتر اور درست تفسیر یہی ہے[1] ۔ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

(۱) تفسير قرطبي ۲/۳۵.

کہتے ہیں کہ آیت کا معنی(والذی أنزل علی الملکین) ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں فرشتے لوگوں کو جادو سیکھایا کرتے تھے جس کا مقصد لوگوں کو اس سے ڈرانا تھا نہ کہ اس جادو کی طرف دعوت دینا۔ زجاج کا کہنا ہے کہ یہی اکثر اہل لغت اور اہل نظر کا قول ہے، اور آیت کا مفہوم یہ کہ وہ دونوں فرشتے از راہ نہی لوگوں کو جادو سیکھایا کرتے تھے چنانچہ وہ ان سے کہتے: تم لوگ ایسا اور اس طرح کی حیلہ سازیاں نہ کرو تاکہ شوہر بیوی کے مابین تفرقہ ڈال دو(۱)۔

آیت کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان آزمائشوں سے گھرا ہوا ہے تاکہ اللہ تعالی اس کو پرکھے کہ ایا وہ ان مختلف آزمائشوں کے سامنے ثابت قدم رہتا ہے یا پھر حق سے منحرف ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالی جس کو چاہتا ہے اور جس چیز سے چاہتا ہے آزماتا ہے، جیسا کہ قوم طالوت کو دریا کے پانی سے روک کر آزمایا ، اسی طرح سور کے گوشت کھانے سے اللہ نے منع کر دیا ہے، کیوں کہ اسی ذات نے ساری مخلوق کو تخلیق بخشی اور اسی نے بہت ساری چیزوں سے روک رکھا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے سورہ انبیاء میں اپنے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُونَ﴾ [سورة الأنبياء:٢٣]۔ "وہ اپنے کاموں کے لئے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں اور سب (اس کے آگے) جواب دہ ہیں"۔

فرشتوں کے قول میں (جس کا ذکر آگے آرہا ہے) غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جادو انتہائی درجہ کا برا عمل ہے، اور وہ فرشتے خود اس کے سیکھنے سے ڈرا رہے تھے، لیکن اس تحذیر کے باوجود لوگوں کا ایک طبقہ ایسا تھا جو کفر پر اصرار کی وجہ سے اس جادو کی تعلیم پر ٹوٹ پڑا، اللہ تعالی ان فرشتوں کے متعلق فرماتا ہے: ﴿وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ يَقُولَآ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ﴾ "وہ دونوں بھی کسی شخص کو اس وقت تک نہیں سکھاتے تھے،جب تک یہ نہ کہہ دیں کہ ہم تو ایک آزمائش ہیں ، تو کفر نہ کر"۔ معلوم ہوا کہ جادو کفر ہے، اور جادو اور جادو گر ایک فتنہ ہے، جو کوئی اس کو سیکھتا ہے اس کا دین فتنہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فتنے انتہائی خطرناک ہوتے ہیں، ان سے بچ کر رہنا اور دوری اختیار کرنا بہت ضروری ہے، نیز یہ فتنے بطور آزمائش اور امتحان ہیں۔ اللہ تعالی ہمیں اور تمام مسلمانوں کو فتنوں سے محفوظ رکھے۔

---

(١) مرجع سابق ٣٧/٢.

بعض علماء تفسیر کا کہنا ہے کہ یہود اس جادو کے پیچھے لگ گئے جو ان دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا جو سر زمین عراق میں بابل کے مقام پر تھے، بندوں کی ابتلاء اور آزمائش کے لیے اللہ تعالی کی طرف سے ان پر جادو کا نزول ہوا اور پھر یہ دونوں لوگوں کو جادو سیکھاتے تھے، بات چاہے جو بھی ہو ایک مسلمان کا اس پر ایمان ہے۔ اور بعض مفسرین جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے کہتے ہیں کہ آیت کی تقدیری عبارت یوں ہے: (وما كفر سيلمان، وما أنزل على الملكين) یعنی سلیمان علیہ السلام نے کفر کیا اور نہ دو فرشتوں پر جادو اترا، اور یہ دو فرشتے جبریل اور میکائیل علیہما السلام ہیں (ولكن الشياطين كفروا، يعلمان السحر ببابل هاروت وماروت) لیکن شیاطین نے کفر کیا، بابل میں ہاروت اور ماروت جادو سیکھاتے تھے۔

اور یہ لوگ محض شر انگیزی کی غرض سے جادو سیکھتے، اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِۦ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَزَوْجِهِۦ﴾ "پھر لوگ ان سے وہ سیکھتے جس سے خاوند و بیوی میں جدائی ڈال دیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ سحر میں تاثیر ہے، لیکن یہ اللہ کی اجازت کے بغیر کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا، کیوں کہ اس کا فرمان ہے: ﴿وَمَا هُم بِضَآرِّينَ بِهِۦ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾ " اور دراصل وہ بغیر اللہ تعالی کی مرضی کے کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے " ۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ ہی پر مکمل اعتماد اور بھروسہ کریں کیوں کہ اللہ کی اجازت کے بغیر انسان کو کوئی بھی مصیبت نہیں پہنچ سکتی، ایک مومن کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ بلند و بالا اور عظیم اللہ کے ذریعہ اپنا بچاؤ کرتا اور اسی سے مدد حاصل کرتا ہے، کیوں کہ وہی اللہ سب کا محافظ اور قوت و غلبہ والا ہے، ابن سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اسباب چاہے جس قدر بھی قوی اثر رکھتے ہوں وہ سب قضا وقدر کے تابع ہیں، مستقل طور پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا(۱)۔

آگے اللہ تعالی بیان کر رہا ہے کہ یہ لوگ جس جادو کو سیکھ رہے یہ ان کے دین کے لیے سخت ضرر رساں ہے، اور اس کے نقصانات کے بالمقابل اس میں کچھ بھی نفع نہیں۔ ﴿وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا۟ لَمَنِ ٱشْتَرَىٰهُ مَا لَهُۥ فِى ٱلْءَاخِرَةِ مِنْ خَلَٰقٍ ۚ﴾

(۱) تفسير سعدى ۸۱/۱.

"یہ لوگ وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان پہنچائے اور نہ نفع پہنچا سکے، اور وہ جانتے ہیں کہ اس کے لینے والے کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں"۔

اس آیت سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ یہود کو یہ معلوم تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ کی تابعداری کے مقابلے میں جادو کو اختیار کرنے والے کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور جادو میں ان کی دلچسپی ایک خریدار کے مانند ہے جس کی قیمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی شکل میں چکانی پڑتی ہے، ان کو یہ بھی پتہ تھا کہ جادو اختیار کرنے والے کا نصیب اور انجام اچھا نہیں ہوتا لیکن پھر بھی ان کی دیدہ دلیری تھی۔ انسان کا یہی حال ہے کہ دانستہ طور پر شر کا مرتکب ہوتا ہے، اور خیر کو جانتے بوجھتے ترک کرتا رہتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان کی اس کرتوت اور انتخاب بد کی سخت ترین مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْاْ بِهِۦٓ أَنفُسَهُمْۚ لَوْ كَانُواْ يَعْلَمُونَ﴾ "اور وہ بدترین چیز ہے جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو فروخت کر رہے ہیں، کاش کہ یہ جانتے ہوتے" (بئسما) کلام عرب میں ذم کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس کا بیان گذر چکا ہے۔ آیت میں اللہ تعالی نے اس فعل کی قباحت کو بیان کیا ہے کہ وہ بدترین چیز ہے جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو فروخت کر رہے ہیں ﴿لوکانوا یعلمون﴾ یعنی کہ یہ لوگ اپنے اس اختیار میں جاہلوں کے مانند ہیں حالاں کہ یہ لوگ جانتے تھے کہ ایمان کے مقابلے میں جادو اختیار کر لینے والے کا آخرت میں کا کوئی حصہ نہیں، یہ جملہ ایسے ہی ہے جیسے کہ کوئی خیر کی معرفت رکھتے ہوئے اس کے برخلاف راہ اختیار کرے اور عقل ہوتے ہوئے اس غلطی کا مرتکب ہو تو اس کے تعلق سے کہا جاتا ہے: "اگر اس کو عقل ہوتی تو ایسا نہیں کرتا" گویا کہ اس کا یہ عمل بے عقل کے عمل کے مانند ہے، اس سے عقل کی نفی از راہ مجاز ہے اس کا حقیقی مفہوم مراد نہیں کہ اس کے پاس عقل ہی نہ ہو، کیوں کہ اگر حقیقی معنوں میں اس کے پاس عقل نہ ہوتی تو پھر اس کو ملامت ہی نہ کیا جاتا، اسی طرح یہود کا عمل جاہلوں کا عمل ہے حالاں کہ وہ جانتے بوجھتے تھے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے اس بہترین اختیار کو بیان فرمایا جس کو اپنانا ضروری تھا: ﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ ءَامَنُواْ وَٱتَّقَوْاْ لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ ٱللَّهِ خَيْرٌۖ لَّوْ كَانُواْ يَعْلَمُونَ﴾ "اگر یہ لوگ صاحب ایمان متقی بن جاتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہترین ثواب انہیں ملتا، اگر یہ جانتے ہوتے"۔ اس آیت

میں اس چیز کا بیان ہے جس کو اختیار کرنا ان کے لیے واجب تھا، اور وہ ہے اللہ پر ایمان اور اس کا تقوی، اگر یہ لوگ ایمان اور تقوی اختیار کرتے تو اللہ کی طرف سے بہترین ثواب انہیں ملتا، اس سے ایمان اور تقوی کے اعلی مرتبہ کا پتہ چلتا ہے جس کی بدولت بندہ اللہ کے ثواب کا مستحق بن جاتا ہے، کیوں کہ ایمان تقوی کی طرف لے جاتا ہے اور تقوی انسان کو اللہ تعالی کی حرام کردہ چیزوں سے روکتا اور اس کے اندر خشیت الہی اور اللہ کا خوف پیدا ہوتا ہے، لہذا جو اللہ کا تقوی اختیار کرتا وہ اللہ سے ڈرتا اور خوف رکھتا ہے۔(اگر یہ جانتے ہوتے) لیکن یہ لوگ تو اپنے اختیارات و تصرفات کے اعتبار سے جاہل کے درجے میں ہیں، کیوں کہ حق کو جانتے بوجھتے ان کے افعال و تصرفات حق کے مخالف ہوتے ہیں جیسا کہ سابقہ آیت میں اللہ تعالی نے ان کے متعلق فرمایا﴿ وَلَقَدْ عَلِمُوا۟ لَمَنِ ٱشْتَرَىٰهُ مَا لَهُۥ فِى ٱلْءَاخِرَةِ مِنْ خَلَـٰقٍ ﴾۔اور یہ سب کچھ ان کے کبر وغرور اور عناد کی وجہ سے ہے جس کی وضاحت اللہ تعالی نے سابقہ کئی آیتوں میں کردی ہے۔ مثلا: ﴿بِئْسَمَا ٱشْتَرَوْا۟ بِهِۦٓ أَنفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُوا۟ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ عَلَىٰ مَن يَشَآءُ ﴾ [سورة البقرة: ٩٠]۔ "بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا وہ انکا کفر کرنا ہے۔ اللہ تعالی کی طرف سے نازل شدہ چیز کے ساتھ محض اس بات سے جل کر کہ اللہ تعالی نے اپنا فضل جس بندہ پر چاہا نازل فرمایا " ۔اور اللہ تعالی کا فرمان:﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ءَامِنُوا۟ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُوا۟ نُؤْمِنُ بِمَآ أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَآءَهُۥ وَهُوَ ٱلْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ [سورة البقرة: ٩١]۔ "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالی کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لاؤ تو کہہ دیتے ہیں کہ جو ہم پر اتاری گئی اس پر ہمارا ایمان ہے، حالانکہ اس کے بعد والی کے ساتھ جو ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے، کفر کرتے ہیں"۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقُولُوا۟ رَٰعِنَا وَقُولُوا۟ ٱنظُرْنَا وَٱسْمَعُوا۟ ۗ وَلِلْكَـٰفِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾ مَّا يَوَدُّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِنْ أَهْلِ ٱلْكِتَـٰبِ وَلَا

ٱلْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَٱللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِۦ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ ذُو ٱلْفَضْلِ ٱلْعَظِيمِ ﴿١٠٥﴾

ترجمہ:

"اے ایمان والو تم (نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو) 'راعنا' نہ کہا کرو، بلکہ 'انظرنا' کہو یعنی ہماری طرف دیکھیے اور سنتے رہا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (۱۰۴)۔ نہ تو اہل کتاب کے کافر اور نہ مشرکین چاہتے ہیں کہ تم پر تمہارے رب کی کوئی بھلائی نازل ہو (ان کے اس حسد سے کیا ہوا) اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی رحمت خصوصیت سے عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے (۱۰۵)"۔

مسلمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتے تھے (رَاعِنا) یعنی ہمارا خیال رکھیے، وہ اس کا صحیح مطلب مراد لیتے تھے، اس سے یہودیوں کو ایک موقع ہاتھ لگ گیا اور وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لفظ سے مخاطب کرتے لیکن اس کا غلط مطلب نکالتے، لہذا اللہ تعالی نے اس لفظ کے استعمال سے ہی منع کر دیا تاکہ یہ دروازہ ہی بند ہو جائے: "اے ایمان والو تم (نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو) 'راعنا' نہ کہا کرو، بلکہ 'انظرنا' کہو یعنی ہماری طرف دیکھیے اور سنتے رہا کرو" اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اگر جائز کام فعل حرام کا وسیلہ ہو تو اس جائز کام سے روکا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں حسن ادب کی تعلیم دی گئی ہے، نیز الفاظ کے استعمال میں حسن انتخاب کی رعایت اور فحش کلامی سے بچنا چاہیے، برے الفاظ یا ایسے الفاظ جس کا نامناسب مفہوم لیا جا سکتا ہو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اسی لیے اللہ تعالی نے انہیں ایسے لفظ کا حکم دیا جس کا صرف بہتر معنی ہی مراد لیا جا سکتا ہے، فرمایا: (وقُولُوا انظرنَا) یعنی انظرنا کہو "ہماری طرف دیکھیے" کیوں کہ اس لفظ سے بھی مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ (وَاسْمَعُوا) "اور سنتے رہا کرو" آیت میں اللہ تعالی نے عمومی طور سننے کا حکم دیا ہے اور کیا سنا جائے اس کی تعیین نہیں کی تاکہ یہ ہر چیز کو عام ہو اور قرآن کریم اور سنت کا سننا اس میں داخل ہو چاہے اس کا سننا لفظ کے اعتبار سے ہو یا معنی کے اعتبار سے یا قبول کرنے کے اعتبار سے، اسی میں ادب کی پاسداری اور اطاعت کا لحاظ ہے۔ اس آیت سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کی ایذا رسانی یا استہزاء کی خاطر بات کا غلط مطلب نکالنے سے بچنا چاہیے، کیوں کہ ادب واحترام دین کا مقصود ہے۔

معلوم ہوا کہ فقہاء نے جن بعض مباح امور سے منع کیا ہے اس کا سبب یہی ہے ان سے مفاسد مرتب ہوتے ہیں، یعنی یا تو مفاسد سے ان کا تعلق ہوتا ہے یا وہ مباح امور دیگر فساد کو پیدا کرتے ہیں، تو ان کی ممانعت یا حرمت بسا اوقات لذاتہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ مفاسد تک پہنچنے کا وسیلہ ہوتے ہیں جس کے نتیجے اور انجام کار میں مفاسد جنم لیتے ہیں، اسی لیے ان کے یہاں یہ اصول ہے "الوسائل لہا حکم المقاصد" یعنی جو مقاصد کا حکم ہوگا وہی حکم وسائل پر بھی لاگو ہوگا۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے کافروں کو دردناک عذاب کی وعید سناتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلِلْكَٰفِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ " اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے "۔

آگے اللہ تعالی نے مسلمانوں کے خلاف یہود اور مشرکین کے شدید بغض وحسد کا بیان کیا ہے، فرمایا: ﴿مَّا يَوَدُّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ وَلَا ٱلْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ "نہ تو اہل کتاب کے کافر اور نہ مشرکین چاہتے ہیں کہ تم پر تمہارے رب کی کوئی بھلائی نازل ہو" یہ عدوات اس وجہ سے ہے کہ اسلام کے ذریعہ مسلمانوں پر خیر کا نزول ہوا اور پھر اللہ تعالی کا فضل بھی ان کو نصیب ہوا۔

آیت کریمہ سے یہ معلوم ہوا کہ یہود اور مشرکین کو یہ معلوم تھا کہ یہ جو کچھ اللہ تعالی کی طرف سے مسلمانوں پر نازل ہوتا ہے وہ اللہ کی پاس سے ان کے لیے خیر ہے، اور یہ لفظ، "خیر" کا عمومی معنی ہے جس میں اللہ تعالی کا عطا کردہ قرآن، سنت رسول، آداب، عبادات، کمزوری سے طاقت کی طرف مسلمان کے حالات کی تبدیلی، الفت ومحبت، نصرت الہی، قوت، بلند مقام ومرتبہ اور اس کے علاوہ اور بہت ساری اللہ کی عطا کردہ بھلائیاں جنہیں دیکھ کر کافر چراغ پا ہوتے ہیں، لہذا یہ سب مسلمانوں کے لیے ہے تو اللہ تعالی کی حمد وثنا بھی واجب ہے، نیز مسلمانوں کو احتیاط کی راہ اپناتے ہوئے دشمنان اسلام سے بچ کر رہنا ہوگا، کیوں کہ مسلمانوں کے حق میں خیر انہیں محبوب ہی نہیں، اسی لیے ان کے ساتھ طرز تعامل میں اس ربانی وضاحت کو مد نظر رکھنا ہوگا۔

اس کے بعد ایک بڑی عظیم بات بیان کی وہ یہ کہ وہ اللہ کی ذات ہی ہے کہ جس کو چاہتا ہے اپنی نوازش اور رحمت خصوصیت سے عطا فرماتا ہے، ارحم الراحمین کا فرمان ہے: ﴿وَٱللَّهُ يَخْتَصُّ

بِرَحۡمَتِهِۦ مَن يَشَآءُۚ وَٱللَّهُ ﴾ یعنی اللہ تعالی ہی مالک کل ہے، وہی جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت عطا کرتا اور اپنی رحمتوں کو اس کے ساتھ خاص کرتا ہے، لہذا ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب تبارک وتعالی سے اس کی رحمت وفضل کی دعا کرتا رہے تاکہ اسے خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالی مزید فضل وکرم سے نوازتا رہے۔اسی طرح اس پر یہ بھی واجب ہے کہ جو فضل اس کو ملا ہے اس کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کرے، مثلا یوں کہے: اللہ کے فضل سے مجھ کو یہ چیز ملی، میں نے جو کچھ کیا اللہ ہی کے فضل سے کیا، جو کچھ ملا اسی کے فضل سے، منفعت اور کامیابی سب اسی کا فضل ہے، نہ کہ اس کی نسبت اپنی عقل، فکر اور سمجھ کی طرف کرے ، کیوں کہ سمجھ دینے والا بھی تو اللہ ہی ہے اسی نے حصول علم، لکھنے سمجھنے اور حفظ کے سارے طریقے آسان کیے، خرید وفروخت اور نفع کو اسی نے آسان کیا، اس کے علاوہ اور بہت ساری نعمتیں ہیں اور ہر نعمت میں اسی طرح اللہ تعالی نے ہمارے لیے راستے آسان کیے۔

آگے اللہ تعالی اپنے وسیع فضل کو بیان کر رہا ہے: ﴿ والله ذُو الفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ یعنی اللہ تعالی کا فضل انتہائی عظیم ہے اس کی کوئی حد نہیں بیان کی جاسکتی، اس لیے ایک مسلمان کو ہر طرح کی بھلائی اسی ذات سے طلب کرنی چاہیے جس کا فضل عظیم ہے۔

﴿مَا نَنسَخۡ مِنۡ ءَايَةٍ أَوۡ نُنسِهَا نَأۡتِ بِخَيۡرٖ مِّنۡهَآ أَوۡ مِثۡلِهَآۗ أَلَمۡ تَعۡلَمۡ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٌ ﴿١٠٦﴾ أَلَمۡ تَعۡلَمۡ أَنَّ ٱللَّهَ لَهُۥ مُلۡكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۗ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِن وَلِيّٖ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٠٧﴾ أَمۡ تُرِيدُونَ أَن تَسۡـَٔلُواْ رَسُولَكُمۡ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِن قَبۡلُۗ وَمَن يَتَبَدَّلِ ٱلۡكُفۡرَ بِٱلۡإِيمَٰنِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ ﴿١٠٨﴾﴾

ترجمہ:

"جس آیت کو ہم منسوخ کردیں، یا بھلادیں اس سے بہتر یا اس جیسی اور لاتے ہیں، کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (۱۰۶)۔ کیا تجھے علم نہیں کہ زمین اور آسمان کا ملک اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی ولی اور مددگار نہیں (۱۰۷)۔ کیا تم اپنے رسول سے یہی پوچھنا چاہتے ہو جو اس سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام) سے پوچھا گیا تھا (سنو) ایمان کو کفر سے بدلنے والا سیدھی راہ سے بھٹک جاتا ہے (۱۰۸)" ۔

اللہ تعالی اپنی حکمت اور بندوں کے ساتھ تدریجی طرز تعامل کو بیان کر رہاہے تاکہ بتدریج اور یکے بعد دیگرے خیر وبھلائی ان کو ملتی رہے، فرمایا: ﴿مَا نَنسَخۡ مِنۡ ءَايَةٍ أَوۡ نُنسِهَا نَأۡتِ بِخَيۡرٖ مِّنۡهَآ أَوۡ مِثۡلِهَآ﴾ " جس آیت کو ہم منسوخ کردیں، یا بھلادیں اس سے بہتر یا اس جیسی اور لاتے ہیں"۔ اس آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ تعالی کبھی کبھی نازل کردہ احکامات ختم اور تبدیل کرتا ہے، پس کسی دوسرے حکم کے پہلی آیت کو منسوخ کرکے ایک حکم سے دوسرے حکم کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور بسا اوقات آیت کو یکسر دل سے نکال کر بھلادیتا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بعض ایسی روایات کا ذکر کیا ہے جن میں اللہ تعالی نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان آیات کو بھلادیا ہے، جس کی حکمت اللہ تبارک وتعالی ہی جانتا ہے ۔ اللہ نے ساتھ ہی نسخ اور نسیان دونوں صورتوں میں اپنے مزید فضل کا بیان کیا کہ وہ یا تو اس سے بہتر آیت نازل کرتا ہے یا اسی جیسی دوسری آیت نازل فرمادیتا ہے جس میں کسی حکم یا دوسری چیز کا بیان ہوتا ہے جس میں مکلف کی مصلحت متحقق ہوتی ہے، چنانچہ نسخ کا وقوع کسی نہ کسی مصلحت کی وجہ سے ہوتا ہے جس کا بخوبی علم اللہ کے پاس ہوتا ہے حالاں کہ ابتدائی مرحلہ میں منسوخ شدہ حکم ہی زیادہ بہتر ہوتا ہے اور پھر واقع اور بعد کے حالات میں حکم ناسخ امت کے لیے زیادہ افضل ہوتا ہے، اور یہ اللہ کی رحمت اور اس کی حکمت ہے وہ مخلوق کے حالات کی رعایت میں ایسا کرتا ہے، وہ علم والا حکیم اور نہایت رحم والا ہے۔ اور یہ مالک کی اس کے ملک کی خصوصیات میں سے ہے، یعنی نسخ کے ذریعہ خیر ہی میں اس سے زیادہ یا اسی جیسا دوسرا خیر لاتا ہے، پاک ہے اللہ کی ذات اور عظمت والی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عالم کے لیے فتوی دینا یا علمی مسائل تحریر میں لانا تبھی ممکن ہے جب اس کو قرآن وسنت رسول کے ناسخ ومنسوخ کا پتہ ہو، اور جو کوئی بغیر علم کے اس کی جرأت کرتا ہے تو وہ اس چیز میں پڑتا ہے جس سے نابلد ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے ایک بڑی اہم بات کہی : ﴿أَلَمۡ تَعۡلَمۡ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٌ﴾ "کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے" یہ سوال بطور تقریر ہے: یعنی کیا تم اقرار نہیں کرتے کہ اللہ تعالی ہر چیز پر قادر ہے؟ تو پھر کیوں تم نسخ کا انکار یا اس پر اعتراض کرتے ہو۔ یہ دراصل یہود پر رد ہے جو کہ کعبہ کی طرف تحویل قبلہ یا اس کے علاوہ دیگر امور کا انکار کرتے تھے ۔ ﴿أَلَمۡ تَعۡلَمۡ أَنَّ ٱللَّهَ

عَلَىٰ كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيرٌ ﴾ تو اے شک کرنے والے اور اے جھٹلانے والے اور اے منافق اللہ کی قدرت کو جان لو پھر اللہ کی قدرت اور جو کچھ وہ منسوخ کرنا چاہے ان دونوں کے درمیان کون سی چیز حائل ہو سکتی ہے، آیتیں اللہ ہی کے پاس سے آتی ہیں، نسخ کا حکم بھی اسی کی طرف سے ہوتا ہے اور احکام اسی کے یہاں سے مقرر ہوتے ہیں۔ مومن جب اللہ کا یہ فرمان: ﴿أَلَمۡ تَعۡلَمۡ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيرٌ ﴾ سنتا ہے تو زبان حال سے پکار اٹھتا ہے: کیوں نہیں، اے میرے رب میں جانتا ہوں۔

پھر یہی سوال تقریری دوسری مرتبہ ایک دوسرے امر عظیم کے ساتھ دہرایا جارہا ہے: ﴿ أَلَمۡ تَعۡلَمۡ أَنَّ ٱللَّهَ لَهُۥ مُلۡكُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ ﴾ "کیا تجھے علم نہیں کہ زمین اور آسمان کا ملک اللہ ہی کے لئے ہے" اگر نہیں تو پھر آسمان اور زمین کا ملک کس کے لیے ہے، حکم تو اسی کا چلتا ہے جس چیز کا بھی ارادہ کرے، اور جس پر چاہتا ہے اپنا فضل عام کرتا ہے۔ پاک ہے وہ اور برتری والا ہے، سارا کا سارا حکم اسی کا ہے لہذا جو جانتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اسی کے لیے آسمان اور زمین کا ملک ہے اس کا واجب بنتا ہے کہ وہ کہے: اے رب میں نے سن لیا، جان لیا اور مان لیا، اور اللہ تعالی کے کسی حکم یا تدبیر پر اعتراض نہ کرے۔

آیت سے تقریری اسلوب بیان کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور اس اسلوب کی نفسیاتی اور فکری تاثیر دعوت وتربیت اور توجیہ وارشاد کے میدان میں انتہائی اہم ہے اور اس کا استعمال موقع اور محل کی مناسبت سے مطلوبہ امور کے اقرار کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

اس کے بعد اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿وَمَا لَكُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴾ "اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی ولی اور مددگار نہیں" ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالی کی حکمت اور اس کی بادشاہت کے قوانین پر اعتراض کرتا ہے یہ آیت تحذیر کے طور پر ہے تاکہ وہ خبردار ہو جائے اس بات سے کہ اللہ کے سوا کوئی اس کا ولی ہے نہ مددگار جو اس کی مدد کر سکے، اللہ کے سوا کوئی حقیقی ولی یا مددگار ہے ہی نہیں جس کو ولایت اور مدد کا حق حاصل ہو۔ اے اللہ تو ہی ہمارا ولی اور ہمارا مددگار ہے، تجھ سے ہی مدد ملتی ہے، جس کا تو ولی وہ کبھی ذلیل نہیں ہو سکتا، اور جس سے تو عداوت رکھے وہ کبھی عزت نہیں پا سکتا۔

آگے کی آیت میں اللہ تعالی صحابہ رضی اللہ عنہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعامل کے سلسلے ایک بڑا دقیق ادب سیکھارہاہے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالی نے صحابہ کو منع کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے چیزوں کے وقوع سے پہلے سوال کریں: ﴿ أَمْ تُرِيدُونَ أَن تَسْـَٔلُواْ رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِن قَبْلُ ﴾ یعنی "کیا تم اپنے رسول سے یہی پوچھنا چاہتے ہو جو اس سے پہلے موسیٰ (علیہ السلام) سے پوچھا گیا تھا" یہ سوال استفہام انکار کے طور پر ہے تاکہ انہیں علم ہو جائے کہ یہ موسی علیہ السلام کے ساتھ یہود کا طرز عمل رہاہے، حدیث میں وارد ہے: "جو کچھ میں نے بیان کرنا چھوڑ دیا ہے تم مجھے ویسے ہی چھوڑ دو، کیوں کہ تم سے پہلے کے لوگ کثرت سوال اور نبیوں سے اختلاف ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئے تھے، لہذا میں تم کو کسی چیز کا حکم دوں تو اس میں سے اپنی استطاعت بھر بجالاؤ، اور جب میں کسی چیز سے منع کروں تو اسے چھوڑ دو"(۱)۔ اس حدیث میں سوال سے ممانعت کا سبب بیان کیا گیا ہے جس سے عقل انسانی کا نقص واضح ہوتاہے اور شریعت ہی اس نقص کا مداواہے، وہی اسے درست رکھتی اور مصلحت کی راہ دیکھاتی ہے۔ حدیث سے واضح ہوا کہ کثرت سوال اختلاف کا ذریعہ ہے چنانچہ بسا اوقات ایک شخص سوال کرتاہے، دوسرا اس میں احتمال ظاہر کرتاہے، تیسر اس سوال میں مزید سوال نکالتا ہے اور پھر اختلاف جنم لیتاہے۔ اللہ تعالی اپنے بندوں کی ضروریات سے بخوبی آگاہ ہے، اس نے رسولوں اور کتابوں کو ان کے لیے بھیجا ہی اس لیے ہے کہ وہ ان کے لیے خیر چاہتاہے، کوئی خیر کا باب ایسا نہیں چھوڑ سکتا جس کو وہ نہ بتلائے اور شر کا کوئی باب ایسا نہیں جس سے وہ انہیں نہ ڈرائے، اس لیے سوال کرنے میں جلد بازی کی ضرورت ہی نہیں، اور کبھی کبھی ترک امر میں ہی خیر ہوتاہے جیساکہ حج کے تعلق سے ان کا سوال جس وقت کہ صحابی رسول نے پوچھا: اے اللہ کے رسول ! یہ حج ہر سال فرض ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ انہوں یہی سوال تین مرتبہ کیاتو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر میں ہاں کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا اور پھر تم اس کی طاقت نہ رکھتے"۔(۲)

---

(۱) مسلم ۲/۹۷۵ حدیث نمبر (۱۳۳۷)

(۲) مسلم ۲/۹۷۵ حدیث نمبر (۱۳۳۷)

یہاں پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ اللہ تعالی کے اوامر ونواہی میں خیر ہی خیر ہے اور اس کی حکمت بسا اوقات انسان نہیں جان سکتا، اس لیے انسان کے لیے اللہ کے اوامر ونواہی میں سوائے "سمعنا واطعنا" کہنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں، اگر اس کی حکمت تک رسائی ہو جاتی ہے تو اچھی بات ہے، اور اگر اس کی حکمت نہیں جان پاتا تو بھی خیر ہی زبان پر لائے۔

آیت سے موسی علیہ السلام کی قوم کا موسی علیہ السلام سے بے جا سوالات کا ثبوت ملتا ہے، جیسا کہ اس مبارک سورہ کی گذشتہ بعض آیتوں سے واضح ہو چکا ہے، حتی کہ وہ لوگ موسی علیہ السلام سے اللہ تعالی کو کھلم کھلا دیکھنے کا مطالبہ کر بیٹھے۔

ابن سعدی رحمہ اللہ تعالی نے ذکر کیا ہے سوال کی ممانعت سے مراد ایسے سوالات ہیں جن کا مقصد از روئے اعتراض اور پریشان کر کے تکلیف دینا ہو، رہے وہ سوالات جن کا مقصد رہنمائی اور تعلیم ہو تو ایسے سوالات پسندیدہ ہیں(۱) ۔ بعض مفسرین نے اس کے مختلف دلائل بھی ذکر کیے ہیں، مثلا اللہ تعالی کا فرمان: ﴿يَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلۡخَمۡرِ وَٱلۡمَيۡسِرِ﴾ [سورة البقرة:٢١٩]- "لوگ آپ سے شراب اور جوئے کا مسئلہ پوچھتے ہیں" اس کا یہ قول: ﴿وَيَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلۡيَتَـٰمَىٰ﴾ [سورة البقرة:٢٢٠]- "اور تجھ سے یتیموں کے بارے میں بھی سوال کرتے ہیں" ۔ نیز فرمایا: ﴿يَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلۡأَهِلَّةِ﴾ [سورة البقرة:١٨٩]- "لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں" ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہتے ہیں: "میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے اچھے لوگ نہیں دیکھے، انہوں نے آپ سے صرف تیرہ سوالات پوچھے اور ان تمام کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ وہ لوگ وہ سوال پوچھا کرتے جو ان کے حق میں مفید ہوتے(۲)۔ اس سے معلوم ہوا سولات کے تعلق سے صحابہ نے اللہ تعالی کی اس ممانعت کا پورا التزام کیا اور ان کے سارے سوالات تفقہ فی الدین تک محدود تھے، اسی لیے ابن عباس رضی اللہ عنہمانے ان معدودے چند سوالوں کی وجہ سے ان کی تعریف کی، نیز وہ ان سوالوں میں تعنت واعتراض سے دور رہے، معلوم ہوا کہ سوال کے آداب کا پاس ولحاظ بہت اہم ہے، اور انسان کو

---

(١) تفسير ابن سعدي١/٨٤-٨٥.

(٢) تفسير قرطبي ٣/٢٨.

وہی سوال کرنا چاہیے جو اس کے حق میں مفید ہوں، یا جن سے جہالت اور شر ختم ہو، اور بے سود سوالات کر کے حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔

اس کے بعد اللہ تعالی ڈراتے اور آگاہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿وَمَن يَتَبَدَّلِ ٱلْكُفْرَ بِٱلْإِيمَٰنِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ﴾ "(سنو) ایمان کو کفر سے بدلنے والا سیدھی راہ سے بھٹک جاتا ہے"۔ آیت میں ایمان کی قدر وقیمت کا بیان ہے، یعنی ایمان ایک مضبوط قلعہ ہے اور یہی صراط مستقیم یعنی سیدھا راستہ ہے، جو کوئی ایمان کو کفر سے بدل دیتا ہے وہ سیدھی راہ سے بھٹک جاتا ہے کیوں کہ کفر ضلالت وگمراہی کی راہ ہے اور ایمان اللہ تعالی کی رضامندی دلانے والی سیدھی راہ ہے جو اس جنت تک پہونچاتی ہے جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔

نیز یہ پتہ چلا کہ جس کو اللہ تعالی کوئی نعمت عطا کرے تو اس نعمت کو معصیت سے نہ بدلے، مثال کے طور زرق کی نعمت کو فضول خرچی سے بدل کر اسے اللہ تعالی کی اطاعت کی بجائے دوسری جگہوں پر خرچ کرنے لگے، یا اس نعمت کے بدلے کبر وغرور اور سرکشی پر اتر آئے یا جس مقصد سے اللہ تعالی نے وہ نعمت عطا کی اس سے نکل کر کوئی اور راہ اپنالے۔

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ ٱلْحَقُّ ۖ فَٱعْفُوا۟ وَٱصْفَحُوا۟ حَتَّىٰ يَأْتِىَ ٱللَّهُ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾ وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا۟ لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ ٱللَّهِ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٠﴾ وَقَالُوا۟ لَن يَدْخُلَ ٱلْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَٰرَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا۟ بُرْهَٰنَكُمْ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُۥ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُۥٓ أَجْرُهُۥ عِندَ رَبِّهِۦ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ وَقَالَتِ ٱلْيَهُودُ لَيْسَتِ ٱلنَّصَٰرَىٰ عَلَىٰ شَىْءٍ وَقَالَتِ ٱلنَّصَٰرَىٰ لَيْسَتِ ٱلْيَهُودُ عَلَىٰ شَىْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ ٱلْكِتَٰبَ ۗ كَذَٰلِكَ قَالَ ٱلَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَٱللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ فِيمَا كَانُوا۟ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿١١٣﴾﴾

ترجمہ:

ان اہل کتاب کے اکثر لوگ باوجود حق واضح ہو جانے کے محض حسد وبغض کی بنا پر تمہیں بھی ایمان سے ہٹا دینا چاہتے ہیں، تم بھی معاف کرو اور چھوڑو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لائے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔(۱۰۹) تم نمازیں قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہا کرو اور جو کچھ بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے، سب کچھ اللہ کے پاس پالو گے، بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے(۱۱۰)۔ یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا، یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں، ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو(۱۱۱)۔ سنو جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے۔ بیشک اسے اس کا رب پورا بدلہ دے گا، اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ غم اور اداسی(۱۱۲) ۔یہود کہتے ہیں کہ نصرانی حق پر نہیں ، اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہودی حق پر نہیں، حالانکہ یہ سب لوگ تورات پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ان ہی جیسی بات بے علم بھی کہتے ہیں ، قیامت کے دن اللہ ان کے اس اختلاف کا فیصلہ ان کے درمیان کر دے گا(۱۱۳) ۔

اللہ تعالی مسلمانوں کو ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اہل کتاب کے پوشیدہ حالات سے آگاہ کر رہا ہے کہ "ان اہل کتاب کے اکثر لوگ باوجود حق واضح ہو جانے کے محض حسد وبغض کی بنا پر تمہیں بھی ایمان سے ہٹا دینا چاہتے ہیں" یہ اللہ تعالی کی طرف سے اہل کتاب کی مسلمانوں کے خلاف بغض وحسد کی حقیقت بیانی ہے جس کی جانکاری اللہ تعالی کے بتلائے بغیر ناممکن تھی، چنانچہ اللہ تعالی نے مسلمانوں کے لیے ان کی حقیقت کھول کر سامنے رکھ دی، کیوں کہ حاسد کے اندر حسد اسی وقت جنم لیتا ہے جب اسے محسود پر کی جانے والی نعمت کا پتہ ہوتا ہے، اس کا ثبوت اللہ تعالی کے قول: ﴿مِّنۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ ٱلۡحَقُّۖ﴾ میں ہے، معلوم ہوا کہ انہیں اس بات کا اعتراف تھا کہ مسلمان حق پر ہیں، اور ان کا نبی سچا ہے، اور اللہ تعالی کی کتاب یعنی قرآن کریم بھی حق ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ لوگ مسلمانوں سے ان کی نعمت ایمان پر حسد نہ کرتے، کیوں کہ حسد تو نعمت ہی پر ہوتا ہے۔

اسی طرح آیت کریمہ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ لوگ مسلمانوں کو دوبارہ کفر کی طرف لوٹانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور ان کو دین اسلام سے الگ کر دینے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑتے کبھی شبہات وشہوات پھیلاتے اور بھڑکاتے ہیں جو کہ ایک مسلمان کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور اس کو دین سے دور کر دیتے ہیں، یا ایسی چیزیں نشر کرتے ہیں جس کو وجہ سے مسلمان دین میں تفریط اور سستی کا شکار ہو کر دین ہی کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ لہذا مسلمانوں کے بارے میں ان کے خفیہ مقاصد کے اس واضح بیان کے بعد حد درجہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس کی بعد اللہ تعالی ان کے ساتھ طرز تعامل کا حکم دے رہا ہے: ﴿فَٱعۡفُواْ وَٱصۡفَحُواْ حَتَّىٰ يَأۡتِيَ ٱللَّهُ بِأَمۡرِهِۦٓ﴾ "تم بھی معاف کرو اور چھوڑو یہاں تک کہ اللہ تعالی اپنا حکم لائے" ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت قتل والی آیت سے منسوخ ہے(۱)۔ اس طرز تعامل کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالی نے پہلے انہیں معاف کرنے اور چھوڑ دینے کا حکم دیا یہاں تک کہ مدینہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی مکاریوں کے بعد جنگ کی گھڑی آن پہونچے، تاکہ اس عفو ودر گذر اور انتظار کے بعد ان پر حجت قائم ہو جائے اور وہ سدھر جائیں، لیکن پھر بھی وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ مکر وفریب کرتے رہے۔

آگے اللہ تعالی مومنوں کے نزدیک ایک ثابت شدہ امر کے خبر دے رہا ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ﴾" یقیناً اللہ تعالی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے "اس لیے وہی ان کی مدد پر بھی قادر ہے لیکن اللہ تعالی کی سنت کا تقاضا ہے کہ ہر چیز کا سبب اور وقت مقرر ہے، اور نصرت الہی کے بھی اسباب، وقت، حالات اور وجوہات ہیں: ﴿حَتَّىٰ يَأۡتِيَ ٱللَّهُ بِأَمۡرِهِۦٓ﴾ "یہاں تک کہ اللہ تعالی اپنا حکم لائے"۔

﴿حَتَّىٰ يَأۡتِيَ ٱللَّهُ بِأَمۡرِهِۦٓ﴾ آیت میں غور کریں، یہ مومن کے بڑی طاقت ہے، اسی لیے وہ صبر کرتا رہتا ہے "یہاں تک کہ اللہ تعالی اپنا حکم لائے"، کوشش کرتا رہتا ہے اور مایوس نہیں ہوتا "یہاں تک کہ اللہ تعالی اپنا حکم لائے"، "بیمار ہونے پر دوا علاج جاری رکھتا ہے "یہاں تک کہ اللہ تعالی اپنا حکم لائے" ہر

---

(۱) تفسير ابن كثير ١/١٥٨.

چیز میں اسباب اختیار کرتا ہے "یہاں تک کہ اللہ تعالی اپنا حکم لائے" یہ آیت مومن کے لیے ایک ایسی طاقت ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے سارے معاملات میں تقویت حاصل کرتا ہے۔ ﴿حَتَّىٰ يَأْتِيَ ٱللَّهُ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾۔

اس کے بعد اللہ تعالی اسلام کے واجبی امور نماز کے قیام اور زکوۃ کی ادائیگی کی طرف توجہ دلا رہا ہے: ﴿وَأَقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا۟ لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ ٱللَّهِ﴾۔ "تم نمازیں قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہا کرو اور جو کچھ بھلائی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے، سب کچھ اللہ کے پاس پالو گے" یہ اقامت صلوۃ اور زکوۃ کی ادائیگی اللہ تعالی کا واجبی حکم ہے اور مسلمان جو کچھ بھلائی آگے بھیجتا ہے وہ اسی کے لیے ہے اور وہ اس کو اللہ غالب وحکمت والے کے پاس بالکل محفوظ پالے گا۔ اور اللہ تعالی کے یہاں وہ ہرگز ضائع نہ ہوگا، بلکہ وہ ہمیشگی کی نعمت کی شکل میں رب العالمین کے پاس موجود ہوگا۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے آیت کا اختتام اپنے فرمان ﴿إِنَّ ٱللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ سے کیا۔ یعنی وہ اللہ ہر ایک کو، جو آگے بھیج رہا، اور جو عمل کر رہا سب کچھ دیکھنے والا ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں اگرچہ وہ ذرہ کے برابر یا اس سے بھی چھوٹی چیز کیوں نہ ہو۔ اس سیاق قرآنی میں مومن کے لیے تشجیعی پہلو ہے، یعنی مومن اس دنیا میں جو بھی نیکی کا کام انجام دیتا ہے وہ ضیاع سے محفوظ ہے اور اپنی آخرت میں اس کو مکمل طور سے پالے گا، اسی طرح سے خیر کا لفظ ہر قسم کے خیر اور بھلائی کو عام ہے، اس لفظ میں خیر و بھلائی کی ساری قسمیں اور تمام مجالات شامل ہیں، نیز حرف "من" تبعیض کے معنی میں ہے جس سے مراد خیر کا ہر جزو ہے، یعنی خیر کے اجزاء واقسام میں سے کچھ بھی تم آگے بھیجو گے سب کچھ اللہ کے پاس پالو گے۔

اگلی آیت میں اللہ تعالی اہل کتاب کی کذب بیانی اور حقائق کو پلٹنے کی عادت بیان کر رہا ہے: ﴿وَقَالُوا۟ لَن يَدْخُلَ ٱلْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَٰرَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ﴾ " یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا، یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں" یعنی ان لوگوں نے دوسروں کو چھوڑ کر جنت صرف اپنے لیے سوچ رکھا ہے اور دوسرے معنی میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو جنت میں جانا چاہتا ہے اس کو یہودی بننا ہوگا جیسا کہ یہود کا گمان ہے یا نصرانی بننا ہوگا جیسا کہ نصاری کا خیال

ہے ، چنانچہ ہر کوئی یہی گمان کئے بیٹھا کہ جنت اسی کی ہے ، اس سے معلوم ہوا کہ اپنے عقیدے میں منحرف بھی یہی خیال کرتا ہے کہ وہ حق پر ہے ، اور وہ جس راہ پر ہے وہ اسے جنت تک لے جائے گی وہ حقیقت کی طرف نہیں دیکھتا، اور حق پہچان جائے تب بھی حق سے الگ ہو جاتا ہے، کیوں کہ باطل کا اس پر غلبہ ہو چکا ہوتا ہے یا اپنی قوم اور ہم مذہب کی ایذار سانی کا خوف اسے حق نہیں قبول کرنے دیتا الا یہ کہ کوئی حق کے سامنے اپنی خواہش نفسانی کو کچل دے۔اپنے آپ کو دغا دینے والوں کا یہی حال ہے۔

پھر اللہ تعالی یہ بیان کر رہا ہے کہ یہود و نصاری کا حال محض تمنا رکھنے والے شخص کے مانند ہے (تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ) یعنی یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں اور ایسی آرزوؤں کی کوئی قیمت نہیں جس کی کوئی حقیقت نہ ہو جب تک کہ اس کی کوئی دلیل اور ثبوت نہ ہو ، فرمایا ﴿قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴾ "ان سے کہو اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو" چنانچہ دلیل ایسی ہی چیز ہے جسے جھوٹا، عناد پرست ، مغرور اور غلط تاویلات کرنے والا پیش کرنے سے عاجز ہو گا ، کیوں کہ اصل دلیل جو ان کی کتابوں میں ملتی ہے وہ تو نبی امی کی بعثت کے وقت اس کی پیروی ان پر واجب کرتی ہے اس کی دلیل قرآن ہے جو تورات کی تصدیق کرتا ہے۔

آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنت صرف دعوی یا نام رکھ لینے یا کسی کی طرف اپنی نسبت کر لینے سے نہیں ملتی، بلکہ اس کے لیے اللہ کے حکم کے مطابق حق کی پیروی ضروری ہے۔اسی لیے اس مباحثہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین اسلام ہر معاملے میں دلیل اور ثبوت پر قائم ہے اور جو اس دین سے انحراف کا شکار ہیں ان کے پاس اپنے باطل کے ثبوت میں کوئی صحیح دلیل نہیں ہے، اسی لیے وہ دلیل والوں کا مقابلہ دلیل و برہان کی بجائے ایذار سانی اور جھوٹ سے کرتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہوتی۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان کی تردید کر رہا ہے (بَلَى) یعنی بات ایسی نہیں جیسا کہ تمہارا دعوی ہے، یہ جنت تمہاری آرزوؤں اور دعوؤں سے نہیں ملنے والی، ہاں لیکن : "جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے "یعنی جنت جن کے لیے ہے وہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے سر تسلیم خم کر دیا، اللہ کے سامنے جھک گئے اور پوری دلجمعی کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو کر خالص اللہ کے لیے عمل کئے

اور جو کچھ بھی کیا اس میں درجہ ٔاحسان پر فائز رہے۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں "آیت میں وجہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا کیوں کہ وہ انسان کے ظاہر کا سب سے اعلی واشرف حصہ ہے[1]۔ یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے مستحق ہیں۔ ﴿ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُۥ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُۥٓ أَجْرُهُۥ عِندَ رَبِّهِۦ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾ " سنو جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے۔ بیشک اسے اس کا رب پورا بدلہ دے گا، اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ غم اور اداسی "یعنی ان کا اجر جنت ہے، انہی لوگوں کے لیے خوف سے امن ہے اور انہیں مستقبل میں کبھی بھی غم لاحق نہ ہوگا، کیوں کہ حال اور مستقبل کے خوف اور ماضی کے ضائع مواقع اور فوت شدہ اوقات پر غم وحسرت سے انسان کی زندگی بے مزہ اور ناخوشگوار ہو کر رہ جاتی ہے جنہیں لوٹایا نہیں جاسکتا، لہذا اس طرح کے سارے خوف جنت میں ختم ہو جائیں گے، اور اہل جنت کو کسی طرح کا خوف وغم لاحق نہ ہوگا، بلکہ دائمی فرحت وسرور میں ہوں گے۔ اے اللہ ہمیں جنت عطا کر اور جنت سے قریب کرنے والے قول وعمل کی توفیق دے۔

آیت سے یہ بھی مفہوم نکلا کہ جو ان مذکورہ اوصاف سے متصف نہیں وہ جہنمی ہے ، تو پھر جہنم سے نجات اخلاص للہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

اللہ تعالی اس کے بعد یہود ونصاری کے متعلق فرماتا ہے: ﴿وَقَالَتِ ٱلْيَهُودُ لَيْسَتِ ٱلنَّصَـٰرَىٰ عَلَىٰ شَىْءٍ وَقَالَتِ ٱلنَّصَـٰرَىٰ لَيْسَتِ ٱلْيَهُودُ عَلَىٰ شَىْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ ٱلْكِتَـٰبَ﴾ " یہود کہتے ہیں کہ نصرانی حق پر نہیں ، اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہودی حق پر نہیں، حالانکہ یہ سب لوگ تورات پڑھتے ہیں" آیت میں اللہ تعالی نے اہل کتاب کا حال بیان کیا ہے کہ یہود ونصاری کے درمیان خود بغض وحسد ، مخالفت وعداوت اور آپس میں عناد پایا جاتا ہے، حالاں کہ انہیں تورات اور انجیل کی شریعت کا علم ہے، اور تورات اور انجیل میں سے ہر ایک کی کسی وقت میں شرعی حیثیت تھی، لیکن ان لوگوں نے آپسی عناد ودشمنی ، کفر اور غلط کا مقابلہ غلط سے کرنے میں اپنی پوری محنت جھونک ڈالی حالاں

---

(١) تفسير قرطبي ٢/٥٢.

کہ وہ تورات اور انجیل پڑھتے تھے، یہ ان کی حالت تھی جب کہ وہ سب کے سب بنی اسرائیل سے تھے، تو بھلا ان کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا رویہ ہو گا جو کہ اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے تھے۔

اسی طرح آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بغض وعناد کی یہ روش اس کے بالکل برعکس ہے جیسا ان کو حقیقت میں ہونا چاہیے تھا کیوں کہ ان کے پاس تورات وانجیل کا علم تھا اور اللہ تعالی نے بتایا بھی ہے کہ وہ اس کو پڑھا کرتے تھے، اس سے یہ ظاہر ہے کہ انسان کے پاس اللہ کی آیتیں ہوتے ہوئے جب اللہ کے نہیں ڈرتا تو حق کا انکار کر دیتا ہے اور خود نوائی اور اپنی غلطیوں کی حمایت کرتا ہے کیوں کہ اس کا رجحان ہی غلبہ پسندی اور اپنی ذات اور حالت پر فخر کی طرف ہوتا ہے۔ پتہ چلا کہ بعض نفسیاتی حالات ایسے ہوتے جس میں آدمی کو ہوشیار رہنے کہ ضرورت ہے تاکہ جس چیز میں یہ لوگ پھنسے ہیں وہ بھی اس میں نہ پھنس جائے ۔ کیوں کہ ہوائے نفس اور شیطان دونوں اپنے عمل میں رواں دواں ہیں اور انسان کو حق سے گمراہی کی طرف پھیر دیتے ہیں پھر انسان بتدریج عناد اور باطل کے ذریعہ حق پر غلبہ کی تڑپ اور پھر اپنے غلط مقاصد کی تاویل کی کوشش میں لگ جاتا ہے اس لیے باطل سے بچنے کی حق کے پاس کوئی جائے پناہ نہیں سوائے دعا، تقوی، اللہ اور اس کی کتاب اور سنت رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مضبوطی سے پکڑنے کے۔

مذکورہ دونوں اصناف یعنی یہود ونصاری میں تیسری صنف کے لوگ بھی شامل ہیں جس کی وضاحت اللہ تعالی نے اس آیت میں کی: ﴿كَذَٰلِكَ قَالَ ٱلَّذِينَ لَا يَعۡلَمُونَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ﴾ "اسی طرح ان ہی جیسی بات بے علم بھی کہتے ہیں" یہ تیسری قسم کے لوگ ہیں، امام قرطبیؒ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: جمہور مفسرین کے قول کے مطابق اس سے مراد کفار عرب ہیں، کیوں کہ ان کے پاس کوئی کتاب نہیں لہذا اہل کتاب بھی اس طرز زندگی میں ان جاہل کفار عرب کے ساتھ ان ہی کے برابر ہیں ، اس سے پتہ یہ چلا کہ جب علم ومعرفت سے اللہ تعالی کا تقوی نہ حاصل ہو اور اس کے حکم کے مطابق اس کی پیروی نہ ہو تو بہت جلد ایسے علم ومعرفت پر ہوائے نفس کا قبضہ جم جاتا ہے اور پھر عالم مکمل طور سے جاہل کے مانند ہو جاتا ہے کیوں کہ اس نے اپنے علم سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھایا ہوتا ہے بلکہ اپنی ہوا پرستی کی وجہ سے حق اور اہل حق کے خلاف مزاحمت وعداوت پر اتر آتا ہے۔ ﴿فَٱللَّهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ فِيمَا

كَانُواْ فِيهِ يَخۡتَلِفُونَ ﴾ "قیامت کے دن اللہ ان کے اس اختلاف کا فیصلہ ان کے درمیان کر دے گا" یہ اللہ تعالی کی جانب سے بیان ہے کہ مسلمان فرقہ پرستی کی اس خطرناک روش یعنی اختلاف سے بچ کر رہے ، نوبت یہ آجاتی ہے کہ معاملہ آپسی بغض وحسد اور تکفیر تک پہنچ جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں اور معصوموں کے خون بہادیئے جاتے ہیں، یہ سب کم علمی کی وجہ سے ہوتا ہے اسی لیے دین کے بارے میں بھی جہالت ہوتی ہے اور یہیں سے دین کی تفسیر اور اس کی سمجھ اللہ تعالی کی مراد اور منہج کے برعکس ہوتی ہے ، اسی طرح یہ چیز لوگوں کے مابین کے معاملات میں داخل ہو جاتی ہے اور پھر آدمی اپنے لیے دوسروں پر ظلم، لوگوں کے معاملات و تعاملات اور بندوں کے مصالح میں فساد انگیزی حلال سمجھنے لگتا ہے ، یہ سب اپنی من مانی تأویل اور برے اعمال کو شیطان کے مزین کرنے یا ظلم وعدوان کے ذریعہ خود کو غالب کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے اور یہی چیز فساد اور بندوں کے درمیان آپسی بغض پیدا کرتی ہے اور یہ تمام امور کتاب وسنت کے منافی ہیں۔ قرآن کریم کی آیات کا تتبع کرنے والے کو درج ذیل امور ملیں گے: شوق دلانے کا اسلوب، ذہن کی صفائی ، ذاتیات سے دور ہو کر عام نگاہ سے دیکھنے کا ارتقاء، مصلحت عامہ کی رعایت، امت کے لیے بمثل جسد واحد ہونا، جہالت اور ہوائے نفس کی خرابیوں سے بچاؤ، حق پر دست درازی کے خطرات، ہوا پرستی اور کبر و غرور یہ سب امور دینی اور سماجی خطرات کی طرف لے جاتے ہیں ، دست درازی اور بڑکپن بغض ، باہمی جنگ وجدال اور افتراق وانتشار کا سبب ہوتا ہے، ان سارے امور سے یہ بات محقق ہو جاتی ہے کہ امت کی مصلحت کی بنیاد اس کے اتحاد میں ہے اور امت کا اتحاد ذاتیات اور انانیت سے تجرد کے مرہون منت ہے، اور اس کا تقاضا ہے کہ ہوا پرستی اور تکبر سے چھٹکارا پانے کی تربیت کو تقویت دی جائے ، اور اللہ تعالی کی حقیقی مراد کی معرفت حاصل کرکے ایمان و تقوی کو بروئے کار لایا جائے، اسی کے مطابق عمل کیا جائے اور مقصود اللہ تعالی کا اخلاص اور نبی صلی اللہ علیہ کی متابعت ہو۔

﴿ وَمَنۡ أَظۡلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَٰجِدَ ٱللَّهِ أَن يُذۡكَرَ فِيهَا ٱسۡمُهُۥ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَآۚ أُوْلَٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمۡ أَن يَدۡخُلُوهَآ إِلَّا خَآئِفِينَۚ لَهُمۡ فِي ٱلدُّنۡيَا خِزۡيٞ وَلَهُمۡ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٞ ﴿١١٤﴾ وَلِلَّهِ ٱلۡمَشۡرِقُ وَٱلۡمَغۡرِبُۚ فَأَيۡنَمَا تُوَلُّواْ فَثَمَّ وَجۡهُ ٱللَّهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ وَٰسِعٌ عَلِيمٞ ﴿١١٥﴾ ﴾

ترجمہ:

"اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کئے جانے کو روکے ان کی بربادی کی کوشش کرے ، ایسے لوگوں کو خوف کھاتے ہوئے ہی اس میں جانا چاہیے ، ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے (۱۱۴)۔اور مشرق اور مغرب کا مالک اللہ ہی ہے۔ تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے، اللہ تعالیٰ کشادگی اور وسعت والا اور بڑے علم والاہے (۱۱۵)"۔

اللہ تعالی مسجد کی عظمت و حرمت اور مقام و مرتبہ کو بیان کر رہاہے: "اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کئے جانے کو روکے ان کی بربادی کی کوشش کرے" چنانچہ اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں جو اللہ کے بندوں کو مسجدوں میں نماز کے قیام اور اعتکاف جیسی نیکیوں کے ذریعہ ذکر الہی سے روکتااوران کو برباد کرنے کی کوشش کرتاہے، چاہے یہ بربادی ڈھاکراور توڑ پھوڑ کر ہو یا غیر مناسب اور ناجائز چیزیں پھینک کر، معلوم ہوا کہ ایسی رکاوٹیں کھڑی کرنے سے باز رہنا چاہیے جوذکرالہی کرنے والوں سے مسجدوں کی ویرانی کا باعث ہوں، یہ احتیاطی حکم مساجد اور مساجد میں ذکرالہی کرنے والوں کے شرف و منزلت کا بین ثبوت ہے، نیز اس سے ذکرالہی کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے خاص طور سے جب یہ ذکر مساجد میں ہو تواس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔اسی لیے جو کوئی انہیں روکتاہے وہ بہت بڑا ظالم ہےاور اس کا یہ ظلم موجب عذاب ہے۔

آیت کا اسلوب بیان ازراہ تعجب ہے، کیوں کہ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا ظلم مساجد کی توہین و تخریب کاری اور ان میں ذکرالہی کرنے والوں پر رکاوٹ سے بڑھ کر ہے۔ چنانچہ اس اسلوب بیان کا مقصد تحذیر و تخویف اور مساجد میں ذکرالہی کی ترغیب دیناہے۔آیت کے مفہوم مخالف سے پتہ چلتاہے کہ جو شخص ان مساجد کا اہتمام اور حفاظت کا خیال رکھے ،اس کی تعمیر و ترقی پر توجہ دے یہ اس کے لیے بڑے شرف و منزلت کی بات ہوگی۔کیوں کہ اللہ تعالی نے اس کو ویران کرنے والے اعلی قسم کے قبیح ظلم سے متصف کیاہے۔امام قرطبیؒ رحمہ اللہ آیت کے سبب نزول اور تفسیر میں مختلف اقوال ذکر کرنے

کے بعد کہتے ہیں: "اس ممانعت میں قیامت تک کی تمام مسجدیں شامل ہیں، یہی صحیح قول ہے، کیوں کہ مسجد کا لفظ عام ہے اور جمع کے صیغے کے ساتھ آیا ہے(۱)۔

پھر اس جرم کی سزا سنایا:﴿ أُوْلَٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَن يَدْخُلُوهَآ إِلَّا خَآئِفِينَۚ لَهُمْ فِي ٱلدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي ٱلْأٓخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾ "ایسے لوگوں کو خوف کھاتے ہوئے ہی اس میں جانا چاہیے ، ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے"۔ وہ ان مساجد میں جانے کے لائق نہیں ہیں، ان کو ان مساجد سے روک دینا چاہیے، کیوں کہ وہ خود ایذاء دیتے اور روکتے ہیں، ایسے تخریب کاروں کی دنیاوی سزا خوف ورسوائی ہے ، لہذا جب مسلمان ان مساجد پر قابض ہو جائیں اور وہ ان کے اقتدار میں آجائیں تو ان کافروں کو ان میں جانے نہیں دینا چاہیے، اور اگر جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے کہ کہیں مسلمان نکال نہ دیں اور کوئی تادیبی کاروائی نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ مساجد کی تخریب کاری کا معاملہ بہت خطرناک اور نقصان دہ ہے، اللہ تعالی ان سے مسجدیں چھین لیتا ہے جس طرح سے بیت الحرام کو مشرکین کے ہاتھوں سے چھینا جس میں ان لوگوں نے بتوں کو رکھ کر برباد کیا ہوا تھا، اللہ تعالی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ پر فتح دی اور اس کے بعد وہ خوفزدہ رہنے لگے، اسی طرح بیت المقدس کو امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فتح کیا، اور ابرہہ اور اس کے ہمنواؤں نے جب کعبہ ڈھانے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالی نے انہیں عذاب سے دوچار کردیا۔

اور رہی بات آخرت کے بدلے کی تو اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿ وَلَهُمْ فِي ٱلْأٓخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾ "اور ان کے لیے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے"۔

لہذا مساجد سے کھلواڑ، بربادی، توہین اور تخریب بہت ہی خطرناک ہے ایسا کرنے والے کو اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے۔ اس کے برعکس دوسری طرف مساجد کے اہتمام اور اس کی تعمیر وترقی کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے ، اس کی تعمیر وترقی کی چاہے کوئی بھی صورت ہو، مثلا: اس کو آباد رکھنا، خراب سامانوں کی اصلاح، بنوانا، نئے سرے سے تعمیر، تبدیلی، نماز کا قیام، اعتکاف، تلاوت وحفظ قرآن وغیرہ کے ذریعہ اللہ کا ذکر۔

---

(۱) تفسير قرطبي ۲/۵۳.

آگے تحدید قبلہ کا بیان ہے، فرمایا: ﴿ وَلِلَّهِ ٱلۡمَشۡرِقُ وَٱلۡمَغۡرِبُ ﴾ "اور مشرق اور مغرب کا مالک اللہ ہی ہے" قرآنی آیات کی شروعات تمام جہتوں کا مالک کا بیان ہے تاکہ ان آیات سے مخاطب سمجھ جائے کہ تحدید قبلہ کا معاملہ تنہا اللہ تعالی کی شان ہے، اسی لیے آیت کے شروع میں ہی مشرق و مغرب کے مالک کی تحدید کر دی گئی کہ وہ اللہ تعالی کی ذات ہے، یہ تعلیم و تقریر کا تدریجی اسلوب بیان ہے جس سے قرآن کے علم و معرفت کو پیش کرنے کا نیا، انتہائی اعلی درجے کا بلیغ، انوکھا اور خوبصورت انداز بیان واضح ہوتا ہے۔ آیت میں مشرق و مغرب کی نسبت اللہ کی طرف نسبت تشریفی ہے، اور اللہ تعالی اپنا شرف کسی کو عطا کرنے میں خود مختار ہے، اسی نے پہلے پہل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس کی طرف قبلہ بنانے کا حکم دیا، پھر منسوخ کر کے بیت اللہ الحرام کو قبلہ بنایا، اس کے بعد سے کعبہ ہی تمام مسلمانوں کا قبلہ بن گیا ، لہذا ساری کائنات کا مالک وہی اللہ ہے، اسی کو تحویل و توجیہ کا پورا حق ہے، جب جس کو جیسے چاہے پھیر دے، اس کے حکم کی کوئی گرفت کرنے والا نہیں۔ اس کے بعد فرمایا: ﴿ فَأَيۡنَمَا تُوَلُّواْ فَثَمَّ وَجۡهُ ٱللَّهِ ﴾ " تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے"۔ یعنی تم اللہ کے حکم کے مطابق جس طرف بھی رخ کرو گے تو تمہارا رخ اللہ کے رخ کی طرف ہی ہوگا جن چیزوں میں قبلہ رخ ہونے کا حکم ہے، جیسے نماز اور قبلہ کی طرف ذبح۔ یا قضاء حاجت کے وقت استقبال قبلہ نہ کرنے کا حکم۔ ﴿ إِنَّ ٱللَّهَ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴾ "اللہ تعالی کشادگی اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے"۔ یعنی وہ اپنے علم میں وسیع ہے اور دینی امور میں اپنے بندوں پر وسعت کرتا ہے، اسی طرح ان کی ہر ضرورت میں بھی، لہذا جس چیز کے وہ ضرورت مند ہوتے ہیں اس میں تنگی نہیں کرتا۔

اس آیت نے علماء کرام اور فقہاء کے اذہان کو کھول دیا اور اس آیت کو انہوں نے وسیع مفہوم میں مختلف جوانب سے سمجھا، جیسے قبلہ کی لاعلمی، بادل کی تاریکی کی بنا پر نماز کی ادائیگی کا مسئلہ ہے، چاہے نماز نفل ہو یا فرض اگر نمازی کو نماز سے فراغت کے بعد پتہ چلے کہ اس نے تو قبلہ کی تعیین میں غلطی کی تھی اور نماز کا وقت ابھی باقی ہو تو کیا وہ نماز کا اعادہ کرے گا یا نہیں ﴿ فَأَيۡنَمَا تُوَلُّواْ فَثَمَّ وَجۡهُ ٱللَّهِ ﴾ " تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے"۔ اس آیت میں ایسی فقہ ہے جس سے عقلیں کھل گئیں اور ان میں ایسی وسعت پیدا ہوئی جس میں نقاش اور جمع ادلہ کی گنجائش ہو۔ پس اس آیت یا اس کے علاوہ دوسری

آیات اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ جانے کتنے فائدے عقل وعلم کو ہوئے، جو ان مسائل کی گہری سمجھ چاہتا ہے وہ کتب تفسیر اور فقہ کی طرف رجوع کرے۔

﴿وَقَالُواْ ٱتَّخَذَ ٱللَّهُ وَلَدٗاۗ سُبۡحَٰنَهُۥۖ بَل لَّهُۥ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۖ كُلّٞ لَّهُۥ قَٰنِتُونَ ١١٦ بَدِيعُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِۖ وَإِذَا قَضَىٰٓ أَمۡرٗا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ ١١٧ وَقَالَ ٱلَّذِينَ لَا يَعۡلَمُونَ لَوۡلَا يُكَلِّمُنَا ٱللَّهُ أَوۡ تَأۡتِينَآ ءَايَةٞۗ كَذَٰلِكَ قَالَ ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِهِم مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡۘ تَشَٰبَهَتۡ قُلُوبُهُمۡۗ قَدۡ بَيَّنَّا ٱلۡأٓيَٰتِ لِقَوۡمٖ يُوقِنُونَ ١١٨﴾

ترجمہ:

"یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے، (نہیں بلکہ) وہ پاک ہے زمین اور آسمان کی تمام مخلوق اس کی ملکیت میں ہے اور ہر ایک اس کا فرماں بردار ہے (۱۱٦) وہ زمین اور آسمانوں کو پیدا کرنے والا ہے، وہ جس کام کو کرنا چاہے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، بس وہی ہو جاتا ہے (۱۱۷) اسی طرح بے علم لوگوں نے بھی کہا کہ خود اللہ تعالیٰ ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا، یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، اسی طرح ایسی ہی بات ان کے اگلوں نے بھی کہی تھی، ان کے اور ان کے دل یکساں ہوگئے۔ ہم نے تو یقین والوں کے لئے نشانیاں بیان کردیں (۱۱۸)"۔

پھر سے نصاریٰ اور ان جیسے یہود کے جھوٹوں اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں دیدہ دلیری کی حالت زار کو بیان کیا جارہا ہے: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَاللهُ وَلَدًا﴾ "یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے" جیسا کہ نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، اور مشرکین مکہ نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، اس سے بڑا افتراء کا منظر نامہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد منسوب کرے، وہ کیسے اللہ پر افترا پردازی کرتا ہے، جب کہ اس اللہ نے کہا ہے: ﴿لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُولَدۡ﴾ [سورة الإخلاص:٣]۔ "نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا" ۔ معلوم ہوا کہ اگر اپنے کردار اور علم وفکر منضبط نہ ہو تو انسان بری طرح پھسل جاتا ہے، اس لیے آدمی کو ہمیشہ یہ دعا کرتے رہنا چاہیے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم برابر پڑھا کرتے تھے: ﴿يَا مُقَلِّبَ

الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ﴾(١) "اے دلوں کو الٹ پھیر کرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ"۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: آپ کتنی زیادہ یہ دعا کرتے ہیں: ﴿يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ﴾ ، تو آپ نے فرمایا: "اے ام سلمہ! ہر آدمی کا دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے، جسے چاہتا ہے (دین پر) ثابت قدم رکھتا ہے، اور جس کا دل چاہتا ہے ٹیڑھا کر دیتا ہے"(٢)۔

پھر اللہ تعالی اپنی پاکی بیان کر رہا ہے: ﴿سُبْحَانَهُ﴾ "وہ پاک ہے"۔ یہ ان کے قول: ﴿اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا﴾ "اللہ کی اولاد ہے" سے پاکی اور براءت کا اعلان ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالی اپنی عظیم بادشاہت کا ذکر کر رہا ہے جس سے ان کے افتراء اور جھوٹ کی خود نفی ہو جاتی ہے: ﴿بَل لَّهُۥ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ﴾ "آسمان اور زمین کی تمام مخلوق اس کی ملکیت میں ہے" تو جس کے لیے یہ ساری کی ساری ملکیت ہو، اور جس نے ان تمام کو عدم سے وجود بخشا ہو اس کو اولاد کی کوئی ضرورت ہی نہیں جو اس کی معاون بنے بلکہ ہر مخلوق اس اللہ تبارک وتعالی کی قدرت اور مشیت کے آگے جھکی ہوئی ہے: ﴿كُلٌّ لَّهُۥ قَٰنِتُونَ﴾ "ہر ایک اس کا فرمابردار ہے" جس کی ساری ملکیت ہے ، اور ساری ملکیت اس کے تابع اور اس کی قدرت اور تصرف کے ماتحت ہے، اور کوئی چیز اس کے علم کے بغیر وجود میں نہ آتی، ایسی ذات ہر نقص سے پاک ہے، اور اسی کے لیے سارا کمال ہے۔

آیت کا یہ سیاق قرآن کریم کے بہترین طریقہ استدلال کی رہنمائی کرتا ہے، کیوں کہ سب سے پہلے کفار کے قول کا ذکر ہے، پھر اللہ تعالی نے ﴿سُبْحَانَهُ﴾ کے ذریعہ ان کے قول سے اپنی ذات کی پاکی بیان کی، اس کے بعد اپنے عظیم تخلیق اور ملکیت کا تذکرہ کیا، اور اخیر میں اپنی زبردست سلطنت اور طاقت کا: ﴿كُلٌّ لَّهُۥ قَٰنِتُونَ﴾ "ہر ایک اس کا فرمابردار ہے" یہ سب اس بہتر انداز سے ہے بیان ہوا کہ آیت کو پڑھنے اور سننے والے کو مقصد ومراد سے واقفیت اور مکمل اطمئنان حاصل ہو جاتا ہے، اور کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پاک ہے اللہ کی ذات جو عظمت والی ہے۔

---

(١) سنن ترمذي ٥/٥٠٣ حديث نمبر (٣٥٢٢).

(٢) مرجع سابق.

اگلی آیت میں اللہ تعالی کی ملکیت وقدرت کا مزید بیان ہے: ﴿بَدِيعُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ﴾ "وہ زمین اور آسمانوں کو پیدا کرنے والا ہے" یعنی اس نے آسمان اور زمین کو نئے سرے سے پیدا کیا اس کی کوئی سابقہ مثال نہیں تھی، اور یہی حال اللہ تعالی کی ہر مخلوق کا ہے، بلکہ اس کی قدرت تو ایسی ہے کہ: ﴿وَإِذَا قَضَىٰٓ أَمۡرٗا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُۥ كُن فَيَكُونُ﴾ "وہ جس کام کو کرنا چاہے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا، بس وہی ہو جاتا ہے"۔ اتنی عظیم قدرت سے بڑی قدرت اور کیا ہو سکتی ہے؟! لہذا ضروری ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کی زیادہ سے زیادہ بزرگی اور پاکی بیان کی جائے، ہمیشہ اس کا ذکر، اور بھلائی کی طلب اور برائی سے بچاو کے لیے اسی سے دعا کی جائے ، وہی ذات ہے جس کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی اور ہر چیز صرف ایک کلمہ "کن" سے کر دیتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی جاہل اہل کتاب یا مشرکین عرب کی سرکشی کا مزید ذکر کر رہا ہے: ﴿وَقَالَ ٱلَّذِينَ لَا يَعۡلَمُونَ لَوۡلَا يُكَلِّمُنَا ٱللَّهُ أَوۡ تَأۡتِينَآ ءَايَةٞۗ﴾ "اسی طرح بے علم لوگوں نے بھی کہا کہ خود اللہ تعالیٰ ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا، یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی"۔ یعنی یہ لوگ کہتے ہیں کہ خود اللہ تعالی ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق باتیں کیوں نہیں کرتا کہ پتہ چلے کہ وہ نبی ہے اور ہم اس پر ایمان لے آئیں، یا کوئی اس نبی کی نبوت کی نشانی لا کر دیکھاتا[(١)]۔ ان کا یہ کہنا محض شرارت اور ڈھٹائی کے لیے تھا، ان کا مقصد طلب حق بالکل نہ تھا، اسی لیے اس کے جواب میں اللہ نے کہا: ﴿كَذَٰلِكَ قَالَ ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِهِم مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡۘ﴾ "اسی طرح ایسی ہی بات ان کے اگلوں نے بھی کہی تھی"۔ ہر منکر اور مغرور کی یہی روش اور عادت ہے ، بالکل واضح اور کھلم کھلا حق کی تردید میں یہ لوگ اپنے سے پہلے کے لوگوں ہی کی طرح ہیں، جن لوگوں نے اپنے نبیوں سے مطالبہ کیا ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دیکھاو اور ایسا کرنے والی موسی علیہ السلام کی قوم ہے: ﴿وَإِذۡ قُلۡتُمۡ يَٰمُوسَىٰ لَن نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى ٱللَّهَ جَهۡرَةٗ﴾[سورة البقرة:٥٥]۔ "اور (تم اسے بھی یاد کرو) تم نے (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا تھا کہ جب تک ہم اپنے رب کو سامنے دیکھ نہ لیں گے ہر گز ایمان نہ لائیں گے"، یعنی اس طرح کے واقعات بار بار پیش آتے ہیں اور یہ مماثلت بھی انوکھی نہیں، جو ماضی میں ہوا وہ آج بھی ممکن ہے ۔ ﴿تَشَٰبَهَتۡ

(١) تفسير قرطبي ٢/٦٤.

﴿قُلُوبُهُمْ﴾ "ان کے اوران کے دل یکساں ہیں" یعنی باطل میں بہت سارے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور پہلے اور آج ہمیشہ ایسا رہا ہے، اسی طرح حق کی پیروی اور اطاعت میں بھی دلوں کے مابین یکسانیت پائی جاتی ہے ، جو چیز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں ہدایت کے لیے مفید تھی وہی ہر زمانے میں مفید ہے ، اور حق کا متلاشی ہر وقت ہدایت پا سکتا ہے، اور جو عناد پرست، متکبر اور شرارتی ہوگا وہ ہر زمانے اور قوم میں ایسا ہی رہے گا۔ اسی لیے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: "لا يُصلِح آخرَ هذه الأمة إلا ما أصلحَ أولَها" "جس چیز سے امت کے پہلے لوگوں کی اصلاح ہوئی بعد کے لوگوں کی اصلاح بھی اسی سے ممکن ہے"۔

پھر اللہ تعالی بیان کر رہا ہے کہ اس نے ایمان کو واجب کرنے والی نشانیوں کو خوب واضح کر دیا ہے:

﴿قَدْ بَيَّنَّا ٱلْءَايَـٰتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ " ہم نے تو یقین والوں کے لئے نشانیاں بیان کر دیں"۔ عبد الرحمن بن سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: " ہر صاحب یقین اللہ تعالیٰ کی روشن نشانیوں اور واضح دلائل و براہین کو پہچان لیتا ہے جن سے اسے یقین حاصل ہوتا ہے اور تمام شکوک و شبہات اس سے ختم ہو جاتے ہیں(۱)"۔ تمام رسول اپنے نبوت اور رسالت کے ثبوت کی واضح دلیلیں اور نشانیاں لے کر آئے تھے ، اور اس سلسلے کی آخری کڑی ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی کھلے دلائل لے کر آئے تھے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اتنا بڑا جم غفیر اسلام قبول نہ کرتا۔ چنانچہ دنیا میں اسلام کا خوب بول بالا ہوا ، لیکن پھر بھی ایک عناد پرست اور متکبر انسان ہمیشہ ڈھٹائی کی راہ تلاش کرتا رہتا ہے جس میں اسے سوائے گھاٹے اور نقصان کے کچھ ہاتھ نہیں آتا، اس لیے ڈھٹائی اور تعنت کے تمام وسائل واسالیب سے انسان کو دور رہنا چاہیے کیوں کہ اس طرح کے تمام وسائل انسان کو دنیا و آخرت کی بھلائیوں سے محروم کر دیتے ہیں اور ان وسائل کو اختیار کرنے والا حق سے دور، اور اپنے ہی ہم نشینوں سے قطع تعلق اور دشمنی کا شکار ہو جاتا ہے اور بسا اوقات تو ساتھیوں کے بیچ سے برطرفی کی نوبت آجاتی ہے ، ہر کوئی مذمت کرتا، شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور لوگ اس سے بچ کر رہنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں، معلوم ہوا کہ سوال اور مطالبہ

---

(۱) تفسير سعدى ۱/۹۰.

میں ڈھٹائی اور تعنت کا انجام کبھی خوش کن نہیں ہوتا یہاں تک کہ ارد گرد اور ساتھ رہنے سہنے والوں کا سماجی رد عمل بھی بہتر نہیں ہوتا۔

﴿ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾ وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ ٱلْيَهُودُ وَلَا ٱلنَّصَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلْهُدَىٰ ۗ وَلَئِنِ ٱتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُم بَعْدَ ٱلَّذِى جَآءَكَ مِنَ ٱلْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ ٱللَّهِ مِن وَلِىٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١٢٠﴾ ٱلَّذِينَ ءَاتَيْنَٰهُمُ ٱلْكِتَٰبَ يَتْلُونَهُۥ حَقَّ تِلَاوَتِهِۦٓ أُو۟لَٰٓئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِۦ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِهِۦ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَٰسِرُونَ ﴿١٢١﴾ يَٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتِىَ ٱلَّتِىٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّى فَضَّلْتُكُمْ عَلَى ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٢٢﴾ وَٱتَّقُوا۟ يَوْمًا لَّا تَجْزِى نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنفَعُهَا شَفَٰعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿١٢٣﴾ ﴾

ترجمہ:

"ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور جہنمیوں کے بارے میں آپ سے پرسش نہیں ہوگی (۱۱۹)۔ آپ سے یہودی اور نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ بن جائیں ، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے، اور اگر آپ نے باوجود اپنے پاس علم آ جانے کے، پھر ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے پاس آپ کا نہ تو کوئی ولی ہوگا اور نہ مددگار (۱۲۰) ۔ جنہیں ہم نے کتاب دی اور وہ اسے پڑھنے کے حق کے ساتھ پڑھتے ہیں، وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کے ساتھ کفر کرے وہ نقصان والا ہے (۱۲۱)۔ اے اولاد یعقوب میں نے جو نعمتیں تم پر انعام کی ہیں انہیں یاد کرو اور میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دے رکھی تھی (۱۲۲)۔ اس دن سے ڈرو جس دن کوئی نفس کسی نفس کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے گا، نہ کسی شخص سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا نہ اسے کوئی شفاعت نفع دے گی نہ ان کی مدد کی جائے گی (۱۲۳)"۔

اللہ تعالی اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر رسالت محمدیہ کے حقائق بیان کرتے ہوئے فرما رہا ہے: ﴿ إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ بِٱلْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۖ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَٰبِ ٱلْجَحِيمِ ﴾ "ہم نے

آپ کو حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور جہنمیوں کے بارے میں آپ سے پرسش نہیں ہوگی" اس آیت میں تمام لوگوں سے رسالت محمد یہ کے درج ذیل حقائق کا بیان ہے:

پہلی حقیقت: بلاشک وشبہ آپ اللہ تعالی کے رسول ہیں ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ﴾ "ہم نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا" اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تزکیہ ہے، کیوں کہ رسول اللہ کا چنندہ ہوتا ہے ،اور یہ سب سے بڑے شرف اور فضیلت کی بات ہے، آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس پیغام کی ادائیگی آپ کی ذمہ داری ہے، اور آپ کو تائید الہی حاصل ہے، اس کے علاوہ آیت کے مفہوم میں اور بھی بے شمار فوائد ہیں۔

دوسری حقیقت: آپ کی رسالت کے سارے مضامین برحق ہیں: ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ﴾ "ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا" یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لے کر آئے وہ اللہ تعالی کی طرف سے حق ہے، اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں، لہذا قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں برحق ہیں، لفظ (بالحق) وصف کامل اور کسی بھی طرح کے نقص وعیب سے پاک ہونے پر دلالت کرتا ہے، کتاب وسنت میں غور وفکر کرنے والا بخوبی جانتا ہے کہ آپ کی لائی ہوئی پوری شریعت مبنی برحق ہے اس کے اہداف ومقاصد، منہج واصول، اسلوب، سہولت ویسر، فطری ہم آہنگی ان تمام امور میں اس کی حقانیت واضح ہے ، یہ شریعت حق کی رہنما بھلائی کا حکم دیتی اور برائی سے روکتی ہے، خیر کو فروغ دینا اور شر سے بچانا اس کا منہج ہے، پوری انسانیت ایسی پختہ ہدایت پیش کرنے سے عاجز اور لاچار ہے ، نیز یہ ہر زمانے اور جگہ کے لیے موزوں اور مناسب ہے، اس کے برعکس لوگوں کے وضع کردہ قوانین نسل در نسل وقت اور جگہ کے ساتھ تبدیلی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں کہ انہیں خود اس کی خامیاں پتہ ہوتی ہیں اور وہ اس کے نقائص وعیوب اور کمیوں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں، اور یہ قوانین امن وامان، خوشحالی ،آپسی چارہ جوئی اور معاونت کو کبھی بروئے کار نہیں لا سکتے، اس کے علاوہ اور بھی اس میں بے شمار خرابیاں ہیں۔

تیسری حقیقت: یہ ایک خوش خبری کا پیغام ہے، آیت کریمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بشیر بیان کی گئی ہے، چنانچہ آپ جنت اور دائمی نعمت کی خوش خبری دینے والے تھے۔

چوتھی حقیقت: یہ ایک پیغام آگہی ہے، آپ نذیر تھے، نافرمانوں کو جہنم سے آگاہ کرتے تھے۔

پانچویں حقیقت: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کافروں کے ذمہ دار نہ تھے: ﴿ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَـٰبِ ٱلْجَحِيمِ ﴾ "اور جہنمیوں کے بارے میں آپ سے پرسش نہیں ہوگی"۔ معلوم ہوا کہ آپ کسی کو ہدایت توفیق نہیں دے سکتے تھے، آپ کا کام محض رہنمائی کر دینا تھا، جو شخص اپنے کفر پر ڈٹا رہتا اس کو توفیق دلانا آپ کے بس میں نہ تھا، اس لیے آپ ان کے برے کرتوت اور جہنم میں ڈالے جانے کے ذمہ دار بھی نہیں تھے۔ ابن الجوزی رحمہ اللہ تعالی نے ذکر کیا ہے کہ ان کے بارے میں سوال نہ کیے جانے کی وجہ ان کے معاملہ کی سنگینی ہے، گویا ان کی اس سنگینی کو بتلانے کے لیے ایسا کہا گیا ہے، آیت میں جحیم سے مراد آگ ہے، اور یہ کہا گیا ہے کہ جحیم اس آگ کو کہتے ہیں جس کا ایندھن خوب بھڑک اٹھے۔

آیت مختصر میں اور اتنے کم الفاظ کے باوجود ایک عظیم مفہوم رکھتی ہے اور اس کا مفہوم تسلسل کے ساتھ بالکل واضح ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لے کر آئے تھے اس کو (بالحق) کے ذریعہ ایک کلمہ میں بیان کر دیا گیا، اور یہ حق دو چیزوں میں محیط ہے: اطاعت گزاروں کو جنت کی بشارت جسے لفظ (بشیر) سے تعبیر کیا گیا، دوسرے نافرمانوں کو جہنم سے آگاہی جو لفظ (نذیر) سے عبارت ہے۔

اسی طرح آپ کی ذمہ داری کی حد بھی مقرر کر دی گئی کہ آپ کافروں اور ان کی بداعمالیوں کے مسؤول نہیں ہیں، اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے یہ ان کے عذاب کی نوعیت ہے۔ یہ سب کچھ: ﴿ وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحَـٰبِ ٱلْجَحِيمِ ﴾ "اور جہنمیوں کے بارے میں آپ سے پرسش نہیں ہوگی"۔ میں سمیٹ دیا گیا۔

اس سے پہلے آیت کے بالکل شروع میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری اور آپ کا فرض منصبی (إنا أرسلناك) کے دو لفظوں میں بیان کر دیا گیا، یعنی آپ کی ذمہ داری اور ڈیوٹی یہ ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اب اس سے زیادہ بلیغ بیان اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں سے یہود و نصاری کے موقف کو بیان کر رہا ہے، فرمایا ﴿وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ ٱلْيَهُودُ وَلَا ٱلنَّصَـٰرَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ﴾ "آپ سے یہودی اور نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ بن جائیں" یعنی نبی سے بتایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ آپ کو جو مشورے دے رہے یا سوالات و مطالبات کر رہیں اس سے ان کا مقصد ایمان قبول کرنا نہیں ہے بلکہ یہ محض ان کی ڈھٹائی ہے، اسی طرح اس آیت میں ان کے دلوں کی پوشیدہ حالت کو معجزاتی

طور ظاہر کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان سے ان کی بے رغبتی کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی خواہش تو یہ ہے کہ آپ ہی ان کے مذہب کے پیروکار بن جائیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مدینہ کے ان اہل کتاب کے کچھ لوگ اسلام نہیں لا سکتے، بلکہ بعض لوگوں نے اسلام قبول کیا، انہی لوگوں میں سے جلیل القدر صحابی عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں، یہاں آیت میں ایک عمومی بات کہی گئی ہے، حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان وارد ہے: (لَوْ آمَنَ بِي عَشَرَةٌ مِنْ الْيَهُودِ لآمَنَ بِي الْيَهُودُ)(۱) " اگر دس یہودی مجھ پر ایمان لے آتے تو تمام یہود مسلمان ہو جاتے "یعنی یہود کے بڑے (احبار و علماء) اگر اسلام قبول کر لیتے تو ان کے اثر سے دیکھا دیکھی دوسرے یہود بھی اسلام میں داخل ہو جاتے، لیکن اللہ تعالی کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔

(حتى تتبع ملتهم) "جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے تابع نہ بن جائیں "یعنی ان کا ایمان لانا اس قدر مشکل ہے۔ بہت سارے فقہاء نے (حتى تتبع ملتهم) سے یہ استدلال کیا ہے کہ تمام کفر ایک ہی ملت و گروہ ہیں کیوں کہ (ملتهم) میں ملت کا لفظ واحد استعمال ہوا ہے، اور اس سے ملت یہود اور ملت نصاری دونوں مراد ہے، واحد لفظ کے استعمال کر کے دونوں کو ایک ہی ملت قرار دیا گیا، کیوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اسلام کے علاوہ اب کوئی ملت مشروع نہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ بات بتائی جو یہود و نصاری یا ان کے علاوہ لوگوں سے کہنی ہے: ﴿قُلْ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلْهُدَىٰ﴾ " آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے " یہ مجمل طور پر حصر کے ساتھ بالکل یقینی بیان ہے۔ یعنی ہدایت کو اللہ کی ہدایت میں محصور کر دیا گیا اور اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے اس کے علاوہ جو کچھ سے سب باطل ہے، کیوں کہ اللہ تعالی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کردہ شریعت کے ذریعہ باقی ساری سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا، اسی طرح انسانوں کے خود ساختہ اصول و ضوابط اور قوانین بھی سراسر گمراہی ہیں، کیوں کہ ہدایت اس شریعت میں منحصر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالی کی جانب سے عطا کی گئی، جیسا کہ اللہ تعالی نے سورہ آل عمران

---

(۱) صحيح بخاري ۳/۸۰ حديث نمبر (۳۹٤۱)

میں فرمایا: ﴿وَمَن يَبۡتَغِ غَيۡرَ ٱلۡإِسۡلَٰمِ دِينٗا فَلَن يُقۡبَلَ مِنۡهُ﴾ [سورة آل عمران:٨٥]۔"جو شخص اسلام کے سوااور دین تلاش کرے،اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا"۔

﴿إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلۡهُدَىٰ﴾ " اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے"اس جملہ پر غور کریں تو معلوم ہوگا یہ جملہ مومن کے لیےایک بڑی طاقت ہے،کیوں کہ وہ اس کے ذریعہ ہر گمراہی سے باز رہے گااور کہے گا"اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے"ہر بدعت سے بچتے ہوئے یہ بات دہرائے گا"اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے"ہر غلط طرز عمل کے تئیں وہ یہی کہے گا"اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے"۔ہر ہوائے نفس کے پاس رک کر بول پڑے گا"اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے"۔لہذا یہ جملہ ایک مومن کا قاعدہ کلیہ،اس کا نور اور ہتھیار ہے جب کبھی شیطان اسے اکسانے اور ورغلانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ خود کو یہ جملہ یاد دلاتے ہوئے اللہ سے ہدایت اور ثبات قدمی کی دعا کرتا ہے، نیز دوسروں کو بھی اس کی یاد دہانی کراتا ہے، اور ہر قسم کی گمراہی کے خلاف کتاب وسنت کے دفاع میں بطور دلیل اس کو استعمال کرتا ہے۔

پھر اللہ تعالی بیان کررہا ہے کہ یہ یہود ونصاری ہواپرست لوگ ہیں: ﴿وَلَئِنِ ٱتَّبَعۡتَ أَهۡوَآءَهُم بَعۡدَ ٱلَّذِي جَآءَكَ مِنَ ٱلۡعِلۡمِ مَا لَكَ مِنَ ٱللَّهِ مِن وَلِيّٖ وَلَا نَصِيرٍ﴾" اور اگر آپ نے باوجود اپنے پاس علم آ جانے کے، پھران کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے پاس آپ کا نہ تو کوئی ولی ہوگا اور نہ مددگار"۔﴿وَلَئِنِ ٱتَّبَعۡتَ أَهۡوَآءَهُم﴾"میں اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے نفس کے بندے تھے، آیت میں یہود ونصاری کی خواہشات کی پیروی اوران کے مخصوص طور طریقوں کی مشابہت اختیار کرنے سے سخت ممانعت ہے،اور خطاب اگرچہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا گیا ہے لیکن اس نہی میں آپ کی امت بھی داخل ہے، کیوں کہ اعتبار عموم معنی کا ہے نہ کہ خصوص مخاطب کا جس طرح کسی بھی نص میں عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں(١)۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آیت میں امت مسلمہ کے کتاب وسنت کی جانکاری ہو جانے کے باوجود یہود ونصاری کی پیروی کرنے پر شدید وعید اور دھمکی دی گئی ہے،اگرچہ کہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن حکم آپ کی امت کو دیا گیا ہے(٢) ۔

---

(١) تفسير ابن سعدي ٩١/١.

(٢) تفسير ابن كثير ١٦٨/١.

آیت میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا گیا ہے اس کا مطلب ممانعت بہت سخت ہے ، کیوں کہ جب ذمہ داری نبھانے میں کسی بڑی شخصیت کو امر و نہی میں مخاطب کیا جائے تو اس سے معاملہ کی سنگینی مقصود ہوتی ہے، اگرچہ کہ آپ کی ذات سے اس کے صدور کا تصور نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ آپ خود فرماتے ہیں: (والّذي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا)(١) "قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی چوری کرے تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالوں"۔ آپ نے ایسا اس لیے فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی کے دین کے نفاذ میں کس قدر سختی سے کاربند ہیں یہاں تک کہ یہ شرعی سزا اگر آپ کے سب سے قریبی کو پہنچتی تب بھی اسے نافذ کردیتے، حالاں کہ یہ بعید تھا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنہا چوری کرتیں۔

اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿ٱلَّذِينَ ءَاتَيۡنَٰهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ يَتۡلُونَهُۥ حَقَّ تِلَاوَتِهِۦٓ أُوْلَٰٓئِكَ يُؤۡمِنُونَ بِهِۦۗ﴾ "جنہیں ہم نے کتاب دی اور وہ اسے پڑھنے کے حق کے ساتھ پڑھتے ہیں، وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں" یعنی جو لوگ اللہ کی نازل کردہ کتاب کے حقوق کی کماحقہ ادائیگی کرتے ہیں وہ لوگ عن قریب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں گے، کیوں کہ وہ ان کتابوں کے مشمولات پر ایمان رکھتے ہیں، اور ان کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ علیہ وسلم کی بعثت، آپ کے اوصاف کا ذکر اور آپ کی اتباع، نصرت و مدد اور ساتھ دینے کا حکم دیا گیا ہے، لہذا یہ سارے حقائق ان کو آپ پر ایمان لانے کے لیے مجبور کریں گے۔ پتہ یہ چلا کہ حق اپنے پیروکار کو دوسرے حق تک لے جاتا ہے، لیکن اسی کی برعکس جو اپنی خواہشات کا پابند ہوتا ہے وہ مزید ہوا پرستی میں بہہ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حق کی معرفت اور اس پر کاربند رہنے کی آرزو بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ہوا پرستی اور ہوا پرستوں سے دوری بہت ضروری ہے کیوں کہ ہوا پرستی آدمی کو بدعت کی طرف کھینچتی ہے اور پھر ایک بدعت دوسری بدعت تک لے جاتی ہے یہاں تک کہ گمراہیاں اس قدر زیادہ ہو جاتی ہیں کہ انسان حق کے راستے سے نکل کر ضلالت اور گمراہی میں جا گرتا ہے ۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ اسی طرح اخلاقی گراوٹ آدمی کو آہستہ آہستہ مزید انحرافات

---

(١) صحيح بخاري ١٥٣/٣ حديث نمبر (٤٣٠٤)

کی طرف لے جاتی ہے، اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ یہی انحراف اس کا ترجیحی طرز زندگی بن جاتا ہے۔ نیز اسی طرح حسن اخلاق کی پابندی مزید بلندئ اخلاق کا سبب ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: (وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ صِدِّيقًا) "انسان مسلسل سچ بولتا رہتا ہے اور سچ کی کوشش میں رہتا ہے، حتی کہ وہ اللہ کے یہاں سچا لکھ لیا جاتا ہے"۔

آگے اللہ تعالی نے کافروں کے انجام سے باخبر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ وَمَن يَكْفُرْ بِهِۦ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَٰسِرُونَ ﴾ "اور جو اس کے ساتھ کفر کرے وہ نقصان والا ہے" اور اللہ تعالی کے دین کے سوا کوئی حقیقی دین اب نہیں ہے، جس دین کو اللہ تعالی نے اپنے بندے اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا۔

اگلی آیت میں بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالی کی جانب سے ناصحانہ خطاب کا اعادہ کیا جارہا ہے: ﴿ يَٰبَنِيٓ إِسْرَٰٓءِيلَ ٱذْكُرُواْ نِعْمَتِيَ ٱلَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٢٢﴾ وَٱتَّقُواْ يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنفَعُهَا شَفَٰعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿١٢٣﴾ ﴾ "اے اولاد یعقوب میں نے جو نعمتیں تم پر انعام کی ہیں انہیں یاد کرو اور میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دے رکھی تھی ۔ اس دن سے ڈرو جس دن کوئی نفس کسی نفس کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے گا، نہ کسی شخص سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا نہ اسے کوئی شفاعت نفع دے گی نہ ان کی مدد کی جائے گی"۔ بنی اسرائیل کے لیے اس نصیحت کا بیان اس سورہ کے شروع میں ان پر اللہ کی نعمتوں کے ضمن میں گذر چکا ہے، اور تاکیداً یہاں پھر سے دہرایا گیا ہے، تاکہ ان میں اس نبی امی کی پیروی کا حوصلہ پیدا ہو جس کے نام واوصاف، احوال اور امتیوں کا تذکرہ ان کی کتابوں میں ہے، اللہ تعالی نے ان کو اس نعمت اور اس کے علاوہ دیگر دنیاوی اور دینی نعمتوں کے چھپانے سے خوف دلایا ہے، اور یہ کہ وہ اپنے ان چچازاد عرب بھائیوں سے اس بات پر حسد نہ کریں کہ اللہ تعالی نے آخری رسول کو ان میں سے کیوں بھیجا، اور پھر ان کو یہ حسد اس نبی کی مخالفت وتکذیب اور موافقت سے روگردانی پر آمادہ نہ کردے۔ صلوات الله وسلامه عليه۔

قرآن کریم میں بار بار اس کو دہرانے سے نصیحت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے اور اس تکرار کے دیگر بہت سارے فائدے ہیں، کہا جاسکتا ہے کہ اس کا سب سے اہم فائدہ ان پر حجت قائم کرنا ہے، کیوں کہ انسانی طبیعت بار بار پند ونصیحت کی محتاج ہوتی ہے، اور بسا اوقات بار بار نصیحت کرنے سے انسان اسے

قبول کرلیتا ہے، اور جو پہلے سے فرمابردار ہو اس کے لیے یہ نصیحت بطور حفاظت یا کوتاہی، کمزوری، اور بھول سے سدھار کے لیے ہوتی ہے، کیوں کہ انسان جس قدر بھی بلندی پر پہنچ جائے نصیحت کا ہمہ وقت ضرورت مند اور محتاج رہتا ہے۔

قرآن کریم میں آیتوں کا تکرار کبھی تو بطور توجیہ وارشاد ہوتا ہے جیسا کہ مذکورہ آیت میں ہے، اور کبھی کچھ زائد بیان ہوتا ہے جس کا پہلے سے ذکر نہیں ہوتا، جیسا کہ قرآن کے قصص وواقعات میں ہے تاکہ قرآن پڑھنے والا ان واقعات سے نصیحت حاصل کرے، اور ایک کو دوسرے سے جوڑ کر علم میں اضافہ کا باعث ہو، نیز اس طرز بیان سے ذہن کو نشاط ملتا ہے، اور پڑھنے سننے والا اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔

﴿وَإِذِ ٱبۡتَلَىٰٓ إِبۡرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَٰتٖ فَأَتَمَّهُنَّۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامٗاۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِيۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِي ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٢٤﴾ وَإِذۡ جَعَلۡنَا ٱلۡبَيۡتَ مَثَابَةٗ لِّلنَّاسِ وَأَمۡنٗا وَٱتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبۡرَٰهِـۧمَ مُصَلّٗىۖ وَعَهِدۡنَآ إِلَىٰٓ إِبۡرَٰهِـۧمَ وَإِسۡمَٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيۡتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلۡعَٰكِفِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ ﴿١٢٥﴾ وَإِذۡ قَالَ إِبۡرَٰهِـۧمُ رَبِّ ٱجۡعَلۡ هَٰذَا بَلَدًا ءَامِنٗا وَٱرۡزُقۡ أَهۡلَهُۥ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ مَنۡ ءَامَنَ مِنۡهُم بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِۖ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُۥ قَلِيلٗا ثُمَّ أَضۡطَرُّهُۥٓ إِلَىٰ عَذَابِ ٱلنَّارِۖ وَبِئۡسَ ٱلۡمَصِيرُ ﴿١٢٦﴾﴾

ترجمہ:

"جب ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمایا ، اور انہوں نے سب کو پورا کردیا تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام بنا دوں گا، عرض کرنے لگے میری اولاد کو؟ فرمایا: میرا وعدہ ظالموں سے نہیں(۱۲۴)۔ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے ثواب اور امن وامان کی جگہ بنائی ، تم مقام ابراہیم کو جائے نماز مقرر کرلو ، ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) سے وعدہ لیا کہ تم میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھو(۱۲۵)۔ جب ابراہیم نے کہا، اے پروردگار تو اس جگہ کو امن والا شہر بنا اور یہاں کے باشندوں کو جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں پھلوں کی روزیاں دے ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا

میں کافروں کو بھی تھوڑا فائدہ دوں گا، پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف بے بس کر دوں گا۔ یہ پہنچنے کی بری جگہ ہے (۱۲۶)"۔

اللہ تعالی اپنے نبی اور خلیل ابراہیم علیہ السلام کے بعض احوال سے باخبر کر رہا ہے: ﴿وَإِذِ ٱبْتَلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَـٰتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّى جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ﴾ "جب ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمایا، اور انہوں نے سب کو پورا کر دیا تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام بنا دوں گا" آیت کی ابتداء سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رسالت کا منصب اور پھر اس کی ذمہ داری کو نبھانا بھی ایک ابتلاء اور آزمائش ہے، آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی اسی آزمائش کا تذکرہ ہے، یعنی اللہ تعالی نے ابراہیم علیہ السلام کو امر و نہی کا مکلف بنا کر آزمایا اور امتحان لیا، فرمایا: ﴿وَإِذِ ٱبْتَلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ رَبُّهُۥ بِكَلِمَـٰتٍ﴾ "جب ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمایا"، کلمات سے مراد شریعت اور اوامر و نواہی ہیں، اور اس کے مفہوم کے بارے میں علماء کے دیگر اقوال بھی ہیں(۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نبی رسالت کی ادائیگی کے ذریعہ آزمایا جاتا ہے اسی طرح ان لوگوں کی بھی آزمائش ہوتی ہے جن کی جانب ان رسولوں کو مبعوث کیا جاتا ہے اور وہ ایمان وعبادات اور عموم شریعت کے پابند ہوتے ہیں، چنانچہ اس شریعت کا ہر مکلف اس شریعت کے ذریعہ پرکھا اور آزمایا جاتا ہے کہ آیا اس پر عمل کرتا ہے یا پہلو تہی اختیار ہے تاکہ اسی حساب جزاء اور سزا دیا جائے، ہر انسان آزمائش سے دوچار ہے، سب سے بڑی آزمائش یہی ہے کہ انسان اللہ تعالی کے دین کو اپنا کر اس کی پابندی کرتا ہے یا اس کو چھوڑ کر کنارہ کش ہو جاتا ہے، مثال کے طور پر باپ اپنے ماتحت اولاد، بیوی اور خادم وغیرہ کی ذمہ داریوں کے ذریعہ آزمائش میں ہوتا ہے اور اسی طرح ماں بھی، حاکم کی آزمائش حکومت سے ہوتی ہے کہ کیا وہ اس میں سچا اور امانت دار ہے یا خیانت، جور و ظلم اور بربادی پر اتر آتا ہے، اگر عادل رہا تو ان سات لوگوں میں سے ہو گا جو قیامت کے دن عرش الہی کے سایے تلے ہوں گے جس دن اس سایہ کے علاوہ کوئی دوسرا سایہ نہ ہو گا، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے(۲)۔ ہر مکلف کا یہی معاملہ ہے: (كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۱۷۰.

(۲) صحیح بخاری ۱/۲۱۹ حدیث نمبر (٦٦٠).

رَعِيَّتِهِ) (١) "تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور اس کے ماتحتوں سے متعلق اس سے سوال ہوگا" حتی کہ انسان خود اس بات کا مکلف ہے کہ وہ اللہ تعالی کے اوامر ونواہی کو اپنی ذات پر نافذ کرے۔

ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذمہ داری کو مکمل طور سے پورا کیا جیسا کہ اللہ تعالی نے ان کے بارے میں کہا: ﴿فَأَتَمَّهُنَّ﴾ " انہوں نے سب کو پورا کر دیا "ان کے اسی شرفِ اتمام کی اہمیت کے پیش نظر ان ذمہ داریوں کے تفصیل بیان کرنے سے پہلے مژدہ سنا دیا: ﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ "میں تمہیں لوگوں کا امام بنادوں گا"۔

آیت سے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کے اوامر بطور آزمائش ہیں تاکہ اطاعت گذار اور نافرمان کے درمیان تمیز ہو، ساتھ ہی ان پر حجت قائم ہو جائے، اور اطاعت وفرمابرداری اور عصیان ونافرمانی میں لوگوں کے درجات مختلف ہیں اسی طرح جزاء اور سزا میں بھی لوگ مختلف ہوں گے، حتی کہ پل صراط پار کرنے میں بھی لوگوں میں یہ تفاوت ہوگا۔ اس لیے اللہ تعالی کی مقرر کردہ تکالیف کو بحسن وخوبی انجام دینے کی ہمیشہ کوشش ہونی چاہیے اور اللہ تعالی سے مدد اور ثبات قدمی کی دعا بھی۔

﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ "میں تمہیں لوگوں کا امام بنادوں گا"۔ یعنی اللہ کے دین وہدایت میں آپ کو نمونہ بنا کر پیش کروں گا اور لوگ آپ کے نقش قدم پر چلیں گے۔ یہ بڑے شرف ومنزلت کی چیز ہے، کیوں کہ انسان خیر کے کاموں میں جب لوگوں کا پیشوا بن جاتا ہے تو اس کے پیروکاروں کے حساب سے اس کا اجر وثواب بھی بڑھتا رہتا ہے، اور ان پیروکاروں کی نیکیوں میں کوئی کمی نہیں کی جاتی، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے: (مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ)(٢) "جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ رائج کیا تو اس کے لیے اس کا (اپنا بھی) اجر ہے اور ان کے جیسا اجر بھی جنھوں نے اس کے بعد اس (طریقے) پر عمل کیا اس کے بغیر کہ ان کے اجر میں کوئی کمی ہو"۔ پیشوائی کی اسی اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالی نے ہمیں اس کی رہنمائی فرمائی، جیسا کہ سورہ الفرقان میں اللہ کے نیک بندوں کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

---

(١) صحيح بخاري ٢٢٢/٢ حديث نمبر (٢٥٥٨)

(٢) صحيح مسلم ٧٠٤/٢-٧٠٥ حديث نمبر (١٠١٧)

﴿ وَٱلَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبۡ لَنَا مِنۡ أَزۡوَٰجِنَا وَذُرِّيَّٰتِنَا قُرَّةَ أَعۡيُنٖ وَٱجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴾ [سورة الفرقان: ٧٤]۔ "اور یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا"۔ آیت کا یہ تقاضا ہے کہ مومن اپنے دین اور اخلاق کو عملی جامہ پہنانے کا شدید آرزومند ہو اور بعض اوامر ونواہی میں سستی برتنے والوں سے دھوکے میں نہ آئے، بالخصوص ان امور میں غیر مسلموں کی تقلید کرنے سے دور رہے جن میں ان کی پیروی ناجائز ہے۔

اس اعلی مقام ومرتبہ کی اچھائیوں کے پیش نظر ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت کے خاطر بھی اس کی دعا فرمائی: ﴿ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِيۖ ﴾ "عرض کرنے لگے، میری اولاد کو؟" معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام دین مصلحت اور اپنی اولاد کی مصلحتوں کے کافی آرزومند تھے، وہ چاہتے تھے کہ اللہ تعالی کی طاعت، اس کا دین اور امامت وپیشوائی ان کی اولاد میں برابر باقی رہے، اس سے ابراہیم علیہ السلام کو اسوہ اور نمونہ بنانے کی اہمیت واضح ہوتی ہے بایں طور کہ مسلمان آپ کے دین کا اہتمام کرکے طریقہ الہی کو برقرار رکھیں، تاکہ بلند اور اعلی مقام پر فائز ہوسکیں، اسی طرح اپنی اولاد کی اصلاح کے بھی خواہش مند رہیں تاکہ ان کی اولاد بھی دینی امور میں دوسروں کے لیے اسوہ اور نمونہ ہو، اور اس کا تقاضا ہے کہ ایک مسلمان کم از کم ان چیزوں میں غیر مسلموں کی اقتداء نہ کرے جن میں ان کی اقتداء سرے سے حرام ہے، تاکہ شر اور اس کی نشر واشاعت میں دوسروں کا پیشوا نہ بنے، اسی کی تعلیم ہمیں اللہ تعالی نے سورہ فرقان میں دی ہے: ﴿ وَٱلَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبۡ لَنَا مِنۡ أَزۡوَٰجِنَا وَذُرِّيَّٰتِنَا قُرَّةَ أَعۡيُنٖ وَٱجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴾ [سورة الفرقان: ٧٤]۔ "اور یہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا"۔

اللہ تعالی نے اپنے خلیل اور نبی ابراہیم علیہ السلام کے مطالبے کا جواب یوں دیا: ﴿ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِي ٱلظَّٰلِمِينَ ﴾ "فرمایا: میرا وعدہ ظالموں سے نہیں" اللہ تعالی نے صرف اس مطالبہ کے حصول میں رکاوٹ آنے والی چیز کا ذکر کیا اس رکاوٹ کے بیان بھی بلاغت اور اللہ تعالی کی مراد میں رحمت کا پہلو ہے، چنانچہ دین پر کاربند ہر شخص دوسروں کے لیے لائق اقتداء اور نمونہ ہے سوائے اس کے جو شر اور اللہ کے

طریق سے انحراف کر کے خود پر ظلم کا مرتکب ہو، ایسے شخص کو یہ بلند مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی خیر میں وہ لوگوں کی امامت اور پیشوائی کر سکتا ہے ،اس مقام و مرتبہ کے حصول کے لیے عدم موانع کی شرط ہے۔ آیت سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ ہدایت پر اولاد کی تربیت کی پابندی کرنا کافی اہمیت رکھتا ہے تا کہ باذنہ تعالی وہ متقیوں کی پیشوائی کر سکیں، اور دینی امور، بھلائی کے کام، عادات و سلوک اور منہج صحیح میں ان کی اقتداء کی جائے۔

بعد کی آیت میں اللہ تعالی بیت عتیق (پرانے گھر یعنی خانہ کعبہ) کی چند خصوصیتوں کا ذکر فرما رہا ہے: ﴿ وَإِذْ جَعَلْنَا ٱلْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ﴾ "ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے ثواب اور امن و امان کی جگہ بنائی"۔ یعنی اللہ تعالی نے اس بیت حرام میں اپنے بندوں کے لیے دینی مقاصد اور خصائص بنائے، ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ﴿ مَثَابَةً ﴾ یعنی ثواب کی جگہ ہے، لوگ ثواب کی غرض سے اس کا قصد کرتے ہیں تا کہ دینی اور دنیاوی نفع حاصل کریں، اور دائمی منفعت کے حصول کے لیے ان کا یہ آنا جانا برابر جاری رہتا ہے، چنانچہ اس میں حج و عمرہ اور طواف جیسے اعمال انجام دیئے جاتے ہیں، نیز اس میں تجارتی منافع بھی ہیں جہاں سے جاڑے اور گرمی کے دو تجارتی سفر ہوا کرتے تھے۔ اس گھر کی دوسری خصوصیت: ﴿ وَأَمْنًا ﴾ "امن و امان کی جگہ" ہے یعنی اس میں ہر کوئی اپنے دینی و دنیوی امور میں مامون و محفوظ ہوتا ہے، اسی لیے ہر مشرک شخص بھی اس کی تعظیم کرتا تھا ،اہل مکہ شرک پر رہتے ہوئے بھی اس کی تعظیم و احترام کرتے تھے ،ان کی تعظیم کا تو یہ عالم تھا کہ اگر کوئی اس میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی پا جاتا تو بھی اسے نہیں ڈراتا تھا، اسلام آنے کے بعد اس کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیت اللہ کی تعظیم ہر طرح سے ضروری ہے ، عبادت کی غرض سے اس کا قصد کر کے، اس کے احترام و اجلال کا خیال رکھ کر ،امن و امان میں خلل ڈالنے والے امور سے اس کی حفاظت، اللہ تعالی کی معصیت سے گریز اگرچہ وہ معصیت مرتکب کی نظر میں کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، کیوں کہ بیت اللہ کی عظمت اس سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اس بیت اللہ کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالی نے مقام ابراہیم کو جائے نماز بنایا، فرمایا: ﴿ وَٱتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبْرَٰهِـۧمَ مُصَلًّى ﴾ "تم مقام ابراہیم کو جائے نماز مقرر کر لو"۔ مقام سے مراد ابراہیم علیہ السلام کے دونوں قدموں کے رکھنے کی جگہ ہے جیسا کہ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول

ہے،اور یہ وہ جگہ ہے جہاں طواف کرنے والے طواف کی دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں(١)۔اس خصوصیت سے ابوالأنبیاءاور موحدین کے امام ابراہیم علیہ السلام کے مقام ومرتبہ کااندازہ ہوتاہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی بیان کر رہاہے کہ اس نے ابراہیم اوران کے فرزند اسماعیل علیہما السلام کو ایک عظیم کام کا حکم دیا، فرمایا: ﴿وَعَهِدْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْعَـٰكِفِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ﴾ " ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) سے وعدہ لیا کہ تم میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھو"۔آیت میں پاک رکھنے کا حکم عام ہے، جس کا مطلب ہے کہ اس کو حسی اور معنوی ہر طرح کی نجاست سے پاک رکھنا ہے ، جیسے: بت، نجاست وگندگی، شرک وکفراور معصیت وغیرہ،تاکہ یہ گھر طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لئے پاک صاف رہے، یہ اس بیت اللہ الحرام اوراس کا طواف ، اعتکاف کرنے والوں اور اس میں نماز پڑھنے والوں کی عظمت ومنزلت کا بیان ہے،اسی طرح اس میں ان عبادتوں کی رفعت شان کی بھی دلیل ہے جن کے اس بیت اللہ میں ادائیگی کے اہتمام کا اللہ تعالی نے حکم دیا۔ شیخ ابن السعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالی نے آیت میں طواف کا پہلے ذکر کیا کیوں کہ یہ بیت اللہ کے ساتھ خاص ہے(٢)، اور مسجد حرام کو عبادتوں کے لیے پاک صاف رکھنے کے حکم سے یہ معلوم ہوا کہ اسی طرح دیگر مساجد کو بھی نمازیوں اور معتکفین کے لیے ہر ایذارساں اور مشغول کن یا نماز واعتکاف میں مانع امور سے پاک صاف رکھنا ضروری ہے ، کیوں کہ پاک رکھنے کی جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ تمام مساجد میں پائی جاتی ہے، نیز معلوم ہوا کہ مساجد کی پاک صفائی کرنے والوں کے لیے اجر وثواب بھی ہے کیوں کہ اس میں ابراہیم علیہ السلام کو دیئے گئے حکم الہی کی تعمیل ہے،اسی ان احادیث کی بھی تعمیل ہے جن میں مساجد کی صفائی اور خوشبودار کرنے کا حکم ہے،خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان سب امور کا اہتمام کیا کرتے تھے۔

---

(١) تفسير قرطبي ٢/٧٧.

(٢) تفسير ابن سعدي ١/٩٤.

اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ﴾ میں یہ امر بھی لائق ملاحظہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت کی نسبت اپنی طرف کی ہے، یہ نسبت تشریفی ہے جو بیت اللہ کے شرف عظیم پر دلالت کرتی ہے، نیز اللہ کی تعظیم یہ بھی ہے کہ مومن ان چیزوں کی تعظیم کرے جن کہ تعظیم اللہ تعالیٰ نے کی، لہذا وہ اس بیت اللہ کی اس کی شایان شان تعظیم اور عزت کرے۔ شیخ ابن السعدی رحمہ اللہ اس آیت کے فوائد کے ضمن میں فرماتے ہیں: اللہ کا گھر ہونے کے حوالے سے یہ نہایت شدت سے اس بات کا متقاضی تھا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اس کی تطہیر کا خوب اہتمام کریں۔اس مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کریں اور اپنی پوری طاقت صرف کردیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف یہ نسبت عزت وشرف اور تکریم کی متقاضی ہے۔ بنابریں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس کی تعظیم و تکریم کا حکم دیا ہے۔ یہ اضافت اور نسبت ہی ہے جو دلوں کو بیت اللہ کی طرف کھینچنے کا باعث ہے(۱)۔

اس کے بعد آیت میں ہمارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی آرزو کا بیان ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا ءَامِنًا وَٱرْزُقْ أَهْلَهُۥ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ مَنْ ءَامَنَ مِنْهُم بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ﴾ " جب ابراہیم نے کہا، اے پروردگار تو اس جگہ کو امن والا شہر بنا اور یہاں کے باشندوں کو جو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں"۔ ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا سے ان کی دوراندیشی اور اہتمام و حرص کا پتہ چلتا ہے، کیوں کی ان کی سوچ اپنی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ ان کی حرص بہت آگے اس بیت اللہ کے ساکنین اور قاصدین کے لیے بھی تھی کہ یہ گھر ان تمام کے لیے ہر طرح کے خوف وخطر سے پرامن ہو تاکہ لوگ مکمل طور پر مطمئن ہو کر رہیں، اسی طرح ان کو پھلوں کی روزی میسر ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس دعا کو مومنوں کے ساتھ مقید کردیا، رہی بات کافروں کہ تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُۥ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُۥٓ إِلَىٰ عَذَابِ ٱلنَّارِ ۖ وَبِئْسَ ٱلْمَصِيرُ﴾ " اللہ تعالیٰ نے فرمایامیں کافروں کو بھی تھوڑا فائدہ دوں گا، پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف بے بس کردوں گا۔ یہ پہنچنے کی بری جگہ ہے"۔یعنی اللہ تعالیٰ کا رزق مومن و کافر اور فرمابردار و نافرمان سب کے لیے ہے، کیوں کہ اس نے کافر کو دنیاوی مال و متاع میں چھوٹ دے رکھی ہے: : ﴿قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُۥ قَلِيلًا﴾ " اللہ تعالیٰ نے فرمایا

(۱) مرجع سابق.

میں کافروں کو بھی تھوڑا فائدہ دوں گا"۔ چنانچہ مسلم ان نعمتوں سے اللہ تعالی کی عبادت واطاعت میں مدد حاصل کرکے جنت میں داخل ہو جائے گا ، رہا کافر ان نعمتوں سے تھوڑا بہت لطف اندوز ہوگا پھر اللہ تعالی اسے جہنم کے ٹھکانے لگادے گا اور یہ کافروں کا بہت برا ٹھکانہ ہے۔ (۱)

﴿وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَٰهِـۧمُ ٱلْقَوَاعِدَ مِنَ ٱلْبَيْتِ وَإِسْمَـٰعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾ رَبَّنَا وَٱجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾ رَبَّنَا وَٱبْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا۟ عَلَيْهِمْ ءَايَـٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ ٱلْعَزِيزُ ٱلْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾ وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَٰهِـۧمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُۥ ۚ وَلَقَدِ ٱصْطَفَيْنَـٰهُ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُۥ فِى ٱلْـَٔاخِرَةِ لَمِنَ ٱلصَّـٰلِحِينَ ﴿١٣٠﴾ إِذْ قَالَ لَهُۥ رَبُّهُۥٓ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ ٱلْعَـٰلَمِينَ ﴿١٣١﴾ وَوَصَّىٰ بِهَآ إِبْرَٰهِـۧمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَـٰبَنِىَّ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰ لَكُمُ ٱلدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٣٢﴾ أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ ٱلْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنۢ بَعْدِى قَالُوا۟ نَعْبُدُ إِلَـٰهَكَ وَإِلَـٰهَ ءَابَآئِكَ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ وَإِسْحَـٰقَ إِلَـٰهًا وَٰحِدًا وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٣﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْـَٔلُونَ عَمَّا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾﴾

ترجمہ:

ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے جاتے تھے اور کہتے جارہے تھے کہ ہمارے پروردگار تو ہم سے قبول فرما، تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے (۱۲۷)۔ اے ہمارے رب ہمیں اپنا فرمانبردار بنالے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنی اطاعت گزار رکھ اور ہمیں اپنی عبادتیں سکھا اور ہماری توبہ قبول فرما، تو توبہ قبول فرمانے والا اور رحم وکرم کرنے والا ہے (۱۲۸) ۔اے ہمارے رب ان میں، انہیں میں سے رسول بھیج ، جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے (۱۲۹)۔ دین ابراہیمی سے وہی بے رغبتی کرے گا جو محض بیوقوف ہو، ہم نے تو اسے دنیا میں بھی برگزیدہ کیا تھا اور آخرت میں بھی وہ نیکوکاروں میں سے ہے (۱۳۰) ۔جب کبھی بھی انہیں ان کے رب نے کہا، فرمانبردار

---

(۱) مرجع سابق.

ہو جا، انہوں نے کہا، میں نے رب العالمین کی فرمانبرداری کی (۱۳۱)۔ اس کی وصیت ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو کی، کہ ہمارے بچو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اس دین کو پسند فرمالیا، خبردار! تم مسلمان ہی مرنا (۱۳۲) ۔ کیا (حضرت) یعقوب کے انتقال کے وقت تم موجود تھے؟ جب انہوں نے اپنی اولاد کو کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو سب نے جواب دیا کہ آپ کے معبود کی اور آپ کے آباؤ اجداد ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) اور اسحاق (علیہ السلام) کے معبود کی جو معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے (۱۳۳)۔ یہ جماعت تو گزر چکی، جو انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے اور جو تم کرو گے تمہارے لئے ہے۔ ان کے اعمال کے بارے میں تم نہیں پوچھے جاؤ گے (۱۳۴) ۔

یہاں سے قرآنی سیاق بیت اللہ کی تعمیری کاروائی اور ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی اللہ تعالیٰ کے حضور دعا والتجا کی طرف منتقل ہو رہا ہے: ﴿وَإِذۡ يَرۡفَعُ إِبۡرَٰهِـۧمُ ٱلۡقَوَاعِدَ مِنَ ٱلۡبَيۡتِ وَإِسۡمَٰعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّآۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلسَّمِيعُ ٱلۡعَلِيمُ﴾ " ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) کعبہ کی بنیادیں اٹھاتے جاتے تھے اور کہتے جارہے تھے کہ ہمارے پروردگار تو ہم سے قبول فرما، تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ آیت کریمہ میں کعبہ مشرفہ کی بنیاد اٹھاتے وقت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی حالت کی عکاسی کی گئی ہے کہ وہ کس شوق سے اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس اطاعت کو قبول کرلے، اس سے معلوم ہوا کہ بندہ مومن کو بھی خوب لگن کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی تمام عبادتوں اور طاعتوں کی قبولیت کی دعا کرتے رہنا چاہیے، یہ نہ خیال کرے کہ میں نے توان عبادتوں کو پورے طور پر ادا کرہی دیا ہے اور اب وہ مقبول ہو چکی ہیں، کیوں کہ اس کو اپنے ادائیگی عمل کے اختتام کا پتہ نہیں ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ دونوں ایک نیک عمل انجام دے رہے تھے اس کے باوجود وہ اللہ سے اس کے قبولیت کی دعا کر رہے تھے، اور وہیب بن الورد کے تعلق سے بیان کیا گیا ہے کہ انہوں نے یہ آیت کریمہ پڑھی اور رونے لگے اور کہنے لگے: اے اللہ کے خلیل آپ اللہ کے گھر کی بنیاد کھڑی کر رہے ہو اس کے باوجود بھی خوف زدہ ہو کہ کہیں تمہارا یہ عمل غیر قبول نہ ہو جائے، یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ مومنون میں مخلص مومنوں حالت کی منظر کشی کی: ﴿وَٱلَّذِينَ يُؤۡتُونَ مَآ ءَاتَواْ وَّقُلُوبُهُمۡ وَجِلَةٌ﴾

[سورة المؤمنون: ٦٠]۔ "اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل کپکپاتے ہیں" یعنی جو بھی صدقات وخیرات اور عبادتیں کرتے ہیں ان کے دل سہمے سہمے رہتے ہیں کہ کسی کوتاہی کی وجہ ان کے یہ اعمال رد نہ کر دیئے جائیں(١)۔

اس کے بعد ابراہیم واسماعیل علیہما السلام دعا کرتے ہیں: ﴿ رَبَّنَا وَٱجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ ﴾ "اے ہمارے رب ہمیں اپنا فرمابردار بنالے" یعنی ہمیں تابعدار، اطاعت گذار اور اپنے سامنے جھکنے والا بنالے، یہ اللہ سے ان کی دعا ہے کہ ان کو ایمان اور عمل صالح پر ثابت قدمی اور دوام کی توفیق دے، اسی طرح ہر مسلمان کو بھی چاہئے کہ ثابت قدمی کی دعا کرے اور اطاعت کے غرور سے بچے، بلکہ نیکی کرتے ہوئے مقبولیت کی، نیز حق پر قائم رہنے اور عدم انحراف کی دعا کرتا رہے، یہی ابراہیم علیہ السلام اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل تھا، آپ دعا کیا کرتے تھے: ﴿يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ﴾(٢) "اے دلوں کو الٹ پھیر کرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ"(٣)۔

ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی یہ دعا اپنے علاوہ بعد میں والی اولاد کے لیے بھی تھی: ﴿ رَبَّنَا وَٱجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةٗ مُّسۡلِمَةٗ لَّكَ ﴾ "اے ہمارے رب ہمیں اپنا فرمابردار بنالے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت کو اپنی اطاعت گزار رکھ" یہ اولاد کے لیے دعا کا ایک نمونہ ہے، اور اولاد کو بھی چاہیے کہ خیر کے کاموں میں اپنے والد کے ساتھ شریک رہیں جیسا کہ اسماعیل علیہ السلام نے اپنے والد کا ساتھ دیا، تاکہ ان سے فیض یابی اور نقش قدم کی پیروی کا موقع میسر ہو۔

ابراہیم واسماعیل علیہما السلام مزید دعا کر رہے ہیں: ﴿ رَبَّنَا وَٱجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةٗ مُّسۡلِمَةٗ لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبۡ عَلَيۡنَآۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴾" اور ہمیں اپنی عبادتیں سکھا اور ہماری توبہ قبول فرما، تو توبہ قبول فرمانے والا اور رحم وکرم کرنے والا ہے" دونوں دعا کر رہے ہیں کہ اللہ تعالی انہیں حج کے اعمال اور مناسک سکھادے، اور کہا گیا ہے کہ اس سے تمام عبادتیں مراد ہیں، اس لیے

---

(١) تفسير ابن كثير ١٨١/١.

(٢) سنن ترمذي ٥٠٣/٥ حديث نمبر (٣٥٢٢).

(٣) تفسير قرطبي ٨٧/٢ (بالاختصار)

عبادت گذار کے لیے "ناسک" کا لفظ بولا جاتاہے اور مناسک سے مراد عام عبادتیں ہیں(١)۔اس کی بعد دونوں اللہ تعالی کے اسماء وصفات کے وسیلے سے توبہ طلب کرتے ہیں کیوں کہ وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم والا ہے ،فرمایا: ﴿إِنَّكَ أَنتَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ﴾ " تو توبہ قبول فرمانے والا اور رحم وکرم کرنے والا ہے" ۔اس سے اسماء وصفات الٰہی کا وسیلہ اختیار کرنے کی اہمیت کا پتہ چلتاہے نیز اللہ کے علاوہ کسی مخلوق کا وسیلہ جائز نہیں ہے۔

یہ دونوں پیغمبر ایک عظیم عبادت اور اطاعت کا کام کرنے کے باوجود اللہ تعالی سے توبہ طلب کر رہے ہیں ، کیوں کہ بندہ چاہے جتنا بھی عمل کرلے اس میں کمی رہ ہی جاتی ہے، جب اللہ تعالی کے چنندہ خلیل اوران کے فرزند رشید کی یہ شان ہے کہ ان کو اللہ تعالی سے توبہ کی طلب ہے تو دوسروں کے بارے میں کیسا تصور کیا جائے، اس لیے انسان کبھی اپنی عبادتوں پر غرور کا شکار نہ ہو بلکہ اللہ تعالی سے ان کی قبولیت کی دعا اور اپنی تقصیر کی بخشش طلب کرتا رہے۔

دعاؤں کا سلسلہ جاری ہے: ﴿رَبَّنَا وَٱبۡعَثۡ فِيهِمۡ رَسُولٗا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيهِمۡۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلۡحَكِيمُ﴾ " اے ہمارے رب ان میں، انہیں میں سے رسول بھیج ، جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے"۔اس دعا سے واضح ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی خواہش تھی کہ ان میں ان کی ذریت اور اولاد میں سے ایک رسول بھیجا جائے اور اللہ تعالی نے آپ کی دعا قبول فرمائی چنانچہ اللہ تعالی نے اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی اولاد سے ان میں اپنے نبی اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: (أنا دعوة أبي إبراهيم وكان آخر من بشَّر بي عيسى بنُ مريم)(٢)۔ میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا اور وہ آخری نبی ہوں جس کی بشارت عیسی بن مریم نے دی"۔ اس دعا میں رسول کی ذمہ داری بتائی گئی ہے: ﴿يَتۡلُواْ عَلَيۡهِمۡ ءَايَٰتِكَ

---

(١) مرجع سابق.

(٢) مسند أحمد ٥٩٥٩/٣٦ حديث نمبر (٢٢٢٦١) ، وسلسلة الأحاديث الصحيحة (١٥٣٦)

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ﴾" جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے، انہیں کتاب و حکمت سکھائے "۔ یہ تلاوت لفظی اور حافظہ کی بنیاد پر ہوتی تھی اور آپ کی تلاوت سن کر صحابہ بھی یاد کر لیا کرتے تھے(۱)۔ ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ﴾" انہیں کتاب و حکمت سکھائے "۔یعنی سمجھا کر عملی طور پر، کیوں کہ تعلیم تفہیم اور تطبیق کا نام ہے، کتاب سے مراد قرآن کریم اور حکمت سے سنت رسول ہے۔ ﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ "اوران کو پاک کرے" اعمال صالحہ کی تربیت دے کر اور برے اعمال سے بچا کر(۲)۔ یہی وارثین انبیاء علماء کی بھی ذمہ داری ہے، اور قرآن کے تلاوت و فہم اور تطبیق کی تعلیم ہی دینی تعلیم کا فرض عین ہے، اسی طرح سنت نبوی کی تعلیم بھی۔ نیز اطاعت و بندگی اور اخلاص للہ کے ذریعہ تزکیہ ٔ نفس تربیت کا لازمی تقاضا ہے، اور تربیت کا مفہوم یہی ہے کہ اللہ تعالی کے محبوب اور پسندیدہ امور پر پرورش اور زندگی میں ان کی عملی تطبیق ہو، نیز منہج و مقصد الہی کے خلاف امور سے نفس کو پاک کیا جائے۔

مختصرا یوں کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم کی بنیادیں: مشق و ممارست، وضاحت و بیان، فہم و استنباط اور اخذ نتائج کے ملکہ کی نشو و نما وغیرہ امور پر قائم ہیں، اور "استنباط و اخذ نتائج" کسی بھی حکم کے تمام وسائل و دلائل کو سیکھ کر مذکورہ حکم تک پہنچنے کی سعی پیہم کا نام ہے۔ اسی طرح تعلیم قوت ارادہ اور اس کی عملی و تطبیقی سر گرمی کا نام ہے تاکہ اس کے ذریعہ عقل و عمل اور طرز زندگی ہر طرح کے شائبہ اور رکاوٹ سے پاک ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَٰهِـۧمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُۥ﴾ "دین ابراہیمی سے وہی بے رغبتی کرے گا جو محض بے وقوف ہو"۔ یعنی دین ابراہیمی سے وہی بے رغبتی کرے گا جو جاہل اور خود کی رسوائی اور ذلت پر راضی ہو کر اپنے آپ کو دھوکہ دے، (رَغِبَ) فعل جب (فی) کے ساتھ استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کی خواہش کرنا، اور جب (عن) کے ساتھ استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ترک کر دینا۔ تو جو کوئی اللہ تعالی کے دین اور اس کی شریعت کی معرفت کے بعد

---

(۱) تفسير سعدى ۹۵/۱

(۲) مرجع سابق.

اس سے بے رغبتی کرتا اور چھوڑ دیتا ہے اور اس کے بدلے میں دوسری شریعت اور دین اختیار کرتا ہے تو اس کا حال اس جاہل بے وقوف جیسا ہے جو روشنی اور بھلائی دیکھتے ہوئے ترک کر دیتا ہے اور اس کے بدلے اس سے کمتر چیز لے لیتا ہے، یہ انتہائی درجہ کی گھٹیا سوچ ہے جس کو ایک سوچتا سمجھتا شخص اپنے سامنے بالکل واضح اور صاف ستھرے حق کے بر خلاف اختیار کرتا ہے۔

(إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ) اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ بسا اوقات انسان خود کو خود ہی سے ایذاء پہنچاتا اور اپنی حقارت وذلت، گراوٹ وکمزوری، حق اور خیر سے دوری کا سبب بنتا ہے، کیوں کہ (السفه) کا مفہوم ہی یہ ہے کہ برائی سے بچنے کی بجائے اس میں داخل ہو جایا جائے اور بھلائی کو چھوڑ کر دوری اختیار کرلی جائے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان اپنے تئیں ذمہ دار ہے اور وہ اپنی ذات کے بارے میں پوچھا جانے والا ہے، اسی کے بر عکس انسان اللہ کی توفیق سے خود کو بھلائی اور خیر کی طرف گامزن کرتا اور اپنی حیثیت کی نشو نما کرتا ہے، ترک معصیت، اطاعت اور مصائب پر صبر اور خیر وبھلائی کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں پر قابو پانے اور بچنے کی سعی پیہم کرتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اس نبی مکرم ابراہیم علیہ السلام کی دونوں جہان میں رفعت شان کو بیان کر رہا ہے: ﴿ٱصۡطَفَيۡنَٰهُ فِي ٱلدُّنۡيَاۖ وَإِنَّهُۥ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ لَمِنَ ٱلصَّٰلِحِينَ﴾ " ہم نے تو اسے دنیا میں بھی برگزیدہ کیا تھا اور آخرت میں بھی وہ نیکو کاروں میں سے ہے" ۔ اللہ تعالی نے ان کو اپنی مخلوقات میں سے منتخب کر رکھا تھا، دنیا میں اپنی خوشنودی اور رضامندی کے اعمال کی توفیق دی اور آخرت میں ان کا شمار نیکو کاروں میں ہے، (صالح) اللہ تعالی کے عظیم ثواب سے جو کامیاب ہو، کلمہ (الاصطفاء) کا معنی ہے دوسروں کے درمیان سے کسی کو چن لینا، اس لفظ میں یہ معنی بھی ہے اللہ تعالی نے جس کو اختیار کیا اس سے وہ محبت بھی کرتا ہے اور اس پر اللہ تعالی کی خاص عنایت ہوتی ہے، لہذا جس کو اللہ تعالی نے چنا ہو اس کی توقیر وعزت، محبت اور تصدیق بقیہ بندوں پر بھی واجب اور ضروری ہے۔ آیت میں خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کی ان کی عقل، خلقت، اخلاق، نبوت اور اس سے لگے ہر امر اور معاملہ میں تعریف اور صفائی دی گئی ہے ، اور اللہ تعالی کے فرمان: ﴿وَإِنَّهُۥ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ لَمِنَ ٱلصَّٰلِحِينَ﴾ " اور آخرت میں بھی وہ نیکو کاروں میں سے

ہے"میں ابراہیم علیہ السلام کے مقام ومرتبہ کا ثبوت ہے،کہ وہ ان کامیاب لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ تعالی نے اجر جزیل اور ثواب عظیم سے نوازا ہے۔

آئندہ کی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالی کے احکامات کو فوری طور پر بلا تاخیر بجالانے کا ذکر ہے: ﴿ إِذۡ قَالَ لَهُۥ رَبُّهُۥٓ أَسۡلِمۡۖ قَالَ أَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾ " جب کبھی بھی انہیں ان کے رب نے کہا، فرمانبردار ہو جا، انہوں نے کہا، میں نے رب العالمین کی فرمانبرداری کی"۔یعنی انہوں نے فوراً اللہ کے حکم کی تعمیل کی۔آیت کریمہ میں ایک ہی کلمہ (أَسۡلِمۡ) کے ذریعہ حکم الہی کے بہت سارے مفاہیم و دلالات ہیں: یعنی اللہ کے فرمابردار ہو جا اطاعت میں، انقیاد وتابعداری میں، عمل میں، انابت ورجوع الی اللہ میں، عبادت میں۔ گویا کہ اس ایک جملہ میں وہ تمام مطالب ومفاہیم آگئے جو ابراہیم علیہ السلام سے مطلوب تھے، یہ قرآن کا بلاغی اور معجزاتی طرز بیان ہے۔اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ اس حکم کی تعمیل اور بجاآوری کو بھی ایک ہی کلمہ (أَسۡلَمۡتُ) کے ذریعہ بیان کیا گیا ،یعنی ابراہیم علیہ السلام نے فورا بلا تردد کہا کہ میں فرمابردار ہو گیا، اس میں بھی بلا تردد قبولیت واطاعت اور تعمیل حکم کے سارے مفاہیم موجود ہیں، یہاں تک کہ جب ان کو اپنے بیٹے کے قتل کرنے کا حکم دیا گیا تب بھی کسی تردد کا شکار نہیں ہوئے اور نہ ہی کسی تاویل اور تفکیر سے کام لیا، بلکہ ذبح کے لیے فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، مگر اللہ تعالی نے اس کے فدیہ میں ایک عظیم ذبیحہ عطا کیا۔ابراہیم علیہ السلام کا یہ طرز عمل ہر اطاعت گذار کے لیے ایک اسوہ اور نمونہ ہے، چنانچہ ہر مسلم کا طرز عمل اللہ تعالی کے اوامر ونواہی میں ایسا ہی ہونا چاہیے لہذا وہ اللہ کی فرمابرداری میں کسی تردد کا شکار نہ ہو اور نہ اس کے اوامر ونواہی کو اپنی خواہشات کا تابع بنائے۔

﴿ أَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾ " میں نے رب العالمین کی فرمانبرداری کی"۔ یہ جملہ توحید خالص کی مثال ہے، یعنی ابراہیم علیہ السلام نہ تو کسی غیر کے لیے جھکے اور نہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا بلکہ واحد اللہ رب العالمین کی فرمابرداری کی۔ اس میں توحید الوہیت اور توحید ربوبیت دونوں کا ثبوت ہے ، (لِرَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ) میں توحید ربوبیت ہے ، یعنی اللہ تعالی ہر چیز کا رب اور مالک ہے۔ (أَسۡلَمۡتُ) میں توحید الوہیت کا بیان ہے، اور اس استسلام کی رب العالمین کے ساتھ تحدید کا فائدہ یہ ہے کہ خوف وخشیت ، محبت ورجاء، طاعت ، حیات وممات ، اور ایمان وعبادات سب کچھ اللہ تعالی کے

لیے محصور ہو گی، چنانچہ کوئی بھی عبادت غیر اللہ کے لیے نہیں کرتے تھے کیوں کہ آپ کی فرمابرداری ایک اللہ کے لیے تھی جیسا کہ آیت میں بیان کیا گیا ہے، نیز کلمہ (أَسْلَمْتُ) میں ہر وہ عبادت آ گئی جس کو بندہ اپنے رب کے لیے انجام دیتا ہے، یہ بھی الفاظ و معانی میں قرآن کی بلاغت اور اس کا اعجاز ہے جس نے اللہ تعالی کی مراد کا پورے طور پر احاطہ کر لیا ہے ،نہ تو کوئی آیت چھوٹی اور نہ کوئی پند و نصیحت۔

بعد کی آیت میں اپنی ذریت اور دین کی بقا کے متعلق ابراہیم علیہ السلام کی آرزو کا بھی ذکر ہو رہا ہے اور اللہ تعالی ابراہیم علیہ السلام کی اس حالت کو بیان کر رہا ہے جو ان کی اولاد کے ساتھ تھی: ﴿وَوَصَّىٰ بِهَآ إِبْرَٰهِـۧمُ بَنِيهِ﴾ "اس کی وصیت ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو کی" اللہ تعالی نے ابراہیم علیہ اسلام کی دعا قبول فرمائی، چنانچہ آپ کے فرزند بھی آپ ہی کے منہج اور طریقے پر چلے، یہاں تک کہ یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام نے بھی اپنے بیٹوں کو وہی وصیت کی جو ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی، فرمایا: ﴿وَيَعْقُوبُ يَٰبَنِيَّ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰ لَكُمُ ٱلدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾ "اور (اس کی وصیت) یعقوب نے اپنی اولاد کو کی، کہ ہمارے بچو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اس دین کو پسند فرمالیا، خبر دار! تم مسلمان ہی مرنا"۔ اس توجیہی اسلوب میں اللہ تعالی کی نعمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالی نے دین ابراہیمی کو اختیار کیا اور چنا اور پھر ان کو اس دین کے لیے منتخب کیا، اور ان کو موت کی یاد دہانی کرا کر نصیحت کی تا کہ ان کے دل اس دین کی پابندی پر آمادہ ہوں ۔ اس نصیحت میں انسان کے خاتمہ کا تنبیہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس کی شکل موت ہے تا کہ اس نصیحت کا اثر زیادہ ہو، اور ان کا خاتمہ اسلام پر ہو ، شیخ ابن السعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو جس چیز اور حالت پر جینے کا عادی ہوتا ہے اللہ تعالی کے حکم سے اس کی موت اسی حالت میں ہوتی ہے، اور جو جس حالت میں مرتا ہے وہ اسی حالت میں قیامت کے دن اٹھایا جائے گا(١)۔

آگے اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ ٱلْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنۢ بَعْدِى قَالُوا۟ نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ ءَابَآئِكَ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ إِلَٰهًا وَٰحِدًا وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُونَ﴾" کیا (حضرت) یعقوب کے انتقال کے وقت تم موجود تھے؟ جب (١) انہوں نے اپنی اولاد کو کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو سب نے جواب دیا کہ

---

(١) تفسير سعدى ١/٩٧.

آپ کے معبود کی اور آپ کے آباؤ اجداد ابراہیم (علیہ السلام) اور اسماعیل (علیہ السلام) اور اسحاق (علیہ السلام) کے معبود کی جو معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے"۔

امام قرطبیؒ رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں: آیت میں خطاب ان یہود ونصاری سے ہے جو ابراہیم علیہ السلام کی طرف ایسی وصیت منسوب کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے بیٹوں سے نہیں کی ہے، ان کا یہ بھی دعوی تھا کہ یہ لوگ یہودیت اور نصرانیت کے دین پر تھے، اللہ تعالی نے ان کی تکذیب کرتے ہوئے ان کے دعووں کی تردید کی اور بطور زجر وتوبیخ ان سے کہا کہ کیا تم لوگ یعقوب (علیہ السلام) کے وقت میں موجود تھے؟ اور کیا انہوں نے جو وصیت کی وہ تمہیں معلوم ہے جس کی بنیاد پر تم یہ دعوی کررہے ہو؟ یعنی تم اس وقت موجود ہی نہیں تھے، بلکہ تم لوگ جھوٹ بولتے ہو۔ (أَمْ) (بَلْ) کے معنی میں ہے، اور (شُهَدَاءَ) شاھد کی جمع، بمعنی حاضر۔ ﴿إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ﴾" جب (حضرت) یعقوب کے انتقال کا وقت ہوا" یعنی موت کے آثار اور اسباب ظاہر ہونے لگے۔

فرزندان یعقوب نے ان کو ایسا جواب دیا جس سے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں، کہا کہ وہ توحید خالص کے ماننے والے ہیں جس میں شرک کی کوئی ملاوٹ نہیں ، مزید گویا ہوئے: : ﴿وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُونَ﴾ "اور ہم اسی (اللہ) کے فرمانبردار رہیں گے"۔ چنانچہ انہوں نے توحید کے ساتھ ساتھ ان سارے اوامر کی فرمابرداری اور پابندی کا اقرار کیا جن کا اللہ نے حکم دیا ہے، چاہے ان کا تعلق ایمانیات سے ہو یا عبادات واخلاقیات سے، غرض یہ کہ ان کا یہ مختصر جواب تمام خیر وبھلائی کا جامع اور اس کے برعکس برائی کے احتمالات سے مانع تھا۔ اس آیت سے یہ درس ملتا ہے کہ دین کی پابندی کے تعلق سے اولاد کی تربیت واصلاح اور اس پر مداومت کی ایسی ہی حرص وآرزو ہر کسی کو زندگی کی آخری گھڑی تک ہونی چاہیے، ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کا واضح نمونہ ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے آخری لمحات میں بھی لوگوں کو نماز اور غلاموں کے ساتھ بھلائی کی تاکید کرتے رہے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا کرتے دیکھتے رہے۔

آیت کے من جملہ فوائد میں سے ہے کہ باپ، عالم اور داعی کو اسلامی امور کا کافی اہتمام ہونا چاہیے، بالخصوص اپنی اولاد اور ان کے دین کو لے کر ہمیشہ فکر مند رہنا چاہیے جن کے وہ ذمہ دار ہیں۔ آیت میں

یہود ونصاری کی گذشتہ نبیوں پر افترا پردازی کی پول کھولی گئی ہے، نیز ان کے اس جھوٹ کی پردہ فاشی کے لیے تقریری اسلوب اختیار کیا گیا ہے، یعنی وہ لوگ یعقوب کی اپنے بیٹوں کی وصیت کے وقت جب وہ لوگ حاضر نہیں تھے تو ان کے یہودیت ونصرانیت کی وصیت کا دعوی محض ایک افتراء ہے۔اس کے بعد اللہ تعالی نے بیان کیا ہے کہ ان کے بیٹوں نے وہی جواب دیا جس پر تمام رسول متفق ہیں، یعنی توحید اور اسلام۔

قصہ کا اختتام اس آیت سے ہوتا ہے: ﴿ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾ ﴾ "یہ جماعت تو گزر چکی، جو انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے اور جو تم کرو گے تمہارے لئے ہے۔ان کے اعمال کے بارے میں تم نہیں پوچھے جاؤگے" ۔ہر شخص کا عمل اس کے ساتھ ہے ،ان کے اعمال کے بارے میں تم جوابدہ نہیں ہو ، اس لیے تمہارا فرض یہ ہے کہ تم اپنے معاملات اور احوال کا جائزہ لو کہ تم کیا کچھ کر رہے ہو۔

معلوم ہوا کہ مخالفین سے راہ حق اور حقائق کو بیان کرتے ہوئے اس کی بدگمانیوں کا رد کر دیا جائے گا، اگر قبول کر لیتا ہے تو بہتر ہے ورنہ اس کی کرتوت کا وبال اسی پر ہے ،کیوں کہ حق کی توفیق کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے، اس کے حق میں بس اتنا کافی ہے کہ خیر و بھلائی اور درست بات کی طرف اس کی رہنمائی کر دی جائے۔

﴿وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٦﴾ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ أَأَنتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ وَمَنْ

أَظۡلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَٰدَةً عِندَهُۥ مِنَ ٱللَّهِۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُونَ ﴿١٤٠﴾ تِلۡكَ أُمَّةٞ قَدۡ خَلَتۡۖ لَهَا مَا
كَسَبَتۡ وَلَكُم مَّا كَسَبۡتُمۡۖ وَلَا تُسۡـَٔلُونَ عَمَّا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ﴿١٤١﴾

ترجمہ:

"یہ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔ تم کہو بلکہ صحیح راہ پر ملت ابراہیمی والے ہیں، اور ابراہیم خالص اللہ کے پرستار تھے اور مشرک نہ تھے (۱۳۵)۔اے مسلمانو! تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور اس چیز پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام دیئے گئے۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں (۱۳۶)۔اگر وہ تم جیسا ایمان لائیں تو ہدایت پائیں، اور اگر منہ موڑیں تو وہ صریح اختلاف میں ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے عنقریب آپ کی کفایت کرے گا اور وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے(۱۳۷)۔اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ تعالیٰ سے اچھا رنگ کس کا ہوگا ، ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں(۱۳۸)۔ آپ کہہ دیجئے کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جو ہمارا اور تمہارا رب ہے، ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، ہم تو اسی کے لئے مخلص ہیں(۱۳۹) ۔کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے؟ کہہ دو کیا تم زیادہ جانتے ہو۔یا اللہ تعالیٰ! اللہ کے پاس شہادت چھپانے والے سے زیادہ ظالم اور کون ہے؟ اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں (۱۴۰)۔یہ امت ہے جو گزر چکی، جو انہوں نے کیا ان کے لئے ہے اور جو تم نے کیا وہ تمہارے لئے، تم ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہ کئے جاؤ گے(۱۴۱)"۔

آیت کریمہ میں پھر سے اہل کتاب کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے اور ان آیات میں یہود و نصاری کے کبر وغرور اور حق کے ثابت ہو جانے کے بعد انکار کو بیان کیا گیا ہے، بلکہ ان کی سرکشی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ یہود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو یہودیت کی اور نصاری نصرانیت کی دعوت دے رہے تھے، اس سے یہ پتہ چلا کہ اہل باطل کھلے حق کا انکار تو کرتے ہی ہیں ساتھ ہی حق پرستوں سے

اپنے باطل کی پیروی کرانا چاہتے اور اس کی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ انہیں خوب علم ہوتا ہے کہ وہ باطل پرست ہیں، یہ الگ بات کہ وہ حق پر ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ ۔﴿وَقَالُواْ كُونُواْ هُودًا أَوْ نَصَـٰرَىٰ تَهْتَدُواْ﴾ " یہ کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے "۔یہاں پر اعلان حق کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمارہاہے کہ آپ ان سے کہہ دیں: ﴿بَلْ مِلَّةَ إِبْرَٰهِـۧمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ ٱلْمُشْرِكِينَ﴾ "بلکہ صحیح راہ پر ملت ابراہیمی والے ہیں، اور ابراہیم خالص اللہ کے پرستار تھے اور مشرک نہ تھے"۔اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دین اسلام اسی دین ابراہیمی ہی کا تسلسل وامتداد ہے ،اور دین الٰہی استقامت اور توحید خالص کا نام ہے۔ ﴿حَنِيفًا ۖ﴾ "خالص اللہ کے پرستار"یعنی شرک وبدعت سے دور۔ معلوم ہوا کہ شرک وبدعت دین سے خارج کردینے والی چیز ہے اور مشرک اپنے اصل توحید کے منافی شرک کی وجہ سے اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔اور اللہ تعالی کے فرمان: ﴿بَلْ مِلَّةَ إِبْرَٰهِـۧمَ حَنِيفًا ۖ﴾ "بلکہ صحیح راہ پر ملت ابراہیمی والے ہیں"، سے پتہ چلتا ہے کہ باطل کے سامنے حق ہمیشہ ڈٹا رہتا ہے، نیز آیت میں اسلام کا اثبات اور شرک کی نفی کی گئی ہے،اور شرک مشرک کی مذمت اور تنقیص کا باعث ہے، کیوں کہ شرک اللہ تعالی کی مرضی کے خلاف شئے ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان یہود ونصاری اور ان کے علاوہ لوگوں کے لیے بات کو مزید واضح کررہا ہے: ﴿قُولُوٓاْ ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَآ أُنزِلَ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ وَإِسْحَـٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَمَآ أُوتِىَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَآ أُوتِىَ ٱلنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُونَ﴾ "اے مسلمانو! تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور اس چیز پر بھی جو ابراہیم، اسماعیل اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور دوسرے انبیاء علیہم السلام دیئے گئے۔ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے، ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں"۔ چنانچہ اللہ پر ایمان ، اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل قرآن وسنت پر ایمان، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَأَنزَلَ ٱللَّهُ عَلَيْكَ ٱلْكِتَـٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ﴾ [سورة النساء:١١٣]۔ "اللہ تعالیٰ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے"۔رسولوں اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان یہ سارے امور اس دین کی بنیاد ہیں ، ہم ان رسولوں میں سے کسی کے

درمیان فرق نہیں کرتے ،اور ہم اللہ ہی کے فرمابردار اوراس کے نازل کردہ احکامات کے پیروکار ہیں۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہ دین اسلام اسی دین کا امتداد ہے جو اس سے پہلے کے تمام رسول لے کر آئے تھے اس لیے ایک مسلمان اللہ پر ایمان لاتا ہے ،اور جو کچھ نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ان پر ایمان کے ساتھ جو اللہ تعالی کی طرف سے آپ سے پہلے کے نبیوں کو دیا گیا ان پر بھی ایمان لاتا ہے۔

دین اسلام بالکل واضح دین ہے، اپنے سے ماقبل کی تصدیق کرنے والا، اور اسلام سے پہلے کے انبیاء کو کچھ لے کر آئے اسی کا ایک سلسلہ ہے ، دین اسلام تمام نبیوں اور رسولوں کی عزت اور ان کا احترام کرتا ہے، ان میں سے کسی کی تنقیص نہیں کرتا، یہ سارے امور اس دین کی بنیاد ہیں، ان میں سے کسی کی تنقیص آدمی کے نقض ایمان اور ارتداد کا سبب ہے۔

اس کے بعد شرط بیان کی جارہی ہے اور اسی شرط کے حساب سے ان پر حکم بھی مرتب ہوگا، فرمایا: ﴿فَإِنْ ءَامَنُواْ بِمِثْلِ مَآ ءَامَنتُم بِهِۦ فَقَدِ ٱهْتَدَواْ﴾ "اگر وہ تم جیسا ایمان لائیں تو ہدایت پائیں"۔ یعنی ہدایت دین اسلام میں منحصر ہے ، اور وہ ہدایت ہو ہی نہیں سکتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کے طریقے کے مخالف ہو، نیز جس دین کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے علاوہ تمام ادیان باطل ہیں، اس لیے اگر یہ لوگ تمہارے دین پر ایمان نہیں لاتے تو پھر ایسے لڑتے جھگڑتے اور دشمنی کرتے رہیں گے ، فرمایا: ﴿وَّإِن تَوَلَّوْاْ فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ﴾" اور اگر منہ موڑیں تو وہ صریح اختلاف میں ہیں" معلوم ہوا کہ ان کی روگردانی ان کے اختلاف کا سبب ہے اور ان کی اس دین سے روگردانی محض جدال اور عناد ودشمنی کی بنیاد پر ہے ، لیکن اللہ تعالی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں سے بیان کررہاہے کہ وہ عنقریب ان معاندین کے تعلق سے آپ کی کفایت کرے گا وہ ان کی باتوں کو اور ہر چیز کو خوب سننے والا اور ان کو اور ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے: ﴿ وَّإِن تَوَلَّوْاْ فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ ٱللَّهُ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ﴾ " اور اگر منہ موڑیں تو وہ صریح اختلاف میں ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے عنقریب آپ کی کفایت کرے گا اور وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے"۔ یعنی جس حق کو دے کر آپ بھیجے گئے اگر منہ موڑیں تو وہ تم سے صریح اختلاف ومخالفت میں ہیں، اللہ تعالی اس اختلاف ومخالفت سے تمہاری کفایت وہ خود کرے گا کیوں کہ اللہ تعالی خوب سنتا ہے اور تمہاری اور ان

کی حالتوں سے بخوبی واقف ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا وعدہ پورا کیا، جیسا کہ ان کا ایک قبیلہ قتل ہوا اور بنو نضیر جلاوطن کیئے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے اسماء وصفات کی معرفت کافی اہمیت کی حامل ہے، اللہ تعالی کے انہی اسماء میں سے: ﴿ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ﴾ دو نام ہیں، جن کا تقاضا ہے کہ ہر مسلم اللہ تعالی کا خوف اور اس سے حیا کرے جو کہ اپنی ہر مخلوق کو سنتا اور ان کے احوال کو جانتا ہے، نیز ان کے علم کا یہ بھی تقاضا ہے کہ مسلم کی امید ورجاء، استعانت ومدد اور توکل وبھروسہ صرف اسی ذات پر ہو جو اس کی ہر بات سنتا اور اس کی احوال سے ہمہ وقت واقف ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں اللہ تعالی دین اسلام کی ایسی خوبصورتی بیان کر رہا ہے جو کہ تمام ادیان پر غالب ہے: ﴿ صِبْغَةَ ٱللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ ٱللَّهِ صِبْغَةً ۖ ﴾ "اللہ کا رنگ اختیار کرو اور اللہ تعالی سے اچھا رنگ کس کا ہوگا "۔ آیت کا ابتدائی حصہ ﴿ صِبْغَةَ ٱللَّهِ ۖ ﴾ اس بات کے اثبات میں ہے کہ یہ اسلام ہی اللہ تعالی کا دین ہے، پھر آیت کا اگلا حصہ تقریری اسلوب میں ایک تعجیزی سوال ہے جو موجب ایمان وتصدیق ہے: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ ٱللَّهِ صِبْغَةً ﴾ "اور اللہ تعالی سے اچھا رنگ کس کا ہوگا "۔ یعنی کیا توحید وعبادت، یسر وسہولت اور حسن اخلاق میں اس دین سے اچھا بھی کوئی دین ہے ؟ نہیں، بلکہ یہی سب سے اچھا دین ہے کیوں کہ اسی پر عمل پیرا ہو کر سماجی، خاندانی اور پیشہ وری کی خوشحالی حاصل کی جاسکتی ہے، نیز کسی بھی فرد بشر کی اخلاقی خوش بختی بھی اسی دین کے مرہون منت ہے ، گہری فکر ونظر کا حامل اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ اسلام اللہ تعالی کا دین ہے جس پر ایمان لانا اور تصدیق کرنا واجب ہے تاکہ اس کے ذریعہ آخرت کی سعادت تک رسائی ہو سکے، اور یہی ہر مومن کا مطمع نظر ہے۔

آیت میں سوالیہ اسلوب کا استعمال ہوا ہے: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ ٱللَّهِ صِبْغَةً ﴾ "اور اللہ تعالی سے اچھا رنگ کس کا ہوگا" تاکہ لوگوں کے لیے ثابت ہو جائے کہ دین اسلام سے بہتر کوئی دین نہیں ہے، اگر ہے تو وہ لوگ لائیں بیان کریں اور دین اسلام سے اس کا مقارنہ کر کے ثابت کریں کہ ان کا دین اسلام سے بہتر ہے ، چنانچہ جب ایسا کوئی دین حقیقت میں موجود ہی نہیں تو ان کے سامنے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ مسلم کے دین واحکام کے پیروکار ہو جائیں۔

آیت کے اختتام میں بطور ثبوت کہا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مومنین اسی دین اسلام کے پابند ہو کر اللہ واحد کے عبادت گذار تھے: ﴿وَنَحْنُ لَهُۥ عَـٰبِدُونَ﴾ " ہم تو اسی کی عبادت کرتے ہیں"۔ یہ ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ ٱللَّهِ صِبْغَةً﴾ کا نتیجہ ہے، یعنی اس دین سے بہتر کوئی دین ہے ہی نہیں، اس سے یہ بات خود سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسی لیے ہم اس دین کے پابند ہیں، رہا تمہارا معاملہ تو تم جانو تمہارا کام جانے، جو اس دین کو اختیار کرنا چاہتا ہے تو بالکل اس کی کھلی گنجائش ہے، لیکن جو روگردانی کرے تو اس پر حجت قائم ہو چکی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہا ہے کہ آپ ان یہود و نصاری سے کہہ دیں: ﴿قُلْ أَتُحَآجُّونَنَا فِى ٱللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ أَعْمَـٰلُنَا وَلَكُمْ أَعْمَـٰلُكُمْ وَنَحْنُ لَهُۥ مُخْلِصُونَ﴾ " آپ کہہ دیجئے کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جو ہمارا اور تمہارا رب ہے، ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال، ہم تو اسی کے لئے مخلص ہیں"۔ قرآن کریم کی اکثر آیتوں کے سیاق میں غور فکر کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان آیات کا مقصد کافروں سے حق اگلوا کر حقیقت کی طرف لے جانا ہے ،اس کے لیے نہایت مستحکم دلائل دے کر ان کا نقاش اور پھر حق وصواب کو ثابت کیا جاتا ہے، جس کے بعد کسی صاحب عقل وشعور کے لیے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، الا یہ کہ کسی کا دل کبر وعناد سے بھرا ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

آیت کریمہ میں اللہ تعالی اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کر رہا ہے کہ آپ اہل کتاب سے کہہ دیجئے: ﴿قُلْ أَتُحَآجُّونَنَا فِى ٱللَّهِ﴾ " کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو" یعنی اللہ تعالی کے دین کے بارے میں۔ یعنی کیا تم اللہ تعالی کے ہم سے زیادہ قریبی ہو جیسا کہ ان کا دعوی تھا کہ وہ اللہ کے بیٹے اور چہیتے ہیں اور اس لیے کہ تمہارے آباء واجداد اور کتابیں پہلے آئیں، تم لوگ ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ ہمارا رب اور تمہارا رب ایک ہی ہے، اور سب کو اپنے عمل کا بدلہ دیا جانا ہے، پھر اس دین کے نئے پرانے ہونے کا کیا فائدہ؟ ہم تو خالص اسی کی عبادت کرتے ہیں، اور کسی بھی مخلوق کا اللہ سے قریب ہونے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اللہ کا اخلاص اور اس کی اطاعت۔ اسی سے اخلاص کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے ، نیز کوئی بھی عبادت ایسے انحرافات سے پاک ہونی چاہیے جس میں اخلاص کے علاوہ شرک وریا وغیرہ کی

آمیزش ہو۔ آیت سے یہ فائدہ بھی ماخوذ ہوتا ہے کہ باطل لوگوں سے جدال اور مباحثہ تشدد اور سختی کی بجائے بہتر اسلوب میں ہونا چاہیے ، ﴿ وَلَنَآ أَعۡمَٰلُنَا وَلَكُمۡ أَعۡمَٰلُكُمۡ ﴾ "، ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال "۔

اہل کتاب کا یہ دعوی تھا کہ پہلے کے انبیاء یہودیت یا نصرایت کے پیروکار تھے ، اللہ تعالی ان کے اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے فرمارہا ہے: ﴿ أَمۡ تَقُولُونَ إِنَّ إِبۡرَٰهِـۧمَ وَإِسۡمَٰعِيلَ وَإِسۡحَٰقَ وَيَعۡقُوبَ وَٱلۡأَسۡبَاطَ كَانُواْ هُودًا أَوۡ نَصَٰرَىٰۗ ﴾ " کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے ؟" تمہارا یہ دعوی علم کی بنیاد پر ہونا چاہیے ، اور اس کا علم تو اللہ کے پاس سے ہی مل سکتا ہے: ﴿ قُلۡ ءَأَنتُمۡ أَعۡلَمُ أَمِ ٱللَّهُۗ ﴾ " کہہ دو کیا تم زیادہ جانتے ہو۔ یا اللہ تعالیٰ "۔ یہ سوال بطور انکار اور تقریر ہے ، ان کا یہ دعوی دو چیزوں میں محصور کردیا گیا: یا تو تم یہ اعتراف کریں کہ اللہ تعالی زیادہ جانتا ہے ، اگر ایسا کہتے ہیں تم خود جھوٹے ثابت ہوگے اور تمہیں اپنے دعوے سے باز آجانا چاہیے ، یا دوسرے یہ کہ تم کہو کہ تم اللہ سے زیادہ جانتے ہو ، اور ایسا کہنا ممکن نہیں ، لہذا اب تمہارے سامنے ایک ہی راستہ بچتا ہے کہ اللہ تعالی جو کہہ رہا ہے اسے مان لو ، اور اللہ تعالی نے سورہ آل عمران میں اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام سے یہودیت اور نصرانیت کی نفی کی ہے: ﴿ مَا كَانَ إِبۡرَٰهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصۡرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسۡلِمًا ﴾ [سورة آل عمران:٦٧]۔ "ابراہیم تو نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ تو ایک طرفہ (خالص) مسلمان تھے "۔ آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ مدعو کے احوال اور اس کے شبہات کی جانکاری ہونا بہت اہم ہے ، نیز اس پر حجت و دلیل قائم کرنے کی کیفیت کا جاننا بھی ضروری ہے۔

پھر دوسرے مرحلہ میں دعوی پیش کرنے اور اہل باطل کے باطل کو غلط ثابت کرنے کے طریق کار کا بیان ہوتا ہے: ﴿ وَمَنۡ أَظۡلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَٰدَةً عِندَهُۥ مِنَ ٱللَّهِۗ ﴾ " اللہ کے پاس شہادت چھپانے والے سے زیادہ ظالم اور کون ہے؟" یعنی کیا اس سے بھی بڑا ظالم کوئی ہو سکتا ہے جو اس گواہی کو چھپاتا ہے جو اس کے پاس اللہ تعالی کی جانب سے پہنچی ہے ، یہ سوال بطور تقریر اور انکار ہے ، کیوں کہ ان کو خود اپنے بارے میں علم ہے کہ وہ اپنے اس علم کو چھپا رہے ہیں جو ان کی کتابوں میں ہے۔ حسن

بصری رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: وہ اللہ تعالی کی عطا کردہ کتاب میں پڑھتے تھے کہ اصل دین اسلام ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور ابراہیم واسماعیل واسحاق ویعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد یہودیت اور نصرانیت سے بری تھے، اللہ کے لیے اس کی انہوں نے گواہی بھی دی اور خود اس کے معترف بھی تھے لیکن پھر انہوں نے نہ مانا، بلکہ اللہ تعالی کی اس شہادت کو ہی چھپادیا(١)۔ اس سے ان اہل کتاب کے دینی منہج کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے، چنانچہ مسلمانوں کو ان کے معاملات اور طبیعتوں سے آگاہ رہنا چاہیے تاکہ اسی حساب سے ان پر حجت قائم کریں اور علماء کو ایک مکابر و معاند اور صاحب شبہ کے سامنے اقامت حجت کے منہج کا علم ہونا چاہیے۔

اس وضاحت کے بعد آیت کا اختتام وعید اور تہدید سے ہو رہا ہے، یعنی اللہ تعالی کا علم تمہارے سارے اعمال کو محیط ہے، فرمایا: ﴿ وَمَا ٱللَّهُ بِغَـٰفِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُونَ ﴾ "اور اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں" ،آیت میں اللہ تعالی سے نقص کی نفی کرکے مدح بیان کی گئی ہے کیوں کہ اس نفی سے اللہ تعالی کے لیے اس علم کا اثبات ہوتا ہے جو مخلوقات کے علم و عمل کو محیط ہے، لہذا جو ذات مخلوق کے اعمال سے غافل نہیں اس ذات سے مخلوق کو لازما خوف کھانا چاہیے کیوں کہ وہ اس کے احاطہ علم میں ہے، نیز امید و دعا بھی اسی سے ہونی چاہیے کیوں کہ وہی مخلوق کی حاجتوں اور مطالبوں کو پورا کرنے پر قادر ہے اور وہی ان کی حاجات کو جانتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی گذشتہ امتوں سے تعلقات کی حقیقت کو بطور تاکید دوبارہ بیان کر رہا ہے: ﴿ تِلۡكَ أُمَّةٞ قَدۡ خَلَتۡۖ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُم مَّا كَسَبۡتُمۡۖ وَلَا تُسۡـَٔلُونَ عَمَّا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ﴾ "یہ امت ہے جو گزر چکی، جو انہوں نے کیا ان کے لئے ہے اور جو تم نے کیا وہ تمہارے لئے، تم ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہ کئے جاؤ گے" ۔ یہ آیت پہلے بھی گزر چکی ہے، اس سے یہ بات مزید پکی ہو جاتی ہے کہ انسان کے لیے انتساب کا دعوی کسی کام کا نہیں، بلکہ عمل اس کی حقیقت حال کا ثبوت ہے، اسی حساب سے اس کی جزا و سزا مرتب ہوگی، ہر شخص اپنے بھلے برے کرتوت اور طاعت و معصیت کا حق دار ہے۔

---

(١) تفسير ابن كثير ١/١٩٤.

﴿سَيَقُولُ ٱلسُّفَهَآءُ مِنَ ٱلنَّاسِ مَا وَلَّىٰهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ ٱلَّتِي كَانُواْ عَلَيْهَاۚ قُل لِّلَّهِ ٱلْمَشْرِقُ وَٱلْمَغْرِبُۚ يَهْدِي مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٤٢﴾ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُواْ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًاۗ وَمَا جَعَلْنَا ٱلْقِبْلَةَ ٱلَّتِي كُنتَ عَلَيْهَآ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ ٱلرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى ٱلَّذِينَ هَدَى ٱللَّهُۗ وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَٰنَكُمْۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِٱلنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤٣﴾﴾

ترجمہ:

"عنقریب یہ لوگ کہیں گے کہ جس قبلہ پر یہ تھے اس سے انہیں کس چیز نے ہٹایا؟ آپ کہہ دیجئے کہ مشرق اور مغرب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے ، وہ جسے چاہے سیدھی راہ کی ہدایت کر دے (۱۴۲)۔ ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم پر گواہ ہو جائیں جس قبلہ پر تم پہلے تھے اسے ہم نے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم جان لیں کہ رسول کا سچا تابعدار کون ہے اور کون ہے جو اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے ، گو یہ کام مشکل ہے، مگر جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے ان پر کوئی مشکل نہیں اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال ضائع نہیں کرے گا ، اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کرنے والا ہے (۱۴۳)"۔

یہاں سے آیت کا سیاق تحویل قبلہ پر اعتراض کرنے والوں کی طرف منتقل ہو رہا ہے، ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کی ہے، پہلے پہل قبلہ کی سمت بیت المقدس کی طرف تھی، پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی جہت تبدیل کرکے بلد حرام مکہ مکرمہ میں کعبہ شریف کی طرف کر دی گئی ،اسی ہی تعلق سے اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے: ﴿سَيَقُولُ ٱلسُّفَهَآءُ مِنَ ٱلنَّاسِ مَا وَلَّىٰهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ ٱلَّتِي كَانُواْ عَلَيْهَا﴾ "عنقریب یہ لوگ کہیں گے کہ جس قبلہ پر یہ تھے اس سے انہیں کس چیز نے ہٹایا؟" تحویل قبلہ پر اعتراض کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے سفہاء کے وصف سے ذکر کیا ہے یعنی کمزور اور کم عقل والے ،اس سے مدینہ کے یہود اور ہر وہ شخص مراد ہے جس نے یہ بات کہی، یہاں پر سفہاء وہ کم عقل، کج فکر اور ہوا پرست لوگ ہیں جس کی ہوا وہوس دلائل نقلیہ وعقلیہ پر غالب ہو چکی ہو، مراد ہر وہ شخص ہے جس نے تحویل قبلہ کو ناپسندیدگی اور نفرت کی نظر سے دیکھا، چاہے وہ اہل کتاب ہوں یا ان کے علاوہ اہل عرب اور منافقین

ومشرکین ہوں، یہ لوگ صاحب عقل وخرداور چیزوں کے حقائق سے باخبر ہونے کے باوجودان کی فکر اور سوچ پر ہواپرستی، کبروغروراور سرکشی کااس قدر غلبہ ہوچکا تھاکہ ان کازاویہ فکرکم عقلوں کی طرح محدود تھا ، حالت رشدوہدایت سے بے بہرہ لوگوں کی طرح بیوقوفوں والی سوچ تھی۔

اس آیت سے یہ فائدہ حاصل ہوتاہے کہ معاشرے میں کچھ ایسے لوگ پنپتے ہیں جو حوادث وواقعات کو پوری امت مسلمہ کے درمیان یاالگ الگ اسلامی سماج کی حد تک فتنہ بھڑکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی ایسی ہی بولی بولتے ہیں جیسی بولی یہ لوگ بولتے تھے جن کی طرف اللہ تعالی نے یہاں پراشارہ کیاہے، کہتے ہیں: ﴿ مَا وَلَّىٰهُمۡ عَن قِبۡلَتِهِمُ ٱلَّتِي كَانُواْ عَلَيۡهَا ﴾ " جس قبلہ پر یہ تھے اس سے انہیں کس چیز نے ہٹایا"۔ یہ سوال اٹھاکر لوگوں میں شک بھڑکاکراوران کی فکراور سوچ بدلنے اوران کے یقین کومتزلزل کرناچاہتے تھے تاکہ مسلمانوں کی صفوں میں فتنہ برپاہوجائے۔ معلوم ہواکہ شرانگیز سوالات کافی خطرناک ہوتے ہیں،اوربسااوقات صرف فتنہ انگیز سوال اٹھاکر عظیم فساد برپاکردیا جاتاہے، نیز کبھی کبھی سولات محض فساد وفتنہ ہوتے ہیں،اس لیے سولات کے رجحانات اوراس کے اچھے برے نتائج سے متنبہ اورآگاہ رہناانتہائی ضروری ہے۔

اللہ تعالی نے ان معترضین کاجواب دے کران کی بولتی ہی بند کردی ، چنانچہ اللہ تعالی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوحکم دیاکہ ان لوگوں سے کہہ دیں: ﴿قُل لِّلَّهِ ٱلۡمَشۡرِقُ وَٱلۡمَغۡرِبُۚ ﴾ " آپ کہہ دیجئے کہ مشرق اور مغرب کامالک اللہ تعالیٰ ہی ہے"۔ کیوں کہ صاحب عقل جانتااور سمجھتاہے کہ جوذات مشرق ومغرب کی مالک ہے اس کویہ اختیار بھی حاصل ہے کہ جیسے چاہے اپنی مرضی کے مطابق قبلہ کے رخ میں ہیر پھیراور تبدیلی کرے،اب اس میں پریشانی کی کیابات ہے ؟ وہ اپنے ملک اوراپنے بندوں میں اپنی منشاکے مطابق حکم چلارہاہے۔

اس سے معلوم ہواکہ عمومی حالات میں فتنہ انگیزاور ثابت شدہ امور میں شک پیداکرنے والے سولات بھڑکاناکافی خطرہ کاباعث ہے اوراگر یہ کام کسی واقع کے رونماہونے کے وقت انجام دیاجائے تو اس کی خطرناکی میں مزید اضافہ ہوجاتاہے،ایک عام معاملہ کواس کی حقیقت سے ہٹاکر غلط رخ دے دیاجاتا ہے،اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے یہ امرواقعی غیر مقبول اور غیر طبیعی ہے،اور پھر کم عقل اور

ناسمجھ لوگ اس فتنہ کا شکار ہو جاتے ہیں ، اور پھر اس مد بھیڑ کا دشمن خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔آیت کے من جملہ فوائد میں سے ہے کہ اللہ تعالی مومنوں کو علمی رد کا ایک منہج اور طریقہ بتلا رہا ہے جس سے کم عقل لاجواب اور غافل غفلت سے بیدار ہو جائے اور مومن کے ایمان میں زیادتی ہو،اسی طرح اس کے فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ فتنہ پرور کی تردید حکمت ودانائی کے ساتھ اور جواب منصفانہ اور خاموش کر دینے والا ہونا چاہیے تاکہ لوگ درستگی کی طرف رجوع کریں اور فتنہ پرور کم عقل شکستہ خوردہ راستے سے ہٹ جائے۔آیت کے فوائد میں سے یہ بھی ہے جس کا ذکر امام قرطبیؒ نے کیا ہے، کہتے ہیں: آیت میں یہ واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالی کے احکام میں ناسخ ومنسوخ ہیں،اور اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے سوائے چند لوگوں کے جن کا قول شاذ کی حیثیت رکھتا ہے،اس میں اس امر کی بھی دلیل ہے کہ جس کو ناسخ کا علم نہ ہو تو وہ حکم اول پر عمل کرتا رہے گا تاآنکہ اس کو ناسخ کا علم ہو جائے،اس میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ قرآن کریم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر باری باری نازل ہوتا تھا(۱) ۔اس میں یہ فائدہ بھی ہے کہ قرآن امت کے مشکلات کا حل پیش کرتا ہے، اور اللہ تعالی اپنے رحم وکرم سے ایسی آیات نازل فرماتا ہے جن سے شر سے نجات اور خیر وبھلائی کا حصول ہوتا ہے: ﴿ إِنَّ هَٰذَا ٱلۡقُرۡءَانَ يَهۡدِي لِلَّتِي هِيَ أَقۡوَمُ ﴾ [سورة الإسراء:۹]۔ "یقیناً یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو بہت ہی سیدھا ہے"۔

اس کے بعد باری جل جلالہ توفیق وہدایت کے متعلق فرمارہا ہے: ﴿ يَهۡدِي مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٖ ﴾" وہ جسے چاہے سیدھی راہ کی ہدایت کر دے"۔معلوم ہوا کہ اللہ تعالی ہی نے اس امت کو اس قبلہ کی ہدایت دی،اور اللہ تعالی کی شریعت ہی حق کا سیدھا راستہ ہے جس میں کسی طرح کی کجی نہیں،اور ہدایت دینا اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے،اس لیے یہ ہدایت آدمی اللہ تبارک وتعالی سے دعا،اس کی خوشنودی کی پیروی اور اس کی تابعداری کے ذریعہ طلب کرتا رہے۔اس کے بعد اللہ تعالی نے اس دین اسلام کی چند خصوصیات کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے امت مسلمہ دیگر امتوں سے ممتاز قرار پائی، فرمایا: ﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلۡنَٰكُمۡ أُمَّةٗ وَسَطٗا لِّتَكُونُواْ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيدٗا ﴾" ہم نے اسی طرح تمہیں عادل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم پر گواہ

---

(۱) تفسير قرطبي ۲/۱۰۲.

ہو جائیں"۔یعنی یہ امت اس دین قویم کی بدولت صفت "وسطیت" سے متصف ہوئی، نیز یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ اس امت کی مدح سرائی اور تعریف اس دین کی وجہ سے کی گئی ہے جس کی بدولت یہ وصف ان میں اللہ تعالی کی طرف سے محقق ہو سکا، اور اس وصف کا مفہوم ہے عدل اور سب سے بہتر انتخاب۔ اس امت کے لیے وسطیت کا یہ وصف بطور مدح وثناء ہے ، چنانچہ قریش نسب کے اعتبار سے عربوں میں معتدل تھے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں وسط ہیں(١) ، اور کعبہ وسط الأرض ہے۔ اور حدیث میں ہے: (خير الأمور أوسطها)(٢)"یعنی ہر کام میں میانہ روی سب سے بہتر ہے"۔ اسی معنی میں اللہ تعالی کا یہ فرمان بھی ہے: ﴿قَالَ أَوۡسَطُهُمۡ﴾ [سورة القلم:٢٨]۔ "ان میں سے سب سے بہتر اور انصاف پسند نے کہا"(٣)۔ معلوم ہوا کہ ایک مومن کو اللہ تعالی کا شکر گزار ہونا چاہیے جس نے کہ اسے امت وسط کا ایک فرد ہونے کا شرف عطا کیا، لہذا اس کا فرض بنتا ہے کہ اس شریعت کی پابند بنے اور مخالفت نہ کرے اور اپنی زندگی میں وسطیت کی ایک مثال قائم کرے، اور اس صفت حسنہ سے منحرف نہ ہو، کیوں کہ اسلام ایک مکمل شریعت ہے، اس کے احکامات کسی حرج کا باعث نہیں اور فطرت کے عین وافق ہیں، اسی طرح اس شریعت کا یہ امتیاز بھی ہے کہ اس کے مشمولات اور اہداف ومقاصد میں نرمی اور سہولت اور رواداری کی مکمل گنجائش رکھی گئی ہے ، اس کی تعلیمات مکارم اخلاق پر ابھارتی اور بدکرداری سے روکتی ہیں، اس کے منہج میں تدرج کی چھاپ ہے، عدل اس کی بنیاد ہے جس میں جور وظلم حرام اور رفق ولین کا حکم ہے۔

ان تمام فضیلتوں کے ساتھ مسلمان لوگوں پر گواہ ہیں، چنانچہ ایک جنازہ کا گزر ہوا تو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کی خوب تعریف کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "(جنت) واجب ہوگئی"، ایک دوسرا جنازہ گزرا تو بعض لوگوں نے کہا کہ بڑا ہی برا شخص تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "(جہنم) واجب ہوگئی"(٤) ۔ علامہ ابن الجوزی(٥) رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: اس آیت کا مفہوم ہے کہ

---

(١) تفسير ابن كثير ١/١٩٦.

(٢) زاد المسير ١/١٣٨.

(٣) مرجع سابق.

(٤) مسلم ٢/٢٥٥ حديث نمبر (٩٤٩)، ترمذي ٥/٥٠٣ حديث نمبر (٣٥٢٢).

(٥) زاد المسير ١/١٣٨.

: تم نبیوں کے حق میں ان کی امتوں کے خلاف گواہی دو۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: " قیامت کے دن نبی آئیں گے اوران کے ساتھ ان کی امت کا صرف ایک ہی شخص ہوگا، بعض نبی آئیں گے اوران کے ساتھ ان کی امت کے صرف دو ہی شخص ہوں گے ، اور بعض نبی آئیں گے اوران کے ساتھ دو سے زیادہ لوگ ہوں گے، ان کی امتوں سے پوچھا جائے گا کہ کیا اس نبی علیہ السلام نے تمہیں تبلیغ کی تھی ؟ وہ انکار کریں گے نبی سے کہا جائے گا تم نے تبلیغ کی ؟ وہ کہیں گے ہاں، کہا جائے گا تمہارا گواہ کون ہے ؟ وہ کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت۔ پس وہ گواہی دیں گے کہ ان رسولوں نے اللہ کا پیغام امتوں تک پہنچادیا تھا، ان سے کہا جائے گا کہ تمہیں کیسے علم ہوا؟ یہ جواب دیں گے کہ ہمارے پاس ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ انبیاء علیہم السلام نے تیرا پیغام اپنی اپنی امتوں کو پہنچایا اور ہم نے آپ کی تصدیق کی ۔ یہی مطلب ہے اللہ عزوجل کے اس فرمان ﴿لِّتَكُونُواْ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ﴾(۱)۔ " تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ"۔

اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے حق میں تمہارے اعمال کے گواہ ہوں گے، اس سے اس گواہی کی اہمیت اور اس کی بہتری واضح ہے، نیز یہ گواہی رسالت کے تبلیغ کی گواہی ہے ،آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ گواہ لائق تعریف ہے، کیوں کہ کسی کی گواہی مقبول ہونا اس کے عدل اور پاکیزگی کی دلیل ہے، اور جس امت کو اللہ تعالی دیگر امتوں پر گواہ بنادے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ان پر گواہ ہوں اس کی منقبت اور شرف ومنزلت کا کیا تصور کیا جاسکتا ہے، یقینا یہ عظیم شرف کی بات ہے۔

آگے اللہ تعالی تحویل قبلہ کی حکمت بیان کررہا ہے: ﴿وَمَا جَعَلْنَا ٱلْقِبْلَةَ ٱلَّتِي كُنتَ عَلَيْهَآ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ ٱلرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى ٱلَّذِينَ هَدَى ٱللَّهُ ۗ﴾۔" جس قبلہ پر تم پہلے تھے اسے ہم نے صرف اس لئے مقرر کیا تھا کہ ہم جان لیں کہ رسول کا سچا تابعدار کون ہے اور کون ہے جو اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے ، گو یہ کام مشکل ہے، مگر جنہیں اللہ نے ہدایت

---

(۱) سنن ترمذی حدیث نمبر (۲۹٦۱)، سنن ابن ماجه (۲/ ۱٤۳۲) حدیث نمبر (٤۲۸٤)، الشيخ الألباني: صحيح.

دی ہے"۔ اللہ تعالی نے تحویل قبلہ کی ابتلاء وآزمائش محض اس لیے کی تاکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت گزاروں اور فرمابرداروں کو مرتدین اور پلٹ جانے سے الگ کردے، صرف ایک قسم کے لوگوں کو چھوڑ کر تحویل قبلہ کے ذریعہ یہ جانچ پرکھ اور تمحیص انتہائی خطرناک تھی، اس میں وہی لوگ کامیاب ہوسکے جن کو اللہ تعالی کی طرف سے ہدایت نصیب ہوئی اور جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق پر یقین کامل اور تمام اوامر ونواہی اور ناسخ ومنسوخ پر اطمینان قلب حاصل تھا۔

معلوم ہوا کہ ابتلاء اور آزمائش ایمان کی کسوٹی ہے جس میں کچھ ثابت قدم رہتے ہیں اور کچھ ایمان سے پلٹ جاتے ہیں، اللہ تعالی نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مختلف مقامات پر آزمائش کی، اور بعد میں آنے والوں کی بھی آزمائش ہوتی رہے گی جیسا کہ اسی سورہ میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ﴾ [سورة البقرة:١٥٥]۔ "اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، مال وجان اور پھلوں کی کمی سے"۔ اس لیے مومن ثبات قدمی کے لیے ہمہ وقت اللہ تعالی کا محتاج رہتا ہے، جیسا کہ تحویل قبلہ کے متعلق اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ﴾۔" مگر جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے"۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر یہ دعا کرتے تھے: (يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ)(١) "اے دلوں کو الٹ پھیر کرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ"۔

آیت کے فوائد میں سے یہ بات بھی ہے کہ لوگوں کے درمیان کھرے کھوٹے کی یہ تمیز اللہ تعالی کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے کیوں کہ وہ تو دلوں کے بھیدوں کو جانتا ہے، اور لوگوں کے ان اعمال سے بھی واقف ہے جس کو انہوں نے ابھی کیا ہی نہیں بلکہ مستقبل میں انجام دیں گے، یہ آزمائشیں تو محض اتمام حجت کے لیے ہوتی ہیں، اللہ تعالی کا بنایا ہوا یہ محکم نظام ہے اور وہ اسی نظام اور قانون کے مطابق اس کائنات میں اپنے سارے امور انجام دیتا ہے۔

---

(١) صحیح بخاری حدیث نمبر (٤٤٨٧)، صحیح ابن ماجه حدیث نمبر (٣٤٧٦). مذکورہ الفاظ حدیث ابن ماجہ کے ہیں .

تحویل قبلہ کا یہ واقعہ آپ کے نبوت کی واضح دلیل ہے، کیوں کہ اگر آپ نبی نہ ہوتے تو تحویل قبلہ سے خود بچتے تاکہ معترضین کے اعتراضات کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اس کے برے انجام سے بچے رہیں ، لیکن ایسا نہیں کیا، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی کے حقیقی بندے تھے اور اللہ تعالی کے احکامات کو ہر حال میں نافذ کرتے چاہے وہ احکامات کچھ لوگوں پر شاق ہی کیوں نہ گزریں۔

آیت کے من جملہ فوائد میں سے یہ بات بھی ہے کہ شرعی نصوص کے سامنے عقل کی کوئی حیثیت نہیں: ﴿وَإِن كَانَتۡ لَكَبِيرَةً﴾ "گو یہ کام مشکل ہے" یعنی ان طبیعتوں پر یہ حکم کافی گراں ہے جو حکم شرعی کے سامنے اپنی ناقص عقل کا استعمال کرتی ہیں، رہے وہ لوگ جو نصوص شرعیہ کو اپنے نفس اور کج فکری پر ترجیح دیتے رہیں ان کا معاملہ ان لوگوں سے مختلف ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے اس تحویل قبلہ والے حکم میں ان کی تعریف کی ہے: ﴿وَإِن كَانَتۡ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى ٱلَّذِينَ هَدَى ٱللَّهُۗ﴾۔ "گو یہ کام مشکل ہے، مگر جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے"۔ چنانچہ ان لوگوں نے فورا حکم کی تعمیل کی اور اپنے دلوں میں ذرا بھی تنگی محسوس نہ کی، کیوں کہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ یہ اللہ تعالی کا حکم ہے، اور اللہ تعالی پر اعتراض کا حق کسی کو حاصل نہیں، جیسا کہ سورۃ الأنبیاء میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿لَا يُسۡـَٔلُ عَمَّا يَفۡعَلُ وَهُمۡ يُسۡـَٔلُونَ﴾ [سورة الأنبياء:٢٣]۔ "وہ اپنے کاموں کے لئے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں اور سب (اس کے آگے) جواب دہ ہیں"۔ لہذا ایک فرمابردار بے جا کے اعتراضات وسولات نہیں کرتا کہ اللہ تعالی نے ایسا کیوں کیا، فلاں کو آگے اور فلاں کو پیچھے کیوں کیا، فلاں کو فلاں چیز کیوں دی، فلاں کو کیوں نہیں دیا، فلاں کو بلندی کیوں عطا کی، فلاں سے فلاں چیز کیوں چھین لی، فلاں اس چیز کا زیادہ حق دار تھا؟ اس طرح کے سارے سوالات اور اعتراضات شر وفساد کا سبب اور فرمابرداری کے متضاد بات ہے، چنانچہ عقل کو نقل پر کبھی بھی مقدم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اللہ سبحانہ وتعالی کے کسی حکم وفعل اور قضا وقدر پر اعتراض کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی بندوں کے ساتھ اپنے عدل وانصاف کا بیان کر رہا ہے: ﴿وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَٰنَكُمۡۚ﴾ "اللہ تعالٰی تمہارے اعمال ضائع نہیں کرے گا"۔ یعنی جن لوگوں نے بیت المقدس کی جانب منہ کر کے نمازیں پڑھیں اور مکہ مکرمہ کی طرف تحویل قبلہ سے پہلے ہی انتقال کر گیے ان کا اجر

وثواب ہر گز ضائع وبرباد نہیں ہوگا، چنانچہ براء (بن عازب) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: کچھ لوگ جو (تحویل قبلہ سے قبل) بیت المقدس کی جانب منہ کرکے نماز پڑھ رہے تھے اور انتقال کر گیے تو لوگوں نے دریافت کیا کہ ان کی نمازوں کا کیا ہوگا؟ تو اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَمَا كَانَ ٱللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَـٰنَكُمْ﴾ "اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال (نماز) ضائع نہیں کرے گا" مذکورہ مسئلہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا سوال کرنا ان کے شدت اہتمام اور دینی معاملات میں غائرانہ جائزہ اور فوت ہو جانے والے مسلمان بھائیوں سے فرط محبت کی دلیل ہے، اور اس میں بعد کے لوگوں کے لیے ایک نمونہ ہے کہ وہ بھی اپنے مسلمان بھائیوں سے ایسی ہے محبت کا مظاہرہ کریں اور ان کے لیے دعائے رحمت کرتے رہیں اگرچہ وہ ان کے وقت میں زندہ نہ ہوں اور نہ ہی ان کو دیکھا ہو۔ اللہ تعالی نے سورہ حشر میں ان کے حق میں کی جانے والی دعا بھی سکھادی، فرمایا: ﴿وَٱلَّذِينَ جَآءُو مِنۢ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا ٱغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَٰنِنَا ٱلَّذِينَ سَبَقُونَا بِٱلْإِيمَـٰنِ وَلَا تَجْعَلْ فِى قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ [سورة الحشر: ١٠]۔ "اور (ان کے لئے) جو ان کے بعد آئیں اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے اور ایمانداروں کی طرف ہمارے دل میں کینہ (اور دشمنی) نہ ڈال ، اے ہمارے رب بیشک تو شفقت و مہربانی کرنے والا ہے"۔

اس کے بعد اللہ تعالی آیت کے اختتام میں اپنی مشفقانہ ورحیمانہ صفات بیان کر رہا ہے، فرمایا: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ بِٱلنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ "اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کرنے والا ہے"۔ یہ اللہ تعالی کی صفت کا بیان ہے کہ وہ رؤوف اور رحیم ہے، صفت رؤوف اپنے آپ میں بہت سارے عظیم معانی سموئے ہوئے ہے، ان میں سے بعض کا ذکر ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کیا ہے: رؤوف کا ایک معنی تو رحیم (مہربانی کرنے والا) ہے ، اور (رأفت) رحمت سے زیادہ بلیغ اور شفقت بھرا ہے، (رأفت) ایک خاص معنی پر دلالت کرتا ہے، اور رحمت کا معنی عام ہے[1] ۔ آیت میں دونوں وصف کا ایک ساتھ ذکر سے اس کی معنویت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ لوگوں کے ساتھ اللہ تعالی کی شفقت

---

(١) زاد المسير ١/١٤٠.

ورحمت ہی کا نتیجہ ہے کہ اس نے رسول بھیجے، کتابیں اتاری، زمین کو ان کے لیے پھیلا دیا، ہر بھلی چیز سے روزی دی اور گناہوں کی سزا دینے میں جلدی نہیں کی تاکہ لوگ گناہوں سے باز آکر سیدھی راہ اختیار کرلیں اور اپنے گناہوں سے تائب ہو جائیں، اگر اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو برائیوں کی بہتات، اطاعت میں کوتاہی، ذکر الٰہی اور شکر میں قلت کے سبب اس روئے زمین پر کوئی باقی نہ بچتا ،اللہ تعالی کی یہ شفقت ورحمت سب کے لیے عام ہے، اور جب ایسا ہے تو مومنوں کے ساتھ اس کی رأفت ورحمت کا کیا حال ہوگا ، یقینا وہ شفقت اور مہربانی کرنے والا ہے، جب وہ تمام لوگوں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کرنے والا ہے تو پھر کیوں کر اس کی نافرمانی اور اس کے ساتھ شرک کیا جائے ، جب وہ رؤوف رحیم ہے تو بندہ اس کے آگے نہ جھکے ، جب وہ رؤوف رحیم ہے ، تو کیوں وہ نہ پکارا جائے ، جب وہی رؤوف رحیم ہے تو کیسے اس سے امید نہ لگائی جائے، کیسے اس سے آرزو نہ رکھی جائے، کیسے اس سے شرم نہ کی جائے۔ کوئی بندہ جب کسی بندے پر رحم کرتا ہے تو وہ اس سے شرم کرتا ہے، بھلا جس کی رحمت بندوں کے آپسی رحم وکرم کا سبب ہو اس کی رحمت کا اندازہ کیسے لگا سکتے ہیں، اللہ تعالی کی یہ اعلی صفات بندے سے شکر الٰہی کا تقاضا کرتی ہیں : ﴿إِنَّ ٱللَّهَ بِٱلنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ "اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کرنے والا ہے"۔ صحیح بخاری میں ہے : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے قیدیوں میں ایک عورت تھی جس کا پستان دودھ سے بھرا ہو تھا اور وہ دوڑ رہی تھی، اتنے میں ایک بچہ اس کو قیدیوں میں ملا اس نے جھٹ اپنے پیٹ سے لگالیا اور اس کو دودھ پلانے لگی۔ ہم سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (أَتُرَوْنَ هَذِهِ طَارِحَةً وَلَدَهَا فِي النَّارِ) " کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ یہ عورت اپنے بچہ کو آگ میں ڈال دے" ہم نے عرض کیا کہ نہیں ، جب تک اس کو قدرت ہو گی یہ اپنے بچہ کو آگ میں نہیں پھینک سکتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا (لَلَّهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هَذِهِ بِوَلَدِهَا) "یعنی جتنا یہ عورت اپنے بچہ پر مہربان ہے اللہ اپنے بندوں پر اس سے کہیں زیادہ رحم کرنے والا ہے"(١)۔

---

(١) صحيح بخاری ٩١/٤ ، حديث نمبر(٥٩٩٩)

﴿قَدۡ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِي ٱلسَّمَآءِۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةٗ تَرۡضَىٰهَاۚ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۚ وَحَيۡثُ مَا كُنتُمۡ فَوَلُّواْ وُجُوهَكُمۡ شَطۡرَهُۥۗ وَإِنَّ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ لَيَعۡلَمُونَ أَنَّهُ ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّهِمۡۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا يَعۡمَلُونَ ١٤٤ وَلَئِنۡ أَتَيۡتَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ بِكُلِّ ءَايَةٖ مَّا تَبِعُواْ قِبۡلَتَكَۚ وَمَآ أَنتَ بِتَابِعٖ قِبۡلَتَهُمۡۚ وَمَا بَعۡضُهُم بِتَابِعٖ قِبۡلَةَ بَعۡضٖۚ وَلَئِنِ ٱتَّبَعۡتَ أَهۡوَآءَهُم مِّنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ ٱلۡعِلۡمِ إِنَّكَ إِذٗا لَّمِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ١٤٥﴾

ترجمہ:

"ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اب آپ کو ہم اس قبلہ کی طرف متوجہ کریں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں ، آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں آپ جہاں کہیں ہوں اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں۔ اہل کتاب کو اس بات کے اللہ کی طرف سے برحق ہونے کا قطعی علم ہے ، اور اللہ تعالیٰ ان اعمال سے غافل نہیں جو یہ کرتے ہیں (۱۴۴)۔ اور آپ اگرچہ اہل کتاب کو تمام دلیلیں دے دیں لیکن وہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے ، اور نہ آپ ان کے قبلے کو ماننے والے ہیں، اور نہ یہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلے کو ماننے والے ہیں ، اور اگر آپ باوجودیکہ آپ کے پاس علم آچکا ہے پھر بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے لگ جائیں تو بالیقین آپ بھی ظالموں میں سے ہو جائیں گے (۱۴۵)"۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" ﴿قَدۡ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِي ٱلسَّمَآءِۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةٗ تَرۡضَىٰهَاۚ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۚ وَحَيۡثُ مَا كُنتُمۡ فَوَلُّواْ وُجُوهَكُمۡ شَطۡرَهُۥۗ﴾ "ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اب آپ کو ہم اس قبلہ کی طرف متوجہ کریں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں آپ جہاں کہیں ہوں اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کے بعد بار بار اپنی نگاہیں آسمان کی طرف کرتے ہوئے تحویل قبلہ کے تعلق سے حکم الٰہی کا انتظار کر رہے تھے(۱) ۔ آپ کو ایک فکر لاحق تھی کہ کسی طرح یہود سے الگ مسلمانوں کا مستقل قبلہ مکہ مکرمہ کی طرف ہو جائے جو کہ

---

(۱) تفسیر قرطبي ۲/۱۰۷.

خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا، اس سے اس بات کی تاکید ہوتی ہے کہ دین اسلام کو اسی دینی ابراہیمی کی خصوصیات حاصل ہیں اور یہ کفار کے دین وعادات اور تقالید سے بہت دور ہے، خاص طور سے ایسے امور میں جو بے نفع ہیں یا جن سے ان کی طاقت و شوکت اور حیثیت میں اضافہ ہو، اور مسلمانوں کی اس میں کوئی مصلحت نہ ہو۔

اللہ تعالی کی نگاہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہی تھی، نبی کی ذات مبارکہ اس کے علم میں تھی، وہ اس کی حرکات و سکنات ، اور اندر گھومتے خیالات اور خواہشات ورغبات سے خوب واقف تھا: ﴿قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي ٱلسَّمَآءِ﴾ "ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں"۔ اللہ تعالی تو ساری مخلوقات کو دیکھتا ہے، لیکن یہاں آپ کی طرف نظر کرم اور آپ کے اندرونی خیالات کی قبولیت کی طرف اشارہ ہے۔ اور پھر تعمیل مقصد و مطلب پر آمادگی کا اظہار: ﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَىٰهَا﴾ سے کیا جارہا ہے، یعنی " اب آپ کو ہم اس قبلہ کی طرف متوجہ کریں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں"۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے انتہائی اعلی شرف و منزلت کی بات ہے، اور جس طرح اللہ تعالی کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اعلی مقام ہے اسی طرح مومنوں کے نہاں خانہ دل میں بھی آپ کا مقام و مرتبہ رچا بسا ہے۔ نیز یہ منفرد اور الگ قبلہ مومنوں کے لیے اور اس دین کے لیے اللہ تعالی کا ہدیہ ہے جس کی بدولت اس امت کو فوقیت حاصل ہوئی۔ " ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا۟ وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُۥ﴾ "آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں آپ جہاں کہیں ہوں اپنا منہ اسی طرف پھیرا کریں"۔ لہذا مسلمان دنیا میں کہیں بھی ہوں وہ نمازوں اور قربانیوں میں اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرتے ہیں، اور جو لوگ مسجد حرام میں ہوتے ہیں وہ اپنا رخ کعبہ کی طرف کرتے ہیں، یہ اللہ تعالی کے عظیم نعمت ہے، رہا مسافر کے لیے نفلی نماز میں استقبال قبلہ کا مسئلہ یا اسی طرح جس کو قبلہ کے حکم کا علم نہ ہو یا جس کے لیے قبلہ کا پتہ لگانا دشوار ہو، یہ سارے مسائل تفسیر اور فقہ کی کتابوں میں زیر بحث ہیں وہیں ان مسائل کو دیکھا جانا چاہیے۔

اس کے بعد تحویل قبلہ کے بارے میں اہل کتاب کے احوال اللہ تعالی بیان کر رہا ہے: ﴿وَإِنَّ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۗ﴾ "اہل کتاب کو اس بات کے اللہ کی طرف سے برحق

ہونے کا قطعی علم ہے"۔ یہ اللہ تعالی کا ان اہل کتاب کے بارے میں یقینی بیان ہے کیوں کہ جس علم کو وہ چھپارہے ہیں اللہ تعالی اس سے بخوبی واقف ہے ، یعنی یہ اہل کتاب اچھی طرح جانتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی اور رسول ہیں، اور جب ایسا ہے تو انہیں یہ بھی علم ہے کہ یہ نبی اللہ تعالی کے حکم کے بغیر نہ تو کوئی حکم دے سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی چیز تبدیل کر سکتے ہیں ، ابن کثیر رحمہ اللہ آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یہ اہل کتاب یہود جنہوں نے بیت المقدس سے پھیر کر کعبہ کی طرف تحویل قبلہ کا انکار کیا وہ چاہے جتنی باتیں بنالیں ان کے دل جانتے تھے کہ اللہ تعالی آپ کو کعبہ کی طرف پھیرے گا کیوں کہ ان کی نبیوں کے واسطے سے ملنے والی کتابوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ساری صفات بیان کی گئی ہیں (١)۔

آگے اللہ تعالی اپنی ایک حقیقت بیان کر رہا ہے جو کہ عقیدہء مومن کی بنیاد ہے، ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا يَعۡمَلُونَ﴾ "اور اللہ تعالی ان کے اعمال سے غافل نہیں جو یہ کرتے ہیں"۔ یعنی اللہ تعالی اہل کتاب کے اعمال اور بروقت جو کچھ کر رہے ہے اس سے غافل نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی عنقریب ان کی بری کرتوت اور کبر وعناد کا بدلہ دے گا۔ آیت میں صفت غفلت کی نفی سے اس کے برعکس صفت کمال کا اثبات ہوتا ہے ، یعنی اللہ تعالی نے اپنی ذات سے غفلت ونسیان کی نفی کی ہے جو کہ انسان کا خاصہ ہے، تاکہ اس کی ذات سے تمام صفات نقص کی نفی اور ہر چیز کے متعلق علم کامل واحاطہء تامہ کا اثبات ہو ، اسی مفہوم کو اللہ تعالی نے سورہ یونس میں یوں بیان کیا ہے: ﴿وَمَا تَكُونُ فِي شَأۡنٖ وَمَا تَتۡلُواْ مِنۡهُ مِن قُرۡءَانٖ وَلَا تَعۡمَلُونَ مِنۡ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيۡكُمۡ شُهُودًا إِذۡ تُفِيضُونَ فِيهِۚ وَمَا يَعۡزُبُ عَن رَّبِّكَ مِن مِّثۡقَالِ ذَرَّةٖ فِي ٱلۡأَرۡضِ وَلَا فِي ٱلسَّمَآءِ وَلَآ أَصۡغَرَ مِن ذَٰلِكَ وَلَآ أَكۡبَرَ إِلَّا فِي كِتَٰبٖ مُّبِينٍ﴾ [سورة يونس: ٦١]۔ "اور آپ کے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی اور نہ کوئی چیز بڑی مگر یہ سب کتاب مبین میں ہے"۔

اس کے بعد اللہ تعالی اہل کتاب کے عناد اور سرکشی کی اصل وجہ بیان کر رہا ہے: ﴿وَلَئِنۡ أَتَيۡتَ ٱلَّذِينَ أُوتُواْ ٱلۡكِتَٰبَ بِكُلِّ ءَايَةٖ مَّا تَبِعُواْ قِبۡلَتَكَۚ﴾ " اور آپ اگرچہ اہل کتاب کو تمام دلیلیں دے دیں لیکن وہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے "۔ یعنی اگرچہ آپ ان کو ہر طرح کی قطعی اور یقینی دلیلیں

---

(١) تفسير ابن كثير ١/١٩٩.

دے دیں تب بھی وہ آپ کی تصدیق نہیں کریں گے ، یہ قرآن کریم کے من جانب اللہ ہونے کی معجزاتی دلیل ہے، چنانچہ اس وقت اہل کتاب کے بعض قبائل مدینہ اور نجران میں آباد تھے اور جس حقیقت کو قرآن نے ثابت کیا ہے وہ بالکل ویسے ہی نکلے۔ اللہ تعالی اپنے نبی سے ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَمَآ أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ﴾ "اور نہ آپ ان کے قبلے کو ماننے والے ہیں"۔ یعنی یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت حال کی ترجمانی ہے کہ آپ بھی کبھی ان کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے اور یہی معاملہ ان کا بھی ہے ،اس لیے اس تعلق سے آپ اور ان کے درمیان کچھ کہنے سننے کا سلسلہ ہی ختم ہے، بلکہ خود یہود ونصاری کے مابین قبلہ کو لے کر اختلاف ہے اور دونوں گروہوں میں سے کوئی دوسرے کا قبلہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں: ﴿وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ﴾ "اور نہ یہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلے کو ماننے والے ہیں"۔ چنانچہ یہود کا قبلہ بیت المقدس کی طرف ہے اور نصاری اپنے نبی عیسی علیہ السلام کی مخالفت کرتے ہوئے مشرق کی جانب رخ کرتے ہیں۔ تو جب یہ لوگ آپس ہی میں ایک دوسرے کا قبلہ تسلیم نہیں کرتے تو نبی عربی کے قبلہ کی متابعت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ہواپرست لوگ ہیں، اور ہواپرست خود پر ظلم کرتا ہے: ﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ﴾ "اور اگر آپ باوجودیکہ آپ کے پاس علم آچکا ہے پھر بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے لگ جائیں تو بالیقین آپ بھی ظالموں میں سے ہو جائیں گے"۔ اس آیت میں اللہ تعالی کے بیان کردہ حق کی مخالفت سے ڈرایا گیا ہے ،اور جو ایسا کرے اس کا شمار من جملہ ظالموں میں سے ہوگا، اور یہ تحذیر ربانی اس وقت مزید سخت ہو جاتی ہے جب خطاب کا رخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو، کیوں کہ ایسا تو ممکن نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ سے ایسے کام کا صدور ہو جس سے آپ ظالم قرار پائیں اس لیے یہ تحذیر آپ کی امت کے لیے ہے۔ نیز یہ تحذیر حصول علم کے بعد ہے: ﴿مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ﴾ " باوجودیکہ آپ کے پاس علم آچکا ہے"۔ معلوم ہوا کہ یہ نہی اور تحذیر علم دیے جانے کے بعد مرتب ہوتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ یہ دین اسلام علم اور حقیقت پر مبنی ہے، یہ ایک مکمل شریعت ہے جس میں عبادات ،ایمانیات، اخلاقیات کی عمدہ تعلیمات ہیں ، اور اس میں ہر مصیبت سے عافیت اور شفاء ہے، یہ ایک مضبوط قلعہ ،

زبردست قوت اور ٹھوس رسی ہے ،اس کے ذریعہ سے دل میں پنپتے وساوس کا خاتمہ ہوتا ہے، اس میں گزشتہ قوموں کے واقعات کا بیان ہے، یہ ایک اعجاز اور طریق حق وخیر کا واضح بیان ہے،اس کے اوصاف حمیدہ اور نعمتوں کا شمار فکر وخیال سے بالاتر اور اقلام ان کو قید تحریر میں لانے سے عاجز ہیں۔ لهذا تمام حمد وثنا اسی اللہ تبارک وتعالی کے لیے ہے۔

ارشاد باری تعالی: ﴿ لَّمِنَ ٱلظَّـٰلِمِينَ ﴾ میں یہ دلیل ہے کہ وہ اہل کتاب جس روش پر ہیں وہ روش باطل اور ظالمانہ ہے،اور اس کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومن راہ حق اور ہدایت پر ہیں، اوران کے پاس علم وبرہان اور سچا دین ہے، یہود ظلم وضلالت کا شکار ہیں ان کا جو ساتھ دے گا وہ انہیں میں سے شمار ہوگا۔اس میں ہر مسلمان کے لیے یہودیت ونصرانیت اور سوائے اسلام کے ہر دین سے دور رہنے کی رہنمائی کی گئی ہے ، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین قابل قبول نہیں ہے۔آیت ﴿مِّنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ ٱلۡعِلۡمِ﴾" باوجود کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے"۔میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

﴿ٱلَّذِينَ ءَاتَيۡنَـٰهُمُ ٱلۡكِتَـٰبَ يَعۡرِفُونَهُۥ كَمَا يَعۡرِفُونَ أَبۡنَآءَهُمۡۖ وَإِنَّ فَرِيقٗا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُونَ ٱلۡحَقَّ وَهُمۡ يَعۡلَمُونَ ﴿١٤٦﴾ ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّكَۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡمُمۡتَرِينَ ﴿١٤٧﴾ وَلِكُلّٖ وِجۡهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَاۖ فَٱسۡتَبِقُواْ ٱلۡخَيۡرَٰتِۚ أَيۡنَ مَا تَكُونُواْ يَأۡتِ بِكُمُ ٱللَّهُ جَمِيعًاۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ ﴿١٤٨﴾﴾

ترجمہ:

"جنہیں ہم نے کتاب دی وہ تو اسے ایسا پہچانتے ہیں جیسے کوئی اپنے بچوں کو پہچانے،ان کی ایک جماعت حق کو پہچان کر پھر چھپاتی ہے (۱۴۶)۔ آپ کے رب کی طرف سے یہ سراسر حق ہے، خبردار آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا(۱۴۷)۔ہر شخص ایک نہ ایک طرف متوجہ ہورہا ہے ، تم نیکیوں کی طرف دوڑو۔ جہاں کہیں بھی تم ہو گے، اللہ تمہیں لے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (۱۴۸)"۔

اس کے بعد اللہ تعالی ایسی حقیقتوں کا انکشاف کر رہا ہے جن کی جانکاری صرف وحی الٰہی کے ذریعہ ممکن ہے: ﴿ٱلَّذِينَ ءَاتَيۡنَـٰهُمُ ٱلۡكِتَـٰبَ يَعۡرِفُونَهُۥ كَمَا يَعۡرِفُونَ أَبۡنَآءَهُمۡۖ وَإِنَّ فَرِيقٗا مِّنۡهُمۡ لَيَكۡتُمُونَ ٱلۡحَقَّ

وَهُمۡ يَعۡلَمُونَ ﴾ "جنہیں ہم نے کتاب دی وہ تو اسے ایسا پہچانتے ہیں جیسے کوئی اپنے بچوں کو پہچانے، ان کی ایک جماعت حق کو پہچان کر پھر چھپاتی ہے"۔ یعنی اہل کتاب جانتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، کیوں کہ آپ کے متعلق ان کے پاس آپ کے اتنے واضح اوصاف ہیں جن سے ان کی لاعلمی کا تصور مکمل طور سے ختم ہو جاتا ہے حتی کہ وہ آپ کو ایسے جانتے پہچانتے ہیں جیسے اپنے حقیقی بیٹوں کو پہچانتے ہیں، قرآن نے ان کی اس حالت کا ایسا عمدہ نقشہ کھینچا ہے جس کی معرفت وحی کی ذریعہ ہی ممکن ہے، چنانچہ جس طرح وہ نبی کی ذات سے واقف ہیں اسی طرح تحویل قبلہ کے متعلق بھی انہیں خوب اچھی طرح پتہ ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے وحی ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو کوئی چیز جھٹلا نہیں سکتی، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہی بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو وحی کی جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی اہل کتاب کا ایک گروہ حق کا یقینی علم ہونے کے باوجود بھی چھپائے پھرتا ہے، اس سے معلوم ہو کہ حقد وحسد اور کبر وغرور ایسی بری خصلتیں ہیں جو آدمی کو عناد اور سرکشی اور دانستہ حقائق کو چھپانے پر آمادہ کرتی ہیں۔ اس لیے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس لاعلاج بیماری کی خطرناکی کو سمجھے، کیوں کہ جب دین کے معاملے میں اس کا اثر اس قدر مبغوض شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو سماجی معاملات اور حقوق کی ادئیگی میں جو کہ دین کے بالمقابل کم اہمیت رکھتے ہیں کس قدر بھیانک نتائج لا سکتے ہیں، ایسے میں آدمی بسا اوقات حق بیانی سے چپی سادھ لیتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو سرے سر حق ہی کو مٹا دیتا ہے کیوں کہ اس کے خیال میں وہ حق یا تو اس کے مقصد کے مطابق نہیں ہوتا یا اس کو اپنی حیثیت ناگوار حد تک گرتی نظر آتی ہے، لہذا اس لاعلاج مرض سے بچنے کی اشد ضرورت ہے، اور اس سے بچنے کی دو شکلیں ہیں: اولا، اللہ تعالی سے عافیت کی دعا، دوم: نفس کو تواضع اور قبول اور پیروی حق کا عادی بنانا ، ایسا نہ ہو کہ اسے طغیان وسرکشی میں چھوڑ دیا جائے، یہی وجہ ہے کہ کبر وحسد سے مرکب حقد اور کینہ نے ہی اہل کتاب کو باوجود حق جاننے کے اخفاء حق پر آمادہ کیا تھا: ﴿ ٱلۡحَقُّ مِن رَّبِّكَ ﴾ "آپ کے رب کی طرف سے یہ سراسر حق ہے"۔ آیت میں حق سے مراد یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہے، یا بیت اللہ الحرام کی جانب قبلہ رخ ہونے کا حکم۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کی راہ ہی درست ہے آیت کے اگلے جملہ میں اسی کی تاکید ہے اسی لیے اللہ تعالی اس کے برعکس راہ اختیار کرنے سے منع کر رہا ہے: ﴿ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ ٱلۡمُمۡتَرِينَ

﴾"خبردار! آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا"۔ یعنی پورا یقین رکھو اور امت کو بھی یہ علم یقین ہونا چاہیے کہ جس راہ پر وہ ہیں وہی حق ہے اور دلوں میں ہر قسم کے شیطانی شک و شبہات کو دفع کریں جو بسا اوقات دین کے دشمن انسانی و جنی شیاطین کے ورغلانے سے ایک مومن کے دل میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آیت میں حق کے مخالف شئے سے روک کر حق کی پیروی اور ثابت قدم رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ خطرات سے ڈرا کر لوگوں کو بچانا بہت اہم ہے ،تاکہ آپسی معاملات اور میل جول کی وجہ سے پیدا ہونے والے خطرات کے سامنے ثابت قدم رہ سکیں، جیسا کہ اہل کتاب مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ بازار وغیرہ جیسے دنیاوی امور میں گھل مل کر رہتے تھے۔

اس کے بعد اہل کتاب کے بارے میں اللہ تعالی دوٹوک فیصلہ سنا رہا ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کو ان کے چکر میں پڑے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے: ﴿ وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا ﴾ "ہر شخص ایک نہ ایک طرف متوجہ ہو رہا ہے"۔ یعنی تم میں سے ہر ایک کا الگ الگ قبلہ ہے جس کی طرف وہ رخ کرتا ہے، اس لیے تم ان کے چکر میں نہ پڑو ، وہ تم سے عناد پر تلے ہوئے ہیں، تمہارا فرض ہے کہ بھلائی اور خیر کے کاموں میں جلدی اور سبقت کرو: ﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ "تم نیکیوں کی طرف دوڑو"۔ آیت میں (الخیرات) جمع کے صیغے کے ساتھ استعمال ہوا ہے ،اور اس سے دین اسلام کے تمام کار خیر مراد ہیں، اور کار خیر کی طرف وہی سبقت کرتا ہے جو ان کی حقیقی قدر و قیمت سے واقف ہے۔ دین کے سارے افعال واقوال اور اعتقادات کو لفظ خیرات سے تعبیر کرنے سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اس دین کے تمام شرائع واحکام خیر ہی خیر ہیں ،ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ مسلمان ان کے حصول میں سبقت کرے۔

﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ یہ جملہ مومن کے لیے ایک ایسی طاقت ہے جس کو وہ ہر موڑ پر استعمال کرتا ہے، جب کبھی اس میں بخیلی اور لالچ آنے لگتی ہے تو ﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ کے ذریعہ بخیلی اور لالچ کے خلاف تقویت حاصل کرتا ہے، جب عبادت میں سستی کا شکار ہو تو ﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ اسے قوت عطا کرتا ہے، اظہار حق کی راہ میں کوئی چیز رکاوٹ بننے لگے تو پکار اٹھتا ہے: ﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ ،اگر اپنے مسلمان بھائی کے خلاف حسد میں مبتلا ہو تو ﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ کے ذریعہ اس حسد کو دور کر لیتا ہے، اگر کسی خیر کے انجام دینے میں پس و پیش کا شکار ہو تو ﴿ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ کو یاد کر لیتا

ہے، غرض یہ کہ یہ جملہ ایک مستحکم اور مضبوط قاعدہ کلیہ ہے جس سے ہر شر کا سد باب اور خیر کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کا دفاع ہوتا ہے۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالی اپنی قدرت کاملہ کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: ﴿أَيْنَ مَا تَكُونُواْ يَأْتِ بِكُمُ ٱللَّهُ جَمِيعًا﴾ "جہاں کہیں بھی تم ہو گے، اللہ تمہیں لے آئے گا" اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالی یوم قیامت کی یاد دہانی کرا رہا ہے جس دن وہ تم سب لوگوں کو چاہے مسلم ہو یا کافر اکٹھا کرے گا، اس ارشاد باری تعالی کا مقصد منکرین و کفار کو ڈرانا، نیز مومنوں کو اس قیامت کے دن کے لیے کار خیر پر ابھارنا ہے جس دن ساری مخلوقات اللہ تعالی کے روبرو جمع ہوں گی۔ فرمان باری تعالی: ﴿يَأْتِ بِكُمُ ٱللَّهُ جَمِيعًا﴾ "اللہ تمہیں لے آئے گا" اس میں رب ذوالجلال کی قدرت کاملہ کا ثبوت ہے، نیز اس دن اٹھ آنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے، اور نہ غائب ہو جانے یا چھپ جانے کا کوئی حیلہ کار گر ہوگا۔ یہ آیت مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھائے جانے اور حساب و کتاب کی بھی دلیل ہے، لہذا انسان خبر دار ہو جائے کہ اسے اپنے رب کے پاس جانا ہے، انسان جب اس بات سے باخبر رہے گا تو اسے معصیت کے ارتکاب کا خوف اور اطاعت کے کاموں میں رغبت ہو گی۔ چنانچہ ﴿يَأْتِ بِكُمُ ٱللَّهُ جَمِيعًا﴾ میں ترغیب و ترہیب دونوں کا بیان ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ "اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔ اس میں اللہ تعالی کی قدرت کا بیان ہے یعنی وہ اللہ قیامت کے دن لوگوں کو اکٹھا کرنے، ان کو دوبارہ پیدا کر کے اٹھانے اور ان کا حساب لینے اور ان کی جزاء و سزا پر قادر ہے۔

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُۥ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَـٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّواْ وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُۥ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا ٱلَّذِينَ ظَلَمُواْ مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَٱخْشَوْنِى وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِى عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾﴾۔

ترجمہ:

"آپ جہاں سے نکلیں اپنا منہ (نماز کے لئے) مسجد حرام کی طرف کر لیا کریں، یہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے، جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اللہ تعالی بے خبر نہیں (۱۴۹)۔ اور جس جگہ سے آپ نکلیں

اپنامنہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور جہاں کہیں تم ہو اپنے چہرے اسی طرف کیا کرو ، تاکہ لوگوں کی کوئی حجت تم پر باقی نہ رہ جائے، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا ہے ، تم ان سے نہ ڈرو ، مجھ سے ہی ڈرو تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور اس لئے بھی کہ تم راہ راست پاؤ(۱۵۰)"۔

آیات کا سیاق ابھی قبلہ ہی سے متعلق ہے ، اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۖ﴾ " آپ جہاں سے نکلیں اپنا منہ (نماز کے لئے) مسجد حرام کی طرف کرلیا کریں"۔ مسجد حرام کی طرف استقبال قبلہ کا یہ تیسری بار حکم دیا جارہا ہے۔ پہلا حکم: اللہ تعالی کے فرمان ﴿قَدۡ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِي ٱلسَّمَآءِۖ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةٗ تَرۡضَىٰهَاۚ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ﴾ [سورة البقرة:١٤٤]۔" ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اب آپ کو ہم اس قبلہ کی طرف متوجہ کریں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں"۔اس کا تعلق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کی تکمیل سے ہے۔ دوسرا حکم: اللہ تعالی کا فرمان ﴿وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۖ وَإِنَّهُۥ لَلۡحَقُّ مِن رَّبِّكَ﴾ [سورة البقرة:١٤٩]۔ "آپ جہاں سے نکلیں اپنا منہ (نماز کے لئے) مسجد حرام کی طرف کرلیا کریں، یہی حق ہے آپ کے رب کی طرف سے"۔اس میں یہ تاکیدی بیان ہے کہ یہ قبلہ حق ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحویل قبلہ کی خواہش بھی حق اور رضائے الہی کے موافق ہے، کیوں کہ آپ اللہ تعالی کے محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ تیسرا حکم: ارشاد باری: ﴿وَمِنۡ حَيۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۚ وَحَيۡثُ مَا كُنتُمۡ فَوَلُّواْ وُجُوهَكُمۡ شَطۡرَهُۥ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيۡكُمۡ حُجَّةٌ﴾ " اور جس جگہ سے آپ نکلیں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور جہاں کہیں تم ہو اپنے چہرے اسی طرف کیا کرو ، تاکہ لوگوں کی کوئی حجت تم پر باقی نہ رہ جائے"۔ اس میں مسلمانوں کے لیے عام حکم ہے کہ جہاں کہیں بھی رہو تو اپنی نمازوں میں مسجد حرام کی طرف رخ کرلو یہی تمہارا قبلہ ہے۔اس کے بعد آیت کریمہ میں ایک بہت ہی اہم فائدے کا ذکر کیا گیا ہے: ﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيۡكُمۡ حُجَّةٌ﴾ "تاکہ لوگوں کی کوئی حجت تم پر باقی نہ رہ جائے" چنانچہ اللہ تعالی نے اس تحویل قبلہ کے ذریعہ یہود مخالفین کی حجت

اور دلیل کا صفایا کر دیا جو کہا کرتے تھے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی عجیب ہیں نماز تو ہمارے قبلہ کی طرف پڑھتے ہیں لیکن ہمارے مذہب کی مخالفت کرتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ عنقریب وہ اس قبلہ سے پھیر کر قبلہ ابراہیمی کعبہ کی طرف کر دیئے جائیں گے جیسا کہ ان کی کتابوں میں مذکور ہے۔ اسی طرح جب رسول اصلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس سے پھر کر قبلہ ابراہیمی کعبہ کی طرف ہوگئے تو اس سے مشرکین عرب کی حجت بھی ختم ہوگئی کیوں کہ وہ کعبہ کو معظم و مشرف مانتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو اپنا قبلہ بنالیا تو وہ بھی خوش ہوگئے اور اعتراض کرنے کی گنجائش باقی نہ رہے(۱) ، چنانچہ اس تحویل قبلہ سے بہت ساری اچھائیاں منظر عام پر آگئیں، ایک طرف تو مشرکین عرب کے اعتراض کا خاتمہ ہوگیا، دوسری طرف یہودیوں پر حجت قائم ہوگئی کہ ان کے علم کے مطابق اس نبی کا قبلہ تو مکہ کی طرف یعنی قبلہ ابراہیمی کی طرف ہونا چاہیے - چنانچہ اب یہ قبلہ مکہ کی طرف ہوگیا اور وہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کرنے والے ہیں ، یہ تحویل قبلہ کا واقعہ مومنوں کے لیے ایک دینی طاقت ثابت ہوا ، اور جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری تھی ان کے لیے ایک امتحان۔ اور اللہ تعالی کے اوامر ونواہی اور ناسخ و منسوخ میں اس کی بڑی حکمتیں ہیں، اس کے ذریعہ یہود اور مشرکین کی حجتیں ختم ہوگئیں سوائے ان لوگوں کے جن کے دل مریض تھے، جنہوں نے حق سے عدول کر کے خود پر ظلم کیا۔ ﴿لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ﴾" تاکہ لوگوں کی کوئی حجت تم پر باقی نہ رہ جائے، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا ہے"۔ ﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي﴾ " تم ان سے نہ ڈرو ، مجھ سے ہی ڈرو "۔یعنی خشیت محض اللہ کا حق ہے اسے کسی اور کے لیے روانہ سمجھو، اس آیت سے مومنوں کو اطمینان دلایا جارہا ہے کہ ان لوگوں سے ڈرنے اور خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ ان کے کارنامے اور سرکشیاں انتہائی حقیر اور بے معنی ہیں، اور وہ اپنی مراد کو کبھی نہیں پہنچ سکتے ، لہذا خوف صرف اللہ رب العالمین کی ذات سے ہو، مومن کی خشیت کو اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ محصور کر دینے سے سارے ظالم و ناحق کٹ حجت کا خوف جاتا رہا، چنانچہ حق پر ہوتے ہوئے لوگوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ اللہ تعالی ظالموں کے خلاف

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۲۰۱.

ان کا مددگار ہے، اس لیے ہونا تو یہ چاہیے کہ ظالم دوسروں پر اپنے ظلم کی وجہ سے رب العالمین سے خوف کھائے۔ حجت اور دلیل تو مومن کے ساتھ ہے اس لیے وہ صرف اللہ سے ڈرتا ہے، یہ آیت مومن کے تثبیت قلب اور تقویت کا سبب ہے، اور یہود کے خلاف ان کی نصرت ومدد کی طرف اشارہ ہے، کیوں کہ جن سے ڈر اور جن کی طاقت کا خوف نہ ہو تو ان پر فتح یابی یقینی ہوتی ہے۔

آیت کے فوائد میں سے ہے کہ توجیہ وارشاد میں تدرج کا خیال ، اور نفسیاتی پہلوؤں کی رعایت ضروری ہے۔ اور بات پیش کرنے میں تاکید اور مفید اسلوب تکرار کا سہارا لینا چاہیے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ تعالی آیت کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں: یہ بار بار آیت کی تکرار استقبال قبلہ کے حکم کی تاکید اور اہتمام کی وجہ سے ہے ، کیوں کہ تحویل قبلہ کا یہ واقعہ ان پر بہت شاق تھا(۱) ۔ اس کے اور بھی کئی فائدے علماء کرام نے ذکر کیے ہیں ، ان میں سے ایک فائدہ جس کا ذکر ابن کثیر وغیرہ(۲) نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے حکم کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو کعبہ کو دیکھ رہے ہیں، دوسرا حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو مکہ میں ہیں لیکن کعبہ کو دیکھ نہیں رہے ہیں، اور تیسرا حکم ان لوگوں کے لیے ہے جو مکہ کے باہر روئے زمین پر باقی شہروں میں ہیں۔ تو جو کعبہ کو دیکھ رہا ہو وہ بعینہ کعبہ کی طرف رخ کرے گا اور جو مسجد حرام سے باہر مکہ میں ہو وہ مسجد حرام کی طرف رخ کرے گا اور جو مکہ کے باہر دوسرے شہر میں ہو مکہ کی طرف متوجہ ہوگا۔ (اللہ اس گھر کی حفاظت کرے)۔

نیز تحویل قبلہ اللہ تعالی کی طرف سے ایک عظیم نعمت ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿ وَلِأُتِمَّ نِعۡمَتِي عَلَيۡكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُونَ ﴾" تاکہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کروں اور اس لئے بھی کہ تم راہ راست پاؤ" چنانچہ مسلمانوں کے قبلہ کی تعیین ایک عظیم نعمت ہے جسے اللہ تعالی نے اپنی رحمت وتوفیق سے پورا کیا، تاکہ اس تشریع کی وجہ سے جس کی نعمتیں بے شمار ہیں مومنوں کو مزید ہدایت وتوفیق حاصل ہو ۔ پس تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو ساری کائنات کا رب ہے۔

---

(۱) تفسير قرطبي ٢/١١٣.

(٢)تفسير ابن كثير ١/٢٠٠.

اسی طرح اس آیت کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان بیت حرام کی طرف قبلہ کی نعمت کا احساس کریں جو بیت حرام کہ لوگوں کے لیے روئے زمین پر تعمیر کیا جانے والا سب سے پہلا گھر ہے اور اس کو اللہ تعالی نے اپنی خصوصی برکتوں سے نوازا ہے، مثلا اس میں نماز کا ثواب دیگر مساجد کے مقابلے میں لاکھ گنا زیادہ ہے، اسی میں آب زمزم کا چشمہ ہے جو لوگوں کی شفایابی کا سبب ہے وغیرہ وغیرہ۔

﴿كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُواْ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ فَٱذْكُرُونِىٓ أَذْكُرْكُمْ وَٱشْكُرُواْ لِى وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾﴾

ترجمہ:

"جس طرح ہم نے تم میں تمہیں میں سے رسول بھیجا جو ہماری آیتیں تمہارے سامنے تلاوت کرتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت اور وہ چیزیں سکھاتا ہے جن سے تم بے علم تھے (۱۵۱)۔ اس لئے تم میرا ذکر کرو میں بھی تمہیں یاد کروں گا، میری شکر گزاری کرو اور ناشکری سے بچو (۱۵۲) "۔

اللہ تعالی اپنے مومن بندوں پر بعثت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم نعمت کا احسان جتلا رہا ہے، فرمایا: ﴿كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُواْ عَلَيْكُمْ ءَايَٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ فَٱذْكُرُونِىٓ أَذْكُرْكُمْ وَٱشْكُرُواْ لِى وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾﴾ "جس طرح ہم نے تم میں تمہیں میں سے رسول بھیجا جو ہماری آیتیں تمہارے سامنے تلاوت کرتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت اور وہ چیزیں سکھاتا ہے جن سے تم بے علم تھے۔ اس لئے تم میرا ذکر کرو میں بھی تمہیں یاد کروں گا، میری شکر گزاری کرو اور ناشکری سے بچو"۔ جس طرح ہم نے اس دین اسلام کی نعمت دے کر تم میں تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا جس نے وحی الہی کے ذریعہ تم کو دین کی ساری باتیں سکھلائیں جس سے تم لاعلم تھے تو تم بھی میرے بتائے ہوئے احکام اور شریعت کے مطابق خالص میری عبادت کے ذریعہ میرا ذکر کرو، اور میری ان عظیم نعمتوں کا شکر بجالاؤ اور میری ناشکری کر کے ان نعمتوں کو نہ چھپاؤ: ﴿وَٱشْكُرُواْ لِى وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾﴾ "میری شکر گزاری

کرواور ناشکری سے بچو"۔اس سے پتہ چلا کہ کفر کا ایک مفہوم کفران نعمت یعنی ناشکری بھی ہے ، کیوں کہ ناشکری نعمت کی اہمیت سے ناواقفیت اور اس کی قدر وقیمت کے عدم احساس کی دلیل ہے ، اس کے برعکس شکران نعمت سے اس خیر وفضل کے تئیں مومن کا شعور واحساس بیدار ہوتا ہے اور وہ اس نعمت پر اللہ تعالی کی شکر بجالاتا ہے ، اور جب بھی اس کے اندر اللہ تعالی کی نعمتوں کا احساس جاگتا ہے اس کے اطمینان وسکون اور سعادت میں مزید اضافہ ہوتا ہے ، چنانچہ جب وہ نعمت اسلام کو یاد کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ وہ ایک مسلمان ہے تو بے مزہ زندگی اور اس میں پیش آنے والے مصائب وآلام اس سے ختم ہو جاتے ہیں ، جب اولاد کی نعمت کا احساس ہوتا ہے تو مال ودولت وغیرہ کی محتاجی سے کچھ سکون حاصل ہوتا ہے ، لیکن اگر کوئی احساس نعمت سے غافل اور بے پرواہ رہتا ہے تو ہلاکت پر ہلاکت اس کا مقدر ہوتی ہے ، ایک نعمت سے غفلت مثلا صحت کی نعمت سے غفلت دیگر نعمتوں سے غفلت کا سبب بنتی ہے ، اور پھر حرص وطمع کے ہموم وغموم کا ایک لا متناہی سلسلہ اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے ، اس لیے اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ نعمتوں کا ایسا شعور واحساس پیدا کیا جائے جو شکر الہی پر آمادہ کرے ، کیوں کہ شکر ہی نعمتوں کی بقا کا سبب اور ذریعہ ہے۔

اسی طرح آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ اللہ تعالی شکر گزاروں کو محبوب رکھتا ہے اور اسے یہ بھی پسند ہے کہ بندے پر اس کی نعمتوں کے اثرات ظاہر ہوں ، لیکن یہ اثر عبادت کے طور پر اعتراف نعمت کی شکل میں ظاہر ہو نہ کہ کبر وغرور اور اکڑ کی شکل میں ، امام ابن کثیر رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں : اللہ تعالی اپنے بندوں کو اپنی نعمتیں یاد دلا رہا ہے کہ اسی نے ان کی طرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا جو ان پر اللہ کی واضح آیتیں تلاوت کرتے اور ان کو اخلاقی خرابیوں ، نفس کی گندگیوں اور جاہلیت کے کاموں سے پاک وصاف کرتے ہیں ، ان کو ضلالت وگمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر نور ہدایت کی طرف لے جاتے ہیں ، نیز کتاب وحکمت یعنی قرآن وسنت کی تعلیم دیتے اور لوگوں کو وہ سب باتیں سکھاتے ہیں جن کو وہ نہیں جانتے۔ چنانچہ اس رسالت الہی کی برکتوں سے وہ اولیاء اللہ اور علماء کے اوصاف سے متصف ہو

گئے اور علمی گہرائی وگیرائی کے اعتبار سے سب سے اعلی، دلی پاکیزگی کے رو سے سب سے نیک، بے جا تکلفات سے دور اور لب ولہجہ کے سب سے زیادہ سچے تھے(۱)۔

آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اللہ کو یاد کرتا ہے اللہ تعالی اس کو یاد کرتا ہے، حدیث قدسی میں ہے، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: (وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي فَإِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُ) اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے، اور جب وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور جب وہ مجھے مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر فرشتوں کی مجلس میں اسے یاد کرتا ہوں"(۲)۔ دل وزبان اور اعمال کے ذریعہ ذکر الہی کے فوائد بہت زیادہ ہیں جن کو کتب حدیث میں بیان کیا گیا ہے، بلکہ بعض علماء نے اپنی مؤلفات میں اس کے لیے خصوصی ابواب وکتب قائم کیے ہیں۔

آیت کے فوائد میں سے ہے دل وجان میں توحید کا رسوخ اور زبان اور عمل سے اس کا اظہار: ﴿فَاذْكُرُونِي﴾ "تم میرا ذکر کرو" ﴿وَاشْكُرُوا لِي﴾ "تم میری شکر گزاری کرو"۔ ذکر الہی ذکر نعمت کا سبب اور ذکر نعمت ذکر الہی کا سبب ہے اور یہ دونوں شکر کا موجب ہیں، اس کے بالمقابل نعمت کو بھولا دینا شکر سے غفلت کا سبب ہے۔ ﴿فَاذْكُرُونِي﴾ "تم میرا ذکر کرو" اس میں ذکر کو اللہ تعالی کی ذات سے مربوط کیا گیا ہے جس سے توحید باری تعالی کا اثبات ہوتا ہے، بایں طور کہ بندہ نعمت کے بدلے میں اللہ تعالی کو یاد کرے، اور ایسا نہ کہ نعمت کے ظاہری اسباب وعوامل اس نعمت کے مسبِّب حقیقی یعنی اللہ تعالی سے غافل کردیں، بلکہ بندہ کسی بھی نعمت کے حصول پر یوں کہے: اللہ تعالی کے فضل وکرم سے مجھ کو تجارت میں نفع ہوا، اللہ تعالی نے فلاں کو میرے تابع کیا جس نے میری مدد کی اللہ تعالی اس کو مزید کی توفیق دے، اللہ تعالی نے اپنے فضل واحسان سے یہ کام میرے لیے آسان کردیا، اسی طرح سے دیگر امور میں بھی بندے کی زبان پر یہ اعتراف جاری وساری ہو کہ تمام اسباب اللہ تعالی کے فضل وکرم سے ہی مہیا ہوتے ہیں، اس میں ایک جانب انعام کرنے والے اللہ تعالی کا شکر ہے کہ اس نے یہ سارے اسباب بندے کے لیے مہیا

---

(۱) تفسير ابن كثير ۱/۲۰۱.

(۲) صحيح بخاري ۳۸٤/٤ حديث نمبر (۷٤۰۵).

کیے تو دوسری جانب اس شخص کی تعریف بھی جس کو اللہ تعالی نے حصول نعمت کا سبب بنایا۔اسی طرح ﴿وَٱشۡكُرُواْ لِي﴾ "تم میری شکر گزاری کرو"۔اس میں بھی شکر کے متعلق توحید الہی کا اثبات ہے۔

﴿وَٱشۡكُرُواْ لِي وَلَا تَكۡفُرُونِ﴾ "میری شکر گزاری کرو اور ناشکری سے بچو"۔اللہ تعالی کے اس فرمان میں مومن کے لیے ایک طاقت ہے ،اس کے ذریعہ ایک مومن اپنی حال زندگی میں اللہ تعالی کی بے بہا نعمتوں کا مشاہدہ کرتا ہے جب کہ منکرین نعمت اللہ تعالی کی ان نعمتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، جب بندہ مومن اپنے اسلام کو یاد کرتا ہے تو اسے اس نعمت کی عظمت کا احساس ہوتا ہے مزید برآں اس کو یہ حوصلہ ملتا ہے کہ وہ ناشکروں میں سے نہیں ہے، پھر اس عظیم اور جلیل القدر نعمت کے سامنے ہر محتاجی اور فاقہ کشی معمولی نظر آنے لگتی ہے،اور اس کے بعد سعادت وخوش نصیبی کے سارے دروازے اس پر واہو جاتے ہیں، جب اپنی صحت وعافیت پر نظر ڈالتا ہے اور خود کو بیماروں کے زمرے میں نہیں پاتا تو یہ نعمت بھی اس کو بڑی لگتی ہے ،اور ہر حاجت ومصیبت اور فاقہ وغربت اس کی نزدیک چھوٹی محسوس ہوتی ہے،اور ہر جانب سے اطمینان وسکون اور سعادت ونیک بختی اس کو ڈھانپ لیتی ہے،اسی طرح چھوٹی بڑی ہر نعمت میں ایک مومن کی یہی شان ہوتی ہے۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسۡتَعِينُواْ بِٱلصَّبۡرِ وَٱلصَّلَوٰةِۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿١٥٣﴾ وَلَا تَقُولُواْ لِمَن يُقۡتَلُ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمۡوَٰتُۢۚ بَلۡ أَحۡيَآءٞ وَلَٰكِن لَّا تَشۡعُرُونَ ﴿١٥٤﴾ وَلَنَبۡلُوَنَّكُم بِشَيۡءٖ مِّنَ ٱلۡخَوۡفِ وَٱلۡجُوعِ وَنَقۡصٖ مِّنَ ٱلۡأَمۡوَٰلِ وَٱلۡأَنفُسِ وَٱلثَّمَرَٰتِۗ وَبَشِّرِ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿١٥٥﴾ ٱلَّذِينَ إِذَآ أَصَٰبَتۡهُم مُّصِيبَةٞ قَالُوٓاْ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيۡهِ رَٰجِعُونَ ﴿١٥٦﴾ أُوْلَٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوَٰتٞ مِّن رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٞۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُهۡتَدُونَ ﴿١٥٧﴾﴾

ترجمہ:

"اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد چاہو، اللہ تعالیٰ صبر والوں کا ساتھ دیتا ہے (۱۵۳) ۔اور اللہ تعالیٰ کی راہ کے شہیدوں کو مردہ مت کہو ، وہ زندہ ہیں، لیکن تم نہیں سمجھتے (۱۵۴) ۔اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، مال وجان اور پھلوں کی کمی سے اور ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے (۱۵۵) ۔ جنہیں جب کوئی مصیبت

آتی ہے تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالی کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں (۱۵۶) ۔ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں (۱۵۷)" ۔

اللہ تعالی اپنے مومن بندوں کو ایک ایسی قوت کی رہنمائی کر رہا ہے جس کے ذریعہ زندگی میں پیش آنے والی مختلف مصیبتوں میں مدد حاصل کی جا سکے ،ارشاد ہوتا ہے: ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسْتَعِينُواْ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّـٰبِرِينَ ﴾ "اے ایمان والو صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد چاہو، اللہ تعالیٰ صبر والوں کا ساتھ دیتا ہے"۔ آیت کریمہ میں اللہ تعالی مومنوں کو ان کے حق میں نفع بخش امر کی رہنمائی میں لفظ ایمان سے خطاب کرتے ہوئے ندا دے رہا ہے: ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ﴾ "اے ایمان والو"۔ لفظ ایمان کے ذریعہ خطاب اور ندائے ربانی میں مومنوں کے لیے اللہ تعالی کی طرف سے ایک عظیم شرف ہے ،کیوں کہ اللہ تعالی اس خطاب کے ذریعہ ان کے ایمان کا ثبوت دے رہا ہے، اب اس نعمت سے بڑی اور کون سی نعمت ہو سکتی ہے، یہ اتنا عمدہ خطاب اس لیے ہے تا کہ ان کو اپنی طرف متوجہ کرے اور ان کے لیے نفع بخش امور ان کو سکھلائے۔ تعلیم و تربیت کے میدان میں ایک معلم یا داعی کے لیے یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے کہ متعلم اور مدعو کو خطاب کرنے یا ندا دینے میں ممکن حد تک عمدہ الفاظ کا استعمال کرے، کیوں کہ جب اللہ تعالی اپنے بندوں کو اتنے عظیم رتبہ سے ندا دے رہا ہے تو بندوں کو اپنے ہی جیسے بندوں کو خطاب یا ندا دینے میں اس کا بدرجہ اولی اہتمام کرنا چاہیے۔ آیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی نے مومنوں کو ندا کے اسلوب حرف (یا) سے خطاب کیا ہے، تا کہ ان کو اپنی طرف متوجہ کرے اور ان کو احساس دلائے کہ بات قابل توجہ ہے، کیوں کہ اس ندا کا مقصد ہی اہم امر کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے، لہذا ضروری ہے کہ پورے اہتمام کے ساتھ اس طرف توجہ کر لی جائے۔ یہ توجیہی و دعوتی اور تربیتی اسلوب مخاطب کو متوجہ کرنے میں کافی مؤثر ہے۔

اللہ تعالی مومنوں کو ان کے حق میں بہت ہی مفید بات بتلانے کے لیے ندا دے رہا ہے، وہ یہ کہ ہر مشکل گھڑی میں دو اہم چیزوں کے ذریعہ مدد حاصل کرو: ﴿ ٱسْتَعِينُواْ بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ ﴾ "تم صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو"۔ یہ مدد کس مکان و محل میں طلب کرنا ہے اللہ تعالی نے اس کی کوئی تحدید نہیں کی تا کہ یہ ہر چیز کے لیے عام رہے اور ایک مومن اس ارشاد سے یہی سمجھے کہ اس کو ہر شر سے بچاؤ اور خیر

کی طلب میں ان دو چیزوں سے مدد حاصل کرنی ہے، کیوں کہ تمام انسانی ضروریات کا محور دو ہی چیزیں ہیں: خیر کی طلب اور شر سے بچاو، اگرچہ ضرورتیں ہر شخص کی مختلف ہوتی ہیں، لہذا صبر کے ذریعہ استعانت کی مختلف شکلیں ہیں: اطاعت کی ادائیگی پر صبر، خیر کی طلب یا شر سے بچاؤ پر صبر، اللہ تعالی کی نافرمانی سے خواہش کو روکنے پر صبر، نفس کو بھلائی کے کام پر آمادہ کرنے پر صبر، بھلی بات کہنے پر صبر، طبیعت پر ناپسندیدہ حالات پیش آنے پر صبر اور اسی طرح دیگر امور جن میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کیوں کہ صبر سے حوصلے بلند ہوتے اور برداشت کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ نیز صبر سر گرمی عمل اور اطمینان قلب کا باعث ہے، اور اس کے ذریعہ ناامیدی و کسل مندی اور مجبوری جیسے مہلک اوصاف سے آدمی محفوظ رہتا ہے، مزید برآں صبر کے بدلے اجر عظیم اور ثواب جزیل کا وعدہ بھی ہے، جیسا کہ آنے والے فوائد کے بیان سے واضح ہوگا، ان شاءاللہ۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ صبر کرنے والے کو اللہ تعالی کی معیت خاصہ حاصل ہے، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں فرمایا: ﴿ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴾ "اللہ تعالیٰ صبر والوں کا ساتھ دیتا ہے" اگر صبر والوں کے لیے معیت باری تعالی کے سوا اور کوئی دوسری نعمت نہ ہوتی تو یہی ایک نعمت ان کی قدر و منزلت، قوت و طاقت اور نصرت و تایید کے لیے کافی ہوتی۔

دوسری چیز جس سے اللہ تعالی نے مدد طلب کرنے کا حکم دیا وہ نماز ہے، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب سخت مشکل اور تکلف دہ معاملہ درپیش ہوتا تو نماز سے مدد حاصل کرتے، جیسا کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی مشکل معاملہ پیش آتا تو نماز پڑھتے(۱)۔ کیوں کہ نماز بندے اور اس کے رب کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے، نماز میں بندہ اپنے رب سے سرگوشی اور رکوع و سجدہ میں عاجزی وانکساری کا اظہار کرتا ہے، سورہ فاتحہ اور قرآن کریم کی تلاوت، اللہ تعالی کی حمد وثنا، تکبیر و تسبیح بیان کرتا ہے، اللہ تعالی کے روبرو کھڑا رہتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوالانبیاء ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجتا ہے، دعائیں کرتا ہے، بندہ سجدے میں اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، جس نماز کی اتنی ساری خوبیاں ہوں تو یقینا یہ نماز ایک مومن کے لیے اس کے شؤون حیات میں مدد

---

(۱) مسند احمد ۳۸/۳۳۳۰ حدیث نمبر (۲۳۲۹۹).

حاصل کرنے کا سب سے بہترین وسیلہ ہے، فرض نمازوں کی وقت پر ادائیگی، سنن رواتب کی پابندی اور مشکل اور سخت حالات میں نوافل کی طرف جلدی سب سے بڑی مدد ہے۔

آگے کی آیات میں راہ جہاد میں شہید کے احوال کا بیان ہو رہا ہے: ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ﴾ "اور اللہ تعالی کی راہ کے شہیدوں کو مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں، لیکن تم نہیں سمجھتے"۔ اس آیت قرآنی میں اللہ تعالی نے شہید کی تعریف اور مفہوم واضح کیاہے کہ شہید وہ شخص ہے جو اللہ تعالی کے راستے میں قتل کر دیا جائے،اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کی راہ میں شہید ہونے والا زندہ ہے، لیکن ہمیں ان کی اس زندگی کا شعور نہیں۔اس سے جہاد فی سبیل اللہ اور شہداء کی فضیلت واضح ہوتی ہے جنہوں نے اپنی زندگی کو اللہ تعالی کی راہ میں قربان کردیا ،یعنی یہ قربانی نہ توکسی دنیاوی منفعت کی لالچ کے لیے تھی اور نہ ہی باطل کے دفاع میں یا ریاکاری اور دیکھاوے کی غرض سے، بلکہ خالص اللہ تعالی کی راہ میں پیش کی جانے والی قربانی تھی، اور شہید کے رتبے پر فائز ہونے کی یہی شرط ہے، جب یہ شرط پائی جائے گی تو ان کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ مردہ نہیں ہیں، بلکہ ہمارا یقین جازم اور پختہ اعتقاد ہے کہ جو فی سبیل اللہ شہادت کی موت پائے وہ زندہ ہے۔جیساکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: (إِنَّ أَرْوَاحَ الشُّهَدَاءِ فِي طَيْرٍ خُضْرٍ تَعْلُقُ مِنْ ثَمَرِ الْجَنَّةِ أَوْ شَجَرِ الْجَنَّةِ)(١) "شہداء کی روحیں (جنت میں) سبز پرندوں کی شکل میں ہیں، جو جنت کے پھلوں یا درختوں سے کھاتی چرتی ہیں"۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ ثواب قبر اور عذاب قبر برحق ہے۔لیکن اس دنیامیں ہم کو ان کی حالتوں کا احساس اور شعور نہیں ہوتا۔اللہ تعالی کی ذات پاک ہے وہ بلند وبالا، عظمتوں اور حکمتوں والاہے،اور تمام امور کامالک وہی ہے۔

ملاحظہ کریں،قرآن کریم توجیہ وارشاد،امر ونہی اور بیان تردید میں ایک سیاق سے دوسرے سیاق کی طرف کس حیرت انگیز اور تعجب خیز انداز سے منتقل ہوتاہے،یہ قرآن کریم کاایساخوبصورت اور حیران کن اختلاف بیان ہے جس سے سماعت لطف اندوز ہوتی ،دلوں میں خشوع،اور عقلیں غور وفکر پر مجبور

---

(١) جامع ترمذي ١٥١/٤ حديث نمبر (١٦٤١) امام البانى نے اس حديث كو صحيح كہا ہے.

ہوتی ہیں، قاریٔ قرآن آیات کے سیاق والفاظ اور کلمات کی حسن تراکیب کی لذت محسوس کرتا ہے، عقل وشعور کو روشنی ملتی ہے، دلوں میں امنگ، اور ضمیر میں حرکت پیدا ہوتی ہے، پاک ہے وہ ذات جس نے قرآن کے ذریعہ عقلوں کو حیران کر رکھا ہے، اور اس کے فصاحت بیان اور رازہائے سربستہ سے جن وانس عاجز ہیں یہ قرآن جن وانس سب کے لیے چیلنج ہے، گو وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

چنانچہ سابقہ آیت میں فی سبیل اللہ شہید ہونے والے کی حالت کا بیان تھا اور اس کے پہلے والی آیت میں مسلمانوں کو صبر وصلاۃ سے مدد حاصل کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، پھر اب اگلی آیت کے سیاق میں ان آزمائشوں کا ذکر کیا جارہا ہے جن میں صبر وصلاۃ کے ذریعہ مدد طلب کرنا ہے، ذرا دیکھیں، یہ ایک سیاق سے دوسرے سیاق کی طرف منتقل ہونے کا انداز کتنا حسین اور دلچسپ ہے، سبحان اللہ! جس نے اپنے قرآن کے ذریعہ بندوں کو عاجز کر دیا۔

اللہ تعالی اپنے بندوں کو دنیا میں پیش آنے والی مصیبتوں کے متعلق خبر دے رہا ہے، فرمایا: ﴿ وَلَنَبۡلُوَنَّكُم بِشَيۡءٖ مِّنَ ٱلۡخَوۡفِ وَٱلۡجُوعِ وَنَقۡصٖ مِّنَ ٱلۡأَمۡوَٰلِ وَٱلۡأَنفُسِ وَٱلثَّمَرَٰتِۗ ﴾" اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے، دشمن کے ڈر سے، بھوک پیاس سے، مال وجان اور پھلوں کی کمی سے"۔ مومنوں کو ان آزمائشوں سے دوچار ہونے والی اس حالت کے بیان سے اس آیت کا تعلق گذشتہ آیت ﴿ٱسۡتَعِينُواْ بِٱلصَّبۡرِ وَٱلصَّلَوٰةِۚ ﴾ سے واضح طور پر سمجھ میں آجارہا ہے، اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ والی آیت سے بھی، کیوں کہ ایک مجاہد کو میدان جہاد اور جہاد سے پہلے اہل وعیال کے فراق کے وقت یا راستہ میں صبر کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔

آیت کریمہ میں آزمائش کی اس خبر سے اللہ تعالی اپنے مومن بندوں کو یہ متعارف کرارہا ہے کہ ابتلاءات اور مصائب اللہ تعالی کا مقصود عین ہے تاکہ وہ اس امر سے باخبر رہیں کہ اس دنیا میں بطور امتحان و اختبار مصیبتیں آسکتی ہیں اور یہ دنیا آخرت کے انجام کے لیے امتحان گاہ ہے، کیوں کہ ہر امتحان کا ایک ہدف اور مقصد ہوتا ہے تاکہ اس امتحان کے نتیجہ میں کامیاب ہونے والے اعلی مراتب سے ہم کنار ہوں، چنانچہ ایک مومن اس مفہوم کو مد نظر رکھتے ہوئے درپیش آزمائشوں کا سامنا کرتا ہے اور زندگی کے مصائب وآلام میں ایک سچے مومن کے شایان شان طرز عمل اختیار کرتا ہے۔

ابتلا اور آزمائش اصلا خیر اور شر دونوں طریقے سے ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿ وَنَبۡلُوكُم بِٱلشَّرِّ وَٱلۡخَيۡرِ فِتۡنَةٗۖ ﴾ [سورة الأنبياء:٣٥]۔ "ہم بطریق امتحان تم میں سے ہر ایک کو برائی بھلائی میں مبتلا کرتے ہیں"۔

آیت سے معلوم ہوا کہ آزمائش کے درجات اور نوعیتیں الگ الگ ہیں، بعض ابتلاءات لوگوں کے لیے بالکل عیاں اور بعض پوشیدہ رہتی ہیں، ان ہی انواع میں سے ایک آزمائش خوف ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ بِشَيۡءٖ مِّنَ ٱلۡخَوۡفِ ﴾ " دشمن کے ڈر سے "۔ اللہ تعالی نے (بِشَيۡءٍ) کہا، یعنی تھوڑا خوف ،نہ کہ سارا خوف، اللہ تعالی کا شکر ہے کہ وہ ہم کو تھوڑے ہی خوف سے آزماتا ہے۔ خوف ایسی کیفیت کا نام ہے جو اضطراب و بے چینی کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے اور اس سے انسان کا اطمینان و سکون ختم ہو جاتا ہے، جیسا کہ جنگوں میں ڈر و خوف جو قتل و غارت ،لوٹ مار اور نکال بھگانے کے سبب پیدا ہوتا ہے، ضروری نہیں کہ یہ خوف صرف حالت جنگ ہی میں ہو بلکہ کبھی کبھی حالت سلم میں دشمن کا یا کسی دوسرے دنیاوی معاملہ کا خوف ہوتا ہے، جیسے کہ کسی پسندیدہ چیز کے کھو جانے یا کسی ناپسندیدہ چیز کے آجانے کا خوف، اس کے علاوہ خوف کے دیگر اسباب بھی ہیں جو احساس امن کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس میں نعمت امن کی یاددہانی بھی ہو رہی ہے جو کہ خوف کی ضد ہے۔ یا جس کے ذریعہ سے خوف کے کسی بھی قسم کا خاتمہ ہو، اس لیے نعمت امن ہم سے اللہ تعالی کی تعریف اور حمد وثنا کا مطالبہ کرتی ہے، جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: (مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِنًا فِي سِرْبِهِ مُعَافًى فِي جَسَدِهِ عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ فَكَأَنَّمَا حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا)(١) "جس نے بھی صبح کی اس حال میں کہ وہ اپنے گھر یا قوم میں امن سے ہو اور جسمانی لحاظ سے بالکل تندرست ہو اور دن بھر کی روزی اس کے پاس موجود ہو تو گویا اس کے لیے پوری دنیا سمیٹ دی گئی"۔

ابتلاء اور آزمائش کی اقسام میں سے جس کا ذکر آیت کریمہ میں کیا گیا ہے ایک قسم بھوک ہے، یعنی آدمی کے پاس اپنی بھوک مٹانے کے لیے کھانا دستیاب نہ ہو، چاہے تو کھانے کی کمی کے سبب، یا کھانا حاصل کرنے کی اس کو طاقت نہ ہو، یا پیداوار پر کوئی عام آفت آجائے، یا درآمدگی کے وسائل وذرائع

---

(١) جامع ترمذي ٤/٤٩٦ حديث نمبر (٢٣٤٦)

ٹھپ پڑ جائیں، یا کسی بھی دیگر اسباب کی بنیاد پر کھانے کی دستیابی نہ ہو سکے۔ مذکورہ حدیث نبوی (عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ) میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

ابتلاء کی تیسری قسم: ﴿وَنَقْصٍ مِّنَ ٱلْأَمْوَٰلِ﴾ "اور مال کی کمی سے"۔ کیوں کہ مال کی کمی سے ضروریات زندگی اور اشیاء تکمیل حیات کی مقصد برآری پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے۔

ابتلاء کی چوتھی قسم: جان کی کمی ﴿وَنَقْصٍ مِّنَ ٱلْأَمْوَٰلِ وَٱلْأَنفُسِ﴾ " اور مال و جان کی کمی سے"۔ یعنی کسی عزیز اور قریبی رشتہ دار کی موت کے ذریعہ جان کمی سے، جس کی وجہ سے نفس انسانی تکلیف سے دوچار ہوتا ہے۔

ابتلاء کی پانچویں قسم: ﴿وَٱلثَّمَرَٰتِ﴾ "اور پھلوں کی کمی سے"۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ثمرات سے مراد اولاد ہے، کیوں کہ اولاد دلوں کا پھل ہوتی ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے نباتات کی کمی اور برکت کا ختم ہو جانا مراد ہے، بہر صورت یہ بھی ایک آزمائش کی شکل ہے۔ چنانچہ جب ایک بندہ مومن اس بیان ربانی سے آگاہ ہو گا تو اس کے نتیجے میں دوسروں کے بالمقابل ان ابتلاءات کو بحسن وخوبی قبول کرلے گا ،دوسروں سے بہتر حالت میں ہوگا، ان ابتلاءات کے تعامل میں حکمت ودانائی کا مظاہرہ کرے گا اور نفسیاتی اعتبار سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پر سکون اور مطمئن ہو گا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے اتنے ہی بیان سے مومن کو آزمائش کے وقت قدرے اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے مزید برآں اللہ تعالی نے اپنے بندوں کو آزمائش کے دوران کی جو ہدایات فرمائیں اس سے اس کی حالت دونوں جہان میں مزید بہتر اور خوب ہو جائے گی ،ارشاد فرمایا: ﴿وَبَشِّرِ ٱلصَّٰبِرِينَ ١٥٥ ٱلَّذِينَ إِذَآ أَصَٰبَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓا۟ إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ﴾ "اور ان صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے (۱۵۵)۔ جنہیں جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ تعالی کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔ یہ اللہ تعالی کی طرف سے بشارت ہے بندہ مومن کے لیے جو ابتلاءات اور مصیبتوں کا مقابلہ دو چیزوں سے کرتا ہے ،اول یہ کہ صبر کرتا ہے، دوسرے یہ کہ اس کی زبان پر إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ کے کلمات ہوتے ہیں ۔

صبر کا مفہوم: کسی بھی مصیبت کے پہنچنے پر اپنے آپ کو جزع وفزع سے روک رکھنے اور نفس پر پیش آنے والے حالات کے وقت دل کے سکون کا نام صبر ہے۔ آیت کریمہ میں بشارت کا کوئی پیمانہ نہیں متعین کیا گیا ہے اس لیے اس میں یہ دلیل ہے کہ یہ بہت عظیم اجر وثواب کے حصول کی بشارت ہے ، اور (إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيۡهِ رَٰجِعُونَ) ہر مصیبت زدہ کا ملجاو ماوا ہے، کیوں کہ مصیبت زدہ کا یہ کہنا کہ (إِنَّا لِلَّهِ)اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ اللہ تعالی کی ملکیت ہے ،اس میں توحید ربوبیت اور توحید الوہیت اور توحید خالص کا اقرار ہے ، اور یہ کہ وہ اللہ کا بندہ وغلام اور اللہ تعالی اس کا مالک کل ہے ، اس لیے وہ اللہ تعالی کے قضا وقدر پر اعتراض نہیں کرتا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: (عدل في قضاؤك)[1]" میرے حق میں تیرا فیصلہ بالکل مبنی برانصاف ہے"۔ اور (وَإِنَّآ إِلَيۡهِ رَٰجِعُونَ) "اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں"۔اس میں اللہ کی طرف لوٹنے کا اعتراف ہے، جس میں موت کے بعد اٹھائے جانے ، حساب وکتاب، جزاء وسزا اور جنت ودوزخ سب کا اقرار شامل ہے، چنانچہ یہ کلمہ ایک مصیبت زدہ کا بہت بڑا سہارا ہے جس کی توفیق اللہ تعالی نے اپنے مومن بندوں کو نصیب فرمائی اور اس کے ذریعہ وہ ہر چھوٹی بڑی در پیش مصیبت میں مدد حاصل کرتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی راہ حق کے ان راہیوں کے اجر وثواب کو بیان کر رہا ہے: ﴿ أُوْلَٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوَٰتٞ مِّن رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٞۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُهۡتَدُونَ ﴾ "ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں"۔ ان صبر والوں اور إنا للہ وإنا إلیہ راجعون کی پابندی کرنے والوں کے لیے اللہ تعالی کی جانب سے تین انعامات ہیں ، پہلا انعام: ﴿ أُوْلَٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوَٰتٞ مِّن رَّبِّهِمۡ ﴾ "ان پر ان کے رب کی نوازشیں ہیں" یعنی ان کو اللہ کی جانب سے عفو ودر گذر، برکات اور دنیا وآخرت کی سرخ روئی حاصل ہے۔ دوسرا انعام: ﴿ وَرَحۡمَةٞۖ ﴾ "ان پر ان کے رب کی رحمتیں ہیں " یعنی اللہ تعالی ان کو ان کی پسند کی چیزیں عطا کرتا اور ناپسندیدہ اور نقصان دہ چیزوں سے بچاتا ہے ،اس میں دخول جنت بھی شامل ہے۔ تیسرا انعام: ﴿ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُهۡتَدُونَ ﴾ "اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں" یعنی اللہ کی ہدایت پر چلنے والے اور سعادت وکمالات کی توفیق پانے والے ہیں، کیوں کہ آزمائشوں کی حقیقت کو تسلیم کرتے

---

(۱) مسند احمد ۲/ ۲٤۷ حدیث نمبر (۳۷۱۲)

ہوئے ان پر صبر کرتے ہیں۔اس سے مصیبت کے وقت صبر اور (إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ) کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور یہ کہ اللہ تعالی یقینی طور پر مومنوں کو آزماتا ہے اور یہ آزمائشیں یا تو اس کے بلندئ درجات کا سبب ہوتی ہیں یا بطور عقاب وسزا تاکہ اس کی وجہ سے اس کے گناہ کی مغفرت ہو جائے ،لہذا سارا حکم اور اختیار اللہ تعالی ہی کا ہے چاہے اس کا حکم اور فیصلہ جیسا اور جس صورت میں بھی ہو۔

﴿إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ ٱلْبَيْتَ أَوِ ٱعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ ٱللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾﴾

ترجمہ:

"صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں ، اس لئے بیت اللہ کا حج و عمرہ کرنے والے پر ان کا طواف کر لینے میں بھی کوئی گناہ نہیں،اپنی خوشی سے بھلائی کرنے والوں کا اللہ قدردان ہے اور انہیں خوب جاننے والا ہے"۔

آیت کا سیاق یہاں سے تبدیل ہو رہا ہے جس میں سعی صفا و مروہ کا بیان ہے اور اس کا مقصد سعی کے تعلق سے مسلمانوں کے ایک اندیشے کو دور کرنا ہے ، کیوں کہ زمانہ جاہلیت میں بھی ان پہاڑوں کا طواف کیا جاتا تھا اور ان پر دو بت نصب تھے ، چنانچہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ ٱلصَّفَا وَٱلْمَرْوَةَ مِن شَعَآئِرِ ٱللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ ٱلْبَيْتَ أَوِ ٱعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ ٱللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ﴾

"صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں ، اس لئے بیت اللہ کا حج و عمرہ کرنے والے پر ان کا طواف کر لینے میں بھی کوئی گناہ نہیں،اپنی خوشی سے بھلائی کرنے والوں کا اللہ قدردان ہے اور انہیں خوب جاننے والا ہے"۔

آیت میں صفا و مروہ دو مشہور پہاڑ کے درمیان طواف کا بیان ہے،اس آیت میں دو امر کی نشاندہی کی گئی ہے، پہلی یہ کہ یہ دونوں پہاڑ اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے ہیں، یعنی آیت میں پہلے اس بات سے آگاہ کیا گیا کہ صفا اور مروہ اس کے دین کی ظاہری نشانیاں ہیں، دوسری یہ کہ زمانہ جاہلیت میں ان کی تعظیم کی وجہ سے ان کے طواف کے ناجائز ہونے کا جو اندیشہ تھا اس کو ختم کر دیا گیا۔اس کے بعد سعی اور حج وعمرہ

کے باہمی ربط کا بیان ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ تربوی ناحیے سے یہ بات بہت اہم ہے کہ پہلے جہل مرکب کو دور کرنے کی کوشش ہونی چاہیے تاکہ سامنے والا بات کو اس کے حقیقی مفہوم میں قبول کرے، جہل مرکب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کے علم یا معلومات کو اس کے صحیح مفہوم کے برعکس سمجھ رہا ہو۔

سعی صفا و مروہ کے متعلق بعض اذہان سے جاہلیت کے اندیشے کو ختم کرنے کے بعد اللہ تعالی نے یہ واضح کیا کہ یہ سعی حج اور عمرہ سے مربوط ہے، فرمایا: ﴿ فَمَنْ حَجَّ ٱلْبَيْتَ أَوِ ٱعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَن يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ "اس لئے بیت اللہ کا حج و عمرہ کرنے والے پر ان کا طواف کر لینے میں بھی کوئی گناہ نہیں" اسی لیے آیت میں حکم یوں بیان ہوا کہ جو صفا و مروہ کا طواف کرے اس پر کوئی گناہ نہیں، اور زمانہ جاہلیت میں ان جگہوں پر بت پرستی کی وجہ سے جو حرج محسوس کرتا ہے اس کے لیے اس میں حرج کی کوئی بات نہیں(۱) ۔ درحقیقت سعی بین الصفا والمروہ حج اور عمرہ کے ارکان میں سے ہے ، معلوم ہوا کہ آیات کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے اسباب نزول کی معرفت انتہائی اہم ہے، اسی طرح جن آیات کا تعلق امر و نہی سے ہو اگر ان کا کوئی سبب نزول ہے تو ان کی جانکاری بھی ضروری ہے۔

آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندے کے سارے معاملات میں حکم صرف اللہ رب االعالمین کا چلتا ہے ،اس لیے اگر ہوا پرست ، بدعتی اور کفار شعائر اللہ میں انحراف کا شکار ہو جائیں تو ان کے اس بگاڑ کی وجہ سے ان شعائر کا چھوڑنا لازم نہیں آتا، بلکہ اللہ تعالی کے حکم کے مطابق اس کا بجالانا واجب ہے تاکہ لوگ اس دین اسلام میں اس کی اصل حقیقت سے واقف ہو سکیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی نفلی حج اور عمرہ کرنے والوں کے حق میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿ وَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ ٱللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴾ "اپنی خوشی سے بھلائی کرنے والوں کا اللہ قدردان ہے اور انہیں خوب جاننے والا ہے"۔اس سے معلوم ہوا کہ نفلی حج اور عمرہ بھی آدمی کے حق میں خیر کثیر کا باعث ہے ، تطوع سے مراد جو فرض سے زائد انجام دیا جائے،اس میں خیر عظیم ہے جس کا اجر مومن کو اللہ تعالی کے پاس ملے گا،اللہ تعالی اپنے بندے کے عمل کا شکر ثواب عظیم دے کر ادا کرتا ہے، کیوں کہ بندے کے

---

(۱) آیت کے شان نزول وغیرہ کے تعلق سے تفسیر قرطبی اور تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں کافی تفصیل مذکور ہے جو خواہشمند ہو ان کی طرف رجوع کرسکتا ہے.

حق میں اللہ تعالی کے شکر گزار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو حسن عمل کا ثواب عطا فرمائے گا۔ آیت میں ترغیب دی گئی ہے کہ بندہ زیادہ سے زیادہ عبادات نافلہ کا اہتمام کرے اور صرف واجبات اور فرائض پر اکتفاء نہ کرے کیوں کہ ان نوافل کا عند اللہ اجر وثواب کرنے والے کے حق میں کافی خیر ہے، اللہ تعالی نے اسی اجر وثواب کی طرف انتہائی خوبصورت عبارت میں اشارہ کیا ہے: ﴿ فَإِنَّ ٱللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴾ " اللہ قدردان ہے اور انہیں خوب جاننے والا ہے"۔ یعنی جو نیکیاں تم جمع کر رہے ہو اللہ تعالی ان سے بخوبی واقف ہے، چنانچہ وہ ہرگز ضائع نہیں جائیں گی، بلکہ تمہارے لیے اس میں عظیم ثواب ہے۔ آیت کریمہ سے یہ فائدہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح نوافل پر اللہ تعالی بندوں کا شکر گزار ہے تو حسن اخلاق کا یہ تقاضا ہے کہ بندہ بھی ایسے شخص کا شکر گزار رہے جو اس کے لیے کوئی غیر ضروری بھلائی کرے۔

غور کریں! اللہ تعالی اپنے بندوں کے ساتھ کس قدر مہربان ہے، وہ ان سے کتنے عمدہ انداز میں اور حسن جزاء کے ساتھ مخاطب ہے ، بندوں کے ساتھ اللہ تعالی کا لطف و کرم لوگوں کے باہمی لطف و کرم سے کہیں زیادہ ہے، بلکہ ایک ماں کا اپنے بیٹے کے ساتھ جو لطف و کرم اور پیار ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ اللہ تعالی کا اس کے ساتھ ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلْنَا مِنَ ٱلْبَيِّنَٰتِ وَٱلْهُدَىٰ مِنۢ بَعْدِ مَا بَيَّنَّٰهُ لِلنَّاسِ فِى ٱلْكِتَٰبِ ۙ أُو۟لَٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ ٱللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ ٱللَّٰعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ وَأَصْلَحُوا۟ وَبَيَّنُوا۟ فَأُو۟لَٰٓئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ كُفَّارٌ أُو۟لَٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ ٱللَّهِ وَٱلْمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ ٱلْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿١٦٢﴾ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَٰحِدٌ ۖ لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلرَّحْمَٰنُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾ ﴾

ترجمہ:

"جو لوگ ہماری اتاری ہوئی دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم اسے اپنی کتاب میں لوگوں کے لئے بیان کرچکے ہیں، ان لوگوں پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے (۱۵۹)۔ مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں اور بیان کردیں تو میں ان کی توبہ قبول کرلیتا ہوں اور میں توبہ قبول کرنے والا

اور رحم کرنے والا ہوں۔(۱۶۰) یقیناً جو کفار اپنے کفر میں ہی مر جائیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے (۱۶۱)۔ جس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں ڈھیل دی جائے گی (۱۶۲)۔ تم سب کا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ بہت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے (۱۶۳)" ۔

آیات قرآنی کا سیاق تبدیل ہو کر ان آیات میں اہل کتاب کے طرز عمل اور برتاؤ کا مزید بیان ہو رہا ہے، تاکہ ان پر حجت قائم ہو یا ہدایت یاب ہو جائیں اور مسلمان ان کی روش سے سبق حاصل کریں۔ ﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلْنَا مِنَ ٱلْبَيِّنَٰتِ وَٱلْهُدَىٰ مِنۢ بَعْدِ مَا بَيَّنَّٰهُ لِلنَّاسِ فِى ٱلْكِتَٰبِ ۙ أُو۟لَٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ ٱللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ ٱللَّٰعِنُونَ ﴾ "جو لوگ ہماری اتاری ہوئی دلیلوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں باوجودیکہ ہم اسے اپنی کتاب میں لوگوں کے لئے بیان کر چکے ہیں، ان لوگوں پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہے"۔ مفسرین کہتے ہیں کہ آیت کا سیاق اگرچہ یہود کے بارے میں ہے، لیکن آیت کا حکم ہر کسی کے لیے عام ہے جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کو چھپائے، اللہ تعالیٰ بیان کر رہا ہے کہ جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی کتاب میں نازل کردہ دلائل وہدایات کو چھپاتے ہیں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے لعنت ہے۔ آیت میں ہدایت سے مراد وہ علم ہے جس سے دین کا قیام ہے اور جس کے ذریعہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی مراد تک رسائی کی ہدایت ملتی ہے۔

توجو لوگ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات کو چھپانے والے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے یعنی اللہ کی رحمت اور قربت سے دوری ہے، ایسے لوگوں پر لعنت کرنے والے فرشتے اور انسان اور اسی طرح دیگر مخلوقات سب کے سب لعنت بھیجتے ہیں، کیوں کہ وہ لوگوں کے لیے نفع بخش دلائل وہدایات ان سے چھپاتے ہیں، جن دلائل وہدایات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت تک رسائی اور اس کے منہیات وزواجر سے بچا جاسکتا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿ مِنۢ بَعْدِ مَا بَيَّنَّٰهُ لِلنَّاسِ فِى ٱلْكِتَٰبِ ۙ ﴾ میں کتاب سے مراد تمام آسمانی کتابیں ہیں، کیوں کہ لفظ کتاب اسم جنس ہے[1] (اور اسم جنس تمام افراد کو شامل ہوتا ہے)۔

---

(۱) تفسير قرطبي ۱۲۵/۲.

معلوم ہوا کہ کتمان علم سرے سے خطرناک ہے، اور جب لوگ اس کے محتاج ہوں تو اس کی خطرناکی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے، اور لوگوں کے پوچھنے پر کتمان علم اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے، چنانچہ علم کا اظہار اور لوگوں سے بیان کرنا ضروری ہے، اللہ کی رضا جس میں ہو اور جن سے اللہ تعالی ناراض ہوتا ہو انسان سب کچھ واضح طور پر بغیر کسی مجاملہ کے بیان کردے، کچھ چھپا کر کسی کی خوشنودی کا طالب نہ ہو اور اپنی یا کسی دوسرے کی مقصد برآری یا کسی دنیاوی مصلحت کے حصول کے لیے یا کسی کا تقرب پانے کے لیے یا ان کے علاوہ کسی بھی مقصد کے لیے جو اللہ کو پسند نہیں نصوص کو توڑ مروڑ کر نہ پیش کرے۔ پتہ چلا کہ علمائے دین کی ذمہ داریاں بڑی عظیم ہیں، اللہ تعالی ان کی مدد فرمائے، اس لیے اس عظیم دینی ذمہ داری کی وجہ سے علماء ربانی کا ساتھ دینا، حق پر ان کی مدد اور ان کا عزت واحترام کرنا ضروری ہے۔

اگر کتمان علم کا مرتکب اپنے گناہ اور فعل قبیح سے تائب ہو تو اللہ تعالی کی رحمت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے، چنانچہ ایسے لوگوں کے حق میں اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: ﴿ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُواْ وَأَصۡلَحُواْ وَبَيَّنُواْ ﴾ "مگر وہ لوگ جو توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں اور بیان کردیں" یہ تین شرطیں ہیں، پہلی شرط: جو غلط کام انجام دے رہے ہیں اس سے رجوع کرتے ہوئے توبہ کریں، اور اس توبہ کا تقاضا ہے کہ اس فعل سے رک جائیں، اور دوبارہ نہ کرنے کا عزم مصمم کریں۔ دوسری شرط: بگاڑ کی اصلاح، اس شرط کا تقاضا ہے کہ جس غلطی پر تھے اس کو علی الاعلان بیان کرتے ہوئے اصل حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کریں، اور جو بگاڑ اور فساد پھیلایا ہے اسے ختم کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کردیں اور حال ومستقبل میں اصلاحی کوششیں جاری رکھیں۔ تیسری شرط: ہر طرح کی تلبیس سے پاک بالکل واضح بیان۔ ﴿ فَأُوْلَٰٓئِكَ أَتُوبُ عَلَيۡهِمۡۚ ﴾ "تو میں ان کی توبہ قبول کرلیتا ہوں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی اپنے بندوں کے ساتھ بہت مہربان ہے، کیوں کہ گنہگار جب اپنی گناہ سے باز آکر گناہ کرنا چھوڑ دیتا ہے اور توبہ واستغفار کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کی توبہ کو قبول کرتا ہے، ایک گنہگار کے لیے اس سے بڑا خیر اور کیا ہو سکتا ہے کہ توبہ کرنے پر اللہ تعالی اس کی توبہ کو قبول کرلے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سماج اور معاشرہ کو بھی چاہیے کہ ایسے شخص کو جو انحرافات سے باز آچکا ہو قبولیت کی نگاہ سے دیکھیں، اور اس کو اس قدر اپنا بنالیں کہ گویا اس سے کوئی غلطی ہوئی ہی نہیں ہے ، اس کو اس کی گذشتہ غلطیوں کی وجہ سے عار نہ دلائیں، کیوں کہ اللہ تعالی اس کی توبہ قبول کر چکا ہوتا ہے۔

آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ سماجی معاملات میں عذر پیش کرنے والے کا عذر قبول کر لینا چاہیے اور ڈانٹ پھٹکار سے بچنا چاہیے۔ آیت سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوا کہ جس کسی سے کوئی غلطی سرزد ہو تو وہ اللہ تعالی سے اپنی غلطی سے توبہ کرتے ہوئے اپنے حال کی اصلاح کرے اگرچہ اس کی غلطی کی خبر کسی کو نہ ہو۔

اس کے بعد آیت کریمہ توجیہ اور کمال رحمت کے بیان کے ساتھ ختم ہوتی ہے: ﴿وَأَنَا ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ﴾ "اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں" یعنی اللہ تعالی تواب بھی ہے اور رحیم بھی ہے، چنانچہ توبہ کرنے والے کے حق میں اس کی رحمت اور معافی دونوں جمع ہوتی ہیں، یہ رحمت تائب کے ساتھ مزید فضل الہی ہے۔ اللہ کی ذات بڑی بابرکت اور فضل و کرم والی ہے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان لوگوں کے احوال بیان کر رہا ہے جنہوں نے کفر کو اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر بھی گئے : ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ وَمَاتُواْ وَهُمۡ كُفَّارٌ أُوْلَٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ لَعۡنَةُ ٱللَّهِ وَٱلۡمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلنَّاسِ أَجۡمَعِينَ ١٦١ خَٰلِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ ٱلۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنظَرُونَ﴾ " یقیناً جو کفار اپنے کفر میں ہی مر جائیں، ان پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ جس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں ڈھیل دی جائے گی"۔ آیت میں ان لوگوں کی حالت کا بیان ہے جنہوں نے اسلام کے مقابلے میں کفر اختیار کیا اور اپنے کفر پر مر بھی گئے - کفر سے اللہ کی پناہ- علامہ ابن سعدی رحمہ اللہ ﴿أُوْلَٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ لَعۡنَةُ ٱللَّهِ وَٱلۡمَلَٰٓئِكَةِ وَٱلنَّاسِ أَجۡمَعِينَ﴾ کی تفسیر کے ضمن میں فرماتے ہیں: جب ان کا کفر اس حد تک پہنچ گیا کہ ان کا وصف ثابت بن گیا تو ان پر لعنت کی صفت بھی ثابت اور لازوال ہو گئی، کیوں کہ حکم اپنے وجود اور عدم وجود کے اعتبار سے اپنی علت کے ساتھ چلتا ہے(۱)۔

---

(۱) تفسير ابن سعدي ۱۲۳/۱.

اس کے بعد اللہ تعالی نے ان کے عذاب کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے لیے دائمی عذاب ہے نہ تو اس میں کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ ہی ان کو کچھ مہلت دی جائے گی ، اس سے پتہ چلا کہ یہ دنیا توبہ اور رجوع الی اللہ کے لیے مہلت کی جگہ ہے، لیکن آخرت صرف دار الجزاء ہے۔

یہ اللہ تعالی کی جانب سے اپنے بندوں کے لیے آگاہی اور خوف دلانا ہے کہ کافروں کا ٹھکانہ جہنم ہے تاکہ اس واضح بیان کے بعد وہ خود کو بچائیں، نیز ممکن ہے انسان کے ذہن میں یہ بات آئے کہ ہو سکتا ہے اس کو قیامت کے دن کچھ مہلت اور چھوٹ مل جائے اور وہ دنیا میں لوٹ آئے اس لیے اللہ تعالی نے اس خیال ہی کو سرے سے ختم کر کے بالکل واضح اور قطعی حکم سنا دیا: ﴿وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ﴾" اور نہ انہیں ڈھیل دی جائے گی"۔

اس کے بعد بندوں پر سب سے اہم واجب کا بیان ہو رہا ہے یعنی کہ بندہ اپنے خالق حقیقی کو پہچانے، فرمایا: ﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ﴾ "تم سب کا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ بہت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے" ۔ آیت کریمہ میں اللہ تعالی کی اس صفت کا بیان ہے جس کی معرفت واعتقاد اور اس کے مفاہیم ودلالات کے مطابق عمل بندے پر واجب ہے، فرمایا: وہی تم سب کا الہٰ یعنی معبود ہے جس کی طرف تم اپنی عبادتوں میں متوجہ ہوتے ہو۔ اس سے اللہ تعالی کے علاوہ تمام معبودوں کا رد اور ان کی نفی ہو گئی۔ : ﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ﴾ "تم سب کا معبود ایک ہی معبود ہے "۔ آیت کے اس جزو میں اللہ تعالی کی وحدانیت کا بیان ہے۔ اور : ﴿لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ " اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں "۔ یہ جملہ نفی اور اثبات پر مشتمل ہے، یعنی اللہ تعالی کے سوا کوئی حقیقی معبود ہے ہی نہیں جس کی لوگ عبادت کریں۔ اس میں اللہ تعالی کے سوا تمام الہٰ و معبود کی نفی اور صرف اللہ تبارک وتعالی کے تنہا معبود ہونے کا اثبات ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بندہ کوئی بھی عبادت اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کسی کے لیے نہ کرے، کیوں کہ وہی رب وخالق اور کائنات میں تصرف کرنے والا ہے اور ہر وہ صفت جس سے خشیت وخشوع اور استعانت واستغاثہ مرتب ہو وہ سب اللہ تعالی کے لیے ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالی کا فرمان ہے: : ﴿هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ﴾" وہ بہت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے" یہ اللہ تعالی کی صفت رحمت ہے جس سے وہ متصف ہے اور اس

کی رحمت پوری کائنات کو شامل ہے، چنانچہ اللہ تعالی کی اپنے بندوں پر رحمت ہی ہے کہ اس نے ان کے لیے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں، اس نے اپنی رحمت سے ان کے لیے آسمان وزمین کو مسخر کردیا، اس کی رحمت ہی ہے کہ وہ اپنے بندوں کی توبہ کو قبول کرتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کافر کے کفر چھوڑنے پر اور جو لوگ اس کے لیے اولاد ہونے کا دعوی کرتے ہیں (اللہ تعالی ان کے افتراءات سے پاک ہے) اور ان کے علاوہ اللہ تعالی کے گنہگار بندے ان تمام کی توبہ اللہ تعالی قبول نہ کرتا، لہذا تمام تعریف اللہ تعالی کے لیے ہے جس کی رحمت ہر چیز کے لیے وسیع ہے۔

فرمان الٰہی ﴿ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلرَّحۡمَٰنُ ٱلرَّحِيمُ ﴾ "اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، وہ بہت رحم کرنے والا اور بڑا مہربان ہے" اس میں اس بات کی نفی ہے کہ اللہ تعالی کے سوا کوئی معبود ہو جو رحمن ورحیم جیسے اسماء وصفات سے متصف ہو، اس لیے اللہ تعالی کے علاوہ جن کی بھی عبادت کی جاتی ہے ان کے پاس رحمت کی وہ صفت نہیں ہو سکتی جس سے اللہ تعالی متصف ہے، اور جن اسماء وصفات سے اللہ تعالی متصف ہے ان سے ان کا متصف ہونا ممکن ہی نہیں۔ نتیجتا رحمن ورحیم جو کچھ دے سکتا ہے دوسرے میں اس کی استطاعت وطاقت نہیں۔ اسی طرح آیت کریمہ اللہ تعالی کی وحدانیت اور اس کے لیے اسم رحمن ورحیم کے اثبات پر مشتمل ہے، گویا کہ اس آیت سے توحید کی تینوں اقسام: توحید ربوبیت، توحید الوہیت اور توحید اسماء وصفات کا اثبات ہوتا ہے۔

﴿إِنَّ فِي خَلۡقِ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ وَٱخۡتِلَٰفِ ٱلَّيۡلِ وَٱلنَّهَارِ وَٱلۡفُلۡكِ ٱلَّتِي تَجۡرِي فِي ٱلۡبَحۡرِ بِمَا يَنفَعُ ٱلنَّاسَ وَمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مِن مَّآءٖ فَأَحۡيَا بِهِ ٱلۡأَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَآبَّةٖ وَتَصۡرِيفِ ٱلرِّيَٰحِ وَٱلسَّحَابِ ٱلۡمُسَخَّرِ بَيۡنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلۡأَرۡضِ لَأٓيَٰتٖ لِّقَوۡمٖ يَعۡقِلُونَ ١٦٤﴾

ترجمہ:

"آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات دن کا ہیر پھیر، کشتیوں کا لوگوں کو نفع دینے والی چیزیں کو لئے ہوئے سمندروں میں چلنا۔ آسمان سے پانی اتار کر، مردہ زمین کو زندہ کردینا، اس میں ہر قسم کے جانوروں کو پھیلا دینا، ہواؤں کے رخ بدلنا، اور بادل، جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں، ان میں عقلمندوں کے لئے قدرت الٰہی کی نشانیاں ہیں (۱۶۴)۔

اللہ تعالی اس آیت میں اپنے بندوں کی توجہ اپنی عظیم بادشاہت کی طرف مبذول کرارہاہے جن میں اس کی ربوبیت اور الوہیت پر دلالت کرنے والی دل فریب نشانیاں موجود ہیں، اور یہ کہ وہی ہر چیز کا خالق ومالک اور ان میں اپنی حکمت سے تصرف کرنے واا ہے، چنانچہ اللہ تعالی اپنے بندوں کو آگاہ کر رہا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کی چیزوں پر نظر دوڑائیں اور غور وفکر کریں یہ چھت نما آسمان کی بلندی اور اس کی وسعت ونزاکت، اس میں پھیلے ہوئے چلتے پھرتے اور ثابت ان گنت ستارے جنہیں شمار کرنے والے شمار نہیں کر سکتے ، ان تمام کو اتنی بے انتہا عمدگی اور جدت کے ساتھ کس نے تخلیق کیا؟ کیا وہ اس کائنات کا خالق نہیں ہے؟ کیا وہ اس کائنات کا رب نہیں ہے؟ روئے زمین پر نظر ڈالیں! اس کی پختگی، ڈھلان، بلند وبالا کوہستان، بحر وبر، نشیب وفراز ، آبادیاں اور اس میں بے شمار نفع بخش اشیاء، یہ سب کچھ اس انداز وکیفیت میں کس ذات نے مسخر کر رکھا ہے؟ کس نے اس میں راستے اور وادیاں بنائیں؟ کیا وہ کائنات کا خالق ومالک نہیں۔ مزید گردش لیل ونہار میں غور کریں کس نازک ترتیب کے ساتھ باہم دیگر آتے جاتے ہیں، ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی ایک دوسرے سے آگے پیچھے نہیں ہوتا، کبھی دن چھوٹا رات لمبی اور کبھی رات چھوٹی اور دن لمبا اور کبھی دونوں برابر ہو جاتے ہیں، کیا یہ اس ذات کی جدت تخلیق نہیں؟ کیا یہ تسخیر وحکم اسی ذات کی جانب سے نہیں؟ کیا اللہ تبارک وتعالی احسن الخالقین نہیں؟ ذرا فکر ونظر اور عقل وشعور سمندروں کی جانب موڑ کر دیکھیں! وہ مال ومتاع سے اور اناج غلوں سے بوجھل کشتیوں کو کس آسانی سے ادھر ادھر اٹھائے پھرتے ہیں ، لوگ ان کے ذریعہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں، کس نے سمندروں کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے؟ اور کس نے ان کی دوریاں متعین کی ہیں؟ اور کس نے خشکی سے ان سمندروں کی سطح کو اتار رکھا ہے، تاکہ پانی کے بہاو سے خشک حصہ سیلاب کا شکار ہو کر ڈوب نہ جائے؟ کیا یہ سب اسی اللہ کی باریک بینی اور رحمتوں کا نتیجہ نہیں جو لطیف ورحمن ورحیم ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی مزید بندے کی فکر کو ان چیزوں کی طرف متوجہ کر رہا ہے جنہیں وہ اپنی نگاہوں سے دیکھتا اور حواس سے محسوس کرتا اور جن کے نفع وضرر سے واقف ہے، یعنی آسمان وزمین کے پیچ مسخر بدلیاں، جن سے زمین اور انسانوں کی ضرورت اور بھلائی کے بقدر بارش نازل ہوتی ہے، پھر آہستہ

آہستہ بارش رک جاتی ہے اور ہوائیں انہیں دوسری جگہ لے کر چلی جاتی ہیں، اگر یہی بارش اللہ کی مقرر کردہ مقدار سے زیادہ ہونے لگے تو لوگ، کھیتیاں اور چوپائے سب ہلاک ہوجائیں، تو کون ہے ان کو ایک اندازے سے نازل کرنے والا؟ کیا یہ خالق کائنات کی قدرت کا کرشمہ نہیں؟ پھر اسی پانی سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اس پر گھاس پوس اور پودے اگ آتے ہیں اور زمین سرسبز وشاداب ہوجاتی ہے اور اللہ کی اس نعمت سے لوگ مسرور ومگن ہوجاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے چوپایوں کو پیدا کرکے روئے زمین پر پھیلادیا تاکہ لوگوں کی سواری، حسن وجمال اور کھانے پینے کا انتظام ہو۔

اسی طرح اللہ تعالی انسانی غور وفکر کا رخ ان ہواوں کی طرف کررہا ہے جو بدلیوں کو اٹھائے ادھر ادھر کرتے اور زمین کر گرد وغبار اڑاتے ظاہر ہوتی ہیں اور ان کی لطافت اور باریکی کی وجہ سے انسان اسے دیکھ بھی نہیں سکتا، البتہ جب وہ اس کے چہرے اور جسم سے ٹکراتی ہیں تو اس کی نرمی کو محسوس کرتا ہے، یا کسی چیز کو اٹھاتے اور حرکت دیتے یا کسی چیز کو اکھاڑ پھنکتے اور برباد کرتے دیکھائی پڑتی ہیں، یعنی انسان صرف اس کا اثر دیکھتا ہے اور خود اسے نہیں دیکھتا ، اللہ تعالی ان ہواؤں کو جیسے چاہتا ہے الٹتا پلٹتا ہے، کبھی رحمتیں لے آتی ہیں تو کبھی عذاب لے کر، کبھی بدلیوں کے درمیان بارش کا مژدہ سناتے ہوئے آتی ہیں، کبھی بادلوں کو بھگا کرلے جاتی ہیں، کبھی ان کو اکٹھا کرتی اور کبھی الگ اور الٹ پھیر کرتی ہیں، نیز یہ ہوائیں کبھی شمال کی جانب سے چلتی ہیں جنہیں (شامیہ) کہا جاتا ہے، اور کبھی یمن کی جانب سے۔ اسی طرح کبھی مشرق کی جانب سے چلتی ہیں جو (صبا) کہلاتی ہیں، اور کبھی پچھم کی جانب سے جنہیں (دبور) کہا جاتا ہے، تو کون ہے جس نے ان ہواؤں کو مسخر کررکھا ہے اور ان کیفیات اور جوانب سے چلارہا ہے؟ کیا وہ اس کائنات کا مدبر اور خالق نہیں ہے؟ کیا وہی معبود برحق نہیں؟ کیا وہی رحمن ورحیم نہیں؟ چنانچہ اس کی ہر مخلوق اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہی اللہ تبارک وتعالی، خالق اور ہر شئے کی تدبیر کرنے والا ہے۔

آیت کا اختتام اللہ تعالی کے اس فرمان سے ہوتا ہے: ﴿ لَآيَـٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴾ "(ان میں) عقلمندوں کے لئے (قدرت الٰہی کی) نشانیاں ہیں"۔ یعنی جن چیزوں کا آیت کریمہ میں ذکر ہوا ان تمام میں غور وفکر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالی کی ذات پر دلالت کرنے والی بے شمار دلیلیں اور نشانیاں ہیں ، جو اپنی

عقل کا استعمال کرتا ہے وہ اسے اچھی طرح سمجھتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لیے اپنے ارد گرد کی اشیاء میں غور و فکر کرنا کافی اہم ہے، اس سے اللہ تعالی پر ایمان اور اس کی فرمابرداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ تعلیمی مناہج و دروس اور دعوت کے اسالیب و وسائل ایسے امور پر مشتمل ہونے چاہئیں جن میں تمام مخلوقات کی تخلیق کے متعلق اللہ تعالی کے ابداع پر فکر و تدبر کار فرما ہو۔ جن میں لوگون کے لیے نصیحت اور اللہ تعالی کی وحدانیت و ربوبیت کے دلائل ہوں کہ وہی خالق اور ہر چیز کا رب اور مالک کل ہے۔

﴿ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ ٱللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ ٱللَّهِ ۖ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ ۗ وَلَوْ يَرَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓا۟ إِذْ يَرَوْنَ ٱلْعَذَابَ أَنَّ ٱلْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ إِذْ تَبَرَّأَ ٱلَّذِينَ ٱتُّبِعُوا۟ مِنَ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوا۟ وَرَأَوُا۟ ٱلْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ ٱلْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوا۟ لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا۟ مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ ٱللَّهُ أَعْمَٰلَهُمْ حَسَرَٰتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُم بِخَٰرِجِينَ مِنَ ٱلنَّارِ ﴿١٦٧﴾ ﴾

ترجمہ:

"بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیے ، اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں، کاش کہ مشرک لوگ جانتے جب کہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر (جان لیں گے) کہ تمام طاقت اللہ ہی کو ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (تو ہر گز شرک نہ کرتے)(۱۶۵)۔جس وقت پیشوا لوگ اپنے تابعداروں سے بیزار ہو جائیں گے اور عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور کل رشتے ناتے ٹوٹ جائیں گے (۱۶۶)۔اور تابعدار لوگ کہنے لگیں گے، کاش ہم دنیا کی طرف دوبارہ جائیں تو ہم بھی ان سے ایسے ہی بیزار ہو جائیں جیسے یہ ہم سے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال دکھائے گا ان کو حسرت دلانے کو، یہ ہر گز جہنم سے نہ نکلیں گے (۱۶۷)"۔

سابقہ آیات کریمہ جو کہ اللہ تعالی کی عظیم بادشاہت اور اس کی الوہیت و ربوبیت کے دلائل و براہین پر مشتمل ہے اور یہ کہ اللہ تعالی ہی ہر چیز کا خالق و مالک اور تصرف کرنے والا ہے یہ سب کچھ اللہ

تعالی نے بالکل واضح طور پر بیان کر دیا اس کے باوجود اس بیان اور وضاحت کے بعد لوگوں کی ایک بڑی تعداد اللہ کا انکار اور اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتی ہے: ﴿ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ ٱللَّهِ أَندَادًا ﴾ " بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہراتے ہیں"۔ یعنی اللہ تعالی کی وحدانیت وربوبیت اور الوہیت کے سارے دلائل دیکھنے اور جاننے کی باوجود بعض لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، چنانچہ عبادت کے سارے اموران کے لیے انجام دیتے ہیں مثلا: امید ورجاء، خوف وخشیت، دعا واستغاثہ وغیرہ، گویا کہ وہ شرکاء اللہ تعالی کے مثل اور اس جیسے ہیں، یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر انہی شرکاء کی عبادت کرتے ہیں اور انہی معبودان باطلہ سے محبت کرتے ہیں، اور وہ ان معبودات سے اتنی محبت کرتے ہیں جتنی کہ اللہ تعالی سے کرتے ہیں۔ ﴿ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ ٱللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ ٱللَّهِ ﴾ "بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کے یہاں غور وفکر، تجزیہ اور نتیجہ اخذ کرنے میں خلل واقع ہوتا ہے، جس کا سبب ہے دوسروں کی اندھی تقلید، یا غلط تربیت اور پرورش یا اللہ تعالی کی عطا کردہ قوت عقل سے بے اعتنائی اور عدم استعمال، جس عقل کا استعمال کر کے وہ اس نتیجہ پر پہنچ سکتا تھا کہ وہ اللہ تعالی کی ربوبیت والوہیت کا اعتراف کرتا۔ لیکن وہ اس کا استعمال نہیں کرتا، پھر دھیرے دھیرے معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ ان معبودان باطلہ، شجر وحجر اور قبر مزارات سے خوف کھانے لگتا ہے اور پھر ان سے ایسی شدید محبت کرنے لگتا ہے جیسی محبت اللہ تعالی سے کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تربیت اور دعوت کے میدان میں لوگوں کی تشفی اور تسلی کے لیے افکار ونظریات کا مناقشہ اور بحث وتمحیص اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ منحرف کا انحراف اور اس کی غلطی واضح کی جاسکے۔

آیت سے پتہ چلا کہ جب ساری مخلوق اللہ تعالی کی غلام ہے تو کیسے ایک مخلوق اپنی ہی جیسی دوسری مخلوق کو اللہ تعالی کا شریک اور اپنا معبود بناتی ہے اور اپنے اس خالق کو چھوڑ دیتی ہے جس نے کائنات اور اس میں موجود اس کی وحدانیت پر دلالت کرنے والی واضح نشانیوں کی طرف اس کی توجہ مبذول کرائی، اور جب ہر مخلوق ناقص الارادہ ہے تو کیوں کر ایک ناقص الارادہ مخلوق سے دوسری مخلوق خود سے شر سے بچاؤ

اور خیر کے حصول کی طلب رکھتی ہے ، حتی کہ سارے انبیاء کرام اللہ تعالی کے بندے ہیں، اللہ تعالی سورہ اعراف میں اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمارہا ہے: ﴿قُل لَّآ أَمۡلِكُ لِنَفۡسِي نَفۡعٗا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُۚ وَلَوۡ كُنتُ أَعۡلَمُ ٱلۡغَيۡبَ لَٱسۡتَكۡثَرۡتُ مِنَ ٱلۡخَيۡرِ وَمَا مَسَّنِيَ ٱلسُّوٓءُ﴾ [سورة الأعراف:۱۸۸]۔ "آپ فرمادیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا، مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ نے چاہا اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت منافع حاصل کرلیتا اور کوئی نقصان مجھے نہ پہنچتا"۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی ذات کے نفع اور نقصان کے مالک نہیں ہیں تو آپ سے کم مقام والی دوسری مخلوقات اپنے یا دوسرے کے نفع ونقصان کی مالک کیسے ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان کی محبت اور اللہ تعالی سے مومنوں کی محبت کے درمیان فرق کو بیان کررہا ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَشَدُّ حُبّٗا لِّلَّهِ﴾ "اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں "۔ لفظ (أَشَدُّ) سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مومن اللہ تعالی کی محبت سے زیادہ کسی چیز سے محبت نہیں کرتے، چنانچہ جو چیز اللہ تعالی سے مقام ومرتبہ میں کم ہو وہ محبت میں بھی کم ہوگی۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالی اور اس کی شریعت وعبادت سے محبت اللہ تعالی کی اطاعت کا حصہ اور ایمان کی علامت ہے، اس لیے بندے کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالی کی نافرمانی اور ناقص عبادت کو ناپسند کرے، اور اس کی عبادت کا شوقین ہو، کیوں کہ جو کوئی کسی چیز سے محبت کرتا ہے وہ اس کا مشتاق ہوتا ہے اور جو اللہ تعالی سے محبت کرتا ہے وہ اس کی طاعت کو بھی پسند کرتا اور اس کی عبادت میں کوتاہی اور نافرمانی سے شرمندہ ہوتا ہے ، کیوں کہ وہ نہیں چاہتا کہ اللہ تعالی اسے غیر پسندیدہ حالت میں دیکھے۔

محبت الٰہی کا تقاضا ہے کہ مومن لوگ اللہ تعالی کو شرک اور نقائص سے پاک سمجھتے ہوئے اس کی تعظیم کریں اور اسی پر توکل اور لالچ وطمع اور خوف وڈر سے اسی کو پکاریں، اس کی محبت دلوں پر ایسی غالب ہو کہ کسی چیز کی محبت اللہ تعالی کی محبت سے بڑھ کر نہ ہو، اسی کے فریادی ہوں، اسی سے التجا کریں، اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

اللہ تعالی کا فرمان ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ "اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں"۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے کہ ایک مسلمان جب اپنے عزم وارادہ کو ٹوٹتے دیکھتا ہے تو اس کے ذریعہ اسے مستحکم کرتا ہے۔ جب اس کے سامنے دو اختیارات ہوتے ہیں تو وہ وہی اختیار کرتا ہے جس میں فرمان الٰہی ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ کارفرما ہو۔ جب دھوکے اور بہکاوے کی گھڑی ہو تو یہی فرمان ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ اس کے تقویت کا باعث بنتا ہے، جب عبادت کی ادائیگی میں طبیعت کمزور پڑنے لگے تو یہی آیت اسے دوبارہ اٹھا کھڑا کرتی ہے، خواہشات جب اللہ تعالی کی محرمات کی طرف لپکنے لگیں تو ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ کے ذریعہ اپنا بچاؤ کرتا ہے، اگر کوئی فتنہ آن پڑے تو اسے دور کرنے کے لیے اسی آیت کا سہارا لیتا ہے، نگاہیں اگر محرمات کی طرف بڑھنے لگیں تو ارشاد باری ﴿وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ درمیان میں حائل ہو جاتا ہے، افکار اگر منتشر ہو جائیں تو یہی ہدایت نامہ اسے حق کی طرف واپس لاتا ہے، غرض یہ کہ کوئی بھی انحراف اور بگاڑ ہو بندہ اللہ تعالی ہی کی مدد سے اس انحراف و بگاڑ کے خلاف غالب ہوتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی بیان کر رہا ہے کہ شرک ظلم ہے : ﴿وَلَوْ يَرَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓاْ إِذْ يَرَوْنَ ٱلْعَذَابَ﴾ "کاش کہ مشرک لوگ جانتے جب کہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر (جان لیں گے)"۔ اللہ تعالی نے شرک کو ظلم سے تعبیر کیا ہے، کیوں کہ مشرک شرک کر کے خود پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے، اور اس لیے بھی کہ شرک اس کے اندرون کی ظلمت اور تاریکی کا ترجمان ہے اور مشرک کو نور سے محروم کر دیا جاتا ہے، چنانچہ مشرکین جو کہ اپنی کرتوت کی وجہ سے شرک کی تاریکیوں میں جا پڑے ہیں اگر عذاب الٰہی کو ابھی جان لیتے جو کہ عذاب الٰہی دیکھنے بعد جانیں گے تو کبھی شرک نہ کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ شرک مشرک کے لیے ایسی تاریکی ہے جو اسے نور توحید اور عبادتوں سے روکے رکھتی ہے جن سے دل روشن و مطمئن ہوتے ہیں۔

اسی کے بالمقابل شرک مشرک کے لیے عذاب و سزا کا سبب ہے اسی لیے اللہ تعالی نے اپنی محبت کے متعلق لوگوں کے مختلف احوال کے ذکر کے بعد مشرکین کے عذاب کا ذکر کیا: ﴿وَلَوْ يَرَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓاْ إِذْ يَرَوْنَ ٱلْعَذَابَ أَنَّ ٱلْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا وَأَنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلْعَذَابِ﴾ " کاش کہ مشرک لوگ

جانتے جب کہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر (جان لیں گے) کہ تمام طاقت اللہ ہی کو ہے اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (تو ہر گز شرک نہ کرتے)"۔ یہ بہت ہی خطرناک قلب وجگر کو جھنجھوڑ دینے والی دھمکی اور وعید ہے، چنانچہ مشرکین وکفار جب عذاب الٰہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو اس وقت ان کو یقین ہوگا کہ تمام طاقت اللہ کی ہے ،آیت(أَنَّ ٱلْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا) میں لفظ (جمیعا) کی تعبیر اس لیے استعمال ہوئی ہے تاکہ یہ پتہ ہو جائے کہ مکمل طاقت صرف اللہ تعالی کے لیے ہے ،اور رہی انسانی قوت وطاقت تو وہ ضعیف اور ناقص ہے مکمل نہیں، نیز انسانی معبودوں کی قوت بھی کافی کمزور اور ضعیف ہے مکمل اور پوری نہیں،اس لیے انسان حیلہ بہانے سے اپنے معبودوں سے راہ فرار اختیار کرنے اور پیچھے ہٹنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، لیکن جس کے پاس مکمل قوت ہو اس کے سامنے یہ سب کچھ کر سکتا اور نہ اس کی طاقت سے اپنی جان چھڑا سکتا ہے۔ ﴿وَلَوْ يَرَى ٱلَّذِينَ ظَلَمُوٓا۟ إِذْ يَرَوْنَ ٱلْعَذَابَ أَنَّ ٱلْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا﴾" کاش کہ مشرک لوگ جانتے جب کہ اللہ کے عذاب کو دیکھ کر (جان لیں گے) کہ تمام طاقت اللہ ہی کو ہے "۔

مشرک اور مومن دونوں کے مابین حب الٰہی کے موازنے اور وصف بیانی کے بعد اس وعید کے لانے کا مقصد ارشاد وتوجیہ اور خوف دلانا ہے،تاکہ سننے والا یا تو راہ راست کی طرف لوٹ آئے یا پھر مذکورہ آیت میں جس عذاب کی وعید سنائی گئی ہے اس کے لیے تیار رہے ،اس وعید ربانی سے ان کو معلوم ہو گیا کہ اگر وہ اسی طرح شرک میں پڑے رہے اور باز نہیں آئے تو انتہائی سخت اور ہولناک عذاب ان کا انتظار کر رہا ہے، جس کی شدت کی تاب وہ نہیں لا سکیں گے۔

اس کے بعد کی آیات پیروکار اور ان کے بڑوں اور پیشواؤں کی حالت زار کے سیاق میں ہیں، فرمایا: ﴿إِذْ تَبَرَّأَ ٱلَّذِينَ ٱتُّبِعُوا۟ مِنَ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُوا۟﴾ جس وقت پیشوا لوگ اپنے تابعداروں سے بیزار ہو جائیں گے "۔ چنانچہ فرشتے اپنے عبادت گزاروں سے ،اور انبیاء ورسول اور صالحین قبر پرستوں سے اعلان براءت کر دیں گے، جیساکہ سورہ مائدہ میں عیسی علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ ٱللَّهُ يَـٰعِيسَى ٱبْنَ مَرْيَمَ ءَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ ٱتَّخِذُونِى وَأُمِّىَ إِلَـٰهَيْنِ مِن دُونِ ٱللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَـٰنَكَ مَا يَكُونُ لِىٓ أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِى بِحَقٍّ﴾ [سورة المائدة:١١٦]۔ "اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ اللہ

تعالیٰ فرمائے گا اے عیسیٰ بن مریم! کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی علاوہ اللہ کے معبود قرار دے لو! عیسیٰ عرض کریں گے کہ میں تو تجھ کو منزہ سمجھتا ہوں، مجھ کو کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کو کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں"۔

چنانچہ اللہ تعالی کے علاوہ جن لوگوں کی عبادت کی جاتی ہے انہوں نے کبھی لوگوں سے اپنی عبادت کرنے کا مطالبہ نہیں کیا، اللہ تعالی کے عدل وانصاف کا یہی تقاضا ہے کہ جن لوگوں کی ان کی مرضی کے بغیر عبادت کی جائے وہ لوگ اپنی براءت کا اظہار کردیں تاکہ ان کی اپنی کرتوتوں کی وجہ سے ان پر اتمام حجت ہو جائے: ﴿وَرَأَوُاْ ٱلۡعَذَابَ وَتَقَطَّعَتۡ بِهِمُ ٱلۡأَسۡبَابُ﴾ "اور عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور کل رشتے ناتے ٹوٹ جائیں گے"۔ یعنی وہ عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور سارے حیلے بہانے، دلیلیں اور چھٹکارے کے وسائل وذرائع ختم ہو جائیں گے اور جہنم سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا ایسے ہی یہ مشرکین کہیں گے: ﴿وَقَالَ ٱلَّذِينَ ٱتَّبَعُواْ لَوۡ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنۡهُمۡ كَمَا تَبَرَّءُواْ مِنَّا﴾ "اور تابعدار لوگ کہنے لگیں گے، کاش ہم دنیا کی طرف دوبارہ جائیں تو ہم بھی ان سے ایسے ہی بیزار ہو جائیں جیسے یہ ہم سے ہیں"۔ اس وقت یہ مشرکین دوبارہ دنیا میں لوٹ جانا چاہیں گے تاکہ توحید الہی کے پرستار بن جائیں، لیکن جب عذاب آنکھوں کے سامنے ہوگا تو اس وقت شرک وکفر اور غیر اللہ کی عبادت پر سوائے حسرت وافسوس اور ندامت وشرمندگی کے کوئی چارہ نہیں ہوگا ﴿كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ ٱللَّهُ أَعۡمَٰلَهُمۡ حَسَرَٰتٍ عَلَيۡهِمۡۖ وَمَا هُم بِخَٰرِجِينَ مِنَ ٱلنَّارِ﴾ "اسی طرح اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال دکھائے گا ان کو حسرت دلانے کو، یہ ہرگز جہنم سے نہیں نکلیں گے"۔ ان آیات کے اختتام میں شرک کے انجام کو بالکل وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے تاکہ ہر مشرک اس سے متنبہ اور آگاہ ہو جائے اور جو کفر کی حالت میں مر جائے اس کے لیے عذاب الہی پر بطور حجت ہو۔ بے شک یہ ایک کافر کے لیے سب سے بڑی حسرت ہوگی جس کا اس کو سامنا ہوگا، اس لیے یہ آیات قرآنیہ اللہ تعالی کی جانب سے بہت عظیم نصیحت ہیں ، اب اگر کوئی اس قرآن اور اس کی نصیحتوں سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو پھر اور کس چیز سے نصیحت پکڑے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ہم کو شرک وکفر اور گناہوں سے محفوظ رکھے اور اپنی رضامندی کے اعمال کی ہدایت وتوفیق اور ان پر ثبات قدمی عطا کرے۔

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ كُلُواْ مِمَّا فِى ٱلْأَرْضِ حَلَـٰلًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُواْ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيْطَـٰنِ ۚ إِنَّهُۥ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٦٨﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِٱلسُّوٓءِ وَٱلْفَحْشَآءِ وَأَن تَقُولُواْ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾﴾

ترجمہ:

"لوگو! زمین میں جتنی بھی حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انہیں کھاؤ پیو اور شیطانی راہ پر مت چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (۱۶۸)۔ وہ تمہیں صرف برائی اور بے حیائی کا اور اللہ تعالیٰ پر ان باتوں کے کہنے کا حکم دیتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں (۱۶۹)"۔

اللہ تعالیٰ تمام انسانوں سے ان نعمتوں کا تذکرہ کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم ورحمت کے نتیجہ میں زمین سے اگتی ہیں، آیت کریمہ کے جزء سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا رزق مومن وکافر سب کے لیے برابر ہے، ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ﴾ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کی دلیل ہے، اور یہ کہ وہی سب کو روزی فراہم کرتا ہے، اسی نے اپنی رحمت وقدرت اور حکمت بالغہ سے زمین کو اس لائق بنایا کہ انسانی ضروریات کے مطابق ہر طرح کی اشیائے خوردنی اگائے، یہاں پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو زمینی پیداوار سے کھانے پینے کی رہنمائی فرمائی جس کا مطلب یہ ہوا کہ زمین کی پیداوار اپنے انواع واقسام اور مقدار کے اعتبار سے انسانی ضرورتوں کے عین موافق ہے، یہ چیز ہمارے لیے بہت سارے ایسے سوالات کا سبب بنتی ہے جو ہمیں ایمان لانے پر مجبور کرتے ہیں۔

کون ہے جس نے انسانی ضرورتوں کے لحاظ سے مقدار اور انواع ہر دو اعتبار سے زمینی پیداوار کا تناسب متعین کیا اور اس زمین کے اندر سے یا اس کے اوپر اتنی چیزیں عطا کیں جو انسانی ضرورتوں کو بخوبی پورا کر سکیں؟ وہ کونسی ذات ہے جس نے بالکل خالی زمین سے بے شمار درخت اور گھاس پوس اگائے جو شکل اور حجم میں ایک دوسرے سے الگ الگ اور سب کے پتے اور پھل بھی مختلف ہیں؟ اور لذتیں بھی میل نہیں کھاتیں، کچھ کھٹے ہیں تو کچھ میٹھے، لذت کی مقدار بھی کم زیادہ ہے، حالانکہ سب کے سب ایک ہی زمین سے نکلتے اور ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں؟ یہ ساری چیزیں انسانی فکر کو یہ سوال کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ کس نے زمین سے ان ساری چیزوں کو نکالا اور وہ بھی اتنے سلیقے سے؟ ضرور کوئی انتہائی قوت وقدرت اور حکمت ورحمت کا مالک ان کا خالق ہے، جس نے ایک ہی سرزمین سے اتنے انواع واقسام

کی اشیاءخوردنی لوگوں کے لیے پیدا کیں، یقیناایسی ذات پر ایمان لانا اسی کی عبادت اور توحید واجب ہے، اوراس کا کوئی ساجھے دار نہیں۔ اللہ تعالی نے اس کے کھانے کے حکم کو لفظ (حلال) سے تعبیر کیا ہے جو کہ حرام کی ضد ہے ، کسی چیز کے حلال وحرام کا حکم وہی دیتا ہے جو اس کا مستحق ہو، اس میں اللہ تعالی کی طرف سے اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ اس رزق کا نکالنے اور اگانے والا صرف اللہ تبارک وتعالی ہے جس نے اس رزق کو تمہارے لیے حلال کیا، نیز اسے پاکیزہ بھی بنایا جس میں کوئی خرابی نہیں، لہذا بلا شک وشبہ اس کی ان نعمتوں کے فضل واحسان کے بدلے میں انسان پر اللہ تعالی کا شکر بجالانا واجب ہوتا ہے، چنانچہ ہم اللہ تعالی کی حمد وثنا کرتے ہیں اس کی ان جلیل القدر اور عظیم نعمتوں پر۔

ان نعمتوں سے استفادہ کے اصلا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں ان نعمتوں کو حرام طریقے سے نہیں کھانا ہے ، جیسے چوری، غصب اور حرام طریقے سے لین دین کے ذریعہ حاصل کیا ہوا رزق وغیرہ۔ اور ان کے پاکیزہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ویسے ہی پاکیزہ حالت میں استعمال کیا جائے، اس حلال اور پاکیزہ کو حرام اور خبیث میں تبدیل نہ کیا جائے، جیسے کہ کوئی چیز حلال وطیب سے بدل کر حرام وخبیث نشہ آور شراب بنادی جائے یا ان میں ایسی چیز کی ملاوٹ کردی جائے جس سے وہ کسی بھی طرح سے نقصان دہ ہو جائے۔

اس نعمت کے بیان کے بعد ایک دوسری عظیم نعمت سے آگاہ کیا جارہا ہے، وہ ہے تمام بنی نوع انسان کے دشمن کی پہچان کرانا ،فرمایا: ﴿وَلَا تَتَّبِعُواْ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيۡطَٰنِۚ إِنَّهُۥ لَكُمۡ عَدُوّٞ مُّبِينٌ﴾ "اور شیطانی راہ پر مت چلو ، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے"۔ یعنی وہ تمام بنی نوع انسان کا بالکل کھلا ہوا واضح دشمن ہے جس چیز کا بھی حکم دیتا اور جن شہوات وشبہات کو خوبصورت شکل میں پیش کرتا ہے ان تمام امور میں تمام لوگوں سے اس کی دشمنی ڈھکی چھپی نہیں ، وہ مومنوں کا دشمن ہے، کیوں کہ وہ برائی کو مزین کرتا ہے اور مومنوں کے دلوں میں غلط وسوسے ڈالتا ہے، جیسے کہ اطاعت کے کاموں میں ٹال مٹول اور تاخیر کرانا یہاں تک وہ اطاعت کا کام چھوٹ جائے یا اس کا وقت نکل جائے، اسی طرح شیطان کافروں کا بھی دشمن ہے ، کیوں کہ وہ ایسے شبہات بھڑکاتا ہے جو ان کافروں کو اتباع حق سے روک رکھتے ہیں، اور ان کے لیے شہوات کو خوب خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے جس سے وہ اسی میں غرق ہو جاتے ہیں اور

اپنے شکوک وشبہات کی بنا پر حق کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتے ، اسی لیے اللہ تعالی نے شیطان کے خطوات یعنی اس کے طریقوں کی سے منع کر دیا ہے۔ لفظ (خطوات) کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بتدریج یکے بعد دیگرے چالیں چلتا ہے ، انسان جب اس کی ایک ڈگر کو اپنا لیتا ہے تو اس کو دوسرے ڈگر کی طرف کھینچ لاتا ہے، یہاں تک کہ اسے فلاح وبہبود اور نجات سے بہت دور کر کے ناگوار مقام تک پہنچا دیتا ہے: ﴿إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوٓءِ وَٱلْفَحْشَآءِ﴾ "وہ تمہیں صرف برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے"۔ یہ عطف الخاص علی العام کے باب سے ہے، کیوں کہ (السوء) میں ہر وہ کام شامل ہے جو انسان کے لیے برا ہو، اور (الفحشاء) انتہائی درجے کے قبیح گناہ کو کہتے ہیں، جیسے قتل، شراب نوشی، زناکاری اور بہتان تراشی وغیرہ، گویا عطف الخاص علی العام توضیح وبیان کا ایک اسلوب ہے جس کا مقصد یا تو مزید وضاحت وتنبیہ اور اس خاص کی طرف ذہنی توجہ مبذول کرانا ہوتا ہے یا مخاطب سے اس لفظ عام میں خاص کے عدم شمول کے احتمال کو ختم کرنا رہتا ہے، نیز خاص کا ذکر کر کے اس کی اہمیت بھی بتانا مقصود ہوتا ہے۔

شیطان کی سب سے سخت اور خطرناک چالوں میں سے ہے کہ وہ اللہ پر جھوٹ اور افتراء کا حکم دیتا اور مزین کرتا ہے، فرمایا﴿وَأَن تَقُولُوا عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ "اور (وہ تمہیں) اللہ تعالی پر ان باتوں کے کہنے کا حکم دیتا ہے جن کا تمہیں علم نہیں"۔ یعنی اللہ تعالی پر بغیر علم کے جھوٹ باندھنے کا، معلوم ہوا کہ جو کوئی اللہ تعالی پر بغیر علم ومعرفت کے کوئی بات کہتا ہے تو وہ شیطان کی راہ پر چلنے والا ہے، اور شیطان نے اسے اپنا شکار بنا کر اسے ایک ممنوع ومحذور اور محرم کام میں پھنسا ڈالا ہے، اس لیے انسان خود کو اللہ تعالی پر بلا علم افتراء پردازی سے بچائے رکھے اور ایسا نہ ہو کہ اپنی من مانی حلال وحرام اور عبادات واحکام میں بدعات ایجاد کرے اور شیطان بھی برائی کو خوب مزین کر کے اسے مزید تقویت پہنچائے، اس سے معلوم ہوا کہ علمی برتری دیکھانا اور عقل کو نقل یعنی نصوص شرعیہ پر مقدم کرنا اور اوہام وخیالات اور ظن وگمان کو بنیاد بنا کر اللہ تعالی پر جھوٹ باندھنے کی جرأت کرنا کافی خطرناک عمل ہے۔ شیطان نے تو انسان کو گمراہ کرنے کا وعدہ لے رکھا ہے، جیسا کہ سورہ اعراف میں اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَٰطَكَ ٱلْمُسْتَقِيمَ﴾ [سورة الأعراف:١٦]۔ "میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا"۔ یہ اللہ تعالی کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس نے ہم کو ہمارے پوشیدہ دشمن سے آگاہ کر دیا

،اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہو سکتی ، کیوں کہ اگر اللہ تعالی ہم کو اس سے آگاہ نہ کرتا تو اس کی خفیہ خصوصیات سے ہم ہر گز واقف نہ ہو پاتے۔ اس لیے اس نعمت کا ہم سے یہ تقاضا ہے کہ ہم شکر الہی کے ساتھ اس شیطان سے خود کو دور رکھیں۔

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾﴾

ترجمہ:

"اور ان سے جب کبھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالی کی اتاری ہوئی کتاب کی تابعداری کرو تو جواب دیتے ہیں ہم اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا، گو ان کے باپ دادے بے عقل اور گم کردہ راہ ہوں (١٧٠)۔ کفار کی مثال ان جانوروں کی طرح ہے جو اپنے چرواہے کی صرف پکار اور آواز ہی سنتے ہیں (سمجھتے نہیں) وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں، انہیں عقل نہیں (١٧١)"۔

شیطانی ہتھکنڈوں اور چالوں اور ان سے بچاؤ کے بیان کے بعد اللہ تعالی ان کفار و مشرکین کے احوال بیان کر رہا ہے جو واضح اور روشن ہدایات و دلائل آجانے کے باوجود کفر و شرک پر مصر ہیں، اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ یہ ہمارے آباء واجداد کی روایت رہی ہے اس لیے ہم بھی ان ہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں، ارشاد باری ہے: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا﴾ "اور ان سے جب کبھی کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالی کی اتاری ہوئی کتاب کی تابعداری کرو تو جواب دیتے ہیں ہم اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا"۔ چنانچہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ لائے ہوئے روشن دلائل کے مقابلے میں اپنے گمراہ اور جاہل آباء واجداد کے کارناموں کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جہل کی بنیاد پر دین کی اتباع انتہائی ہلاکت خیز ہے، نیز محض اشیاء محسوسہ کی سمجھ ہونا (جس کو عقل ادراک سے تعبیر کرتے ہیں) انسان کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کے صحیح اور غلط کی پرکھ و سمجھ بھی ضروری ہے ، کیوں کہ عقل ادراک جنون کی ضد ہے، اور اس کے ذریعہ انسان اشیاء کے حجم، رنگ اور لمبائی چوڑائی وغیرہ کو جان سکتا ہے، اور اس طرح کی عقل تو

مسلم وکافر ہر کسی کے پاس ہوتی ہے، البتہ عقل رشد جس سے صحیح وغلط اور حق و باطل کی پرکھ ہوتی ہے ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی، اور انسان حق کی معرفت اور تلاش میں اس عقل رشد کا استعمال نہیں کرتا تو خود کو ہلاک کر بیٹھتا ہے اور پھر تباہی اس کا ٹھکانہ ہوتی ہے ، آیت کریمہ ﴿أَوَلَوْ كَانَ ءَابَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْـًٔا وَلَا يَهْتَدُونَ﴾ "گوان کے باپ دادے بے عقل اور گم کردہ راہ ہوں" ۔سے ہم کو اسی بات کا اشارہ ملتا ہے، اور آیت میں صیغہ استفہام بطور انکار اور تعجب کے استعمال ہوا ہے، یعنی تعجب ہے کہ ان آباء واجداد کو حق کی ذرا بھی سمجھ نہیں پھر بھی ان ہی کی پیروی کی جارہی ہے، کیوں کہ رشد وہدایت علم ویقین کی بنیاد پر حق کے انتخاب اور اس کی تقلید و پیروی کا نام ہے، رہی باطل کی تقلید تو وہ بے وقوفی اور گمراہی کی دلیل ہے، بالخصوص جب حق بالکل واضح اور صحیح وغلط الگ الگ ہوں تو ایسی صورت میں باطل کی تقلید حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

انکشاف حق کے بعد جہالت اور جاہلوں کی تقلید کے سبب انسان دنیا وآخرت کی بھلائی سے محروم ہو کر رہ جاتا ہے ، (ہم اللہ تعالی سے توفیق اور راہ راست کی دعا کرتے ہیں) اسی لیے اللہ تعالی نے قرآن کریم نازل فرما کر روشن اور واضح آیات ودلائل کے ذریعہ پورے بنی نوع انسان کو مخاطب کیا، تاکہ جہالت وگمراہی کے دلدل سے نکل کر علم ومعرف اور حق کی راہ اختیار کرلیں، اسی لیے اللہ نے انسانوں کے ذہن ودماغ کو ان کے ارد گرد کی تمام اشیاء کی جانب متوجہ کیا تاکہ اسی میں غور وفکر کرکے سچائی تک پہنچ سکیں اور حق کے پیروکار بن جائیں، حتی کہ زمین سے اگنے یا اس پر موجود روزانہ کی اشیائے خورد نوش کی جانب بھی توجہ دلائی۔

آیت کریمہ داعی کے لیے ایک تجربہ اور نمونہ کے طور پر ہے جس سے دعوتی میدان میں کبھی بھی اس کو سابقہ پڑ سکتا ہے، اسی طور سے صحیح سوچ بوجھ اور دینی اور دنیاوی تمام امور میں غور وفکر کرتے ہوئے عقل کا استعمال کافی اہم ہے ،ایسا نہ ہو کہ انسان صرف دوسروں کا مقلد اور ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہے، اگر لوگ اچھا کریں تو خود بھی اچھا کرے اور اگر لوگ برے ہوں تو خود بھی برا بن جائے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے۔ بلکہ انسان کو خود اعتماد ہونا چاہیے، کیوں کہ بعض کفار محض اپنے سے اگلوں کی تقلید کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کرسکے اور ان ہی کو دلیل بنائے بیٹھے رہے ،اسی لیے انہوں نے اپنی روش پر

کبھی تنقیدی نگاہ ہی نہیں ڈالی کہ حق تک رسائی ہو سکے۔ معلوم ہوا کہ تقلید کی دو صورتیں ہیں: یا تو جہالت کی بنیاد پر یا علم معرفت کی بنیاد پر، اگر جہالت کی بنیاد پر ہے تو ایسی تقلید مقلد کی ہلاکت کا سبب ہے، رہی عقل و شعور اور علم کی بنا پر خیر اور اہل خیر کی تقلید تو وہ عین مطلوب و مقصود ہے، ان میں سب سے بڑھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء اور پیروی ہے۔ امام قرطبیؒ رحمہ اللہ نے تقلید، اس کے انواع واقسام اور احکام کے متعلق علماء کے اقوال وآراء کا بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے، مزید جانکاری کا خواہش مند ان کی تفسیر کی طرف رجوع کر سکتا ہے (١)، اسی طرح امام شوکانی نے بھی اپنی کتاب "أدب الطلب ومنتهى الأرب" میں اس تعلق سے سیر حاصل بحث کی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے ان کی روش کو مثال سے سمجھا کر مزید واضح کر دیا تاکہ وہ خود راہ راست پر آجائیں اور وہ دوسروں کے لیے عبرت ونصیحت ہوں، فرمایا: ﴿ وَمَثَلُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ كَمَثَلِ ٱلَّذِى يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَآءً وَنِدَآءً ۚ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴾ "کفار کی مثال ان جانوروں کی طرح ہے جو اپنے چرواہے کی صرف پکار اور آواز ہی سنتے ہیں (سمجھتے نہیں) وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں، انہیں عقل نہیں"۔ اس آیت میں فہم وتعلم کی صلاحیتوں کو ضائع اور بیکار چھوڑے رکھنے کی خطرناکی بیان کی گئی ہے، یعنی کہ انسان حق سننے میں اپنے کانوں کو استعمال میں نہ لائے، نفع بخش خیر و بھلائی کے استفسار وسوال کے لیے اس کی زبان نہ کھلے، آس پاس کی واضح اور روشن دلائل و براہین اور نشانیاں جو قرآن وسنت کے واسطے سے دیکھائی اور سنائی گئی ہیں ان سے اپنی آنکھیں بند رکھے، تو ایسے ہی کافروں کی مثال ان جانوروں اور چوپایوں جیسی ہے جن کو چرواہا آوازیں دیتا ہے لیکن ان میں کچھ سوچ بوجھ نہیں ہوتی کہ چرواہا کیا کہہ رہا ہے اور اس کی بات کا مطلب کیا ہے، وہ صرف ایک آواز سنتے ہیں اور اس سے زیادہ ان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح کفار بھی حق کی آواز سنتے ہیں، لیکن اپنی سماعت و گویائی اور نگاہوں سے ایسے بے اعتنائی برتتے ہیں، گویا کہ انہوں نے محض ایک آواز کے سوا کچھ سنا دیکھا ہی نہ ہو، جس سے ان پر صرف حجت قائم ہو گئی اور اس سے انہوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، کیوں کہ ان کے پاس عقل ہی نہیں، اس سے مراد رشد وہدایت والی عقل ہے، ادراک واحساس والی عقل مراد نہیں، کیوں کہ اگر احساس

---

(١) دیکھیے تفسیر قرطبی ٢/١٤٢-١٤٤.

وادراک والی عقل مراد ہوتی تو وہ مرفوع القلم ہوتے۔ اسی طرح یہ مثال ان کے ان معبودوں پر بھی صادق آتی ہے جن کی وہ پوجا کرتے ہیں جو کہ نہ تو سنتے دیکھتے ہیں اور نہ ہی بولتے ہیں۔ یہ کفاران کو پکارتے اور ان سے اپنی مرادیں طلب کرتے ہیں، حالانکہ وہ معبودان کی ایک نہیں سمجھتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مثالوں کے ذریعہ کوئی بات سمجھانا تعلیم کا ایک بہترین طریقہ ہے جس کے ذریعہ ایک داعی اور مربی اپنی مراد بڑی عمدگی سے مخاطب تک پہنچا سکتا اور ذہن کے قریب کر سکتا ہے کیوں کہ مثل کے مضامین و مشتملات سے عقل و شعور بیداری اور فکر و نظر میں نشاط آتا ہے، لہذا دعوتی اور تربیتی حوالے سے ضرب المثل کے اسلوب کی اہمیت مسلم ہے۔

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُلُواْ مِن طَيِّبَـٰتِ مَا رَزَقْنَـٰكُمْ وَٱشْكُرُواْ لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ ٱلْمَيْتَةَ وَٱلدَّمَ وَلَحْمَ ٱلْخِنزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهِۦ لِغَيْرِ ٱللَّهِ ۖ فَمَنِ ٱضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٧٣﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلْكِتَـٰبِ وَيَشْتَرُونَ بِهِۦ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُوْلَـٰٓئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِى بُطُونِهِمْ إِلَّا ٱلنَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ ٱللَّهُ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ أُوْلَـٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشْتَرَوُاْ ٱلضَّلَـٰلَةَ بِٱلْهُدَىٰ وَٱلْعَذَابَ بِٱلْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ أَصْبَرَهُمْ عَلَى ٱلنَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ ٱللَّهَ نَزَّلَ ٱلْكِتَـٰبَ بِٱلْحَقِّ ۗ وَإِنَّ ٱلَّذِينَ ٱخْتَلَفُواْ فِى ٱلْكِتَـٰبِ لَفِى شِقَاقٍۭ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾﴾۔

ترجمہ:

"اے ایمان والو! جو پاکیزہ روزی ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں انہیں کھاؤ پیو اور اللہ تعالی کا شکر کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرتے رہو(۱۷۲)۔ تم پر مردہ اور (بہاہوا) خون اور سور کا گوشت اور ہر وہ چیز جس پر اللہ کے سوا دوسروں کا نام پکارا گیا ہو حرام ہے، پھر جو مجبور ہو جائے اور وہ حد سے بڑھنے والا اور زیادتی کرنے والا نہ ہو، اس پر ان کے کھانے میں کوئی پابندی نہیں، اللہ تعالی بخشنے والا مہربان ہے(۱۷۳)۔ بیشک جو لوگ اللہ تعالی کی اتاری ہوئی کتاب چھپاتے ہیں اور اسے تھوڑی تھوڑی سی قیمت پر بیچتے ہیں، یقین مانو کہ یہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے بات بھی نہ کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے(۱۷۴)۔ یہ وہ

لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے خرید لیا ہے، یہ لوگ آگ کا عذاب کتنا برداشت کرنے والے ہیں (۱۷۵)۔ان عذابوں کا باعث یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سچی کتاب اتاری اور اس کتاب میں اختلاف کرنے والے یقیناً دور کے خلاف میں ہیں (۱۷۶)"۔

سابقہ آیات سے قبل والی آیت﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ﴾ میں تمام انسانوں کے لیے منادی تھی، اور اس آیت میں مومنوں کو خصوصی ندا دی جا رہی ہے: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُلُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ وَٱشْكُرُواْ لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴾ ، "اے ایمان والو! جو پاکیزہ روزی ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں انہیں کھاؤ پیو اور اللہ تعالیٰ کا شکر کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرتے رہو" ، جس طرح سابقہ آیت سے قبل والی آیت میں لوگوں کو ان کے خالق ورازق کی راہ میں رخنہ ڈالنے والے شیطان کی پیروی سے ڈرایا گیا ہے اسی طرح اس آیت میں اللہ تعالی نے مومنوں کے احوال کی مناسبت سے خاص طور پر شکر گذاری کا حکم دے رہا ہے، جب کہ گذشتہ سے قبل والی آیت میں لوگوں کو شکر کا حکم نہیں ہے، کیوں کہ آیت میں خطاب مومن وغیر مومن سب کے لیے ہے ،اور غیر مومن نے کچھ ایسا کیا ہی نہیں کہ ان کو شکر گذاری کا حکم دیا جائے،اس لیے ایسی چیز کا حکم دیا جو تمام لوگوں کے مناسب ہو یعنی شیطان کی تابعداری سے بچاؤ کا حکم جو لوگوں کو برائی اور بے حیائی کے کاموں اور اللہ تعالی پر بلا علم جھوٹ بات کہنے کا حکم کرتا ہے،اس آیت میں اللہ تعالی صیغہ ندا کے ذریعہ مومنوں کو متوجہ کرتے ہوئے ہدایت کر رہا ہے کہ وہ اللہ کی عطا کردہ پاکیزہ نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں، توجیہ وارشاد کے تعلق سے آیات کی یہ ترتیب وتنسیق قرآن کی عمدہ طرز خطاب وتوجیہ اور اعجاز بیان کی عمدہ مثال ہے، آیات کے ان دلالات ومعانی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسی سے مخاطب ہوتے وقت مقام ومحل کی رعایت ضروری ہے، چنانچہ مخاطب کو بلا موقع ومحل کی رعایت کے کسی بات کا حکم نہیں کر دینا چاہیے، چاہے اس حکم کا تعلق دعوتی امور سے ہو یا تربیتی اور اداری امور سے، جب تک کہ مخاطب ایسی کیفیت میں نہ ہو جو اس حکم کی متقاضی ہو، اسی طرح جن واجبات وفرائض کا تعلق مخاطب سے ہے اس کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، مختصرا یوں کہنا چاہئے کہ اہم اور مہم کی ترتیب کا اہتمام

ضروری ہے، مثال کے طور پر اگر نماز کھڑی ہو تو کافر کو اس کی ادائیگی کا حکم دینا غیر مناسب ہوگا، کیوں کہ ابھی اس نے وہ کام انجام ہی نہیں دیا کہ نماز کا نمبر آئے، یعنی کلمہ شہادت کا اقرار ہی نہیں کیا ہے۔

آیت کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جو چیزیں پاکیزہ نہیں ہیں انہیں نہ کھاؤ ، اور آئندہ کی آیت میں ان چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، یعنی اس آیت میں جو ہدایت کی گئی ہے وہ آنے والی آیت سے مربوط ہے، گویا یہ کھانے پینے کے تعلق سے ایک ضابطہ اور قاعدہ عامہ بتلادیا گیا ہے، پھر آگے والی آیت میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے، توجیہ وارشاد میں یہ نظم وترتیب اور انداز بیان کی خوبصورتی تعلیمی اور تربیتی حوالے سے کافی مفید ہے، چنانچہ معلومات کی ادائیگی میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ پہلے پہل مختصرا قاعدہ عامہ کی شکل میں معلومات دی جائے، اس کے بعد اس کی تفصیل میں جایا جائے، تاکہ ذہن پوری معلومات کو عمومی اور تفصیلی دونوں طرح سے قبول کرلے۔

آیت کا دار ومدار اس بات کے ثبوت پر ہے کہ تمام قسم کا رزق اللہ تعالی کی طرف سے ہے، اس لیے آیت میں رزق کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کی گئی ہے: ﴿مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقۡنَٰكُمۡ﴾ "جو پاکیزہ روزی ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں"۔ پھر اللہ تعالی اپنے مومن بندوں کو عمومی شکر بجالانے کا حکم دے رہا ہے: ﴿وَٱشۡكُرُواْ لِلَّهِ﴾ "اور اللہ تعالی کا شکر کرو"۔ یعنی جس اللہ نے یہ کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں فراہم کیں اس اللہ کی شکر گذاری کرو، اور یہ شکر قلبی اعتقاد رکھ کر، زبانی طور پر اظہار کرکے اور عملی طور پر نافذ کرکے ادا ہو سکتا ہے، بایں طور کہ وہ کام انجام دیئے جائیں جس سے ثابت ہو سکے کہ واقعتا بندہ اللہ تعالی کا شکر گذار ہے ، مثلا اس رزق کو اللہ کی رضامندی والے کام مثلا صدقات وغیرہ میں خرچ کرے اور اس رزق کے ذریعہ سے وہ کام نہ کرے جو غضب الہی کا موجب ہوں، جیسے اسراف اور فضول خرچی اور فخر ومباہات وغیرہ۔

آیت کریمہ میں اس بات کی وضاحت ہے کہ عبادت اور شکر دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے اور لازم وملزوم ہیں: فرمایا: ﴿وَٱشۡكُرُواْ لِلَّهِ إِن كُنتُمۡ إِيَّاهُ تَعۡبُدُونَ﴾ "اور اللہ تعالی کا شکر کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرتے رہو"۔ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ شکر عبادت ہے، کیوں کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تم اللہ تعالی کی عبادت کرتے ہو تو ان نعمتوں پر اللہ تعالی کا شکر ادا کرو، اور

شکران نعمت میں اس بات کا ثبوت ہے کہ بندہ مومن اللہ تعالی کا عبادت گذار ہوتا ہے، کیوں کہ شکر الہی میں بندے کی طرف سے یہ اقرار ہوتا ہے کہ یہ پاکیزہ اور عمدہ روزیاں اللہ تعالی کی طرف سے ہیں، چاہے ان کو پیدا کرنے کا معاملہ ہو یا بندوں کو عطا کرنے کا، بندہ مومن رزق کے حصول کی نسبت اپنی محنت وکوشش کی طرف نہیں کرتا، اسی طرح اس کی سیرابی اور خریداری کا حوالہ نہیں دیتا، جیسا کہ سورہ واقعہ میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے : ﴿أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ﴿٦٤﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَٰهُ حُطَٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ﴾ [سورة الواقعة:٦٣-٦٥] "اچھا پھر یہ بھی بتلاؤ کہ تم جو کچھ بوتے ہو۔ اسے تم ہی اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اسے ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور تم حیرت کے ساتھ باتیں بناتے ہی رہ جاؤ"۔ ان آیات کے فوائد کا بیان ان شاء اللہ اپنے مقام پر آئے گا ، معلوم ہوا کہ شکران نعمت ایک عظیم عبادت ہے جس کو بجالانا اور اس کے لوازم اور تقاضوں کو پورا کرنا ایک مومن کے لیے ضروری ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کا کھانا حرام ہے ، فرمایا: ﴿ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ ٱلْمَيْتَةَ وَٱلدَّمَ وَلَحْمَ ٱلْخِنزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهِۦ لِغَيْرِ ٱللَّهِ﴾ " تم پر مردہ اور (بہا ہوا) خون اور سور کا گوشت اور ہر وہ چیز جس پر اللہ کے سوا دوسروں کا نام پکارا گیا ہو حرام ہے"۔ صحیح غور وفکر کا حامل یہ بخوبی جانتا ہے کہ یہ سب محض اس لیے حرام ہیں کہ یہ ہمارے لیے نقصان دہ ہیں اور پاکیزہ طبیعتیں اسے قبول نہیں کر سکتیں۔ (مردار) سے مراد جو اپنی موت آپ مرا ہو اور اس کی روح بغیر ذبح کیے نکل گئی ہو، آیت میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کس طریقے سے مرا ہے، یہاں موت کے وسیلہ کی کوئی تحدید نہیں ہے اس کا بہت بڑا فائدہ ہے کیوں کہ عصر حاضر میں بہت سارے ایسے وسیلے ایجاد ہو گئے ہیں جو پہلے غیر معلوم تھے، جیسے بجلی کے جھٹکے لگا کر موت دینا۔ قرآن کریم میں یہ ارشاد ربانی ایک معجزہ ہے، کیوں کہ حرام کی اس قسم میں ذبح نہ کرنے کو وجہ سے خون مردہ کے جسم ہی میں رکا رہ جاتا ہے، مردار کے اس حکم سے مچھلی اور ٹڈی مستثنی ہیں ، جیسا حدیث نبوی میں آپ کا فرمان ہے : (أحلت لنا ميتتان :

الحوت والجراد ، ودمان: الكبد والطحال) (١) "یعنی ہمارے لیے دو مردار مچھلی اور ٹڈی اور دو خون کلیجی اور جگر حلال ہیں"۔ اور آیت میں (خون) سے مراد بہتا ہوا خون ہے ،اسی طرح سور اس کی خباثت کی وجہ سے حرام ہے، نیز غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا جانور جو معبودوں کے لیے ذبح کیا جاتا ہے یہ سب حرام ہیں ،ان تمام کے فقہی احکام فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں الحمد للہ۔ لیکن پھر بھی اللہ تعالی کا اپنے بندوں پر اتنا لطف و کرم ہے کہ اس نے ان حرام چیزوں میں سے بحالت مجبوری ضرورت کے بقدر کھانا حلال قرار دیا ہے، چنانچہ اگر کسی کو بھوک کی وجہ سے اپنی جان جانے کا خطرہ ہو تو ضرورت بھر جس سے اس کی جان بچ سکے ان حرام چیزوں میں سے کھا سکتا ہے ،اسی لیے اللہ تعالی نے آیت میں ﴿غَيۡرَ بَاغٖ وَلَا عَادٖ﴾ کی قید لگائی ہے کہ " وہ حد سے بڑھنے والا اور زیادتی کرنے والا نہ ہو "یعنی وہ ان حرام چیزوں کو اپنی طلب اور خواہش سے نہ کھائے اور ضرورت سے زیادہ بھی نہ کھائے، بلکہ یہ محض اس کی شدید مجبوری ہو یعنی موت کا خوف،ایسی صورت میں اللہ تعالی اس سے مؤاخذہ نہیں کرے گا کیوں کہ : ﴿إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمٌ﴾ "اللہ تعالی بخشنے والا مہربان ہے" یعنی اس حرام کے کھانے پر بخشنے والا ہے، مہربان ہے اسی لیے اس نے ضرورت کے وقت حرام کھانے کی اجازت دے رکھی ہے، اور یہ اللہ کی رحمت ہی ہے۔ آیت کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت میں انسانی زندگی کی حفاظت پر خاص توجہ دی گئی ہے، چاہے کسی چیز کی ممانعت کا مسئلہ ہو یا جواز کا، کیوں کہ اللہ تعالی نے ان تمام چیزوں کو حرام کیا ہے جو انسانی زندگی کے لیے نقصان دہ ہیں اور حرام کی ہوئی چیزوں کو ضرورت کے وقت جائز بھی کر دیا ہے تاکہ انسان ہلاکت سے بچ سکے،اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں جان کی کتنی اہمیت ہے اور اس کی حفاظت اور بچاؤ پر کس قدر توجہ ہے،اس لیے ان تمام وسائل وذرائع پر روک لگادی گئی ہے جو اس کی ہلاکت کا سبب ہیں۔

اس آیت سے یہ فائدہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کسی بھی نظام اور لائحہ عمل اور توجیہ وارشاد کی تیاری کے وقت دور اندیشی اور تلافی مافات اور تمام متوقع احتمالات کو سامنے رکھنا کافی اہم ہے۔

---

(١) مسند احمد ١٠/ ١٥-١٦ حديث نمبر (٥٧٢٣)، صحيح ابن ماجه حديث نمبر (٢٦٩٥).

اس آیت میں اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ شریعت اسلامیہ اللہ تعالی کی جانب سے نازل کردہ ہے کیوں کہ یہ شریعت ان تمام امور کو محیط ہے جو انسان کے ذہن ودماغ میں آنے والے نہیں تھے ، احتیاطی تدابیر، توجیہ وبیان کی ایسی گہرائی وگیرائی کہ جن وانس سب مل کر اس کی تہہ تک پہنچنا چاہیں تو بھی نہیں پہنچ سکتے، جب کہ الفاظ دیکھیں تو کافی مختصر اور مفاہیم ودلالات اور مختلف فوائد کافی وسیع، ساتھ ہی قرآن کریم کی انسانی عقل ونفس پر تاثیر کی قوت یہ سارے حقائق اس شریعت کے من جانب اللہ ہونے کا بین ثبوت ہیں۔

اس کے بعد قرآن کریم کا سیاق پھر سے اہل کتاب کے احوال بیان کر رہا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ يَكۡتُمُونَ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلۡكِتَٰبِ وَيَشۡتَرُونَ بِهِۦ ثَمَنٗا قَلِيلًا ﴾ "بیشک جو لوگ اللہ تعالی کی اتاری ہوئی کتاب چھپاتے ہیں اور اسے تھوڑی تھوڑی سی قیمت پر بیچتے ہیں"۔ یہ قرآنی بیان اہل کتاب کی دو کرتوت پر مشتمل ہے جس کا وہ ارتکاب کرتے تھے ،ایک تو کتمان علم، دوسرا اللہ تعالی کی آیات کو بیچ کھانا، چنانچہ اللہ تعالی ان آیات میں علمائے اہل کتاب کے انہی کارناموں کی پول کھول رہا ہے یعنی علمائے اہل کتاب کا کتمان حق، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور نبوت کے تذکرہ کو دبادینا جس کو اللہ تعالی نے ان کی کتابوں میں بیان کیا ہے اور اس کتمان کے بدلے میں ان کو تھوڑی سی قیمت مل جاتی ہے جس کی مدت ختم ہو جانے والی ہے کیوں کہ جو مال ان کو ملا ہے وہ گھٹتے گھٹتے بالآخر ایک وقت ختم ہو جائے گا، نیز آخرت کے دائمی اجر وثواب کے مقابلہ میں وہ انتہائی حقیر اور کمتر قیمت ہے، کیوں کہ آخرت کا ثواب نہ تو کم ہو گا اور نہ ہی ختم ہو گا،اس سے معلوم ہوا کہ کتمان علم اور شرعی مفاہیم ونتائج کو اللہ اور اس کے رسول کی مراد سے ہٹ کر محض تھوڑر سے دنیاوی مفاد کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کرنا،اور سرداران باطل پرست اور اکابرین کی قربت کے حصول کے چکر میں ان کے من مرضی کے موافق اور اللہ ورسول کی مراد کے مخالف نصوص میں تحریف کرنا یہ سب انتہائی گھناؤنے اور قابل اجتناب کام ہیں۔

آیت میں قرآن کریم کا بلاغی پہلو یہ بھی کہ صرف دو لفظوں کے معنی کی گیرائی میں بہت ساری باتیں بیان کر دی گئی ہیں، وہ دو لفظ ہیں (یکتمون) اور (یشترون) ، طبیعت کی شر پسندی، بدخوئی، اوامر

الٰہی کی حقارت وتذلیل اور توہین، اللہ تعالی کی سامنے جرأت ودلیری، بغض وحسد، اور قصداً مقصود الٰہی کی مخالفت وغیرہ تمام چیزیں ان دو لفظوں کے مفہوم میں آجاتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ بعض طبیعتیں بہت ہی زیادہ خبیث اور ڈھیٹ ہوتی ہیں ، اسی طرح آیت میں لفظ (یشترون) سے ان کے آیات اور احکام الٰہی کے لین دین کا مفہوم اور اس کے خسارہ کو بڑے واضح انداز میں مخاطب کے لیے بیان کر دیا گیا ہے کیوں کہ اس لفظ سے خرید وفروخت کے معاملات میں ہمیشہ لوگوں کو سابقہ پڑتا ہے اور اس کے مفہوم کو دیکھتے جانتے ہیں۔ چنانچہ مراد اور مقصود کو سمجھنے میں یہ لفظ کافی مؤثر ثابت ہو سکتا ہے ، اور وہ دنیاوی خسارے کے ساتھ ساتھ آخرت کے بھاری گھاٹے کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنہیں وہ اپنے لیے جان بوجھ کر مول لے رہے ہیں، اس میں دوسروں کو ان لوگوں کی روش اختیار کرنے سے ڈرایا اور آگاہ کیا جارہا ہے تاکہ مکلفین غیروں کے حالات سے واقف ہو کر ان سے نصیحت اور عبرت حاصل کریں۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان کی سزا کا ذکر کر رہا ہے: ﴿أُولَٰٓئِكَ مَا يَأۡكُلُونَ فِي بُطُونِهِمۡ إِلَّا ٱلنَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ ٱللَّهُ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ "یقین مانو کہ یہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے بات بھی نہ کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے"۔ یعنی دنیا میں کھائے ہوئے ان کے یہ مال قیامت کے دن ان کے پیٹ میں آگ بن جائیں گے ، یہ اللہ تعالی کی طرف سے وعید شدید ہے، اس سے خود کو بچانا چاہیے، اسی پر بس نہیں بلکہ ان کی دوسری سزا یہ ہوگی کہ ان کو اللہ تعالی کی ہم کلامی سے محروم کر دیا جائے گا ، فرمایا: ﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ ٱللَّهُ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ﴾ "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے بات بھی نہ کرے گا"۔ اور ان کو اللہ تعالی کی خوشنودی حاصل نہ ہوگی بلکہ اللہ تعالی کے غضب سے ان کا سامنا ہوگا ، قیامت کے دن اس سے سخت عذاب اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان اللہ تعالی کی رضا سے مشرف نہ ہو، اور اللہ تعالی اس سے بات نہ کرے۔ ان کی تیسری سزا: ﴿وَلَا يُزَكِّيهِمۡ﴾ "اور نہ انہیں پاک کرے گا" یعنی اللہ تعالی ان پر اپنے غضب اور ان سے ناراضی کے سبب گناہوں سے انہیں پاک نہیں کرے گا۔ چوتھی سزا: ﴿وَلَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ "بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے"۔ لفظ (أليم) شدت عقاب پر دلالت کرتا ہے۔

ان لوگوں کا وصف یہ ہے کہ: ﴿ أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشۡتَرَوُاْ ٱلضَّلَٰلَةَ بِٱلۡهُدَىٰ ﴾" یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے خرید لیا ہے" ۔یعنی ان لوگوں نے ہدایت کے بدلے میں کھلی ہوئی گمراہی اختیار کرلی، اور اس کے لیے ہدایت کو بطور قیمت کے پیش کیا ،اس سے معلوم ہوا کہ سب کچھ وہ جانتے بوجھتے کر رہے تھے، اس آیت میں ایک طرف تو اہل کے کتاب کے علماء سوء کی حالت زار کا انکشاف ہے تو دوسری طرف تحذیر بھی ہے کہ دنیا کی طمع اور لالچ اور غفلت سے آدمی خود کو محفوظ رکھے کیوں کہ یہ ایسی چیز ہے کہ آدمی حصول دنیا کے واسطے اپنی آخرت فروخت کردیتا ہے ، اللہ تعالی اس غفلت سے ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اپنی امان میں رکھے۔ ان اہل کتاب نے گویا کہ عذاب الٰہی کو خریدا اور اس عذاب کی بڑی قیمت بھی ادا کی، نیز انہوں نے دنیا کے معمولی فائدے کے بدلے میں اللہ کی مغفرت کو بھی بیچ ڈالا جس کی بدولت وہ جنت میں جاسکتے تھے: ﴿ أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ ٱشۡتَرَوُاْ ٱلضَّلَٰلَةَ بِٱلۡهُدَىٰ وَٱلۡعَذَابَ بِٱلۡمَغۡفِرَةِۚ فَمَآ أَصۡبَرَهُمۡ عَلَى ٱلنَّارِ ﴾" یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے خرید لیا ہے، یہ لوگ آگ کا عذاب کتنا برداشت کرنے والے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ کچھ پیمانے ایسے ہوتے ہیں انسان جن کی وجہ سے فکری اعتبار سے منحرف اور عملی اعتبار سے کورا ہو جاتا ہے ،خاص طور سے منافع دنیا وآخرت کے خود ساختہ پیمانے اور ایک حقیر اور فانی چیز کو دائمی اور لازوال نفع کثیر پر مقدم کرنے میں، اس لیے ہمیں اپنے تصرفات میں کافی غور وفکر، محاسبہ نفس اور حق کی طرف رجوع کی ضرورت ہے۔اے اللہ ہم تجھ سے ہدایت وتوفیق طلب کرتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی بیان کررہا ہے کہ اس نے قرآن کریم کو صداقت اور دلائل کے ساتھ نازل کیا، اور یہ قرآن بالکل حق ہے: ﴿ ذَٰلِكَ بِأَنَّ ٱللَّهَ نَزَّلَ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ ﴾"ان عذابوں کا باعث یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سچی کتاب اتاری"۔ اس لیے لازم اور ضروری ہے کہ قرآن کے مقاصد ومراد میں کچھ بھی اپنی طرف سے تصرف اور چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے ، کیوں کہ یہ بالکل حق اور سچائی پر مبنی کتاب ہے اس میں کہیں کوئی کجی نہیں۔

اس کے بعد قرآنی سیاق اہل کتاب یہود ونصاری کے آپسی اختلافات کے بیان میں ہے تاکہ مومنین اس سے نصیحت اور ہدایت حاصل کریں۔ چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ وَإِنَّ ٱلَّذِينَ ٱخۡتَلَفُواْ فِي ٱلۡكِتَٰبِ لَفِي شِقَاقِۭ بَعِيدٖ ﴾۔ "اور اس کتاب میں اختلاف کرنے والے یقیناً دور کے خلاف میں ہیں"۔

چنانچہ اہل کتاب یہود و نصاری شدید اختلاف اور تفرقہ کا شکار ہیں، سبب یہ کہ انہوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا، اور اسی اختلاف نے انہیں آپسی تفرقہ کو جنم دیا ،اس لیے معلوم ہوا کہ اختلاف کے شر سے بہت بچ کر رہنا چاہیے، اور ضروری ہے کہ حق آجانے کے بعد اہل حق کسی قسم کا اختلاف نہ کریں، لیکن جہاں نفس پرستی سرایت کر جاتی ہے تو پھر حق کی فاسد تاویلات، مہلک ہوا پرستی اور کج فہمی اختلاف کا باعث بن جاتی ہے، کیوں کہ ایسے میں نصوص کو اللہ کی مراد سے پھیر کر اپنی خواہشات کے مطابق بنالیا جاتا ہے،اس لیے ضروری ہے کہ اپنی خواہشات کو حق کے تابع کریں نہ کہ حق کو خواہشات کے تابع،اور بلا شبہ جو کوئی بھی حق کو اپنی خواہشات کرتا ہے گمراہ ہو جاتا ہے اور دوسروں کے ساتھ اختلاف میں پڑ جاتا ہے ،اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ حق ہی پر امت متفق اور متحد ہو سکتی ہے ،اور جو حق کا مخالف ہو گا وہ حق اور اہل حق سے اختلاف میں پڑا رہے گا، نیز اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ ہمیں ایسی دعوت کا خاص اہتمام کرنا ہوگا جو حق اور اتباع دلیل سے متعارف کرائے۔

﴿لَّيْسَ ٱلْبِرَّ أَن تُوَلُّوا۟ وُجُوهَكُمْ قِبَلَ ٱلْمَشْرِقِ وَٱلْمَغْرِبِ وَلَـٰكِنَّ ٱلْبِرَّ مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ وَٱلْمَلَـٰٓئِكَةِ وَٱلْكِتَـٰبِ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ وَءَاتَى ٱلْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ذَوِى ٱلْقُرْبَىٰ وَٱلْيَتَـٰمَىٰ وَٱلْمَسَـٰكِينَ وَٱبْنَ ٱلسَّبِيلِ وَٱلسَّآئِلِينَ وَفِى ٱلرِّقَابِ وَأَقَامَ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَى ٱلزَّكَوٰةَ وَٱلْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَـٰهَدُوا۟ ۖ وَٱلصَّـٰبِرِينَ فِى ٱلْبَأْسَآءِ وَٱلضَّرَّآءِ وَحِينَ ٱلْبَأْسِ ۗ أُو۟لَـٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ صَدَقُوا۟ ۖ وَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُتَّقُونَ ﴿١٧٧﴾﴾

ترجمہ:

"ساری اچھائی مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنے میں ہی نہیں ، بلکہ حقیقتاً اچھا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو، جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے، غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی اور زکوۃ کی ادائیگی کرے، جب وعدہ کرے تب اسے پورا کرے، تنگ دستی، دکھ درد اور لڑائی کے وقت صبر کرے، یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیزگار ہیں"۔

آیت کی شروعات نیکی کی حقیقت کے متعلق غلط فہمی کی تردید سے کی گئی ہے ، جو یہ سمجھ لیے ہیں کہ نماز کی ادائیگی کے وقت قبلہ رخ ہو جانا ہی اصل نیکی ہے۔ اسی غلط مفہوم کو ذہن سے نکالنے کے لیے یہ آیت ہے، تاکہ اصل اور صحیح حقیقت کی معرفت کے لیے ذہن بالکل تیار اور توجہ زیادہ ہو: ﴿لَّيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ "ساری اچھائی مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنے میں ہی نہیں"۔ گویا مخاطب زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ تو پھر نیکی کیا ہے؟ اور پھر اسی سوال کا جواب دیا جا رہا ہے: ﴿وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا ۖ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ﴾ " بلکہ حقیقتاً اچھا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو، جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے، غلاموں کو آزاد کرے، نماز کی پابندی اور زکوۃ کی ادائیگی کرے، جب وعدہ کرے تب اسے پورا کرے، تنگ دستی، دکھ درد اور لڑائی کے وقت صبر کرے" ۔ یعنی اللہ تعالی پر ایمان، عبادت، اخلاق حسنہ، اللہ تعالی کی فرمابرداری اور اطاعت میں خود کو لگا دینا، اللہ تعالی کے متعین کردہ حقوق العباد کی پاسداری یہ سارے امور اصل نیکی کے کام ہیں، یہ سارے امور ایک ہی آیت میں بطور علم ہیں اور بطور تشریع بھی ، اور یہی امور افراد اور سماج کی سعادت و کامرانی کے ضامن ہیں۔

امام قرطبیؒ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (البر) ایک ایسا جامع لفظ ہے جس میں خیر کے تمام کام آجاتے ہیں(۱)۔ یعنی یہ ہر اس عمل کو شامل ہے جس کو اللہ تعالی پسند کرتا اور راضی ہوتا ہے ، اور ہمارے علماء کہتے ہیں کہ: یہ بہت ہی عظیم اور اہم آیت ہے جس میں اسلام کے بنیادی احکامات بیان کئے گیے ہیں ، کیوں کہ یہ آیت سولہ قواعد پر مشتمل ہے: اللہ اور اس کے اسماء وصفات پر ایمان، حشر و نشر، میزان، پل صراط، حوض، شفاعت، جنت و جہنم پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، کتب سماویہ پر ایمان، اور یہ کہ یہ تمام کتابیں اللہ

---

(۱) تفسير قرطبي ۲/۱٦۰.

تعالی کی جانب سے حق ہیں، تمام نبیوں پر ایمان، انفاق مال، نمازوں کی پابندی، زکاۃ کی ادائیگی، وعدوں کی پاسداری اور مصائب اور تکالیف پر صبر (۱)۔

چنانچہ آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ نیکی ان سارے امور کو شامل ہے، اور صرف نماز میں قبلہ رخ ہو جانے کا نام نیکی نہیں ہے، بلکہ نیکی کا مفہوم بہت عام اور وسیع ہے، بلکہ یوں کہیے کہ سارے امور اعتقاد کو دل سے تسلیم کرنے اور اخلاص کے ساتھ عملا واجبات کی ادائیگی کا نام نیکی ہے۔

آیت کریمہ میں پانچ ارکان ایمان کا بیان ہے: اللہ تعالی پر ایمان، قیامت کے دن پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، کتابوں پر ایمان، نبیوں پر ایمان، البتہ ایمان کا چھٹا رکن (قضاوقدر پر ایمان) آیت میں صراحت کے ساتھ نہیں بیان ہوا ہے، لیکن اللہ تعالی نے آیت میں اس کی طرف اپنے فرمان: ﴿ وَٱلصَّٰبِرِينَ فِي ٱلۡبَأۡسَآءِ وَٱلضَّرَّآءِ ﴾ سے اشارہ کیا ہے۔ یعنی " جو تنگ دستی، دکھ درد کے وقت صبر کرے" ۔ کیوں کہ صبر کا تعلق قضاوقدر سے ہے۔ واللہ تعالی أعلم۔

آیت کریمہ میں اجتماعی اور سماجی باہمی تعاون وہمدردی کا مفہوم بھی ہے، دوسروں کے احوال کی خبر گیری، اور انہیں اپنے اس مال میں سے جس کے حصول میں اس نے خود کو تھکایا ہے، یہاں تک کہ اس مال کی محبت اس کے دل میں بیٹھ گئی، یعنی اللہ تعالی نے دل کو مال کی محبت سے خالی نہیں کیا اور نہ ہی مال کی محبت میں کمی کی، البتہ اس کے علاج کے لیے یہ ترغیب دلائی کہ بندہ اللہ تعالی کی مراد کو اس چیز پر مقدم رکھے جو اس کے دل میں رچی بسی ہے، اس ترغیب کے ذریعہ سے بندہ مال کی محبت پر قابو پا سکتا ہے ۔ فرمایا: ﴿ وَءَاتَى ٱلۡمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ ﴾ "جو مال سے محبت کرنے کے باوجود دے"۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اسے ترغیب دلائی کہ وہ اللہ کی محبوب چیز انفاق کو مال کی اپنی شدید محبت پر مقدم رکھے۔

یہ منہج ربانی تربیت کے میدان میں بھی مفید ہے، چنانچہ ایک مربی کسی امر حقیقت کو کمتر نہ بنائے اور نہ ہی مخالف حقیقت شے سے اس کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرے ، چاہے اس کا مقصد اس حقیقت سے روک کر کسی دوسرے بھلے کام کی انجام دہی ہو یا کسی کام کو چھوڑ کر اس سے افضل کسی کام کو اختیار کرانا ہو، بلکہ عقل وفطرت کے موافق حقیقت کو باور کرائے تاکہ ذہن توجیہ وارشاد کے ساتھ ہم

---

(۱) مرجع سابق.

آہنگ ہو جائے پھر جو بھی حقیقت یعنی کوئی امر و نہی، یا کسی عمل کی افضیلت اور مفضولیت کا مسئلہ جنہیں مخاطب تک پہنچانا مقصود ہو اس کو بیان کرے۔

انفاق صرف قریبی رشتہ داروں میں محصور نہیں ہے بلکہ آیت کریمہ میں اس کے مختلف انواع و اقسام بیان ہوئے ہیں، تاکہ دوسرے لوگ اور پورا معاشرہ اس سے مستفید ہو، اور باہمی تعاون و امداد اور پشت پناہی کا ماحول سماج کے تمام ضرورت مندوں اور محتاجوں تک دراز ہو، کیوں کہ یہ اللہ تعالی کا حکم ہے، اسی نے مال و دولت سے نواز کر انفاق کا حکم دیا اور اس کے لیے غیر کو تمہارا محتاج بنایا ہے ، اور جس ذات نے دوسروں کو تمہارا محتاج بنایا ہے اسی ذات نے تم کو مال و زر سے نواز کر ان کے ساتھ بھلائی اور ان کی خبر گیری کا حکم دیا ہے۔

اور بیک وقت جس ذات نے لوگوں میں فقیر و محتاج بنائے اس ذات نے فارغ البال افراد کو یہ حکم بھی دیا کہ وہ ان ضرورت مندوں کے احوال کا پتہ لگاتے اور ان کی مدد کرتے رہیں اور یہ کام محض اللہ تعالی کا فضل سمجھ کر انجام دیا جائے اور دینے والا بھی کسی احسان کی آس نہ رکھے ۔ آیت میں اس توجیہ وارشاد سے مراد زکاۃ نہیں بلکہ انفاق کا یہ حکم زکاۃ سے ہٹ کر ہے، کیوں کی مال میں زکاۃ کے علاوہ بھی بہت سارے حقوق ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اسی آیت کریمہ میں صراحت کے ساتھ زکاۃ کا ذکر کیا ہے، امام قرطبیؒ (۱) اور دیگر علماء نے اس مسئلہ کی تحقیق کی ہے۔

انفاق کے ان انواع و اقسام میں مستحقین کے درمیان ترتیب کا بھی لحاظ کیا گیا ہے، جن میں اولیت قریبی رشتہ داروں کو حاصل ہے، کیوں کہ ان کے حقوق دوسروں پر مقدم ہیں، اس کے بعد یتیم کا ذکر کیا گیا ہے جنہیں کم عمری اور لا عملی کی وجہ سے کمانا نہیں آتا، بعدہ مساکین کا نمبر آتا ہے جنہیں حصول مال کے وسائل و ذرایع کا علم تو ہوتا ہے پر وہ ان سے عاجز اور مجبور ہوتے ہیں، اس لیے ترتیب میں یتیم مسکین پر مقدم اور انفاق کے زیادہ حقدار ہیں، ان کے بعد وہ مسافرین ہیں جن کے منزل مقصود تک پہنچنے کے وسائل منطقع ہو گئے ہوں، مسافرین کے بعد وہ لوگ ہیں جو اپنی ضرورت کی طلب کے لیے لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں پھر انفاق کی وہ شکل ہے جس کا تعلق گردن آزاد کرنے سے ہے۔

---

(۱) دیکھیے تفسیر قرطبی ۲/۱۶۲

لوگوں کی مجبوری اور عدم مجبوری کے لحاظ سے اس یکے بعد دیگرے کی ترتیب میں انسان اگر غور وفکر کرے گا تو اللہ تعالی کی اس عمدہ ترتیب پر حیران رہ جائے گا۔

آیت میں نماز وزکاۃ جیسی عبادات کا بھی بیان ہے ، نماز ایسی عبادت ہے جس کا تعلق اللہ اور اس کے بندے کے درمیان اور زکاۃ ایسی عبادت ہے جو اللہ تعالی کے لیے ہی کی جاتی ہے لیکن اس کا تعلق بندے اور مجتمع سے ہے، گویا اس میں عبادت کی دو قسموں کی جانب اشارہ ہے ،اس اعتبار سے کہ یہ دونوں عبادتیں مقاصد دین کے لحاظ سے بقیہ عبادات کی ترجمان اور نمونہ ہیں، چنانچہ روزہ اور حج بھی نماز ہی کی طرح ہیں جن کا تعلق اللہ اور بندے سے ہے،اور زکاۃ بھی اللہ کی عبادت ہے اور اس کی بنیاد اور مرکز سماج کے افراد کے مابین تعاون سے ہے، گویا زکاۃ اسی جیسی دیگر عبادات مثلا صدقات اور کفارات وغیرہ کا ایک نمونہ ہے۔

آیت کریمہ میں اخلاق وکردار کے متعلق بھی تعلیمات کا ایک مجموعہ موجود ہے جو سماج اور معاشرے کے اتحاد واتفاق کا سبب اور انسانی شر وفساد سے بچاؤ کا ذریعہ ہیں ،ان میں سے عہد وپیمان کی پاسداری کافی اہم ہے یعنی فریقین کے مابین معاہدات کی ضمانت اور گارنٹی اور ان کی حفاظت ، کیوں کہ وعدوں کو توڑ دینے اور ان کی خیانت سے انفرادی ومعاشرتی اور شہری وملکی پیمانہ پر بغض وعداوت پیدا ہو تی ہے،اور ان کی حفاظت اور پاسداری سماج اور معاشرے کے امن وامان کی ضامن ہے۔

اس کے بعد آیت کریمہ میں صبر کے تین مقامات کا تذکرہ ہے ، اور یہ تینوں بڑے ہے سخت مقامات ہیں، اگر انسان ایک مقام پر صبر کرلے جاتا ہے تو اللہ تعالی کی توفیق سے وہ دوسرے مقامات پر بھی صبر کرلے جائے گا ، وہ تینوں مقامات یہ ہیں: شدید فقر وفاقہ کی حالت ، مرض کی حالت اور جہاد کے میدان میں شدید قتال کے وقت ،ان تینوں مقامات میں سے ہر ایک بذات خود بہت بڑا جہاد ہے،اور جس کو اس بات کا شعور واحساس ہوگا کہ اللہ تعالی اس کا نگہبان اور محافظ ہے وہ ان صفات سے متصف ہوگا ، کیوں کہ ذات الہی سے اس کو بڑی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں کہ اللہ تعالی اس کے اس فقر وفاقہ پر صبر کا بہتر بدلہ دے گا ،اور بیماری سے شفایابی اور اجر کا مستحق ہوگا اور دشمن کے مقابلہ کے وقت صبر کے بدلے یا تو اسے غلبہ حاصل ہوگا یا شہادت کے ذریعہ دائمی سعادت وکامرانی والی زندگی سے ہم کنار ہوگا ۔

اس میں اللہ تعالی کی جانب سے یہ وضاحت ہے کہ انسان ابتلاءات اور آزمائشوں سے دوچار ہو کر رہے گا، لہذا اگر کوئی ان میں سے کسی آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے اس کے بہتر انجام سے باخبر ہونا چاہیے جس کا ذکر اللہ تعالی نے آیت کے اخیر میں کیا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد ہے: ﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴾ " یہی سچے لوگ ہیں اور یہی پرہیز گار ہیں"۔اے اللہ تو اپنے رحم وکرم سے ہمیں سچے اور پرہیز گار لوگوں میں سے بنا،اے سارے جہان کے پروردگار، یاارحم الراحمین۔

صادق اور متقی لوگ سب سے بہتر مخلوق ہیں، کیوں کہ وہ سب سے بہتر اخلاق سے متصف ہیں، اسی لیے اس تعریف وثنا کے مستحق ٹھہرے،اللہ تعالی نے متقیوں کے لیے تیار کردہ اجر عظیم اور ثواب جزیل کا ذکر قرآن کریم کی بہت ساری آیات میں کیا ہے۔

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٨﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٧٩﴾ ﴾

ترجمہ:

"اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیاہے،آزاد،آزاد کے بدلے، غلام ، غلام کے بدلے عورت ، عورت کے بدلے ، ہاں جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے اسے بھلائی کی اتباع کرنی چاہیے اور آسانی کے ساتھ دیت ادا کرنی چاہیے ، تمہارے رب کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے ، اس کے بعد بھی جو سرکشی کرے اسے دردناک عذاب ہوگا (١٧٨)۔ عقلمندو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے اس کے باعث تم (قتل ناحق سے) رکوگے (١٧٩)"۔

نیکی وبھلائی کی حقیقت بیانی کے بعد سیاق قرآنی ایک ایسے امر کی طرف منتقل ہو رہاہے جس کے ذریعہ لوگوں کی زندگی صحیح وسالم اور ٹھیک رہے، اور لوگوں میں امن وامان اور استقرار قائم رہے تاکہ لوگ پورے اطمینان وسکون اور امن کے ساتھ بہتر زندگی گزاریں اور دنیا وآخرت کے واجبات کی ادئیگی

کر سکیں، چنانچہ فرمان باری تعالی ہے: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِصَاصُ فِى ٱلْقَتْلَى ﴾ "اے ایمان والو تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے" ۔ آیت کی ابتداء ندا سے ہے اور یہ ندا مومنوں کو دی جارہی ہے ، کیوں کہ شرائع اسلام کے نفاذ اور تطبیق کا اہتمام اللہ پر ایمان رکھنے والے ہی کرتے ہیں، آیت میں وضاحت ہے کہ یہ تمہارے اوپر فرض ہے اور مقتول کے حق میں عدل و مساوات کو بروئے کار لانے کے لیے اس کی تطبیق ضروری ہے، آیت کے اسلوب کا یہی تقاضا ہے ، یعنی یہ لازمی امر ہے، اس کا مقصد بندوں کے درمیان قتل کے جرائم کو لے کر عدل وانصاف کی فضا قائم کرنا ہے ، اس سے یہ معلوم ہوا کہ معاشرے کے تمام سر برآوردہ افراد پر بغیر کسی مجاملت اور حق کی پردہ پوشی کیے اللہ کے فرائض کی حمایت ضروری ہے، بلکہ حاکم وقت کے ذمہ فرائض کا نفاذ اور عوام پر اس کی بجاآوری واجب ہے، یہاں تک کہ قاتل کے متعلقین اور خاندان والوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ فرائض کے نفاذ میں حاکم وقت کا ساتھ دیں اور قاتل کی پردہ پوشی کرتے ہوئے کوئی اسے پناہ نہ دے، کیوں کہ ایسا کرکے وہ گویا قاتل سے جس پر کہ قصاص واجب ہو چکا ہے اللہ کے فیصلہ کو روک رہا یا چھپا رہا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی قصاص کی مزید تفصیل بیان کر رہا ہے: ﴿ ٱلْحُرُّ بِٱلْحُرِّ وَٱلْعَبْدُ بِٱلْعَبْدِ وَٱلْأُنثَىٰ بِٱلْأُنثَىٰ ﴾ "آزاد، آزاد کے بدلے، غلام ، غلام کے بدلے عورت ، عورت کے بدلے"۔ امام قرطبی فرماتے ہیں: علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ آیت قتل کی نوعیت کا حکم بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے جب وہ اپنے ہی قسم کے فرد کو قتل کرے، یعنی جب کسی آزاد کو کوئی آزاد قتل کرے، اور کوئی غلام کسی غلام کو قتل کرے، اور کوئی عورت کسی عورت کو قتل کرے تو ان کا یہ حکم ہے[1] ۔ اور مفسرین کا بیان ہے کہ اس آیت کا ایک سبب نزول ہے اور یہ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو قصاص کے تعلق سے ظلم و زیادتی کرتے تھے، چنانچہ جب کوئی غلام قتل کیا جاتا تو مقتول کے ورثاء سرکشی اور حد سے آگے بڑھتے ہوئے اس کے بدلے میں کسی آزاد کے قتل کا مطالبہ کرتے[2]۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم نے بہت سارے ایسے مروج امور کا سدھار کیا جو اگر ایسے ہی چھوڑ دیے جاتے تو مستقبل میں

---

(١) تفسير قرطبي ٢/١٦٥.

(٢) تفسير ابن كثير ١/٢١٥ ، زاد المسير ١/١٦٣ وغيره.

بھی اسی طرح باقی رہتے، چنانچہ اللہ تعالی نے اپنی شریعت کے ذریعہ مسلمانوں کی آئندہ کی زندگی کو منظم کیا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ آیات کا صحیح مطلب سمجھنے کے لیے اسباب نزول اور ناسخ ومنسوخ کی معرفت اور ایک حکم سے مربوط تمام آیات کا جمع کرنا ضروری ہے تبھی آیت کے صحیح مفہوم تک رسائی ہو سکتی ہے، کیوں کہ قصاص ہی کے تعلق سے سورہ مائدہ میں اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ ٱلنَّفْسَ بِٱلنَّفْسِ﴾ [سورة المائدة:٤٥]۔ "اور ہم نے یہودیوں کے ذمہ تورات میں یہ بات مقرر کردی تھی کہ جان کے بدلے جان ہے"۔ (یعنی اس میں غلام آزاد کے درمیان کوئی تفریق نہیں) ،اس لیے بہت ہی خطرناک غلطی ہے کہ کسی آیت کو اس قسم کی دوسری آیتوں سے یا اس آیت کی شرح وتوضیح میں وارد سنت مطہرہ سے الگ کرکے کوئی مفہوم اخذ کیا جائے، یہ ساری چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ منہج اسلام عقل کی پختگی اور فکری بلندی کا سبب ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء شریعت عقل وفکر کے اعتبار سے سب سے بہتر ہوتے ہیں، اسی لیے علماء کرام تفسیر وفقہ کی کتابوں میں قتل وغیرہ کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے فقہی احکامات کا بالتفصیل ذکر کرتے ہیں۔ حتی کہ کسی ذمی کے قتل اور اس کی مال کی چوری وغیرہ کا بھی حکم بیان کرتے ہیں ،اس سے معلوم ہوا کہ ان حدود کو لاگو کرکے شریعت اسلامیہ نے ایک طرف انسانی زندگی کو روشن اور تابناک بنایا تو دوسری طرف فقہی احکامات کی تفصیلی گیرائی، دلائل کے مفاہیم کی چھان بین اور کتاب وسنت کے دلائل کے مابین ربط وتعلق کے ذریعہ علماء کی فہم وفراست کو جلا بخشی ، یہاں تک کہ فقہ اسلامی ایک معیاری اور اعلی مکتب فکر کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا اور مسلمان اپنی طرف سے ایسی کسی بھی قانون سازی سے بالکل بے نیاز ہوگئے جس پر لوگوں کا اتفاق ناممکن ہے، فالحمد والشکر للہ تعالی۔

اس کے بعد آیت کریمہ میں عفو ودرگذر کا بیان ہے اور یہ عفو درگذر مقاصد شریعت میں سے ایک مقصد ہے جس کا تعلق مسلمانوں کے باہمی امور سے ہے، فرمایا: ﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهُۥ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ﴾ "ہاں جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے"۔ آیت میں اخوت اور بھائی چارگی کو ثابت کیا گیا ہے، حتی کہ معاملہ قتل کا ہے اس کے باوجود اللہ تعالی نے قاتل اور وارث مقتول کے تعلق کو اخوت سے تعبیر کیا ہے: ﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهُۥ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ﴾ "ہاں جس کسی کو

اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے" ۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ قتل کے ان معاملات کی وجہ سے اسلامی اخوت وبھائی چارگی ختم نہیں ہوتی۔ توجو کوئی تنازل کرتے ہوئے قاتل سے قصاص نہ لے کر دیت پر راضی ہو جائے یا بغیر دیت کے سرے سے معاف کر دے۔ دیت کی صورت میں مقتول کی ولی کو چاہئے کہ قاتل کے ساتھ خیر وبھلائی کا معاملہ کرتے ہوئے دیت کا مطالبہ کرے : ﴿فَٱتِّبَاعٌۢ بِٱلۡمَعۡرُوفِ وَأَدَآءٌ إِلَيۡهِ بِإِحۡسَٰنٖۗ﴾ "اسے بھلائی کی اتباع کرنی چاہیے اور آسانی کے ساتھ دیت ادا کرنی چاہیے"۔ یعنی مقتول کا ولی اپنے قاتل بھائی کے بارے میں بھلائی کی اتباع کرے ،یعنی دیت ایسے طریقے سے وصول کرے کہ اس پر شاق نہ گزرے، یا اتنی زیادہ دیت کا مطالبہ نہ کرے کہ قاتل کے اندر اس کے ادائیگی کی طاقت ہی نہ ہو، بلکہ اچھے طریقے سے تقاضا اور مطالبہ کرے ، اور اسے دیت میں ایسی چیز کا مطالبہ نہ کرے جس کے ادا کرنے سے وہ عاجز ہو ، اور اسی کے مد مقابل قاتل پر واجب ہے کہ اچھی طرح سے دیت ادا کر دے: ﴿وَأَدَآءٌ إِلَيۡهِ بِإِحۡسَٰنٖۗ﴾ " آسانی کے ساتھ دیت ادا کرنی چاہیے "یعنی خون بہا میں ٹال مٹول اور قولی وفعلی تکلیف پہنچائے بغیر دیت کو ادا کر دے۔ یہ رب رحیم وکریم کی طرف سے انتہائی اعلی درجے کی توجیہ ہے کہ اس نے اشارے اشارے میں مقتول کے اولیاء کو عفو ودر گذر پر ابھارا ہے، اور قاتل اور مقتول کے اولیاء کے مابین تعامل کے آداب بیان کرتے ہوئے اس بات پر کافی زور دیا کہ فریقین آپس میں دینی بھائی ہیں: ﴿فَمَنۡ عُفِيَ لَهُۥ مِنۡ أَخِيهِ شَيۡءٞ﴾ "ہاں جس کسی کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دے دی جائے"۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے اس حکم میں اپنی رحمت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ذَٰلِكَ تَخۡفِيفٞ مِّن رَّبِّكُمۡ وَرَحۡمَةٞۗ﴾ "تمہارے رب کی طرف سے یہ تخفیف اور رحمت ہے "۔ یعنی قصاص کا حکم اور عفو ودر گذر کی مہلت تم پر اللہ تعالی کی طرف سے تخفیف اور اس کی رحمت ہے ، فالشکر والحمد للہ۔ اس لیے اللہ تعالی نے ہم پر جو شرعی احکامات نازل فرمائے اس کی بنیاد پر ہمیں اس کا شکر گذار ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ سارے احکامات اس کی ظاہری وباطنی رحمت پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالی جو بھی حکم دیتا یا فیصلہ کرتا ہے یا جس چیز سے بھی منع کرتا یا روکتا ہے یہ سب اللہ تعالی کی رحمت کا ثبوت ہیں، اور اللہ اپنے اس دین کی وجہ سے بندوں کو کسی مشکل اور پریشانی میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

ممکن ہے قصاص کے نفاذ یا خون بہا کی حصولی یا مسئلہ ہذا میں فریقین کے درمیان مکمل معافی کے بعد ظلم وزیادتی ہو جائے اس لیے اللہ تعالی نے فوراًاس کے بعد اس ظلم وزیادتی کی سزا بھی بیان کردی، فرمایا: ﴿فَمَنِ ٱعۡتَدَىٰ بَعۡدَ ذَٰلِكَ فَلَهُۥ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ " اس کے بعد بھی جو سرکشی کرے اسے دردناک عذاب ہوگا"۔ یہ سزااس لیے بیان کی گئی تاکہ زیادتی کرنے والا اپنی زیادتی سے باز رہے اور فریقین کے بیچ مزید شر وفساد نہ پھیلنے پائے اور اس وعید شدید کے ذریعہ شر وفساد وہیں پر رک جائے ۔ ﴿فَمَنِ ٱعۡتَدَىٰ بَعۡدَ ذَٰلِكَ فَلَهُۥ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ یہ شریعت اسلامیہ کی گہرائی وگیرائی اور اس کے دوام وہمیشگی کی دلیل ہے کہ اس نے لوگوں کے ذریعہ برپا کئے گئے ایک شر کے بعد دوسرے شر کے امکانات پر بھی احکامات جاری کئے تاکہ تمام تکلیف دہ مسائل کا علاج اور لوگوں کے درمیان واقع ہونے والے سارے فسادات کا جڑ سے خاتمہ کیا جاسکے، کیوں کہ یہ شریعت اس ذات باری تعالی کی جانب سے نازل کی ہوئی ہے جو تمام چیزوں کا علم رکھنے والا اور حکمت والا ہے۔اس کے بعد اللہ تعالی بیان کررہاہے کہ قصاص کا یہ حکم الہی بہت بڑی نعمت ہے: ﴿ وَلَكُمۡ فِي ٱلۡقِصَاصِ حَيَوٰةٞ يَٰٓأُوْلِي ٱلۡأَلۡبَٰبِ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ﴾ " عقلمندو! قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے اس کے باعث تم (قتل ناحق سے) رکوگے "۔یعنی قصاص جس میں قاتل پر حد نافذ کی جاتی ہے، یا خون بہا قبول کرلینے، یا مطلقا معاف کردینے میں ہی لوگوں کی زندگی ہے،اوراس حکم کے نفاذ کے ذریعہ لوگوں کی آپسی زندگی محفوظ ہوسکتی ہے، کیوں کہ جب قصاص کا نفاذ ہوگا تو طبیعتیں اپنی گمراہی، سرکشی اور تشدد سے باز رہیں گی،اور قصاص کے خوف سے دل بیدار رہیں گے کہ اگراس نے اس جرم کا ارتکاب کیا تواس کا انجام قصاص کی صورت میں اسے بھگتنا ہوگا، کیوں کہ جب کوئی بھی قتل ہوگا تو عنقریب قاتل کو بھی شرعی طور قتل ہونا ہے،اس لیے جس کسی کا کوئی حق اس کے مسلم بھائی کے پاس ہو تو شریعت کے دائرے میں رہ کر اس کا مطالبہ کرے اور اس کا قتل کرکے ظلم وزیادتی کا مرتکب نہ ہو۔ یہیں سے حاکم کے وجود، حکومت کا قیام اور اس حکومت کے اثر ورسوخ اور قوت کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے،تاکہ شریعت الہی کی تطبیق وتعمیل ہوسکے، نیز شریعت کے نفاذ اور تطبیق میں عوام الناس کو بھی حاکم وقت کے شانہ بہ شانہ اوراس کا دست وبازو بن کر رہنا چاہیے۔

آیت کی تکمیل فرمان الٰہی: ﴿لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ﴾ "اس کے باعث تم (قتل ناحق سے) رکو گے "۔ یعنی اللہ تعالی کی شریعت کے نفاذ سے ہی تقوی کا حصول اور ناحق قتل کے ارتکاب سے بچا جا سکتا ہے، اور اللہ تعالی کے احکامات کے سامنے جھک جانے میں ہی اللہ تعالی کا تقوی ہے ،اور جب اللہ تعالی کا تقوی ہو گا تو آدمی قتل جیسے جرم کے ارتکاب سے دور رہے گا، لہذا تقوی ہی سے یہ سب کچھ متحقق ہو سکتا ہے اور جب یہ سب متحقق ہو تو یہی تقوی کی دلیل ہے۔

﴿ كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلۡمَوۡتُ إِن تَرَكَ خَيۡرًا ٱلۡوَصِيَّةُ لِلۡوَٰلِدَيۡنِ وَٱلۡأَقۡرَبِينَ بِٱلۡمَعۡرُوفِۖ حَقًّا عَلَى ٱلۡمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنۢ بَدَّلَهُۥ بَعۡدَ مَا سَمِعَهُۥ فَإِنَّمَآ إِثۡمُهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُۥٓۚ إِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٞ ﴿١٨١﴾ فَمَنۡ خَافَ مِن مُّوصٖ جَنَفًا أَوۡ إِثۡمٗا فَأَصۡلَحَ بَيۡنَهُمۡ فَلَآ إِثۡمَ عَلَيۡهِۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ﴿١٨٢﴾ ﴾

ترجمہ:

"تم پر فرض کر دیا گیا کہ جب تم میں سے کوئی مرنے لگے اور مال چھوڑ جاتا ہو تو اپنے ماں باپ اور قرابت داروں کے لئے اچھائی کے ساتھ وصیت کر جائے ، پرہیزگاروں پر یہ حق اور ثابت ہے(۱۸۰)۔ اب جو شخص اسے سننے کے بعد بدل دے اس کا گناہ بدلنے والے پر ہی ہو گا، واقعی اللہ تعالی سننے والا اور جاننے والا ہے(۱۸۱)۔ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی جانبداری یا گناہ کی وصیت کر دینے سے ڈرے ، پس وہ ان میں آپس میں صلح کرا دے تو اس پر گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے(۱۸۲)"۔

اس کے بعد قرآنی سیاق میں مسلمانوں کو تعلیم دی جارہی ہے کہ جب موت کے اسباب ظاہر ہونے لگیں تو وصیت کرنے میں جلدی کریں ، ارشاد ربانی ہے : ﴿ كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلۡمَوۡتُ إِن تَرَكَ خَيۡرًا ﴾ "تم پر فرض کر دیا گیا کہ جب تم میں سے کوئی مرنے لگے اور مال چھوڑ جاتا ہو تو وصیت کر جائے"۔ (كُتِبَ) یعنی اے مومنو! جب موت کے اسباب اور علامتیں پائی جانی لگیں ، جیسے کہ ایسی بیماری جس سے شفایابی کی امید نہ ہو، یا ایسے حالات و مصائب جن میں قتل کا غالب گمان ہو یا اسی طرح کے دیگر احوال تو جس کو اللہ تعالی نے مال و دولت کی فراوانی دی ہو (إِن تَرَكَ خَيۡرًا) کا یہی مفہوم ہے، تو ایسا شخص اللہ تعالی کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے "اپنے ماں باپ اور قرابت داروں کے لئے اچھائی

کے ساتھ وصیت کر جائے ،پرہیزگاروں پر یہ حق اور ثابت ہے"۔یعنی جب وہ بہت زیادہ مال وغیرہ چھوڑ جاتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ اس مال میں سے اپنے والدین اور قرابت داروں کے لیے وصیت کر جائے ،اور قرابت داروں کی وصیت میں ان کی حاجت وضرورت اور فقر وفاقہ کے حساب سے ترتیب کو ملحوظ رکھے، یقینا یہ وصیت تقوی کے اسباب میں سے ہے،اور یہ وصیت اس پر حق ہے جو تقوی کی صفت سے متصف ہو،اور پھر یہ وصیت وصیت کرنے والے کے تقوی کی دلیل ہے۔

اس وصیت کے مسئلہ میں علماء کے یہاں تفصیل ہے کہ کیا وصیت ثلث مال میں ہے ؟اور کیا یہ ثلث کی وصیت مال کثیر میں ہے قلیل میں نہیں؟اور کیا اس کا تعلق ایسے والدین سے ہے جو وارث نہ ہوں ؟ ان تمام مسائل کے فقہی احکامات کتب تفسیر اور میراث سے متعلق کتب فقہ میں دیکھے جا سکتے ہیں ؟البتہ یہاں آیت سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے انسان،اس کے مال اور اس کے قرابت داروں کا کافی خیال رکھا ہے،چاہے اس کی حفاظت کا معاملہ ہو یا اس کی تقسیم کا یا باہمی الفت ومحبت کا ،اسی طرح اس ارشاد باری کی گہرائی اور گیرائی جو کہ علمی، فکری، اہداف ومقاصد اور انجام ہر اعتبار سے ذہن ودماغ کے بالکل موافق ہے،اس سے دل میں اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے،اور انسان کو یہ بھی ادراک ہو جاتا ہے کہ اس شریعت کا اللہ تعالی کے علاوہ کسی اور کی جانب سے ہونا ناممکن ہے، کیوں کہ یہ شریعت اپنی گہرائی وگیرائی،توضیح وبیان اور احکامات میں مکمل طور سے ایک معجزہ ہے۔ فنحمد الله تعالى ونشكره۔

اس کے بعد اللہ تعالی اس شخص کا حال بیان کر رہا ہے جو وصیت کے وقت حاضر رہا اور حاضرین سے یا ورثاء سے اس وصیت سے باخبر ہونے کے باوجود بعد میں وصیت کرنے والے کی اس وصیت کو بدل دیتا ہے ، فرمایا: ﴿فَمَنۢ بَدَّلَهُۥ بَعۡدَ مَا سَمِعَهُۥ فَإِنَّمَآ إِثۡمُهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُۥٓۚ﴾ "اب جو شخص اسے سننے کے بعد بدل دے اس کا گناہ بدلنے والے پر ہی ہو گا"،اور وصیت کرنے والے کو تو اس کی وصیت کا اجر اللہ تعالی کے وہاں مل جائے گا، ہاں گناہ اس شخص کے سر آئے گا جو وصیت سننے کے بعد اس میں ہیر پھیر کرتے ہوئے تبدیل کر ڈالے، ﴿إِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٞ﴾ "واقعی اللہ تعالی سننے والا اور جاننے والا ہے" ، لہذا اللہ تعالی نے یقینا وصیت کرنے والے کی وصیت کو سن رکھا ہے اور اس کو تمہارے وصیت کے سننے اور جاننے کا بخوبی علم ہے،اور اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس وصیت کا کیا بنا،ایا اس کا نفاذ ہوا یا اس میں پھیر

بدل کر دیا گیا۔ تو پھر جس ذات کا علم اور سمع تم کو احاطہ کیے ہوئے ہے تو تم کو سوائے اس کے کچھ زیب نہیں دیتا کہ تم ایک مومن کی روش اپناؤ جس کو اس بات کا علم ویقین ہے کہ اللہ تعالی خوب سننے اور جاننے والا ہے، کیوں کہ جس کو اس بات کا یقین ہو گا وہ ضرور اس ذات سے ڈرے گا جو اسے اپنے سمع و علم اور قدرت کے اعتبار سے احاطہ میں لیے ہوئے ہے، چنانچہ یہ توجیہ وہدایت الہی کافی بلیغ اور سننے والے اور اس کے معنی ومفہوم کو سمجھنے والے کے لیے انتہائی اثر انداز ہے۔

چونکہ بسا اوقات وصیت کرنے والا ظلم وزیادتی اور جانب داری کا شکار ہو جاتا ہے، اور یہ جور وظلم یا تو نادانی یا بعض ورثاء کی جانب داری کی بنیاد پر ہوتا ہے یا کسی حیلہ یا سبب یا کسی بھی طرح کی ضرر رسانی کے ذریعہ ، اسی لیے اللہ تعالی نے یہ مصلحت آمیز عمدہ توجیہ فرمائی: ﴿فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ "ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی جانبداری یا گناہ کی وصیت کر دینے سے ڈرے ، پس وہ ان میں آپس میں صلح کرا دے تو اس پر گناہ نہیں، اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے"۔ یہاں پر اللہ تعالی کی بندوں کے ساتھ عنایت کا ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ بسا اوقات انسان سے غلطی بغیر ارادے کے ہو جاتی ہے اور کبھی عمدا اور جان بوجھ کر بھی، اس لیے اللہ تعالی نے اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا: ﴿فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا﴾ "ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی جانبداری سے ڈرے" ، (جنف) کہتے ہیں بغیر قصد وارادے کے حق اور صواب سے ہٹ جانے کو، ﴿أَوْ إِثْمًا﴾ "یا گناہ کی وصیت" ، اثم قصدا اور جان بوجھ کر حق سے نکل جانے کو کہتے ہیں، اس لیے دونوں صورتوں میں وصیت کرنے والے کو وصیت کے وقت موجود کسی نصیحت کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ وصیت کا عمل بحسن وخوبی انجام پائے اور وصیت کرنے والے اور جس کے لیے وصیت کی جارہی ہے دونوں کے متعلق صلح وآشتی برقرار رہے، اس لیے جو وصیت کے وقت موجود ہو اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ نصیحت کے اس کام کو بجالائے، ایسا کرنے پر اس کو کوئی گناہ نہیں: ﴿فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ﴾ ، اس توجیہ ربانی میں اللہ رب العالمین ان خدشات اور احتمالات کو ختم کر رہا ہے جو وصیت کے وقت موجود شخص کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں کہ یہ وصیت تو وصیت کرنے والے کا اپنا معاملہ ہے، اس کے لیے کیا ضروری ہے کہ اسے منع کرے یا وصیت میں ظلم وزیادتی سے

روکے ، چنانچہ روشن اور تابناک شریعت اسلامیہ نے اس طرح کے جتنے خدشات ہو سکتے تھے سب کا خاتمہ کر دیا، اللہ کی قسم یہ اس شریعت الٰہی کی گیرائی ہے کہ اس نے ایسی ایسی باریکیوں کو واضح کیا ہے جس سے کوئی انسان پہلے سے آگاہ نہیں ہو سکتا، اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ وہ ذات علیم وخبیر ہے۔

شیخ ابن السعدی رحمہ اللہ تعالی اس آیت کی تفسیر میں ذکر کرتے ہیں کہ (١) : جو شخص وصیت کے وقت موجود رہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وصیت کرنے والے کو عدل وانصاف اور نیکی کی نصیحت اور جور وظلم سے منع کرے ، پھر بھی اگر وصیت کرنے والا عمداً جور وظلم پر آمادہ ہو اور نصیحت پر عمل نہ کرے تو ایسی صورت میں وصیت کے وقت موجود شخص کے لیے مناسب یہی ہے کہ ان لوگوں کے مابین صلح کرادے جن کے حق میں وصیت کی گئی ہے، اور کسی طرح باہمی رضامندی اور صلح ومصالحت کے ذریعہ ان کے مابین عدل وانصاف کی کوشش کرے، اور انہیں وصیت کرے کہ وہ اپنے مرنے والے کی ذمہ داری کو پورا کریں، اس کا یہ عمل واقعی بڑی نیکی کا کام ہے اور ان پر کوئی گناہ نہیں جیسے کہ اس شخص پر گناہ ہوتا ہے جو جائز وصیت کو تبدیل کرتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے آیت کا اختتام اپنے فرمان: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ " اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے"۔ سے کیا، یہ مغفرت الٰہی اس شخص کے لیے ہے جس سے بغیر قصد وارادے کے غلطی کا صدور ہو جاتا ہے، اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ انسان سے غلطی ہو جایا کرتی ہے، نیز اس سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوا کہ انسان بسااوقات جان بوجھ کر بھی غلطی کرتا ہے، حتی کہ ایسے وقت میں بھی وہ اس کا مرتکب ہو جاتا ہے جب وہ دنیا چھوڑ کر آخرت کی طرف جارہا ہو، اسی طرح نفسیاتی اثرات ، محبت ومیلان اور کراہت وبغض انسان کے ساتھ اس کی زندگی کی آخری گھڑی تک لگے رہتے ہیں، اس لیے یہ چیز اس بات کی متقاضی ہے کہ انسان اپنی نفسیاتی کیفیات سے آگاہ رہے اور اس کو قابو میں کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتا رہے، اور ہر حال میں اللہ تعالی کے پاس جو کچھ ہے اسی کی طلب نفس پر غالب رہے ، اور آدمی کو کسی چیز کی محبت یا کراہیت اسے جور وظلم اور زیادتی پر آمادہ نہ کرے۔ ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ١٨٣ أَيَّامًا

(١) تفسير ابن السعدي ١/١٤٢-١٤٣.

مَّعۡدُودَٰتٖۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوۡ عَلَىٰ سَفَرٖ فَعِدَّةٞ مِّنۡ أَيَّامٍ أُخَرَۚ وَعَلَى ٱلَّذِينَ يُطِيقُونَهُۥ فِدۡيَةٞ طَعَامُ مِسۡكِينٖۖ فَمَن تَطَوَّعَ خَيۡرٗا فَهُوَ خَيۡرٞ لَّهُۥۚ وَأَن تَصُومُواْ خَيۡرٞ لَّكُمۡۖ إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ ﴿١٨٤﴾ شَهۡرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلۡقُرۡءَانُ هُدٗى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٖ مِّنَ ٱلۡهُدَىٰ وَٱلۡفُرۡقَانِۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوۡ عَلَىٰ سَفَرٖ فَعِدَّةٞ مِّنۡ أَيَّامٍ أُخَرَۗ يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلۡعُسۡرَ وَلِتُكۡمِلُواْ ٱلۡعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُواْ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُونَ ﴿١٨٥﴾﴾

ترجمہ:

"اے ایمان والو تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو(۱۸۳)۔ گنتی کے چند دن ہیں لیکن تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ اور دنوں میں گنتی پورا کرلے ، اور اس کی طاقت رکھنے والے ، فدیہ میں ایک مسکین کو کھانا دیں، پھر جو شخص نیکی میں سبقت کرے وہ اس کے لئے بہتر ہے ، لیکن تمہارے حق میں بہتر کام روزے رکھنا ہی ہے اگر تم با علم ہو(۱۸۴)۔ ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ، جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت کی حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے اسے روزہ رکھنا چاہیے، ہاں جو بیمار ہو یا مسافر ہو اسے دوسرے دنوں یہ گنتی پوری کرنی چاہیے اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے سختی کا نہیں ، وہ چاہتا ہے تم گنتی پوری کرلو اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائیاں بیان کرو اور اس کا شکر ادا کرو(۱۸۵)"۔

ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ روزے کی فرضیت کا حکم بیان کررہاہے: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ﴾" اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو"۔ آیت کریمہ کی شروعات میں اسلوب ندا کے ذریعہ مومنین کو مخاطب کیا جارہاہے، جس سے اس چیز کی اہمیت ثابت ہوتی ہے جس کے لیے یہ ندا دی جارہی ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو ایمان کی

امتیازی صفت سے مخاطب کررہا ہے: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ﴾ اور یہ بہت بڑے شرف ومنزلت کی چیز ہے، گویا یہ کہا جارہا ہے کہ اے وہ لوگو! جو ان چیزوں پر ایمان لائے جو تم تک پہنچا۔

یہ کتنے زیادہ شرف کی بات ہے کہ ہمارا رب اپنے بندوں کو ایمان کے اعلی وارفع مرتبے کے ساتھ ندادے رہا ہے ، پھر اس ندا کے بعد ان پر روزے کی فرضیت کو بیان کیا جارہا ہے، ہو بہو یہی اسلوب ندا آیت قصاص اور آیت وصیت میں بھی ہے ، جیسا کہ فرمان باری تعالی ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡقِصَاصُ﴾ [سورة البقرة:١٧٨]۔ "تم پر مقتولوں کا قصاص لینا فرض کیا گیا ہے" نیز فرمایا: ﴿ كُتِبَ عَلَيۡكُمۡ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلۡمَوۡتُ إِن تَرَكَ خَيۡرًا ٱلۡوَصِيَّةُ ﴾ [سورة البقرة: ١٨٠]۔"تم پر فرض کر دیا گیا کہ جب تم میں سے کوئی مرنے لگے اور مال چھوڑ جاتا ہو تو وصیت کر جائے"۔اسی طرح اس روزہ کی فرضیت والی آیت میں فرمایا: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ ﴾ (كُتِبَ)یعنی تم پر فرض اور واجب کیا گیا ہے۔ اور روزہ کی فرضیت کا یہ حکم ہجرت کے دوسرے سال نازل ہوا ، لفظ(كُتِبَ) یہ وجوب پر دلالت کرتا ہے، یہ مامور بہ اور جس کا اللہ تعالی نے تاکیدی حکم دیا ہے اس کی اہمیت کی دلیل ہے۔

اللہ تعالی نے روزے کی فرضیت کے تعلق سے یہ وضاحت کر دیا کہ یہ روزہ اگلی امتوں پر بھی فرض کیا گیا تھا:﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ ﴾" اے ایمان والو تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے "۔اس خبر اور جانکاری دینے کا مقصد یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اس حکم کی تعمیل میں اگلوں پر سبقت لے جانے پر ابھارا جائے، نیز یہ حکم صرف تمہارے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عبادت ہے جو تم پر اور تم سے پہلے کی امتوں پر فرض کی گئی ہے ،تاکہ کہیں یہ خدشہ اور خیال نہ پیدا ہو کہ یہ تو ایک سزا ہے۔اور طبیعت پر روزے کی مشقت اور گرانی کا احساس نہ ہو، نیز یہ روزہ تقوی میں اضافہ اور تقویت کا سبب ہے، بلکہ اس کے ذریعہ اعلی مقامات تک رسائی ہوتی ہے۔ ﴿لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ﴾" تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو"۔ یہ اللہ تعالی کا اپنے بندوں کے ساتھ لطف وکرم ہے کہ اس نے روزے کے متعلق لوگوں میں اپنی سنت اور اس کے عظیم فائدہ یعنی حصول تقوی کو بیان کر دیا،اس سے معلوم ہوا کہ روزہ مسلمان کے اندر تقوی پیدا کرتا ہے ،کیوں کہ ایک روزہ دار محض اللہ تعالی کے لیے کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے، تو اللہ تعالی بھی اس

عظیم عبادت کے بدلے میں اسے تقوی سے نوازتا ہے ، اور یقینا روزہ شیطان رجیم کے ہتھکنڈوں اور راستوں سے بچاو کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اس کے علاوہ اس روزے کے اور بھی بہت سارے نفسیاتی، اخلاقی اور جسمانی فائدے ہیں، نیز اس کے عظیم اجر وثواب کے متعلق کثیر تعداد میں احادیث نبویہ موجود ہیں۔

اللہ تعالی نے روزوں کی مدت بھی بیان کر دی تا کہ طبیعت پر کوئی گرانی محسوس نہ ہو، اور اس کے لیے ایسی تعبیر کا استعمال کیا جس سے تعداد کی قلت کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ﴾ " گنتی کے چند دن ہیں "۔ یعنی یہ بہت زیادہ دن نہیں بلکہ گنتی کے چند دن ہیں، روزے کی فرضیت کے ضمن میں اپنے بندوں کے ساتھ اللہ تعالی کا یہ لطف و کرم بھرا انداز اس کی رحمت کا ثبوت ہے، اس لیے بندوں کو بھی تربیتی، دعوتی اور نصیحت کے مجالات میں ایک دوسرے کی توجیہ اور رہنمائی کے وقت اسی رحم، اور لطف و کرم اور نرمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے ، اسی طرح زندگی کی ہر جہت میں دوسروں کے ساتھ معاملات کے وقت بھی۔ جیسے کام وکاج کے میدان میں، یا معاشرے کے افراد کے باہمی تعاون کے میدان میں، غرض یہ کہ ہر حال میں ہمیں لطف و کرم اور نرمی کا رویہ اپنانا چاہیے ، الا یہ کہ کوئی ایسا معاملہ در پیش ہو جہاں نرمی کی بجائے سختی کی ضرورت ہو۔

اس کے بعد مریض اور مسافر سے روزہ کی مشقت کو معاف کر کے اللہ تعالی کی رحمتوں کا سلسلہ جاری ہے ، فرمایا: ﴿فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ " لیکن تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ اور دنوں میں گنتی پورا کرلے "۔ یہ اسلامی عبادات کی فرضیت کی عمدگی اور گیرائی ہے کہ اس میں ان ممکنہ امور کی رعایت کی گئی ہے جو فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ بن سکتے ہیں، چنانچہ شریعت میں مشقت اور پریشانی دور کرنے والے احکامات بھی بیان کر دیے گئے ہیں، احتیاطی تدابیر کے اس معیار کے بعد شک وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ احکامات کی یہ باریکی ممکن ہی نہیں ہے کہ علم وحکمت اور رحمت والے اللہ تعالی کے علاوہ کسی اور سے صادر ہو سکے۔

اس کے بعد آیت میں ایک دوسری قسم کے روزہ دار کے احوال کا بیان ہے : ﴿ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾ " اور اس کی طاقت رکھنے والے ، فدیہ میں ایک مسکین کو کھانا دیں "۔ یہ وہ لوگ ہیں جو طاقت والے ہیں اور روزہ رکھ بھی سکتے ہیں لیکن کسی سبب سے روزہ ان پر

شاق گزرتا ہے، توانہیں اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں، یہ حکم روزہ کی فرضیت کے ابتدائی ایام میں تھا، پھر جواز کا یہ حکم منسوخ کردیا گیا جس کا بیان ان شاء اللہ آگے آرہا ہے، اس حکم میں بھی اللہ تعالی نے روزہ رکھنے کو روزہ نہ رکھنے سے افضل قرار دیا ہے ،تاکہ روزہ نہ رکھ کر کھانا کھلانے سے روزہ رکھنے کی طرف لوگوں کا رجحان ہو، فرمایا: ﴿فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُۥ ۚ وَأَن تَصُومُوا۟ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ " پھر جو شخص نیکی میں سبقت کرے وہ اس کے لئے بہتر ہے ، لیکن تمہارے حق میں بہتر کام روزے رکھنا ہی ہے اگر تم با علم ہو "۔ اللہ تعالی کے فرمان ﴿فَمَن تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُۥ﴾ " پھر جو شخص نیکی میں سبقت کرے وہ اس کے لئے بہتر ہے "۔ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ہر دن کے بدلے ایک مسکین سے زیادہ کو کھلاتا ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے، اور اگر وہ روزہ رکھتا ہے تو یہ کھلانے سے بہتر ہے۔ اس کے قائل سلف میں سے عبد اللہ بن مسعود ، ابن عباس رضی اللہ عنہم ، مجاہد، طاؤوس اور مقاتل وغیرہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ کی توجیہات وہدایات میں انسانی طبیعت کی مکمل رعایت کرتے ہوئے نزول احکام میں تدریج کا لحاظ رکھا گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ افضل واکمل پر آمادہ اور اسی کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے ،اسی طرح تربیتی اور پیشہ وارانہ کارکردگی کے میدان میں توجیہ وارشاد کے وقت لوگوں کے احوال کی رعایت ، لوگوں کی صلاحیتوں کے مابین فرق کا لحاظ واحتیاط کافی اہم ہے ، ساتھ ہی جو صلاحیت میں دوسروں سے کمزور ہیں انہیں یوں ہی نظر انداز نہ کیا جائے ، بلکہ ان پر بھی توجہ رکھتے ہوئے انہیں مناسب مقام دینا چاہیے اور پھر انہیں خود کو احسن واکمل کی طرف آگے بڑھانے کی ترغیب دلائی جائے، کیوں کہ جب اللہ تعالی نے عبادات اور اپنے بندوں کے معاملات میں شفقت اور نرمی کو ملحوظ رکھا ہے اور انہیں بہتر کرنے کی حوصلہ افزائی کی اور ترغیب دلائی ہے تو لوگوں کو اپنے باہمی معاملات میں بدرجہ اولی یہی روش اختیار کرنی چاہیے۔

اللہ تعالی کے فرمان ﴿وَأَن تَصُومُوا۟ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ " لیکن تمہارے حق میں بہتر کام روزے رکھنا ہی ہے اگر تم با علم ہو "۔ میں لوگوں کو اس علم کا حوالہ دیا گیا ہے جو انہیں روزہ کی اجازت سے متعلق حاصل ہوا وہ یہ کہ جو روزہ کی طاقت رکھے لیکن روزہ رکھنا اس کے

لیے مشقت کا باعث ہو تو اس کو اس کے بدلے ایک یا ایک سے زیادہ مسکین کو کھانا کھلانا ہے ، ساتھ ہی روزہ رکھنے کی حوصلہ افزائی کی گئی کیوں کہ یہی زیادہ بہتر اور افضل ہے، ﴿وَأَن تَصُومُواْ خَيۡرٞ لَّكُمۡۖ إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ﴾ " لیکن تمہارے حق میں بہتر کام روزے رکھنا ہی ہے اگر تم با علم ہو "۔ یعنی فاضل و مفضول کی جانکاری کے بعد علم کو افضل کے اختیار کی بنیاد قرار دیا: ﴿إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ﴾ " اگر تم با علم ہو "۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے اختیار کے ساتھ افضل کی تشجیع بھی ہونی چاہیے، توجیہ کا یہ اسلوب انتہائی اعلی اور اچھوتا ہے، ہم اللہ تعالی کے شکر گذار ہیں کہ شریعت کے نزول کے منہج اور طریقہ پر قیاس کرتے ہوئے ہم اپنی معمول کی زندگی میں بھی ان سے مستفید ہو سکتے ہیں ،اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک مسلمان دعوتی وتربیتی، خاندانی، سماجی، مہنی اور اداری مجالات میں قرآن کریم کے ان توجیہی مناہج واسالیب کا کس قدر کردار ادا کرتا ہے۔

روزہ کی فرضیت کے متعلق بعد کی آیت میں مدح کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، بایں طور کہ آیت کی شروعات ماہ رمضان کی مدح وثنا سے ہوئی ہے: ﴿شَهۡرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلۡقُرۡءَانُ هُدٗى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٖ مِّنَ ٱلۡهُدَىٰ وَٱلۡفُرۡقَانِ﴾ " ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ، جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت کی اور حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں"۔ اس آیت میں مومنوں سے اللہ تعالی کے نزدیک اس مہینہ کے مقام ومرتبہ کو بیان کیا گیا ہے، تاکہ وہ اس مہینہ کا خاص اہتمام اور اس کے مقام و مرتبے کو سمجھیں، اس میں ایک طرح سے غیر مسافر اور مریض کے لیے روزہ نہ رکھنے کے جواز کی منسوخی کے تعلق سے مومنوں کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے، اس قرآنی سیاق میں مسلمان کے لیے ایک اسلوب کی تعلیم ہے وہ یہ کہ کسی چیز کے حکم کے وقت آغاز میں بطور تمہید اس چیز کی اہمیت اور فضیلت بیان کر دینی چاہیے ، ایسا کرنے سے آدمی اس حکم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے پورے اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ اس کی بجاآوری میں مشغول ہو جائے گا۔ آیت کریمہ سے قرآن کریم کی فضیلت بھی واضح ہوتی ہے کیوں کہ قرآن ہی کے سبب ماہ رمضان و ماہ صوم کی بھی تعریف کی گئی ہے ،اسی طرح اس میں یہ بھی ہے کہ قرآن کریم کا آسمان دنیا پر نزول رمضان کے مہینہ میں اور بالتحدید شب قدر میں ہوا، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿إِنَّآ أَنزَلۡنَٰهُ فِي لَيۡلَةِ ٱلۡقَدۡرِ﴾ [سورة

القدر: ١]۔ "یقیناہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا"۔ پھر اس کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف واقعات کے حساب سے الگ الگ نازل ہوتا رہا، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی سندوں سے مروی ہے(١) ۔

اسی طرح اللہ تعالی نے اس آیت میں قرآن کریم کی مدح یوں بھی کی کہ یہ قرآن ہدایت کرنے والا ہے: ﴿شَهۡرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلۡقُرۡءَانُ هُدٗى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٖ مِّنَ ٱلۡهُدَىٰ وَٱلۡفُرۡقَانِ﴾ "ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا ، جو لوگوں کو ہدایت کرنے والا ہے اور جس میں ہدایت کی حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں"۔ یعنی یہ قرآن کافر و مسلم سب کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے۔ کافر کے لیے اس لیے ہدایت ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ اللہ تعالی کے دین تک رسائی حاصل کر سکے کیوں کہ اس میں بے شمار ایسے دلائل و براہین اور ہدایتیں ہیں جس کی وجہ سے وہ اللہ تک پہنچ سکتا ہے، اور مسلم کے لیے اس لیے ہدایت ہے کیوں کہ اس میں وہ سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے جو اللہ تعالی ایک مسلم سے کرانا یا منع کرنا چاہتا ہے ، چنانچہ اس قرآن میں اللہ تعالی کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ تمام امور اور اوامر و نواہی بیان کر دیے گیے۔ اسی طرح اللہ تعالی نے قرآن کریم کی مزید مدح اس طرح بھی کی کہ اس قرآن میں واضح دلائل موجود ہیں، فرمایا: ﴿وَبَيِّنَٰتٖ مِّنَ ٱلۡهُدَىٰ وَٱلۡفُرۡقَانِ﴾ " اور جس میں ہدایت کی اور حق و باطل کی تمیز کی نشانیاں ہیں"۔ یعنی قرآن پڑھنے اور اس میں غور فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سارے دلائل و براہین اور واضح کھلی ہوئی روشن ہدایات موجود ہیں جن میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قرآن جو کہ ضلالت کے مقابلے میں ہدایات، گمراہی کے بدلے میں رشد لے کر آیا وہ سب صحت پر مبنی ہیں، نیز وہ حق و باطل اور حلال و حرام کے درمیان فرق کرنے والا ہے(٢) ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص ہدایت کا متلاشی ہے وہ قرآن کریم کو لازم پکڑے، اور جو چاہتا ہے کہ دلائل و براہین کی معرفت اور جانکاری ہو، اسی طرح جو لوگوں سے حق بیان کرنے کا خواہش مند ہے وہ

---

(١) تفسير ابن كثير ١/٢٢٢.

(٢) مرجع سابق.

بھی قرآن کو حرز جان بنائے، جو علم اور اس کے اصول، فقہ و توحید، حق و باطل کے درمیان فروق کی معرفت کا ارادہ رکھتا ہے وہ بھی قرآن کریم کو لازم پکڑے، اس لیے کہ یہ قرآن کریم وہ نور اور روشنی ہے جس سے رضائے الٰہی کا راہی مستفید ہوتا ہے۔ اسی طرح ماہ رمضان اور اس ماہ میں قرآن کریم کے نزول کے مابین خصوصی ربط سے رمضان کے مہینہ میں تلاوت قرآن کریم کی فضیلت واضح ہوتی ہے۔

ماہ رمضان کی خصوصیات اور اس میں نزول قرآن کے بیان کے بعد اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ﴾ "تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے اسے روزہ رکھنا چاہیے"۔ جو شخص اس مہینہ کے چاند نکلنے کے وقت موجود ہو تو اسے اللہ تعالی نے حکم دیا کہ وہ روزہ رکھے، اس حکم سے سابقہ اجازت والی آیت صحت مند اور مقیم کے حق میں منسوخ ہوگئی، جس میں یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ نہ رکھ کر ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو بطور فدیہ کھانا کھلائے، جیسا کہ سابقہ آیت میں گزر چکا ہے(۱)۔ پھر اس وجوب کے حکم سے مسافر اور مریض کو مستثنی کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوۡ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ "ہاں جو بیمار ہو یا مسافر ہو اسے دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کرنی چاہیے"۔ یہ محض اللہ تعالی کا لطف و کرم ہے، جس کا بیان سابقہ آیت میں ہو چکا ہے، یہاں دوبارہ اس لیے بیان کیا تاکہ یہ ثابت کیا جائے کہ آیت کی منسوخی کے بعد اس کا حکم مسافر اور مریض کے حق میں ابھی اسی طرح باقی ہے، اور یہ گمان نہ ہو کہ مسافر اور مریض بھی ان لوگوں کے ساتھ نسخ کے حکم میں شامل ہیں جو کچھ مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے تھے، لیکن انہیں روزہ رکھنے اور روزہ نہ رکھ کر کھانا کھلانے کا اختیار تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالی مسافر اور مریض سے روزہ کی رخصت اور دوسرے دنوں تک مؤخر کرنے کا سبب بیان کر رہا ہے: ﴿يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلۡعُسۡرَ﴾ "اللہ تعالی کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے سختی کا نہیں"۔ یہ اللہ تعالی کی رحمت اور عنایت ہے کہ اس نے مریض اور مسافر کو روزہ مؤخر کرنے کی رخصت دی ہے، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالی نے یہ روزہ یا اس کے علاوہ دیگر فرائض کے ذریعہ مسلمانوں پر شدت اور سختی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ اس نے معاملات کو بے حد آسان کیا تاکہ لوگ بہ آسانی اللہ تعالی کی اطاعت کر سکیں، اور اس روزہ کا مقصد محض تقوی کا

---

(۱) مرجع سابق.

حصول ہے جس کی حصول یابی میں ہی انسان کی کامرانی وکامیابی ہے، جس کو اللہ تعالی نے سابقہ آیت میں یوں بیان کیا ہے: ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُونَ ﴾" اے ایمان والو تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو"۔ روزے کے فقہی مسائل میں قدرے تفصیل ہے: روزہ کی قضاء، مریض اور مسافر کے احوال، سفر کی مدت اور مسافت، روزہ کن لوگوں پر فرض ہوتا ہے، اس طرح کے دیگر فقہی مسائل جن کی جانکاری کے لیے کتب تفسیر وفقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اس کے بعد اللہ تعالی مریض اور مسافر کے حق میں فرمارہا ہے: ﴿ وَلِتُكۡمِلُواْ ٱلۡعِدَّةَ ﴾"وہ چاہتا ہے تم گنتی پوری کرلو"۔ یعنی اللہ تعالی ان سے چاہتا ہے کہ وہ چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا کرلیں، اور مہینہ کے دنوں کی تعداد مکمل ہو جائے۔ اس کے بعد اللہ تعالی اپنی تکبیر بیان کرنے کی ہدایت کررہا ہے ، جس میں اللہ تعالی کا شکر واحسان بجالایا جائے ، کیوں کہ اس نے لوگوں کو اسی عبادت کی رہنمائی اور ادائیگی کی توفیق بخشی، فرمایا: ﴿ وَلِتُكَبِّرُواْ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُونَ ﴾ "اور اللہ تعالی کی دی ہوئی ہدایت پر اس کی بڑائیاں بیان کرو اور اس کا شکر ادا کرو"۔ اس آیت میں رمضان کے آخری ایام میں تکبیر پر ابھارا گیا ہے، جیسا کہ جمہور مفسرین کا قول ہے، اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ: مسلمانوں پر واجب ہے کہ جب شوال کا چاند دیکھیں تو اللہ تعالی کی تکبیر بیان کریں، انہی سے یہ بھی مروی ہے کہ آدمی شوال کا چاند دیکھنے سے لے کر خطبہ عید ختم ہونے تک تکبیر پڑھے گا(١)۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزہ اللہ تعالی کی نعمت ہے جس کا تقاضا ہے کہ بندے اللہ تعالی کا شکر ادا کریں، بلکہ یہ روزہ اللہ تعالی کی نعمتوں میں سے ایک جلیل القدر اور عظیم نعمت ہے جس کے شکر کی شروعات تکبیر ہے ، اور یہ تکبیر بھی اللہ تعالی کے ذکر اور شکر کے شعائر میں سے ایک شعیرہ ہے۔

﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌۖ أُجِيبُ دَعۡوَةَ ٱلدَّاعِ إِذَا دَعَانِۖ فَلۡيَسۡتَجِيبُواْ لِي وَلۡيُؤۡمِنُواْ بِي لَعَلَّهُمۡ يَرۡشُدُونَ ١٨٦ ﴾

(١) تفسير قرطبي ٢/٢٠٤.

ترجمہ:

"جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب بھی وہ مجھے پکارے قبول کرتاہوں ، اس لئے لوگوں کو بھی چاہیے وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے(۱۸۶)"۔

اس کے بعد قرآن کریم کا سیاق دعا کی قبولیت کے بیان کی طرف منتقل ہو رہا ہے، یعنی جو اللہ تعالی سے دور و نزدیک جیسے بھی دعا کرے اللہ تعالی اس کی دعا قبول کرتا ہے، ایک دیہاتی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سوال کیا کہ: کیا ہمارا رب ہم سے قریب ہے تاکہ ہم اس سے سرگوشی کریں؟ یا دور ہے تاکہ ہم اس کو زور سے پکاریں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جواب میں خاموش رہے، تو اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴾ "جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب بھی وہ مجھے پکارے قبول کرتاہوں ، اس لئے لوگوں کو بھی چاہیے وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے" ۔ یہ بڑی عظیم الشان آیت ہے، اور اعرابی کا سوال بھی برحق تھا جس میں سوال کرنے والا اپنے پروردگار کی قربت اور دوری کی معرفت کا متلاشی تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشی اس لیے تھی کہ آپ اپنے من سے دین کے معاملے میں کچھ نہیں کہتے تھے، اور رحمتوں والے رب کا جواب بڑا عظیم آیا، چنانچہ اللہ تعالی اپنے بندوں سے کافی قریب ہے، ان کی باتوں کو بلکہ ان کے راز اور سرگوشیوں کو بھی سنتا اور ان کے احوال اور تغیرات سے واقف ہے، مخلوقات کے امور کا کوئی بھی حصہ اس سے غائب اور پوشیدہ نہیں ہے، اللہ تعالی کی مخلوق سے قربت کی صفت ویسی ہے جیسی اس کے شان کے لائق ہے، مخلوقات کی آپس میں ایک دوسرے کی قربت کی طرح اس کی قربت نہیں ہے، اور نہ ہی اللہ تعالی کی قدرت مخلوقات کی قدرت کی طرح ہے ، بلکہ اللہ تعالی مخلوق کی قدرت کا خالق ہے ، اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی اپنے علم و معرفت اور قدرت کے اعتبار سے قریب ہے، جیسا

کہ اس کا ارشاد ہے: ﴿وَنَحۡنُ أَقۡرَبُ إِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ ٱلۡوَرِيدِ﴾ [سورة ق:١٦]۔ "اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں" ۔اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: (أَيُّهَا النَّاسُ أَرْبِعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ، فَإِنَّكُمْ لَا تَدْعُونَ أَصَمَّ، وَلَا غَائِبًا، إِنَّمَا تَدْعُونَ سَمِيعًا بَصِيرًا، إِنَّ الَّذِي تَدْعُونَ أَقْرَبُ إِلَى أَحَدِكُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهِ) "اے لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو، تم نہ کسی بہرے کو پکار رہے ہو، نہ غائب کو، تم اس کو پکار رہے ہو جو ہر وقت خوب سننے والا ہے، قریب ہے اور تمہارے ساتھ ہے ، جس کو تم پکار رہے وہ تم سے اس کی سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے"(١)۔ یہ بات آپ نے اپنے ساتھیوں سے کسی غزوہ کے موقع پر ارشاد فرمائی تھی، کیوں کہ وہ تکبیر کے ساتھ اپنی آواز زیادہ بلند کر رہے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ سلم نے ان سے بیان کیا کہ اللہ تعالی اپنے بندے سے اس کی جان سے زیادہ قریب ہے، اگر بندہ اپنے بارے میں غور و فکر کرے تو اسے کچھ وقت کے بعد خود سکون مل جائے، کیوں کہ جب اللہ تعالی بندے کو اس چیز میں توفیق دینا چاہتا ہے جس میں وہ غور و فکر کرتا ہے تو وہ اس میں بہت زیادہ غور و فکر کرنے سے پہلے ہی اس کو صواب کا الہام کر دیتا ہے ،اور پھر اس کو شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے، اور وہ چیز اس کے نزدیک مرغوب ہوتی چلی جاتی ہے پھر اسے قرار آجاتا ہے، چنانچہ بندہ اپنی قدرت سے جتنا قریب ہے اس سے زیادہ اللہ تعالی اپنی قدرت کے اعتبار سے بندے سے قریب ہے۔

آیت کریمہ کے من جملہ فوائد میں سے ہے: طلب و دعا اور مناجات واستغاثہ اور دیگر امور جس میں بندہ اپنے رب سے مخاطب ہوتا ہے ان سب میں اللہ تعالی کے ساتھ ادب واحترام کی اہمیت ، نیز بندہ کو اس بات کا یقین ہو کہ اللہ تعالی اس کے قریب اس کی سرگوشی اور شکایت اور حاجت و مقصد کو سن رہا ہے، اس لیے اپنی آواز کو بلند نہ کرے، آیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی دعائیں قبول کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أُجِيبُ دَعۡوَةَ ٱلدَّاعِ إِذَا دَعَانِۖ﴾ "ہر پکارنے والے کی پکار کو جب بھی وہ مجھے پکارے قبول کرتا ہوں"۔اس لیے مسلم جب بھی دعا کرے تو اسے قبولیت کا پورا یقین ہونا چاہیے، اور یہ جان رکھے کہ اللہ تعالی اس کے احوال سے زیادہ باخبر ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی مراد پوری کرنے کا زیادہ مناسب

---

(١) فتاوى ابن تيميه ١٥/١٧.

وقت کون سا ہے ،چاہے اس دعا کے ذریعہ کسی شر کو دور کرنا ہو یا کسی خیر کو لانا ہے،اس لیے مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ اللہ تعالی کے اوامر کو عملی طور پر بجالا کر، نواہی سے بچ کر اور مستحبات کی ادائیگی میں خوب کوشش کرتے ہوئے اللہ تعالی کی بات مان لیا کریں ،اور اسی اللہ پر ایمان رکھیں جس نے انہیں بھلے لوگوں میں سے بنایا: ﴿فَلْيَسْتَجِيبُواْ لِي وَلْيُؤْمِنُواْ بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾" اس لئے لوگوں کو بھی چاہیے وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے"۔(رُشْد)(غَیّ) کی ضد ہے،اور رشد کہتے ہیں کسی چیز کواس کے صحیح مقام پر رکھنا ،آخرت کو دنیا پر مقدم رکھنا رشد ہے، صحیح راہ کی معرفت اور اس پر چلنا اور غلط راہ کی معرفت اور اس سے دور رہنا بھی رشد ہے۔ اس ہدایت ربانی ﴿فَلْيَسْتَجِيبُواْ لِي وَلْيُؤْمِنُواْ بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ سے یہ معلوم ہوا کہ کمال درجے کا رشد یہ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مان لی جائے اور اللہ تعالی اور اس کے اوامر پر مومن کا ایمان ہو۔

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ ٱلصِّيَامِ ٱلرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ ٱللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَٱلْـَٔـٰنَ بَـٰشِرُوهُنَّ وَٱبْتَغُواْ مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُواْ وَٱشْرَبُواْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلْخَيْطُ ٱلْأَبْيَضُ مِنَ ٱلْخَيْطِ ٱلْأَسْوَدِ مِنَ ٱلْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّواْ ٱلصِّيَامَ إِلَى ٱلَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَـٰشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَـٰكِفُونَ فِى ٱلْمَسَـٰجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ ٱللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ ءَايَـٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾﴾

ترجمہ:

"روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے جماع تمہارے لئے حلال کیا گیا وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو تمہاری پوشیدہ خیانتوں کا اللہ تعالی کو علم ہے اس نے تمہاری توبہ قبول فرما کر تم سے در گزر فرمالیا اب تمہیں ان سے مباشرت کی اور اللہ تعالی کی لکھی ہوئی چیز کی تلاش کرنے کی اجازت ہے۔ تم کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے ظاہر ہو جائے ، پھر رات تک روزے کو پورا کرو ، اور عورتوں سے اس وقت مباشرت نہ کرو جب کہ تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو، یہ اللہ

تعالیٰ کی حدود ہیں تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ بچیں (۱۸۷)"۔

اللہ تعالی کی اپنے بندوں سے قربت کے متعلق سائل کے سوال کے جواب کے اس فاصلے کے بعد قرآن کریم کا سیاق دوبارہ شعیرہ صوم کی طرف لوٹ رہا ہے، روزہ سے متعلق آیات کے درمیان اس فاصلے کا فائدہ یہ ہے تاکہ روزہ کی طرف توجہ مزید سے مزید تر ہو جائے اور بعد میں آنے والی ان آیات کا شوق پیدا ہو جن میں اللہ رحمن ورحیم کی اپنے روزہ دار بندوں کے ساتھ رحمت کا بیان ہے، جس میں روزہ دار کے لیے رمضان میں کھانے پینے اور بیوی سے جماع کے وقت میں اضافہ کیا گیا ہے، کیوں کہ روزہ کی فرضیت کے ابتدائی ایام میں کھانے پینے اور جماع کی رخصت صرف افطار کے وقت سے لے کر عشاء کی نماز تک یا عشاء سے قبل سو جانے تک تھی، اس لیے اگر کوئی عشاء سے قبل سو جاتا یا عشاء کی نماز پڑھ لیتا تو کھانے وغیرہ سے رک جاتا، اور آنے والی رات تک اس کے لیے کھانا پینا اور جماع کرنا حرام ہو جاتا، لہذا لوگوں کو اس میں بڑی دشواری ہوئی، چنانچہ اللہ تعالی نے ان کے لیے وقت میں اضافہ کر دیا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ ٱلصِّيَامِ ٱلرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ﴾ "روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے جماع تمہارے لئے حلال کیا گیا"۔ آیت میں (رفث) سے مرد جماع ہے، اسی لیے ہر وہ کام جو جماع سے کمتر ہو وہ بھی حلال ہے، کیوں کہ اعلی کے جواز کو بیان کر دینے سے ثابت ہو گیا کی ادنی بھی اس جواز میں شامل ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالی زوجین کے باہمی تعلقات کی خصوصیت بیان کر رہا ہے: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ "وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو"۔ وہ تمہارے آرام کا اور تم ان کے آرام کا باعث ہو، زوجین کے درمیان جس نے یہ خاصیت رکھی وہ اللہ تبارک وتعالی کی ذات ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نفسیاتی سکون کی نعمت دونوں طرف سے ہے، اس میں کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے بلکہ یہ سکون ایک دوسرے کو فراہم کرنے میں دونوں برابر ہیں۔ لباس کے لفظ میں پردہ، چھپانا ، قربت اور متصل کے مفاہیم شامل ہیں ، کیوں کہ لباس جسم سے سب سے زیادہ قریب اور ملا ہوا رہتا ہے، ان تمام مفاہیم پر اگر انسان غور کرے اور نصیحت حاصل کرنا چاہے تو یقیناً زوجین ایک دوسرے کے

لیے حقیقی طور پر ان تمام مفاہیم کے قائم مقام ہیں ،اور ہونا بھی یہی چاہیے کہ یہ تمام مفاہیم زندگی میں حقیقی طور موجود ہوں۔

اس کے بعد اللہ تعالی واضح کر رہا ہے کہ افطار کے وقت کی تنگی کی وجہ سے مسلمان جس مشقت سے دوچار ہوئے اللہ تعالی اس سے خوب باخبر تھااور اس کا علم تھا کہ مسلمان خود سے خیانت کر بیٹھیں گے ،اوران سے جماع یا کھانے پینے کا صدور ہو جائے گا،اسی لیے اللہ تعالی نے ان سے اس مشقت کو ختم کر دیا جیسا کہ فرمایا: ﴿ عَلِمَ ٱللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ﴾ " تمہاری پوشیدہ خیانتوں کا اللہ تعالی کو علم ہے اس نے تمہاری توبہ قبول فرما کر تم سے در گزر فرمالیا"۔ یہ سراپا اللہ تعالی کی رحمت اور اس کا کرم ہے۔ اور اللہ تعالی کے فرمان : ﴿ عَلِمَ ٱللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ ﴾ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالی کو مستقبل میں انسان سے سرزد ہونے والے اعمال کا علم ہے ،اور آیت میں جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے اس کی وجہ اس شخص سے حرج کو دور کرنا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کھا پی لینے اور جماع کی شکایت لے کر آیا تھا،اب جب کہ آیت میں جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا تو اس سیاق سے وہ یہی گمان کرے گا کہ جو کچھ اس سے سرزد ہو گیا اسی طرح سے اس کے علاوہ دوسروں سے بھی سرزد ہوا ہے،اس سے توجیہ اور غلطیوں کی اصلاح کے وقت پردہ پوشی کی اہمیت واضح ہوتی ہے ،جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہج اور طریقہ تھا کہ جب کسی کو کوئی ہدایت کرنی ہوتی تو عمومی طور پر کرتے ،ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ : نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی شخص کے متعلق کوئی ناگوار چیز سننے کو ملتی تو آپ یوں نہ کہتے کہ فلاں شخص کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ یوں کہتا یا کرتا ہے ؟،بلکہ یوں کہتے: لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ یوں اور یوں کہتے ہیں یا کرتے ہیں ؟(١)۔

اس کے بعد اللہ تعالی کے عفو ودر گذر کے بارے میں اس کے لطف وکرم کا بیان ہو رہا ہے: ﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ﴾ "اس نے تمہاری توبہ قبول فرما کر تم سے در گزر فرمالیا"۔ یعنی اس نے صرف تمہاری توبہ ہی قبول نہیں فرمائی بلکہ جو کچھ تم سے ہوا اسے در گزر بھی کر دیا، گویا کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو، پاک ہے اللہ کی ذات جو بہت بڑا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔اس کے بعد ڈائرکٹ اجازت دی جا رہی

(١) أبو داود ١٤٣/٥ حديث نمبر (٤٧٨٨).

ہے: ﴿فَٱلۡـَٔـٰنَ بَـٰشِرُوهُنَّ﴾ "اب تمہیں ان سے مباشرت کی اجازت ہے"۔ اس کے بعد اس مباشرت سے جڑا ہوا اس مباشرت کا ہدف بھی بیان کر دیا: ﴿وَٱبۡتَغُواْ مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَكُمۡ﴾ "اور اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی چیز کی تلاش کرنے کی اجازت ہے"۔ اس سے مراد اولاد ہے، یعنی اس مباشرت سے اولاد طلب کرو، یہ اس ہدف سے آگاہ کرنا ہے جس کی خواہش زوجین کو اس جماع سے ہوتی ہے، تمام تعریف اللہ تعالی کے لیے ہے جو ان نعمتوں کے ذریعہ اپنے بندوں پر فضل کرنے والا ہے ،یعنی چیزوں کو مسخر کرنا، سہولیت اور آسانیاں پیدا کرنا اور دین کا علم دینا وغیرہ یہ سب اللہ تعالی کی نعمتیں ہیں۔

فائدہ: ولد کا لفظ مذکر اور مونث دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

آگے رخصت کا مزید بیان کر کے تمام احتمالات دور کر دیے گیے، یعنی یہ رخصت صرف جماع کے لیے نہیں بلکہ اس رخصت میں کھانا پینا بھی شامل ہے: ﴿وَكُلُواْ وَٱشۡرَبُواْ﴾ "تم کھاتے پیتے رہو"۔ اس کے بعد اس وقت کی تعیین کر دیا جس کے ساتھ رخصت ختم ہوتی ہے: ﴿حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلۡخَيۡطُ ٱلۡأَبۡيَضُ مِنَ ٱلۡخَيۡطِ ٱلۡأَسۡوَدِ مِنَ ٱلۡفَجۡرِ﴾ "یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگہ سیاہ دھاگے سے ظاہر ہو جائے"۔ یعنی یہاں تک کہ فجر کے وقت سے دن کی سفیدی رات کی تاریکی سے ظاہر ہو جائے، روزہ کی شروعات کی تعیین کے بارے میں یہ قرآن کریم کی دقت بیانی ہے، تاکہ یہ وقت بالکل ثابت رہے اور اس میں تبدیلی نہ ہو، اور وہ فجر کا وقت ہے، اور فجر کی پہچان دن کی سفیدی رات کی تاریکی سے ظاہر ہونے کے ذریعہ ہوتی ہے، اس کے بعد روزہ شروع ہو جاتا ہے اور رات آنے تک رہتا ہے یعنی سورج کے غروب ہونے تک: ﴿ثُمَّ أَتِمُّواْ ٱلصِّيَامَ إِلَى ٱلَّيۡلِ﴾ " پھر رات تک روزے کو پورا کرو "۔

اس کے بعد معتکف کے لیے جماع کی ممانعت کا بیان ہے، کیوں کہ وہ اعتکاف جیسی جلیل القدر اور عظیم الشان نفلی عبادت میں مشغول ہوتا ہے ، فرمایا: ﴿وَلَا تُبَـٰشِرُوهُنَّ وَأَنتُمۡ عَـٰكِفُونَ فِي ٱلۡمَسَـٰجِدِ﴾ " اور عورتوں سے اس وقت مباشرت نہ کرو جب کہ تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو"۔ یہ معتکفین کے لیے استثنائی حکم ہے کہ وہ دیگر روزہ داروں کی طرح رات میں اپنی بیوں سے جماع نہیں کر سکتے ، یعنی معتکف کے لیے جماع دن و رات کسی وقت جائز نہیں، رات میں اعتکاف کی وجہ سے اور دن میں اعتکاف اور روزہ دونوں وجہ سے۔

اعتکاف کہتے ہیں اللہ تعالی کی اطاعت کے لیے مسجد کو لازم پکڑنا، اس کے بعد اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿تِلْكَ حُدُودُ ٱللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا﴾ "یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ"۔یعنی یہ احکامات اللہ تعالی کی متعین کردہ حدیں ہیں اس لیے ان کی مخالفت نہ کرو، لفظ (تلک) سے اشارہ اوامر ونواہی کی طرف ہے، اور حدود کے معنی آڑ اور رکاوٹ، ان کو اللہ کی حدود اس لیے کہا گیا ہے کیوں کہ یہ حدود خارجی چیزوں کے لیے رکاوٹ ہے جن کا تعلق اس سے نہیں، اور جو چیزیں ان کے اندر ہیں وہ اس سے نکل نہیں سکتیں، اور اسی لیے گناہ کی سزاؤں کو حدود سے تعبیر کیا گیا ہے، کیوں کہ وہ گنہکار کو دوبارہ اس گناہ کے ارتکاب سے روکتی ہیں(١) ۔اس سے معلوم ہوا کہ دلوں میں اللہ تعالی کی حدود کی تعظیم کافی اہمیت رکھتی ہے، اسی پر نئی نسل کی تربیت وپرورش ہونی چاہیے تاکہ وہ ان کی تعظیم ان میں راسخ ہو جائے ، نیز یہ بات بھی کافی اہم ہے کہ اپنی خواہشات کو قابو میں رکھا جائے، بایں طور کہ وہ اللہ تعالی کی حدود کے پاس رک جائیں اور اس سے آگے نہ بڑھیں۔

(فَلَا تَقْرَبُوهَا) میں یہ اشارہ ہے کہ ان حدود کے پاس بھی نہ جاو کہ کہیں تجاوز کرکے اس میں جاپڑو، اگرچہ کہ مفہوم یہی ہے کہ ان حدود کو پار نہ کرو، لیکن اس نہی کو قریب کے لفظ سے تعبیر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ہر اس وسیلہ سے دور رہا جائے جو مخالفت کرکے حدود کی پامالی تک لے جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کو مسلمان ایک طاقت سمجھتے ہوئے ہر خواہش اور کجی کے دفاع میں استعمال کرے ، جب بھی معصیت کا گھراؤ ہو تو خود سے مخاطب ہو: ﴿تِلْكَ حُدُودُ ٱللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا﴾ "یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ"۔جب بھی اس کا نفس اسے کسی حکم کی مخالفت کے لیے بہکائے تو اس فرمان الہی سے اس کا مقابلہ کرے: ﴿تِلْكَ حُدُودُ ٱللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا﴾ "یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ"۔ اگر شیطان اسے اللہ کے کسی حد کے ارتکاب کو سنوار کر پیش کرے تو اسی فرمان الہی سے قوت حاصل کرے: ﴿تِلْكَ حُدُودُ ٱللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا﴾ "یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ"۔ گویا کہ اس آیت کا مفہوم اگر مومن کی زندگی میں پوری طرح حاضر رہے تو یہ اس کے لیے ایک بہت بڑی قوت ہے۔

---

(١) تفسير قرطبي ٢/٢٢٥

اس کے بعد آیت کا اختتام اللہ تعالی کے اس قول سے ہوتا ہے: ﴿كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ ءَايَٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُونَ ﴾ " اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان فرماتا ہے تاکہ وہ بچیں"۔ جس طرح اللہ تعالی نے ان حدود کو بیان کیا اسی طرح ان حدود سے متعلق تمام احکامات کو بھی بیان کیا، تاکہ ان احکام کے مخاطب اس سے تجاوز نہ کریں اور یہ جان سکیں کہ کیسے وہ ہدایت یاب اور اطاعت گذار ہوں گے، اور اللہ تعالی کی حدیں پار نہیں کریں گے، یقیناً اللہ کے اوامر ونواہی کے التزام سے لوگوں کے اندر تقوی پیدا ہو سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو اللہ تعالی کی حدود کے بارے میں اللہ سے ڈرتا ہے تو اللہ تعالی اسے تقوی سے نوازتا ہے جس کی وجہ سے اسے مزید خیر و بھلائی نصیب ہوتی ہے۔

﴿ وَلَا تَأۡكُلُوٓاْ أَمۡوَٰلَكُم بَيۡنَكُم بِٱلۡبَٰطِلِ وَتُدۡلُواْ بِهَآ إِلَى ٱلۡحُكَّامِ لِتَأۡكُلُواْ فَرِيقٗا مِّنۡ أَمۡوَٰلِ ٱلنَّاسِ بِٱلۡإِثۡمِ وَأَنتُمۡ تَعۡلَمُونَ ﴿١٨٨﴾ ﴾

ترجمہ:

"اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھایا کرو، نہ حاکموں کو رشوت پہنچا کر کسی کا کچھ مال ظلم وستم سے اپنا کر لیا کرو، حالانکہ تم جانتے ہو(۱۸۸)"۔

آیت کا سیاق نہی سے شروع ہوتا ہے: ﴿ وَلَا تَأۡكُلُوٓاْ أَمۡوَٰلَكُم بَيۡنَكُم بِٱلۡبَٰطِلِ ﴾ "اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھایا کرو"۔ یہ آیت اموال میں غلط طریقے سے لین دین اور حاصل کرنے کی ممانعت کے طور پر وارد ہوئی ہے ، باطل حق کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے، آیت میں اموال کی فاسد اور غلط طریقے سے لین دین کو کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے ﴿ وَلَا تَأۡكُلُوٓاْ أَمۡوَٰلَكُم ﴾ "اور ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھایا کرو"۔ جب کہ اس مال کو حاصل کر کے اسے کھانے کے علاوہ دوسری چیزوں میں بھی خرچ کیا جاتا ہے، لیکن اللہ تعالی نے اس فاسد اور غلط طریقے سے مال کے حصول کو غذا طلبی یا حرام کھانے کے قائم مقام قرار دیا جسے انسان اپنے پیٹ کے اندر داخل کر لیتا ہے، اس سے اس وصف کی قباحت اور زیادہ ہو جاتی ہے، لہذا مال کو باطل طریقے سے حاصل کر کے اسے کسی طرح سے بھی خرچ کیا جائے، وہ اس کو باطل طور پر کھانا مانا جائے گا، اور اس کو کھانے سے تعبیر کرنا اس کی قباحت بیان کرنے کے لیے ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ نیک طبیعت کے حاملین باطل اور غلط چیز کے وسائل وسالیب کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اور (بینکم) کے

لفظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس سے باہمی لین دین کا ہر باطل اور غلط طریقہ مراد ہے، اور (باطل) سے تمام حرام اقسام مراد ہیں کیوں کہ حرام کی تمام اقسام باطل ہیں ، جیسے: دھوکہ دہی، قمار بازی، رشوت، سود، کام پورا کیے بغیر اجرت لینا، یا جو کام پورا کرلے اسے پوری اجرت نہ دینا، غرض یہ کہ باطل اعمال بے شمار ہیں ان کی کوئی گنتی نہیں، لیکن ان تمام اقسام کو صرف ایک لفظ میں سمیٹ دیا گیا، وہ یہ کہ باطل طریقے سے مال کھانے سے منع کر دیا گیا، چنانچہ معاملات کے تمام اقسام جنہیں اللہ تعالی نے حرام کیا ہے باطل کے اس ایک لفظ میں آگئے ، چاہے حرام خرید وفرخت یا دیگر لین دین اور معاملات کے حرام طریقے ہوں۔ یہ قرآن کریم کا اعلی اسلوب بیان اور عظیم بلاغت ہے۔

یہ انتہائی جامع ومانع قاعدہ ہے جس میں کسی خاص باطل قسم یا حرام مال کے لین دین کے طریقے کی تعیین وتحدید نہیں کئی گئی ، تاکہ اس میں ماضی میں رائج تمام اقسام وطریقے اس میں آجائیں ، اور اسی طرح مستقبل میں جو نئی نئی قسمیں اور طریقے وجود میں آئیں وہ بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی اخلاقی قیمت ، اور فقہ کا اعلی معیار ہے کہ باطل کے تمام جدید اقسام وذرائع کے استیعاب کی اس میں گنجائش ہے۔ یہ اس تابناک اور روشن شریعت اسلامیہ کے فقہی، فکری اور اخلاقی اعجاز کی دلیل ہے، اور اس سے قرآن کریم کا معجزہ ہونا متعدد طریقوں سے ثابت ہوتا ہے، ان ہی میں سے ایک یہ ہے کہ قرآن کریم کسی چیز کی قدیم وجدید تمام انواع واقسام کو سمیٹ لیتا ہے، چنانچہ یہ آیت اللہ تعالی کی طرف سے ایک جلیل القدر توجیہی قاعدہ ہے، اسی طرح یہ نہی جو کہ حرمت کے لیے ہے اس میں اس بات کا بیان ہے کہ سماجی شر وفساد، آپسی بغض وحسد کے اسباب اور مجبوری کے غلط استعمال کا خاتمہ اس دین کے مقاصد میں سے ہے۔

آگے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَتُدۡلُواْ بِهَآ إِلَى ٱلۡحُكَّامِ﴾ "نہ حاکموں کو رشوت پہنچاؤ"۔ یہ باطل طریقے سے مال کھانے کی ایک قسم کا بیان ہے، یعنی رشوت یا کسی اور حیلے سے حاکم کو مال دے کر دوسروں کا مال باطل طریقے سے حاصل کر لیا جائے، ﴿وَتُدۡلُواْ بِهَآ إِلَى ٱلۡحُكَّامِ لِتَأۡكُلُواْ فَرِيقٗا مِّنۡ أَمۡوَٰلِ ٱلنَّاسِ بِٱلۡإِثۡمِ وَأَنتُمۡ تَعۡلَمُونَ﴾ "نہ حاکموں کو رشوت پہنچا کر کسی کا کچھ مال ظلم وستم سے اپنا کر لیا کرو، حالانکہ تم جانتے ہو"۔ اس میں یہ بیان اور اشارہ ہے کہ انسان سے دوسروں کے حق میں باطل

طریقے سے مال کھانے کی وجہ سے اس سے جور وظلم کا صدور ہوتا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ حق پر نہیں اس کے باوجود ظلما اس کا مال کھاتا ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ شریعت نے مال کے لین دین اور ہیر پھیر کے ضابطہ میں حاکم کے حکم پر کوئی اعتماد نہیں کیا ہے، کیوں کہ بسا اوقات حاکم سے بعض دلائل پوشیدہ رہ جاتے ہیں اور مظلوم کی بجائے ظالم کے حق میں فیصلہ کر دیتا ہے، بلکہ اس کا اعتماد اس سے بڑی چیز پر ہے اور وہ ہے محاسبہ نفس، یعنی لوگوں کے اموال کے تعلق سے انسان گناہ اور اللہ کے عذاب سے خود کو خوف دلائے ۔

﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِىَ مَوَٰقِيتُ لِلنَّاسِ وَٱلْحَجِّ ۗ وَلَيْسَ ٱلْبِرُّ بِأَن تَأْتُوا۟ ٱلْبُيُوتَ مِن ظُهُورِهَا وَلَـٰكِنَّ ٱلْبِرَّ مَنِ ٱتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا۟ ٱلْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَٰبِهَا ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٨٩﴾﴾

ترجمہ:

"لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں (کی عبادت) کے وقتوں اور حج کے موسم کے لئے ہے (احرام کی حالت میں) اور گھروں کے پیچھے سے تمہارا آنا کچھ نیکی نہیں، بلکہ نیکی والا وہ ہے جو متقی ہو اور گھروں میں تو دروازوں میں سے آیا کرو ، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ (١٨٩)"۔

اس کے بعد قرآنی سیاق ایک سوال کے جواب کی طرف منتقل ہوتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے چاند کو لے کر کیا گیا تھا، کہ چاند پہلے بالکل باریک اور چھوٹا ظاہر ہوتا ہے، پھر دھیرے دھیرے بڑا ہوتا ہے یہاں تک کہ پورا ہو کر بدر کامل بن جاتا ہے، اور پھر آہستہ آہستہ گھٹتے ہوئے بالکل ختم ہو جاتا ہے ، اور ہر تیس یا انیتس دن میں اس کی یہی صورت حال پھر سے دہرائی جاتی ہے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْأَهِلَّةِ﴾ "لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے قسط وار نزول کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس میں بہت سارے ان سوالوں کا جواب دیا گیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کئے جاتے تھے، اور اس کے جواب میں آیت نازل ہوتی تھی۔

چاند کے تعلق سے سوال کا جواب دیتے ہوئے اللہ تعالی ارشاد فرمارہا ہے : ﴿ قُلۡ هِيَ مَوَٰقِيتُ لِلنَّاسِ وَٱلۡحَجِّ ﴾ "آپ کہہ دیجئے کہ یہ لوگوں (کی عبادت) کے وقتوں اور حج کے موسم کے لئے ہے"۔ آیت میں لفظ (مواقیت) کے بہت سارے فائدے ہیں، اور یہ فائدے مسلم وکافر تمام لوگوں کے لیے ہیں، کیوں کہ چاند کی توقیت کا سبھی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، البتہ مسلمانوں کا اس میں مزید فائدہ یہ ہے کہ وہ اپنی عبادات کے اوقات اس سے معلوم کرتے ہیں، کیوں کہ چاند بہت ساری عبادتوں کا وقت ہے، جیسے روزہ، زکاۃ، عقود، دیون، عہد وپیمان، اور وہ عام زندگی میں پیش آنے والے وہ تمام امور جن میں لوگ کسی وقت پر متفق ہوں جن کو شمار میں نہیں لایا جاسکتا، گویا کہ یہ عظیم فائدہ ایک جملہ میں بیان کر دیا گیا ، اسی طرح لفظ (مواقیت) تمام اوقات اور ازمان کو محیط ہے، اور اس میں وہ تمام اوقات آگئے جن پر لوگ باہم کسی مقصد سے اتفاق کر لیتے ہیں، جیسے کہ قرض کی ادائیگی کا وقت آجانا، یا اس کے علاوہ مختلف مقاصد کے متعینہ اوقات ، اور اسی طرح عبادتوں کے اوقات ۔ نیز لفظ (الناس) میں مسلم وکافر تمام انسان آگئے، اور یہ اللہ تعالی کی طرف سے چاند کا فائدہ سب کے لیے عام ہے، چنانچہ انسان کو قرآن کریم کی اس تعبیر ، الفاظ کی باریکی وگیرائی اور بیان وبلاغت کی وسعت میں غور وفکر کرنا چاہیے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے اوقات کے من جملہ فوائد میں سے وقت حج کا خصوصی ذکر کیا، اس میں اس فائدہ کا اظہار دیگر عبادات کے لیے بطور مثال کے ہوا ہے جن کا تعلق چاند نکلنے سے ہے ۔ اسی طرح حج کا ذکر اس لیے بھی کیا کیوں کہ بعد میں جو توجیہ بیان کی جارہی ہے اس کا تعلق حج ہی سے ہے، اس حیثیت سے کہ اللہ تعالی نے عبادت کے اس غلط اعتقاد کی اصلاح فرمائی جو زمانہ جاہلیت میں حج کا احرام باندھنے والے کے یہاں پایا جاتا تھا، چنانچہ اللہ تعالی نے اس سے آگاہ کرتے ہوئے اسلوب نفی سے ابتداء کی، فرمایا: ﴿ وَلَيۡسَ ٱلۡبِرُّ بِأَن تَأۡتُواْ ٱلۡبُيُوتَ مِن ظُهُورِهَا ﴾ " (احرام کی حالت میں) اور گھروں کے پیچھے سے تمہارا آنا کچھ نیکی نہیں"۔ انصار کا کوئی آدمی زمانہ جاہلیت میں جب حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیتا اور گھر سے نکل جاتا اور کسی ضرورت کے تحت اگر دوبارہ گھر میں لوٹ کر آنا پڑتا تو وہ گھر کے دروازے سے نہیں داخل ہوتا بلکہ گھر کے پیچھے سے دیوار پھاند کر داخل ہوتا تاکہ ان کے اور آسمان کے درمیان کوئی چیز

حائل نہ ہو(۱) ، کیوں کہ دروازہ کے اوپر ایک لکڑی لگی ہوتی ہے اور گھر میں داخل ہونے والا اس کے نیچے سے ہو کر گزرتا ہے، اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دروازے کی اس اوپری لکڑی کے نیچے سے نہ گزرنا نیکی اور اللہ تعالی کی اطاعت ہے، تو اللہ تعالی نے اس عادت یا اعتقاد کو غلط قرار دیا اور اس کو یوں تعبیر کیا کہ اس طریقہ میں کوئی نیکی نہیں ہے، یعنی پہلے ان سے جہل مرکب کو دور کیا تاکہ اس کی جگہ علم شرعی آجائے :﴿ وَلَٰكِنَّ ٱلۡبِرَّ مَنِ ٱتَّقَىٰۗ ﴾"بلکہ نیکی والا وہ ہے جو متقی ہو"۔ یعنی نیکی تو حقیقت میں اللہ تعالی کا تقوی ہے۔اس آیت سے بدعت کا بطلان ہوتا ہے، اگرچہ نیت عبادت اور نیکی کی ہی کیوں نہ ہو، اور اس بات کا ثبوت ہے کہ بدعت اطاعت اور نیکی نہیں ہو سکتی، نیکی تو یقینی طور پر شریعت کے مطابق بغیر کسی کمی وزیادتی اور مخالفت کے اوامر کی بجاآوری کے ذریعہ اللہ تعالی کا تقوی اختیار کرنے میں ہے۔اس کے بعد اللہ تعالی نے صحیح چیز کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:﴿وَأۡتُواْ ٱلۡبُيُوتَ مِنۡ أَبۡوَٰبِهَاۚ﴾"اور گھروں میں تو دروازوں میں سے آیا کرو" ۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ منہج اسلام ایک اعلی اخلاقی منہج ہے، اور یہ سختی اور تعنت پر مبنی نہیں، بلکہ بلا تعنت و تشدد کے رواداری والا منہج ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ اس آیت میں دیگر عبادات کو چھوڑ کر حج ہی کو ذکر کرنے کا سبب اور وجہ کیا ہے، جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ :اللہ تعالی نے مواقیت حج اور گھروں میں پیچھے سے داخل ہونے والی بات کو ایک ساتھ اس لیے ذکر کیا ہے کیوں کہ دونوں مسئلے ایک ساتھ پیش آئے ، یعنی چاند سے متعلق سوال اور گھروں میں پیچھے سے داخل ہونے سے متعلق سوال(۲)۔اس کے بعد آیت کے اختتام میں اللہ تعالی تقوی کا حکم دے رہا ہے جس سے فلاح وکامیابی ملتی ہے:﴿وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُونَ ﴾" اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ "۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کا تقوی متقی کو کامیابی وکامرانی اور نجات سے ہمکنار کرتا ہے، یہ چیز ایک مسلم کو تقوی پر اپنی اور دوسروں کی تربیت کے لیے آمادہ کرتی ہے، اور ظاہر اور مخفی دونوں صورتوں میں تقوی ہی کردار کا اصل ضابطہ ہے۔

---

(۱) تفسير قرطبي ٢/ ٢٣٠.

(٢) مرجع سابق.

آیت میں ترتیب کے طریقے سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اصلاح اور سدھار میں تدرج کو کافی اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ آیت میں پہلے جہل مرکب کو دور کیا گیا: ﴿ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَن تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِن ظُهُورِهَا ﴾ "(احرام کی حالت میں) اور گھروں کے پیچھے سے تمہارا آنا کچھ نیکی نہیں"۔ پھر اس کے بعد صحیح علم سے باخبر کیا گیا جس کی اتباع کرنا اور اپنانا ضروری ہے:: ﴿ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ﴾ "بلکہ نیکی والا وہ ہے جو متقی ہو"۔ جب فکر کی تصحیح اور نیکی کی سمجھ آگئی تو اس کے بعد کردار اور روش کی تصحیح کی گئی: ﴿وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا﴾ "اور گھروں میں تو دروازوں میں سے آیا کرو"۔ اس کے بعد نصیحت کی جاتی ہے جو اس تبدیلی کی اور امر الہی کے مطابق عمل کی محرک ہے:: ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾ " اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ "۔ اس طرح سے یہ آیت اصلاح و تصحیح اور تعلیم کے میدان میں ایک انتہائی دقیق اور عمدہ علمی و تربیتی منہج فراہم کر رہی ہے۔

﴿ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (١٩٠) وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ (١٩١) فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (١٩٢) وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ (١٩٣) الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (١٩٤) وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَأَحْسِنُوا ۛ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (١٩٥) ﴾

ترجمہ:

"لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو ،اللہ تعالی زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا(۱۹۰)۔ انہیں مارو جہاں بھی پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے اور (سنو) فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے ، اور مسجد حرام کے پاس ان سے لڑائی نہ کرو جب تک کہ یہ خود تم سے نہ لڑیں، اگر یہ تم سے لڑیں تو تم بھی انہیں مارو ، کافروں کا بدلہ یہی ہے(۱۹۱)۔ اگر یہ باز آجائیں تو اللہ تعالی بخشنے والا مہربان ہے(۱۹۲)۔ ان سے لڑو جب تک کہ فتنہ نہ مٹ جائے اور اللہ تعالی کا دین غالب نہ آجائے اگر یہ رک جائیں (تو تم بھی رک جاؤ) زیادتی تو صرف ظالموں پر

ہی ہے(۱۹۳)۔ حرمت والے مہینے حرمت والے مہینوں کے بدلے ہیں اور حرمتیں ادلے بدلے کی ہیں ، جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اسی کے مثل زیادتی کرو جو تم پر کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے(۱۹۴)۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو ، اور سلوک و احسان کرو اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے(۱۹۵)"۔

ان آیات میں صیغہ جمع کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کو خطاب کیا جارہا ہے:

﴿وَقَٰتِلُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ ٱلَّذِينَ يُقَٰتِلُونَكُمۡ وَلَا تَعۡتَدُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلۡمُعۡتَدِينَ﴾ "لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو ، اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا"۔ قتال کی اجازت کے تعلق سے نازل ہونے والی پہلی آیت میں اللہ تعالی دو باتوں کے التزام پر توجہ دلا رہا ہے، پہلی بات: یہ کہ جو مسلمانوں سے قتال کریں ان ہی سے قتال کیا جائے، دوسری بات: یہ کہ ظلم وزیادتی نہ ہو۔ اس آیت کے مفہوم کے فوائد میں سے ہے کہ اس میں قتال کے ہدف کی تعیین کردی گئی وہ یہ کہ یہ قتال فی سبیل اللہ ہونا چاہیے، اس سے ان تمام جنگوں کی نفی ہوگئی جو اللہ تعالی کی راہ میں نہ لڑی جائیں، اس لیے حقیقی مجاہد وہی ہے جو فی سبیل اللہ جہاد کرے، اور شہید بھی وہی شمار ہوگا جو اللہ تعالی کی راہ میں قتل کیا جائے۔ آیت کریمہ مسلمانوں سے لڑنے والوں سے قتال کے حکم پر مشتمل ہے، اور ایک ہی کلمہ (وَلَا تَعۡتَدُوٓاْ) "زیادتی نہ کرو" میں قتال کے آداب کو بھی بیان کردیا گیا، علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے کہ اس حکم میں مثلہ، خیانت، عورتوں، بچوں، بوڑوں، راہبوں، پادریوں کا قتل، درخت جلانا، بغیر مصلحت کے جانوروں کا قتل، یہ سارے امور داخل ہیں(۱) ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک اخلاقی اور رحمت وسلامتی والا مذہب ہے، نہ کہ انتقام، قتل وغارت اور ایذاء رسانی کا، اسلام انسانیت کے امن وامان اور قوت وطاقت کی حفاظت کرتا ہے، اور اس کے قتال کا مقصد شر وفساد ختم کرنا اور منفعت کی ترویج ہے، اور یہ کہ حد سے تجاوز کرتے ہوئے کسی پر ظلم و زیادتی نہ کی جائے حتی کہ جنگ میں بھی اس کا لحاظ رکھا گیا ہے ، بلکہ آیت کریمہ کا اختتام بھی اللہ تعالی کے

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۲۳۳.

اس فرمان سے ہوتا ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلۡمُعۡتَدِينَ﴾ "اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا"۔ یعنی اللہ تعالیٰ ظلم وزیادتی کو پسند نہیں فرماتا، اس لیے جو لوگ ظلم وزیادتی کرتے ہیں ان کو بھی پسند نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظلم وزیادتی سے پرہیز کرتے ہوئے خود کو قابو میں رکھنا چاہیئے، نیز اللہ تعالیٰ کو یہ محبوب ہے کہ ایک مسلمان اللہ کی مراد کے مطابق عمل کرے، تاکہ جہاد فی سبیل اللہ کا صحیح حق ادا ہو سکے۔

عام دشمنان اسلام سے قتال کی اجازت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ سے بھی قتال کی اجازت دی اور ان کے حق میں بھی صیغہ امر سے خطاب کیا، بلکہ جیسے ہی مسلمان ان پر قابو پائیں اور موقع ملے ان کو قتال کی اجازت دے رہا ہے: ﴿وَٱقۡتُلُوهُمۡ حَيۡثُ ثَقِفۡتُمُوهُمۡ﴾ " انہیں مارو جہاں بھی پاؤ" اور اسی طرح ﴿وَأَخۡرِجُوهُم مِّنۡ حَيۡثُ أَخۡرَجُوكُمۡۚ﴾ " اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے" یعنی مکہ مکرمہ سے تم بھی انہیں نکالو، کیوں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین وہیں سے نکالے گئے تھے، اور وہ لوگ مشرکین کی ایذاء رسانی اور گرفت سے اپنا دین بچانے کے لیے اپنے سارے مال ومتاع چھوڑ کر چلے گئے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد دشمن کے ساتھ عدل وانصاف پر مبنی ہے، اس لیے جس طرح ان لوگوں نے تم کو تکلیف دی، ستایا اور تمہارے گھروں سے تم کو نکالا تم بھی ان سے جنگ کرو اور انہیں مکہ سے نکالو۔ آپسی تعامل کے تعلق سے اسلام کا عدل وانصاف اس میں بالکل واضح ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک دینی حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَٱلۡفِتۡنَةُ أَشَدُّ مِنَ ٱلۡقَتۡلِ﴾ " اور (سنو) فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے " ، یعنی دین کا فتنہ ان کے قتل سے زیادہ خطرناک اور بڑا جرم ہے، اس لیے مشرکین کا مومنوں کو کفر پر مجبور کرنے کا فتنہ مومنوں کے ذریعہ ان کے قتل کرنے سے زیادہ سخت ہے، اس کی وجہ یہ کہ ان کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو کافی ایذاء اور حسی ومعنوی تکلیفیں دی گئیں، اور حقیر وذلیل اوصاف سے آپ کو پکارنے کی نفسیاتی جنگ بھی کی جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جادو، کہانت اور شعر سے متہم کیا، نیز آپ کو جسمانی تکلیفیں بھی پہنچائی گئیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کا فتنہ سب سے بڑی مصیبت اور سب سے بڑا جرم ہے، اسی طرح جو لوگ اللہ کے دین کے متعلق لوگوں کو فتنے میں ڈالتے ہیں وہ کافی خطرناک لوگ ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ دینی فتنے، ان کے وسائل واسالیب اور

ان کی شکلوں سے بچا جائے، یا لکھ بول کر، دیکھا کر یا کسی بھی ذریعہ سے ان فتنوں کو مسلم ممالک میں منتقل کیا یا پھیلا یا جائے۔

یہاں آیت میں اللہ تعالی نے قتل کی خطرناکی اور نقصانات اور ایک مومن کے دین کے فتنہ کے خطرناکی اور نقصانات کے درمیان مقارنہ اور مقابلہ کرکے بات کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ دین کا فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے، اس سے یہ اہمیت عیاں ہوتی ہے کہ ایسے سارے افکار و مفاہیم جو جہاد کے نفاذ یا کسی ہدف کی تکمیل میں رکاوٹ بنیں انہیں دور کیا جانا چاہیے، اور حق کے غلبہ اور دین کے معاملہ میں مومن کی مدد کے لیے خود کو ہمہ وقت تیار رکھا جائے ۔اس آیت کا دعوتی، تربیتی، ادارتی اور دیگر عام مجالات میں بھی فائدہ ہے، جہاں مصالح اور مفاسد کے درمیان مقارنہ کرکے فکری رکاوٹوں کا ازالہ کرتے ہوئے درست اور محکم راہ اور انتخاب کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی مکہ مکرمہ کی حرمت بیان کر رہا ہے: ﴿وَلَا تُقَٰتِلُوهُمۡ عِندَ ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَٰتِلُوكُمۡ فِيهِۖ فَإِن قَٰتَلُوكُمۡ فَٱقۡتُلُوهُمۡۗ﴾" اور مسجد حرام کے پاس ان سے لڑائی نہ کرو جب تک کہ یہ خود تم سے نہ لڑیں، اگر یہ تم سے لڑیں تو تم بھی انہیں مارو "۔ یہ بیت اللہ الحرام کے مقدس ہونے کی دلیل ہے، اس لیے قلبی اور عملی ہر اعتبار سے اس کی تعظیم و توقیر اور ہر طرح کا ادب واحترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے، بلکہ اس میں قتال حتمی طور پر ممنوع ہے، الا یہ کہ یہ کفار خود قتال پر اتر آئیں تو تم ان سے وہاں قتال کرو، چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر کچھ ایسا ہی ہوا، کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ شروع نہیں کی، اور اللہ تعالی نے آپ کو بغیر کسی جنگ کے مکہ کی فتح نصیب فرمائی۔ اور کافروں کا بدلہ یہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿كَذَٰلِكَ جَزَآءُ ٱلۡكَٰفِرِينَ﴾ ۔اس کے بعد اللہ تعالی ایک ممکنہ امر کو بیان رہا ہے اور اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا: ﴿فَإِنِ ٱنتَهَوۡاْ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمٞ﴾" اگر یہ باز آجائیں تو اللہ تعالی بخشنے والا مہربان ہے "، یعنی اگر یہ شرک چھوڑ کر اسلام میں داخل ہو جائیں تو اللہ تعالی ان کو بخش دے گا اور ان پر رحم فرمائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی اسلام کی وجہ سے ان کے سابقہ سارے گناہ معاف فرمادے گا، نیز یہ بھی پتہ چلا کہ اصل ہدف یہ نہیں کہ مسلمان طاقت وقوت کے ذریعہ غالب ہو جائیں اور

ان کو تشفی ان سے ہو جائے اور بس، بلکہ اصل ہدف یہ کہ لوگ اسلام قبول کرلیں اور اس طرح سے اسلام کا بول بالا ہو۔

اللہ تعالی ان سے قتال کی وجہ بیان کر رہا ہے، فرمایا: ﴿وَقَٰتِلُوهُمۡ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتۡنَةٞ وَيَكُونَ ٱلدِّينُ لِلَّهِۖ﴾ " ان سے لڑو جب تک کہ فتنہ نہ مٹ جائے اور اللہ تعالی کا دین غالب نہ آجائے "۔یعنی ان سے قتال کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے دین کے متعلق فتنہ میں نہ ڈالا جائے، اور مکہ میں کوئی ظالم نہ رہے جو ان کے دین میں فتنہ کا سبب بنے، اور پورے مکہ میں دین صرف اللہ رب العالمین کا ہو، شرک کا جڑ سے خاتمہ ہو اور صرف اللہ کا دین باقی بچے ، چنانچہ اگر وہ اپنے شرک وکفر سے باز آجاتے ہیں، اور اسلام قبول کر لیتے ہیں تو پھر یہی قانون ان پر لاگو ہوگا: ﴿فَإِنِ ٱنتَهَوۡاْ فَلَا عُدۡوَٰنَ إِلَّا عَلَى ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ " اگر یہ رک جائیں (تو تم بھی رک جاؤ) زیادتی تو صرف ظالموں پر ہی ہے "۔

سابقہ سیاق میں عدل وانصاف، ظلم سے اجتناب، ہدف کی تکمیل، برابری کے سلوک کا ظہار ہے ، نیز یہ کہ اسلام اور ایمان ہر طرح کے جور وظلم اور عداوت ودشمنی پر غالب ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے دشمنی کی سارے اسباب ختم اور لوگوں کی جانیں محفوظ ہو جاتی ہیں، اسلام سے پہلے چاہے اس نے جتنا بھی بڑا ظلم کیا ہو اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کو اس سے قصاص اور بدلہ لینے کا حکم نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالی کا فرمان تو یہ ہے کہ: ﴿فَإِنِ ٱنتَهَوۡاْ فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمٞ﴾ " اگر یہ باز آجائیں تو اللہ تعالی بخشنے والا مہربان ہے "۔

اس کے بعد اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿ٱلشَّهۡرُ ٱلۡحَرَامُ بِٱلشَّهۡرِ ٱلۡحَرَامِ وَٱلۡحُرُمَٰتُ قِصَاصٞۚ﴾ " حرمت والے مہینے حرمت والے مہینوں کے بدلے ہیں اور حرمتیں ادلے بدلے کی ہیں "۔اس آیت میں برابری کے سلوک کا بیان ہے، تاکہ ہر طرح کے ظلم وزیادتی کی روک تھام ہو، چنانچہ جو کوئی زیادتی کرتے ہوئے حرام مہینوں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم الحرام اور رجب میں تم سے لڑے تو تم بھی ان سے لڑو، کیوں کہ جو شخص اللہ تعالی کی حرمتوں پر جرأت دکھلائے تو اس سے قصاص لیا جائے گا، یعنی جیسے کو تیسا بدلہ، فرمایا: ﴿فَمَنِ ٱعۡتَدَىٰ عَلَيۡكُمۡ فَٱعۡتَدُواْ عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا ٱعۡتَدَىٰ عَلَيۡكُمۡۚ﴾ " جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر اسی کے مثل زیادتی کرو جو تم پر کی ہے "۔اس سے اللہ تعالی کی حرمتوں کے متعلق اسلام کی

عنایت واحترام کا پتہ چلتاہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ ظالم کے شر وفساد کی روک تھام بھی ضروری ہے، حتی کہ اگران کی طرف سے ظلم وزیادتی حرام مہینوں میں یا کسی محترم جگہ یالباس احرام میں ہوتب بھی اس کا دفاع ضروری ہے،اس کے بہت سارے فوائد ہیں: جیسے کہ اس سے حق اورامن کورواج ملتاہے ،نیز تاکہ کافرلوگ ان کی حرمت کاغلط استعمال کرتے ہوئے ظلم وزیادتی اورفساد پرنہ کریں، یاانفرادی طورپر کوئی حج یاعمرہ کااحرام باندھ کر ظلم وفساد پھیلاناشروع کردے،اس لیے ضروری ہے کہ ایسے شخص کوسزاہواور روکا جائے ، یہ آیات صلح حدیبیہ کے سال نازل ہوئی ہے جس کی تفصیل مفسرین کے یہاں مذکور ہے(۱)۔

اب چوں کہ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ بسااوقات اگراسے بدلہ لینے کی اجازت دے دی جائے تواپنی حدپر باقی نہیں رہتااور جب تک تشفی نہ ہوجائے بدلہ لینے لگتاہے،اسی لیےاللہ تعالی نے آیت میں تقوی کے التزام کاحکم دیاہے جس کامفہوم یہ ہے کہ آدمی اللہ کی حدود کے اندررہےاوراس سے آگے نہ بڑھے(۲) ،فرمایا:﴿وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلۡمُتَّقِينَ﴾ "اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے "۔اس میں تقوی کاحکم ہےاور یہ بتلایاگیاہے کہ اللہ تعالی تقوی اختیارکرنے والوں کے ساتھ ہے،اس سے معلوم ہواکہ جس کویہ پسند ہوکہ اللہ تعالی اس کے ساتھ رہے تووہ تقوی کاالتزام کرے،تاکہ اللہ تعالی اس کامعین ومددگارہو،اسی کے برعکس اس کامفہوم یہ ہواکہ جوکوئی اللہ سے نہیں ڈرتاتواللہ تعالی اس کوبے یارومددگارچھوڑدیتاہے، پھروہ ہمیشہ اور ہرحال میں ذلیل وخوارہوتاہے ۔

اس کے بعد اللہ تعالی اپنے بندوں کوفی سبیل اللہ خرچ کرنے کاحکم دے رہاہے:﴿وَأَنفِقُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ﴾"اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو"۔یعنی اے مال ودولت کی فراوانی والو! اللہ تعالی کی راہ میں صدقہ کرو،یعنی خیر کے مختلف راستوں میں، کیوں کہ اللہ تعالی نے کسی ایک طرف خرچ کرنے کی تعیین نہیں کی ہے،بلکہ یہ ارشادخیر کے تمام راستوں کے لیے عام ہے(فی سبیل اللہ)"اللہ کی راہ میں"،تاکہ یہ

---

(۱) دیکھیں: تفسیر قرطبي ۲/۲۳٦-۲۳۷.

(۲) تفسیر بن السعدي ۱/۱۵۳.

انفاق فی سبیل اللہ کے تعلق سے قاعدہ کلیہ ہو ،اور چوں کہ یہ آیت جہاد کے سیاق میں ہے،اس لیے جہاد فی سبیل اللہ میں خصوصی طور پر خرچ کی ترغیب ہے۔اور مال کو روک رکھنے سے اللہ تعالی نے منع فرمایا کیوں کہ یہ روکنے والے کی ہلاکت کا باعث ہے : ﴿وَلَا تُلْقُوا۟ بِأَيْدِيكُمْ إِلَى ٱلتَّهْلُكَةِ﴾ " اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو "۔ اس مفہوم کی اس طرح سے تصویر کشی سے معلوم ہوا کہ انسان کا اپنے مال کو روکے رکھنا اور اللہ کی راہ میں اسے خرچ نہ کرنا اس کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے، گویا کہ مال روک کر اس نے خود کو کھینچ کر ہلاکت میں ڈھکیل دیا ہو،اسی کے بالمقابل ہلاکت انفاق کے ذریعہ دور ہوتی ہے، یا یوں سمجھیں کہ انفاق ہلاکت کو ٹالتا ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے(إنَّ الصَّدقَةَ لَتُطفِئُ غَضب الرَّبِّ وتَدْفَعُ عَن مِيتَةِ السُّوءِ)(١) "یعنی صدقہ اللہ تعالی کے غضب کو ختم کرتا اور بری موت سے بچاتا ہے"۔ کیوں کہ انفاق میں فارغ البال کی طرف سے مفلوک الحال کو، طاقتور کی طرف سے کمزور کو، مالدار کی طرف سے فقیر کو تقویت حاصل ہوتی ہے،اور جہاد میں بھی اس انفاق کی بڑی مصلحتیں ہیں، کیوں کہ اس سے فارغ البال اور دیگر لوگ ہلاکت سے محفوظ ہوتے ہیں، اور اس جہاد کے ذریعہ اسلام سربلند اور ظالموں کے شر کا دفاع ہوتا ہے۔اس کے بعد اللہ تعالی احسان کا حکم دے رہا ہے: ﴿وَأَحْسِنُوٓا۟ ۛ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ﴾" اور سلوک و احسان کرو اللہ تعالی احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے "۔اس توجیہ میں احسان کی تمام صورتیں شامل ہیں، مال وجاہ کے ذریعہ، بھلی بات کے ذریعہ یا اس کے علاوہ دیگر احسان کی جو بھی شکل ہو۔اس آیت میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ احسان کرنے والے کو اللہ تعالی کی محبت میسر ہوتی ہے،اور یہ بہت ہی جلیل القدر اور عظیم الشان بدلہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالی کی محبت حاصل ہو جائے اور جس کو اللہ تعالی پسند کرے تو پھر اس کی عنایت وتوفیق اور رہنمائی شامل حال ہوتی ہے، بلکہ اللہ تعالی اس کی محبت مخلوق کے دلوں میں بھی ڈال دیتا ہے۔

فرمان باری تعالی : ﴿وَأَحْسِنُوٓا۟ ۛ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ﴾ آدمی کی طاقت ہے جس کے ذریعہ وہ نفس کی بخیلی کو دور کرتا اور نفس کو خیر کے کاموں پر آمادہ کرتا ہے، اگر کسی پر احسان کرنے میں متردد ہو تو اس فرمان الہی﴿وَأَحْسِنُوٓا۟ ۛ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُحْسِنِينَ﴾" اور سلوک و احسان کرو اللہ تعالی احسان

---

(١) ابن ماجه ٣/٥٢ حديث نمبر (٦٦٤)

کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے "۔ کے ذریعہ اس احسان کا عزم کرلیتا ہے، اگر بخیلی کی خواہش جا گنے لگے تو اللہ کے فرمان ﴿وَأَحۡسِنُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴾" اور سلوک و احسان کرو اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے "۔ کے ذریعہ اس پر غلبہ حاصل کرتا ہے، اگر اسے لگنے لگے کہ اس نے تو بہت زیادہ خرچ کردیا ہے تو یہی فرمان ﴿ وَأَحۡسِنُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴾" اور سلوک و احسان کرو اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے "۔ اس کو مضبوط بناتا ہے، اگر کسی نیکی میں سستی کا شکار ہو تو ﴿وَأَحۡسِنُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴾" اور سلوک و احسان کرو اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے "۔ اس میں نشاط لاتا ہے، اگر کہیں پر خود کو ترجیح کی کیفیت طاری ہو تو عتاب اور سرزنش کے لیے یہی فرمان ﴿وَأَحۡسِنُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلۡمُحۡسِنِينَ ﴾" اور سلوک و احسان کرو اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے "۔ ذریعہ بنتا ہے، غرضیکہ یہ آیت مومن کی قوت ہے جس کو وہ احسان کی ہر صورت اور ہر مقام پر استعمال کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالی سے توفیق و مدد اور ہدایت کی دعا کرتے ہیں، اور یہ بھی کہ وہ مجھ کو اور میرے اسلامی بھائیوں کو احسان کرنے والوں میں سے بنائے۔

﴿ وَأَتِمُّواْ ٱلۡحَجَّ وَٱلۡعُمۡرَةَ لِلَّهِۚ فَإِنۡ أُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِۖ وَلَا تَحۡلِقُواْ رُءُوسَكُمۡ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡهَدۡيُ مَحِلَّهُۥۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوۡ بِهِۦٓ أَذٗى مِّن رَّأۡسِهِۦ فَفِدۡيَةٞ مِّن صِيَامٍ أَوۡ صَدَقَةٍ أَوۡ نُسُكٖۚ فَإِذَآ أَمِنتُمۡ فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلۡعُمۡرَةِ إِلَى ٱلۡحَجِّ فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِۚ فَمَن لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٖ فِي ٱلۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ إِذَا رَجَعۡتُمۡۗ تِلۡكَ عَشَرَةٞ كَامِلَةٞۗ ذَٰلِكَ لِمَن لَّمۡ يَكُنۡ أَهۡلُهُۥ حَاضِرِي ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۚ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلۡعِقَابِ ١٩٦ ﴾

ترجمہ:

"حج اور عمرے کو اللہ تعالیٰ کے لئے پورا کرو ، ہاں اگر تم روک لئے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو اسے کرڈالو ،اور سر نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی قربان گاہ تک نہ پہنچ جائے، البتہ تم میں سے جو بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (جس کی وجہ سے سر منڈا لے) تو اس پر فدیہ ہے خواہ روزے رکھ لے خواہ صدقہ دے دے، خواہ قربانی کرے، پس جب تم امن کی حالت میں ہو جاؤ تو جو شخص عمرے سے لے کر حج تک تمتع کرے پس اسے جو قربانی

میسر ہواسے کرڈالے ، جسے طاقت نہ ہوتو وہ تین روزے حج کے دنوں میں رکھ لےاور سات واپسی پر ، یہ پورے دس ہوگئے ، یہ حکم ان کے لئے ہے جو مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں، لوگو! اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لوکہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے"۔

اللہ تعالی جو کہ علیم وحکیم ہے مومنوں کے لیے حج کی فرضیت بیان کر رہا ہے: ﴿ وَأَتِمُّواْ ٱلْحَجَّ وَٱلْعُمْرَةَ لِلَّهِۚ ﴾ "حج اور عمرے کواللہ تعالی کے لئے پورا کرو "۔آیت کی شرعات امر کے صیغہ سے ہورہی ہے ،جس کا تقاضاہے جوحج اور عمرہ شروع کرے اس کے لیےاس کو پورا کرناواجب ہے،اس سے ادائیگی اور اتمام کی اہمیت کی تاکید ہوتی ہے ،اور اتمام کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اس کے تمام ارکان واجبات اور مستحبات کے ساتھ احسن طریقے سے ادا کیا جائے،اس میں کسی تردد سے بچ کر عزیمت کو مقدم رکھا جائے ،اس کی وجہ سے ہر خیر کے کام کے وقت ایک مسلم کے اندر عزیمت اور توکل علی اللہ کی صفت پیدا ہوتی ہے ،اور وہ اس تردد کو سرے سے ختم کردیتا ہے جو کہ انسان کی ناکامی کا سبب ہے ،اور ہر عمل کی انجام دہی میں اتقان سے کام لیتا ہے،اور جتنا ہوسکے ہر طرح سے اچھے طور پر انجام دینے کی کوشش کرتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:(إِذَا عَمِلَ أَحَدُكُم عَمَلًا فَلْيُتْقِنْهُ) (١) "تم میں سے کوئی جب کوئی کام کرے توپورے اتقان کے ساتھ کرے"۔اسی طرح آیت کریمہ میں ایک اوراہم امر کی تاکید ہے،وہ ہے اخلاص وللہیت : ﴿ وَأَتِمُّواْ ٱلْحَجَّ وَٱلْعُمْرَةَ لِلَّهِۚ ﴾ " حج اور عمرے کواللہ تعالیٰ کے لئے پورا کرو "۔یعنی اس میں کوئی ریاء ونمود یا کوئی دوسرا مقصد نہ ہو، بلکہ صرف اللہ وحدہ لاشریک لہ کا اخلاص ہو۔اس سے معلوم ہوا کہ دین اسلام اخلاص کا دین ہے ، عمل کرکے فخر ومباہات اور ریاکاری کا دین نہیں، چاہے وہ دینی اعمال ہوں یادنیاوی۔اخلاص سے کبر وغرور نہیں آتا جو کہ سماج کے لوگوں میں بغض وعداوت کو جنم دیتا ہے۔ عبادتوں کی ادائیگی کا اثر عام زندگی اور اخلاق وکردار پر ظاہر ہوتا ہے،اور پھر ایک مسلم کی زندگی کے بقیہ سارے امور ونشاطات پر۔

شریعت اسلامیہ میں محرم کے لیے حج اور عمرہ کی تکمیل میں ممکنہ درپیش رکاوٹوں کے احکامات اللہ کے اس فرمان میں بیان ہوئے ہیں: ﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ ﴾" ہاں اگر تم روک لئے جاؤ"۔جوحج یاعمرہ

---

(١) السلسلة الضعيفة، حديث نمبر (٢٦٤٧٩).

کی عبادت میں داخل ہو اور اس کو پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش آجائے تو شریعت اسلامیہ میں پہلے ہی سے احتیاطا اس کا حل نکالتے ہوئے اس کے استثنائی احکامات بیان کر دیے گئے ہیں تاکہ آدمی کسی حرج اور مشقت میں نہ پڑے، اب یہ رکاوٹ کوئی بھی ہو، آیت میں (حصر) کا لفظ عام ہے جس میں وہ تمام اسباب و موانع شامل ہیں جو حج وعمرہ کے تکمیل مین رکاوٹ بنیں، اللہ تعالی نے اس کی کوئی نوعیت نہیں بیان کی تاکہ اس میں کافی وسعت رہے، کیوں کہ رکاوٹ کے اسباب واقسام تو بہت زیادہ ہیں، یہ اس شریعت الہی کی گہرائی وگیرائی ہے، کیوں کہ اللہ تعالی اپنے بندوں کے مستقبل سے باخبر اور جاننے والا ہے، نیز یہ شریعت اسلامیہ کا اعجاز ہے کہ اس کے احکامات میں تمام ممکنہ امور کا استیعاب ہے، اسی طرح اس میں اس کا بلاغی اعجاز بھی ہے کہ ایک ہی لفظ (أُحۡصِرۡتُمۡ) میں تمام قسم کے موانع آگئے۔ تعلیمی طور بھی اس سے ایک فائدہ اخذ ہوتا ہے، وہ یہ کہ مصلحت مرسلہ سے متعلق زندگی کے مختلف مراحل میں نظام وتعلیمات کے صیاغہ کے طریقہ کار کی معرفت۔

اللہ تعالی نے اس حصار اور رکاوٹ کا سب سے آسان اور بہتر حل بیان کیا، فرمایا: ﴿فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِۖ﴾ " تو جو قربانی میسر ہو اسے کر ڈالو "۔ یعنی ایک بکرہ یا اونٹ یا گائے ذبح کر دی جائے، اس میں مزید کوئی شرط نہیں لگائی ، یہ اللہ تعالی کی طرف سے آسانی کے طور پر ہے، کیوں کہ وہ اللہ حکمت والا مہربان ہے اس کے یہاں صورت حال کی رعایت ہوتی ہے۔ ﴿فَمَا ٱسۡتَيۡسَرَ مِنَ ٱلۡهَدۡيِۖ﴾ " تو جو قربانی میسر ہو اسے کر ڈالو "۔ اللہ تعالی نے آسانی کو پیمانہ بنایا اور اسی پیمانہ سے آدمی اختیارات میں سے کسی ایک کا فیصلہ کرتا ہے ، مقصد یہ ہے کہ حج یا عمرہ کرنے والے حرج میں نہ پڑیں، اس سے معلوم ہوا کہ نظام سازی اور توجیہ وتخطیط میں احتمالات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا اعتبار کیا جائے اور ان کا مناسب حل بھی نکالا جائے جو بدیل کے طور پر ہوں جن میں ممکنہ صورت حال کی رعایت کی گئی ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالی احرام سے حلال ہونے کی ترتیب کا ذکر کر رہا ہے کہ یہ تحلل ہدی کی قربانی کے بعد ہے ﴿وَلَا تَحۡلِقُواْ رُءُوسَكُمۡ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡهَدۡيُ مَحِلَّهُۥۚ﴾ "اور سر نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی قربان گاہ تک نہ پہنچ جائے"۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اسلامیہ میں تمام عبادتیں اللہ تبارک وتعالی کی طرف سے ایک منظم منہج اور طریقے کے مطابق ہیں، اور اللہ تعالی اور ہمارے نبی محمد

صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عبادتوں کو جس طرح مشروع کیا ہے ان کو اسی کے مطابق اپنانا لازم ہے۔اس کے بعد اللہ تعالی دیگر موانع یا کوئی غیر متوقع اور اچانک صورت حال کو بیان کر رہا ہے جو حج اور عمرہ کا احرام باندھنے والے کو پیش آجاتی ہے: ﴿فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ بِهِۦٓ أَذًى مِّن رَّأْسِهِۦ فَفِدْيَةٌ مِّن صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ نُسُكٍ﴾" البتہ تم میں سے جو بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (جس کی وجہ سے سر منڈا لے) تو اس پر فدیہ ہے خواہ روزے رکھ لے خواہ صدقہ دے دے، خواہ قربانی کرے" چوں کہ اللہ تعالی بندوں کے ساتھ پیش آنے والی ہر ممکنہ اسباب سے پورے طور پر باخبر ہے جن کی وجہ سے بندہ کے لیے مناسک حج وعمرہ کے طریقے کی مخالفت ناگزیر ہو جاتی ہے، لهذا اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو اللہ تعالی نے تعلیم دی کہ بندہ اس وقت کیا کرے۔اس سے اس شریعت کی منہجی گیرائی کا پتہ چلتا ہے جس کا اللہ تعالی کے علاوہ کسی اور کے جانب سے ہونا ناممکن ہے، اس سے مومن کے ایمان وتصدیق میں اضافہ ہی ہوتا ہے، چنانچہ اگر کسی کو ایسی بیماری لاحق ہو جائے جس سے سر کے بالوں کا منڈوانا ناگزیر ہو تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز ہے، اور ساتھ میں وہ اس کا کفارہ ادا کرے گا، کفارہ کی مختلف صورتوں میں سے کسی ایک کا اس کو اختیار ہے: روزہ رکھنا یا کھانا کھلانا یا ذبح کرنا، اور اس کی تفصیل حدیث میں بیان کی گئی ہے، اور فقہاء نے اس کی مزید فقہی تفاصیل ذکر کی ہیں۔اس شریعت اسلامیہ کی منہجیت کا فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کی وجہ سے ایسے بے مثال علماء پیدا ہوئے اور اللہ تعالی کے فضل وکرم سے ان کی فہم وفراست کو ایسی جلا ملی کہ انہوں نے کئی ایسے عظیم علوم ایجاد کئے جن کی نظیر سابقہ امتوں میں نہیں ملتی، جیسے قواعد فقہیہ، اصول فقہ، مصطلح الحدیث اور ان کے علاوہ دیگر علوم ومعارف جن کے موجد اللہ تعالی کے فضل وکرم پھر شریعت ربانی کی منہجیت کے فضل سے مسلمان ہی ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی تمتع کی قربانی کا حکم بیان کر رہا ہے جب کہ دشمن وغیرہ سے پر امن ہو جائیں: ﴿فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِٱلْعُمْرَةِ إِلَى ٱلْحَجِّ فَمَا ٱسْتَيْسَرَ مِنَ ٱلْهَدْيِ﴾" پس جب تم امن کی حالت میں ہو جاؤ تو جو شخص عمرے سے لے کر حج تک تمتع کرے پس اسے جو قربانی میسر ہو اسے کر ڈالے "۔یہ حکم اس وقت ہے جب کوئی حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے، پھر عمرہ کر کے حلال ہو جائے، اور پھر ایک مقیم کی طرح ہر چیز کا فائدہ اٹھائے، پھر حج کے وقت دوبارہ حج کا احرام باندھے تو ایسے شخص کو قربانی

دیناواجب ہے، نیز ایسے میں بھی شریعت نے درپیش صورت حال کی رعایت کی: ﴿فَمَن لَّمۡ يَجِدۡ فَصِيَامُ ثَلَٰثَةِ أَيَّامٖ فِي ٱلۡحَجِّ وَسَبۡعَةٍ إِذَا رَجَعۡتُمۡۗ تِلۡكَ عَشَرَةٞ كَامِلَةٞۗ﴾ " جسے طاقت نہ ہو تو وہ تین روزے حج کے دنوں میں رکھ لے اور سات واپسی پر ، یہ پورے دس ہوگئے "۔ یعنی شریعت نے ایسی صورت حال کی پوری رعایت کی جس کا سابقہ کسی بھی حاجی کی پڑ سکتا ہے، جیسے کہ کسی کو قربانی کا جانور نہ مل سکے، یا اس کے پاس قربانی خریدنے کے لیے قیمت نہ ہو ،ایسے میں بدل کے طور پر روزہ رکھنے کا حکم دیا، اور یہ روزہ دو حصوں میں رکھنا ہے تاکہ اس کی وجہ سے کسی مشقت کا سامنا نہ کرنا پڑے، تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور سات روزے اپنے وطن لوٹنے کے بعد، اب یہاں شریعت اسلامیہ کا اعجاز ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے احتمالات کا اعتبار اور صورت حال کی رعایت کرتے ہوئے پہلے ہی یہ حکم دے دیا تاکہ کوئی دشواری نہ اٹھانی پڑے، اور ایسا اللہ تعالی ہی کی ذات سے ممکن ہے جو شریعت سازی کے بارے میں اپنے بندوں پر کافی مہربان، اور مطلوبہ حکم اور پیش آمدہ صورت حال جس کا سامنا ایک مسلمان کو کرنا پڑ سکتا ہے دونوں کے درمیان مناسب حل نکالنے میں بڑی حکمت والا ہے۔

اس میں ایک مسلمان کے لیے تنظیم وتخطیط کے طریقہ کار کا ڈھنگ سکھلایا گیا ہے ،اس سے فکری بلندی، ذہنی کشادگی اور ادراک ومعارف کی وسعت حاصل ہوتی ہے تاکہ پوری حالات زندگی پر اس کی نظر ہو،اور اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ذاتی مسائل اور امت کے مسائل کو کیسے حل کرنا ہے ،لوگوں کے حالات اور انفرادی، سماجی، بعض یا ساری امت کے درپیش معاملات کی سطح پر ناگہانی صورت حال کی رعایت کیسے کی جائے ،چنانچہ منہج اسلام مومن کو بہت کچھ خیر وبھلائیاں سکھلاتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی فرماتا ہے کہ یہ حکم ان کے لیے ہے جو مسجد حرام کا رہنے والے نہ ہوں :﴿ذَٰلِكَ لِمَن لَّمۡ يَكُنۡ أَهۡلُهُۥ حَاضِرِي ٱلۡمَسۡجِدِ ٱلۡحَرَامِۚ﴾" یہ حکم ان کے لئے ہے جو مسجد حرام کے رہنے والے نہ ہوں " ۔ علامہ ابن السعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: جو مسجد حرام کی پاس رہنے والے ہیں ان پر یہ قربانی نہیں ہے، کیوں کہ قربانی کا سبب ان میں نہیں پایا جاتا[۱] (یعنی ایک سفر میں دو عبادت کے حصول سے قربانی واجب ہے)۔ فقہاء کے یہاں اس کی مزید تفصیل ہے۔

---

(۱) تفسير ابن اسعدي ١/١٥٦.

اس کے بعد اللہ تعالی تقوی کا حکم دے رہا ہے: ﴿وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ﴾ " لوگو! اللہ سے ڈرتے رہو "۔اس جملہ سے جس میں کہ تقوی کا حکم ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج اور عمرہ کرنے والوں کو اس عبادت کی ادائیگی کے بارے میں اللہ تعالی سے ڈرنا واجب ہے ، کیوں کہ اللہ تعالی کے علاوہ ان کا کوئی نگہبان اور محاسب نہیں، لہذا لازم اور ضروری ہے کہ وہ فرائض کو اللہ تعالی کے حکم کے مطابق ادا کریں،اس سے معلوم ہوا کہ دعوتی، تربیتی اور تعلیمی میدان کے تمام امور میں تقوی کی نصیحت کرتے رہنا چاہیے ، کیوں کہ خیر و بھلائی کی بار بار تاکید کرنا نہایت اہم ہے،اور اس کے مثبت اثرات و فوائد ہیں، حتی کہ پیشہ وارانہ اعمال اور باہمی تعلقات و معاملات میں بھی ہر ایک کے یہاں ہمیشہ خیر کی وصیت و تاکید ہونی چاہیے۔

آگے اللہ تعالی اس کے بالمقابل جو اللہ کا تقوی نہیں اختیار کرتا اور عبادت میں کھلواڑ یا سستی کرتا ہے اسے سزا سے آگاہ کر رہا ہے: ﴿وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلۡعِقَابِ﴾ " اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے "۔ یعنی تقوی کا التزام نہ کرنے کی صورت میں اللہ تعالی کی سخت سزا ہے اس شخص کے لیے جو اللہ تعالی کے اوامر کو ہلکے میں لیتا ہے،اس لیے مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اللہ تعالی کے احکام و اوامر کو پوری سنجیدگی سے قبول کریں اور ان میں سستی اور لاپرواہی نہ کریں،اس وعید کا مقصد لوگوں کو اللہ تعالی کی طرف سے ڈرانا اور خوف دلانا ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کا خوف کی وجہ سے ہی بتوفیق الہی تقوی کا حصول ہوتا ہے،اسی طرح یہ یاد دلانا اور بتلانا کہ اللہ تعالی سخت عذاب دینے والا ہے بندے کے لیے حصول تقوی کا سبب ہے، کیوں کہ خوف سے نفرت اور امن و سلامتی سے محبت انسانی طبیعت کی فطرت ہے۔اس سے یہ فائدہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ تربیت کے میدان میں ارشاد و توجیہ کے ساتھ ساتھ ان ارشادات و توجیہات کے مخالفین کے لیے عقوبات کا بھی بیان کرنا نہایت اہم ہے۔اسی طرح اس میں ہر فرد بشر کی تربیت ہے کہ وہ خود کو اللہ تعالی کے تقوی کا عادی بنائیں ، کیوں کہ کوئی بھی فرد بشر ایسا نہیں جو کسی حاجی کی عبادت میں کوتاہی کا محاسبہ کرے، بلکہ نگہبان، محاسب اور سزا دینے والی صرف اللہ وحدہ لاشریک کی ذات ہے۔

﴿ٱلۡحَجُّ أَشۡهُرٞ مَّعۡلُومَٰتٞۚ فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ ٱلۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي ٱلۡحَجِّۗ
وَمَا تَفۡعَلُواْ مِنۡ خَيۡرٖ يَعۡلَمۡهُ ٱللَّهُۗ وَتَزَوَّدُواْ فَإِنَّ خَيۡرَ ٱلزَّادِ ٱلتَّقۡوَىٰۖ وَٱتَّقُونِ يَٰٓأُوْلِي ٱلۡأَلۡبَٰبِ ١٩٧
لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ أَن تَبۡتَغُواْ فَضۡلٗا مِّن رَّبِّكُمۡۚ فَإِذَآ أَفَضۡتُم مِّنۡ عَرَفَٰتٖ

فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ عِندَ ٱلۡمَشۡعَرِ ٱلۡحَرَامِۖ وَٱذۡكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمۡ وَإِن كُنتُم مِّن قَبۡلِهِۦ
لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ ﴿١٩٨﴾ ثُمَّ أَفِيضُواْ مِنۡ حَيۡثُ أَفَاضَ ٱلنَّاسُ وَٱسۡتَغۡفِرُواْ ٱللَّهَۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ
رَّحِيمٞ ﴿١٩٩﴾ فَإِذَا قَضَيۡتُم مَّنَٰسِكَكُمۡ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ كَذِكۡرِكُمۡ ءَابَآءَكُمۡ أَوۡ أَشَدَّ
ذِكۡرٗاۗ فَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِي ٱلدُّنۡيَا وَمَا لَهُۥ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ مِنۡ خَلَٰقٖ ﴿٢٠٠﴾
وَمِنۡهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِي ٱلدُّنۡيَا حَسَنَةٗ وَفِي ٱلۡأٓخِرَةِ حَسَنَةٗ وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ﴿٢٠١﴾
أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمۡ نَصِيبٞ مِّمَّا كَسَبُواْۚ وَٱللَّهُ سَرِيعُ ٱلۡحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ ۞ وَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ فِيٓ أَيَّامٖ مَّعۡدُودَٰتٖۚ
فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوۡمَيۡنِ فَلَآ إِثۡمَ عَلَيۡهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَآ إِثۡمَ عَلَيۡهِۚ لِمَنِ ٱتَّقَىٰۗ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّكُمۡ
إِلَيۡهِ تُحۡشَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

ترجمہ:

"حج کے مہینے مقرر ہیں ، اس لئے جو شخص ان میں حج لازم کرلے وہ اپنی بیوی سے میل ملاپ کرنے، گناہ کرنے اور لڑائی جھگڑے کرنے سے بچتا رہے ، تم جو نیکی کرو گے اس سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے اور اپنے ساتھ سفر خرچ لے لیا کرو، سب سے بہتر توشہ اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے ، اور اے عقلمندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو(۱۹۷)۔ تم پر اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی گناہ نہیں ، جب تم عرفات سے لوٹو تو مسجد حرام کے پاس ذکر الٰہی کرو اور اس کا ذکر کرو جیسے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے، تم اس سے پہلے راہ بھولے ہوئے تھے(۱۹۸)۔ پھر تم اس جگہ سے لوٹو جس جگہ سے سب لوگ لوٹتے ہیں ، اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے رہو یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے(۱۹۹)۔ پھر جب تم ارکان حج ادا کر چکو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے آباؤاجداد کا ذکر کیا کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ ، بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں دے۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں(۲۰۰)۔ اور بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں نیکی دے ، اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور عذاب جہنم سے نجات دے(۲۰۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ہے اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے(۲۰۲)۔ اور اللہ تعالیٰ کی یاد ان

گنتی کے چند ایام (ایام تشریق) میں کرو ، دو دن کی جلدی کرنے والوں پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو پیچھے رہ جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ، یہ پرہیزگار کے لئے ہے اور اللہ تعالٰی سے ڈرتے رہو اور جان رکھو تم سب اس کی طرف جمع کئے جاؤ گے(۲۰۳)"۔

ان آیات میں اللہ تعالٰی اس عظیم عبادت جو کہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن ہے یعنی حج کے مزید احکامات بیان کر رہا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ٱلۡحَجُّ أَشۡهُرٞ مَّعۡلُومَٰتٞۚ﴾" حج کے مہینے مقرر ہیں"۔ اللہ تعالی واضح کر رہا ہے کہ حج کے مہینے مخاطب کو معلوم ہیں، کیوں کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے معروف ومشہور ہیں، اور وہ شوال، ذی القعدہ اور ذی الحجہ کے دس دن ہیں، معلوم ہوا کہ جو چیز بالکل واضح اور معروف ہو اس کو دوبارہ ذکر کرنا ضروری نہیں، امام قرطبیؒ رحمۃ اللہ علیہ فرکاتے ہیں(۱) کہ: اللہ تعالی نے یہاں پر عمرہ کا تذکرہ نہیں کیا ہے کیوں کہ عمرہ پورے سال کیا جاتا ہے، البتہ حج سال میں ایک ہی بار ہوتا ہے اور: " حج کے مہینے مقرر ہیں"۔

اس کے بعد اللہ تعالی حج کرنے والے کے آداب واخلاق بیان کر رہا ہے: ﴿فَمَن فَرَضَ فِيهِنَّ ٱلۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي ٱلۡحَجِّۗ﴾" اس لئے جو شخص ان میں حج لازم کرلے وہ اپنی بیوی سے میل ملاپ کرنے، گناہ کرنے اور لڑائی جھگڑے کرنے سے بچتا رہے "۔ جو حج کی عبادت میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ حج کو اپنے آپ پر فرض کرلیتا ہے، اور حج کے متعلق جتنے امور ہیں سب کو مکمل کرنا لازم ہوتا ہے، اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے عہد نامہ میں شریک ہو کر وہ خود کو اس عہد نامے کے تمام ایجنڈوں کا پابند بنالیتا ہے ، امام قرطبیؒ رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: حج اور عمرہ کرنے والا باطنی طور پر نیت کر کے ظاہری طور پر احرام باندھ کر اور قولی طور پر تلبیہ پڑ کر حج وعمرہ کی شروعات سے خود کو اس کے تمام اعمال کا پابند کر لیتا ہے ، لہذا حج کی عبادت میں داخل ہو جائے تو اسے اس کے تمام واجبات وفرائض اور متعلقات کی پابندی ضروری ہوتی ہے ، انہیں میں سے یہ ہے کہ: ﴿فَلَا رَفَثَ﴾ "بیوی سے میل ملاپ نہ کرے"، یعنی جماع اور اس سے نیچے کے کام، ﴿وَلَا فُسُوقَ﴾ "اور

(۱) تفسير قرطبي ٢/٢٦٩.

گناہ نہ کرے "یعنی معصیت کے سارے کام، ﴿وَلَا جِدَالَ﴾ "اور لڑائی جھگڑا نہ کرے"، یعنی کسی معاملے کو لے کر لوگوں کے بیچ جو لڑائی جھگڑا ہو جایا کرتی ہے اس سے بچے(۱)۔

حالت حج کی یہ تمام ممنوعات ایک حاجی کے اندر خود پر کنٹرول کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں، کیوں کہ اللہ تعالی کی منع کردہ چیزوں سے دور رہ کر اس کے عزم وارادے مضبوط ہوتے ہیں اور ممنوعات سے باز رہنے کی اور صبر کی قدرت پیدا ہوتی ہے، اور کسی چیز کو چھوڑ نہ سکنے کے سابقہ تمام بہانے ختم ہو جاتے ہیں، اس کی تمام صلاحیتیں نکھر کر سامنے آجاتی ہیں، اور فرائض وواجبات کے متعلق برباد کر دینے والے سارے اوہام وخیالات زائل ہو جاتے ہیں، یہ مناسک حج مکارم اخلاق کی تطویر اور ترقی ذات کا ایک اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ حج کے فضائل وفوائد، انفرادی، اجتماعی خاندانی اور پیشہ وارانہ زندگی سے اس کے تعلق کی تفصیل کافی طویل اور ختم نہ ہونے والی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اپنے مومن بندوں کو اس چیز کی آگاہی اور یاد دہانی کراہا ہے جس کی معرفت مومنوں کو پہلے سے ہے یعنی ان کے احوال کے متعلق اس اللہ کا علم کامل، فرمایا: ﴿وَمَا تَفْعَلُوا۟ مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ ٱللَّهُ﴾ " تم جو نیکی کرو گے اس سے اللہ تعالی باخبر ہے "۔ یاد دہانی کا یہ اسلوب جو کہ اللہ تعالی کے منہیات سے جڑا ہوا ہے، ایک مسلمان کے لیے خیر کے کام کرنے اور اس میں کوتاہی نہ کرنے کا باعث ہے، اور مومن جن منہیات سے پرہیز کرتا اور اس کے بالمقابل نیکی کے کام انجام دیتا ہے سب اللہ تعالی کے علم میں ہے، ان میں تمہاری دلچسپی اور منہیات سے نفس کو قابو میں رکھے رہنے اور اوامر سے آراستگی کو خوب جانتا ہے، چنانچہ وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا کیوں کہ وہ اللہ جاننے والا اور رحم وکرم والا ہے۔ آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ اللہ تعالی نے خیر کی کوئی تحدید نہیں کی ہے، بلکہ مطلقا ذکر کیا ہے تاکہ خیر کی تمام انواع واقسام اس میں شامل ہو جائیں: ﴿وَمَا تَفْعَلُوا۟ مِنْ خَيْرٍ﴾ " تم جو نیکی کرو گے"۔ تاکہ انسان اپنی طاقت کے حساب سے جتنا ہو سکے ہر طرح کے خیر کی کوشش کرے، اور یہ قرآن کے بیان کی باریکی اور اس کا توجیہی اعجاز ہے، کیوں کہ کچھ لوگوں کے پاس مال کی قدرت ہوتی ہے، کچھ لوگ جسمانی اعتبار سے مضبوط ہوتے ہیں اور کچھ علمی طور پر اور کچھ ذکر واذکار کی طاقت رکھتے ہیں،

---

(۱) مرجع سابق.

غرضیکہ خیر کے انواع واقسام بے شمار ہیں اور لوگوں کے مختلف حالات کے اعتبار سے ان کے لئے الگ الگ خیر کے کام مناسب ہوتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی حجاج کرام کو بصیغہ امر سفر کے لیے حسب ضرورت اپنے ساتھ زادراہ رکھنے کی طرف توجہ دلا رہا ہے: ﴿ وَتَزَوَّدُوا۟ فَإِنَّ خَيْرَ ٱلزَّادِ ٱلتَّقْوَىٰ ﴾" اور اپنے ساتھ سفر خرچ لے لیا کرو، سب سے بہتر توشہ اللہ تعالی کا ڈر ہے "۔ ایسا اس لیے ہے کیوں کہ بعض حجاج حج کے لیے آتے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں رہتا، اور اسے توکل علی اللہ سمجھتے، اس لیے اللہ تعالی نے انہیں توشہ اور زادراہ لینے کا حکم دیا تاکہ انہیں لوگوں کے پاس مانگنے نہ جانا پڑے(۱) ۔ اسی لیے حج میں استطاعت کی شرط لگائی گئی ہے، جس کا بیان ان شاءاللہ تعالی آگے آئے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ منہج اسلام ایک عملی منہج ہے، وہ ایک مسلمان کو اسباب اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالی ہی نے اسباب پیدا کیے اور انہیں مخلوقات کے لیے آسان بنائے، چنانچہ ایک مسافر کے لیے اس کے سفر میں سب سے اہم اور ضروری چیز یعنی زادراہ کی اللہ تبارک وتعالی ہدایت فرمارہا ہے، اور اسی کے ساتھ ایک دوسرے قسم کے زادراہ سے آگاہ کر رہا ہے، اور وہ ہے تقوی ، جس میں خوف وخشیت ، رغبت ورہبت ، محبت اور ان کے علاوہ دیگر امور شامل ہیں جو حاجی کو اللہ کے دین کی عملی تطبیق پر آمادہ کرتے ہیں۔ نیز آیت میں دنیا کے زاد سفر اور آخرت کے زاد سفر پر متنبہ اور آگاہ کیا گیا ہے، اور جسم کی حفاظت اور سفر کی مشقت سے بچنے کے لیے اس زادراہ کی اہمیت کو اس امت کا پہلا گروہ یعنی صحابہ خوب اچھی طرح سمجھ گیے تھے۔ حتی کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہا کرتے تھے: انسان کی عزت اسی میں ہے کہ عمدہ زاد سفر اپنے ساتھ رکھے، اور وہ اپنے ساتھوں سے خوب دل کھول کر خرچ کرنے کی شرط لیا کرتے تھے(۲) ۔

زادراہ اور اس کی دو قسموں میں سے افضل وبہتر قسم: ﴿فَإِنَّ خَيْرَ ٱلزَّادِ ٱلتَّقْوَىٰ ﴾ کے بیان کے بعد اللہ تعالی حکم دے رہا ہے کہ یہ تقوی صرف اللہ تعالی وحدہ لاشریک لہ کے لیے ہونا چاہیے: ﴿ وَٱتَّقُونِ

---

(۱) تفسير ابن كثير ١/٢٤٦.

(۲) مرجع سابق.

﴿ يَـٰٓأُوْلِي ٱلۡأَلۡبَـٰبِ ﴾" اور اے عقلمندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو "۔آیت میں خطاب عقل وفہم والوں کو کیا گیا ہے ،اور بلا شبہ جنہوں نے اسلام قبول کیاُاور اللہ تعالی پر ایمان لائے وہی عقل مند ہیں ، کیوں کہ انہوں نے باطل کو چھوڑ کر حق کو اختیار کیا۔امام قرطبیؒ رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں :(ألباب) لُبّ کی جمع ہے ،اور ہر چیز کا لُبّ اس کا خالص حصہ ہوتا ہے ،اس لیے عقل کو بھی لُبّ کہا گیا ہے(۱) ۔اور اللہ تعالی کا ان کو اولوالالباب سے خطاب کرنا ان کے حق میں مدح وتعریف ہے ،کیوں کہ اللہ تعالی ان کو حکم دے رہا اور عقلمند کی صفت کے ذریعہ تعریف بھی کر رہا ہے :﴿وَٱتَّقُونِ يَـٰٓأُوْلِي ٱلۡأَلۡبَـٰبِ ﴾" اور اے عقلمندو! مجھ سے ڈرتے رہا کرو "۔ اس سے یہ مستفاد ہوا کہ دعوتی اور تربیتی مجالات میں مدعو اور تربیت یافتہ کو ان کی اچھی صفات وخصوصیات سے یاد کرنا چاہیے ،کیوں کہ یہ چیز خیر کی مزید کوشش کے لیے زیادہ مؤثر اور حوصلہ افزا ثابت ہو گی۔

اس کے بعد اللہ تعالی حج کے موقع سے تجارت کا مسئلہ بیان کر رہا ہے ،اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عرب میں عکاظ ،مجنہ ،اور ذوالمجاز جیسے بازار لگا کرتے تھے ،تو لوگوں کو موسم حج میں تجارت کرنے میں گناہ کا گمان ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی(۲) : ﴿ لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ أَن تَبۡتَغُواْ فَضۡلٗا مِّن رَّبِّكُمۡۚ ﴾ "تم پر اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی گناہ نہیں "۔چنانچہ آیت کی ابتداء گناہ کے خیال کی نفی سے ہوئی:﴿ لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ ﴾ "تم پر کوئی گناہ نہیں "۔یعنی حج کے ایام میں تجارت کر کے اللہ کا فضل تلاش کرنے میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے ،تا کہ اس کے مقابلے میں حج میں تجارت کے ذریعہ فضل الٰہی تلاش کرنے کی مکمل اجازت دے دی جائے ،اور اس تعلق سے کسی طرح کی جستجو اور فکر باقی نہ رہے ،بلکہ اللہ تعالی کے اس تلاش رزق کو اپنی ذات کے ساتھ مربوط کیا ہے : ﴿أَن تَبۡتَغُواْ فَضۡلٗا مِّن رَّبِّكُمۡۚ ﴾ "اپنے رب کا فضل تلاش کرنے میں "۔تا کہ ایک مومن کو یہ معلوم ہو کہ وہ جو بھی رزق تلاش کرتا ہے وہ اللہ تعالی کے فضل کی تلاش وجستجو ہے ،اور یہ رزق لوگوں کے لیے اللہ کا فضل ہے ،اس لیے فضل کا متلاشی اللہ تعالی سے طلب کرے اور اس میں دوامر ملحوظ

---

(۱) تفسير قرطبي ٢/٢٧٤.

(۲) تفسير ابن كثير ١/٢٤٧.

خاطر ہوں، اول: رزق کی تلاش وجستجو اور اس کے لیے کوشش: ﴿أَن تَبۡتَغُواْ﴾ دوم: اللہ تعالی سے دعا ، کیوں کہ اللہ تعالی نے اس فضل کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی ہے: ﴿فَضۡلٗا مِّن رَّبِّكُمۡۚ﴾ " اپنے رب کا فضل "۔ چنانچہ اس آیت میں بہت سارے امور اور فوائد جمع کر دیے گیے ہیں، کچھ تو وہ ہیں جن کا ذکر گزرا، اور انہی میں سے ہے: دعا کی اہمیت وفضیلت، اسی طرح طلب رزق میں محنت وکوشش کی اہمیت، جس کے پاس فضل ہے اسی ذات سبحانہ وتعالی پر توکل۔ انہی فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ دین اسلام عمل کا دین ہے، اسی طرح تجارت کے ذریعہ لوگوں کو نفع پہنچانے کی اہمیت، اور یہ کہ تجارت میں اصلا جواز ہے جب تک کہ عین شئے یا لین دین کا طریقہ حرام نہ ہو۔

اس کے بعد حجاج کے لیے ذکر الہی کے وجوب کا بیان ہے: ﴿فَإِذَآ أَفَضۡتُم مِّنۡ عَرَفَٰتٖ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ عِندَ ٱلۡمَشۡعَرِ ٱلۡحَرَامِۖ﴾ " جب تم عرفات سے لوٹو تو مسجد حرام کے پاس ذکر الٰہی کرو "۔ عرفہ حاجیوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے اور یہ حج کے اعمال میں سب سے اہم عمل ہے[1]، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے: (الحَجُّ عَرَفَةُ)[2] "حج وقوف عرفہ کا نام ہے" (أَفَضۡتُم) یعنی جب تم عرفات سے لوٹو، اس کی اصل (فاض الإناءُ بعدَ أن امتلأ) یعنی برتن بھر کر ارد گرد سے بہہ پڑا، لفظ (أَفَضۡتُم) کے ذریعہ میدان عرفات کی تصویر کشی کی گئی کہ وہ حجاج کی کثرت سے لوگوں سے بالکل بھرا ہوا اور بھرنے کی وجہ سے لوگ نکلنے لگیں گویا کہ حجاج میدان عرفات میں بھر کر بہہ پڑے ہوں تاکہ مشعر حرام یعنی مزدلفہ کی طرف کوچ کریں جہاں اللہ تعالی ذکر الہی کا حکم دے رہا ہے، تاکہ ذکر الہی حجاج کی زبان پر جاری وساری رہے، بلکہ اللہ تعالی اس ذکر کا حکم بار بار دے رہا ہے اور ساتھ ہی اس کا سبب بھی بیان کر رہا ہے: ﴿وَٱذۡكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمۡ﴾" اور اس کا ذکر کرو جیسے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے "۔ یہ نعمت ہدایت اور اس دین اور عظیم شریعت کی توفیق کی یاد ہانی ہے۔ اور (كَمَا هَدَىٰكُمۡ) میں ہدایت کی نسبت اللہ تعالی کی طرف ہے تاکہ بندوں کو یہ معلوم ہو کہ بلاشبہ وہ اللہ تعالی ہی کی ذات ہے جس نے ان کے دلوں کو اس دین کی ہدایت نصیب فرمائی، اور اس کے لیے

---

(١) تفسير ابن كثير ١/٢٤٨.

(٢) النسائي ٥/٢٥٦ حديث نمبر (٣٠١٦).

رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا، اوران پر کتاب وسنت نازل فرمایا، چنانچہ اگراللہ تعالی کی ہدایت وتوفیق بندے کے شامل حال نہ ہوتی تو وہ ہر گز ہدایت نہ پاتا، اور جب بندے کو یہ عظیم نعمت حاصل ہو جائے تو اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس سب سے بڑی نعمت پر اللہ تعالی کی حمد وثنا اور شکر بجالائے، اس دین عظیم کی ہدایت ہی آخرت کی نعمتوں تک پہنچانے والا واحد راستہ ہے، لہذا اللہ تبارک وتعالی کا ذکر، حمد وثنا اور شکر گذاری ضروری ہے، بلکہ اللہ تعالی ہدایت یافتہ بندے کی ہدایت سے پہلے اور بعد کی حالت کی طرف اشارہ بھی کر رہا ہے، تاکہ بندہ اپنی پہلی ضلالت وگمراہی والی حالت اور موجودہ ہدایت والی حالت کے مابین موازنہ اور مقارنہ کرے: ﴿وَإِن كُنتُم مِّن قَبۡلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ﴾" تم اس سے پہلے راہ بھولے ہوئے تھے "۔اس سے آدمی کے لیے ہر نعمت سے ماقبل اور مابعد والی کیفیت کے درمیان موازنہ ومقارنہ کی اہمیت واضح ہوتی ہے، تاکہ اس پر اللہ تعالی کے فضل وکرم کی معرفت اور اس کا احساس ہو۔ اس منہج ربانی سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اس منہج کو ہمیشہ ساتھ رکھا جائے تاکہ دعوت اور تربیت کے میدان میں ایک اسلوب کے طور استعمال کیا جائے، تاکہ مدعو اور تربیت یافتہ کو یہ معرفت ہو کہ وہ پہلے کیسا تھا اور اب بعد میں کیسا ہے؟ اور اس اسلوب کا استعمال مزید دیگر مجالات، مثلا اصلاح، ادارتی اور پیشہ وارانہ امور بھی ہونا چاہیے، کیوں کہ اس مقارنہ سے اللہ تعالی کی نعمت وفضل کا اظہار ہوگا، اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تبدیلی ہوگی، لیکن اس کا مقصد یہ نہ ہو کہ ایک حالت کی فضیلت بیان ہو اور دوسری حالت پر ڈانٹ ڈپٹ ہو، بلکہ اس کا مقصد محض اللہ تعالی کی نعمتوں کی یاددہانی ہو اور یہ کہ اللہ تعالی ہی فضل عطا کرنے والا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اپنے بندوں سے مناسک حج کے دوسرے مرحلے کا ذکر کر رہا ہے: ﴿ثُمَّ أَفِيضُواْ مِنۡ حَيۡثُ أَفَاضَ ٱلنَّاسُ﴾" پھر تم اس جگہ سے لوٹو جس جگہ سے سب لوگ لوٹتے ہیں "۔اس سے مراد مزدلفہ میں رات گزارنا ، مشعر منی جانا، رمی جمرات، قربانی، طواف اور سعی کے لیے جانا ہے۔اللہ تعالی ان کو استغفار کا بھی حکم کر رہا ہے: ﴿وَٱسۡتَغۡفِرُواْ ٱللَّهَۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمٞ﴾ " اور اللہ تعالی سے بخشش طلب کرتے رہو یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے "۔ کیوں کہ انسان اللہ تعالی کی چاہے جتنی بھی اطاعت کرلے اس سے نقص اور خطا کا ہونا لازمی ہے، اس لیے وہ استغفار سے کبھی الگ

نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی ضروری ہے کہ عبادت گذار خود کو اور اپنی عبادت کو مکمل نہ سمجھے، کیوں کہ نقص اور سہو وخطا انسانی طبیعت کا خاصہ ہے ، اس لیے وہ ہمہ وقت استغفار کا محتاج ہے۔ اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ ایک حاجی کافی مشقت اور جلیل القدر عبادت کر رہا ہوتا ہے اس کے باوجود اللہ تعالی اسے استغفار کا حکم دے رہا ہے ، تو بھلا انسان کے روزانہ ، ہفتہ وارانہ ، ماہانہ اور پوری حالات زندگی کے بارے میں کیا کہا جائے، بندہ استغفار کا کتنا زیادہ ضرورمند اور محتاج ہے ؟! چونکہ انسان زندگی میں نقص وسہو ، خطا و معاصی اور غلط اجتہادات سے دوچار ہوتا رہتا ہے، اور کبھی کبھی اس میں ریاو نمود بھی آجاتا ہے ان کے علاوہ دیگر ایسے امور جو اعمال اور اخلاص میں فساد پیدا کرتے ہیں اس لیے ایک انسان کے لیے ہر وقت استغفار کرتے رہنا انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

﴿إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ اللہ تعالی کی ان دو صفتوں میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب ایک مسلم استغفار کرے تو اس کو یہ ادراک ویقین ہو کہ اللہ تعالی غفور ورحیم ہے، وہ گناہوں کو بخش دیتا اور استغفار کرنے والے پر مہربان ہوتا ہے ، اس لیے استغفار کا خواہاں غفور ورحیم ہی سے مغفرت طلب کرے، آیت کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس میں توحید کا بیان ہے بایں طور کہ استغفار صرف اللہ سبحانہ وتعالی سے ہی طلب کرنا ہے : ﴿وَٱسۡتَغۡفِرُواْ ٱللَّهَۚ﴾ " اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتے "۔ چنانچہ استغفار کے لیے کسی دوسرے کا رخ نہ کیا جائے۔

مناسک حج کی ادائیگی کے بعد اللہ تعالی حاجیوں کو ذکر الہی کا حکم دے رہا ہے: ﴿فَإِذَا قَضَيۡتُم مَّنَٰسِكَكُمۡ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ كَذِكۡرِكُمۡ ءَابَآءَكُمۡ أَوۡ أَشَدَّ ذِكۡرٗاۗ﴾ "پھر جب تم ارکان حج ادا کر چکو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کیا کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ "۔ اللہ تعالی حاجیوں کو حج کی ادائیگی اور فراغت کے بعد ذکر دائمی کا حکم کر رہا ہے، جیسے کہ ایک بچہ اپنے ماں باپ کو یاد کرتا ہے، اور لگاتار پورے دن اس کی زبان پر اپنے ماں باپ کا ہی ذکر رہتا ہے(1) ۔ اگر اس سے مراد بڑے بھی ہوں تب بھی ان کا بھی یہی حال ہوتا ہے ہمہ وقت: میرے والد آئے ، میری والدہ آئیں، میرے والد کہاں ہیں ؟ میری ماں کہاں ہے؟ میرے والد نے فلاں بات کہی ، میری ماں نے یہ بات

(١) تفسير ابن كثير ١/ ٢٥٠.

کہی۔ ہاں البتہ چھوٹا بچہ اپنے ماں باپ کو زیادہ یاد کرتا ہے۔ اس آیت میں تشبیہ دے کر ذکر کی اہمیت بیان کی گئی ہے کہ انسان خود کو اللہ تعالی کے ذکر میں مشغول رکھے، چنانچہ ایک بچہ جیسے ہی نیند سے بیدار ہوتا ہے، اس کی زبان پر ماں باپ کی پکار شروع ہو جاتی ہے، جب بھی کھانے کی ضرورت پڑتی ہے تو ماں باپ کو پکارتے ہوئے رونے لگتا ہے، اسی طرح جب آسودہ بھی ہوتا ہے اور کھیل کود میں بھی وہ اپنے ماں باپ کو نہیں بھولتا، ایک سچے مسلم کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے، چنانچہ کھانے پینے سے پہلے بسم اللہ کے ذریعہ اللہ تعالی کا ذکر کرتا ہے ، یہ اللہ کی یاد ہے، جب کھانے پینے سے فارغ ہوتا ہے تو الحمد للہ پڑھ کر اللہ کا ذکر کرتا ہے، یہ بھی اللہ کی یاد ہے، اسی طرح جب سونے جاتا ہے تو اللہ کا ذکر کرتا ہے، جب سو کر اٹھتا ہے تو اللہ کا ذکر کرتا ہے، نماز سے پہلے اور بعد اللہ کا ذکر کرتا ہے، غرضیکہ اپنے تمام امور میں وہ اللہ تعالی کا ذکر کرتا ہے ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: (لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا من ذِكْرِ اللهِ)(١) "تمہاری زبان ہمیشہ اللہ تعالی کے ذکر سے تر رہے"۔ بلکہ آدمی کے لیے ضروری ہے کہ بچہ جس قدر اپنے ماں باپ کو یاد کرتا ہے اس سے بھی زیادہ اللہ تعالی کا ذکر کرے ، کیونکہ اللہ تعالی فرماتا ہے : ﴿كَذِكۡرِكُمۡ ءَابَآءَكُمۡ أَوۡ أَشَدَّ ذِكۡرٗا﴾ "جس طرح تم اپنے آباؤاجداد کا ذکر کیا کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ "۔ اللہ تعالی سے ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے اوقات کو اپنے ذکر اور شکر میں مشغول رکھے۔

دوسری جانب اس آیت سے دعوتی، تربیتی اور تعلیمی حتی کہ ادارتی اور پیشہ وارانہ امور میں بھی اس آیت کا بڑا فائدہ ہے ، وہ ہے کسی بات کے بیان میں وضاحت کی اہمیت، جیسا کہ اس آیت کریمہ میں تشبیہ کے ذریعہ بات واضح کی گئی ہے ، اور تشبیہ بآسانی مفہوم کے ادائیگی کا ایک دلچسپ ذریعہ ہے ، اس سے انسان معنی اور مفہوم کی گیرائی تک پہنچ جاتا ہے، اس تشبیہ کا مقصد مقام ومرتبہ میں مماثلت نہیں ہے، بلکہ ذکر کی صورت حال کا ایک تصور اور مفہوم ذہن سے قریب کرنے کے لیے یہ تشبیہ لائی گئی ہے، ورنہ ہمارے رب کے ذکر کا مقام تو اس سے کہیں زیادہ عظیم اور بلند ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی طلب دنیا کے تعلق سے لوگوں کے احوال بیان کر رہا ہے ، اور ان کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم کا بیان اللہ تعالی کے اس فرمان میں ہے: ﴿فَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا

(١) ترمذي ٥/٤٢٧-٤٢٨ حديث نمبر (٣٣٧٥).

﴿فِي ٱلدُّنۡيَا وَمَا لَهُۥ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ مِنۡ خَلَٰقٖ﴾" بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں دے۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں بھی کوئی حصہ نہیں "۔ یہ لوگوں کی ایک قسم ہے ، جو دنیا کی زیب وزینت اور اس کی چاہتوں اور لا متناہی امیدوں میں گرفتار رہتے ہیں، چنانچہ دنیاوی امور کے لیے ان کی دعائیں اور امیدیں خوب ہوتی ہیں، اور مکمل اور دائمی حیات آخرت سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا ، اس لیے ان کی دعاؤوں میں آخرت کا کوئی جزء نہیں ہوتا۔ اس آیت میں ایسے لوگوں کا ذکر کرکے اس بات کی آگاہی دلائی گئی ہے کہ امور آخرت کا اہتمام کرتے ہوئے اعتدال اور توازن برقرار رکھنا ضروری ہے ، اور امور آخرت کے متعلق اللہ تعالی سے زیادہ سے زیادہ دعا وسوال کرنا چاہیے ، کیوں کہ وہی بہتر اور باقی رہنے والی زندگی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالی دوسری قسم کے لوگوں کا ذکر کرہاہے: ﴿وَمِنۡهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِي ٱلدُّنۡيَا حَسَنَةٗ وَفِي ٱلۡأٓخِرَةِ حَسَنَةٗ وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ﴾" اور بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں نیکی دے ، اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور عذاب جہنم سے نجات دے "۔ چنانچہ اس قسم کے لوگ اپنی دعاؤوں میں امور دنیا وآخرت دونوں کا اہتمام کرتے ہیں ، اور جہنم کے عذاب کا تصور کرتے ہوئے اس سے اللہ تعالی کی پناہ طلب کرتے ہیں - اللہ تعالی مجھے اور مسلمانوں کو جہنم کی آگ سے محفوظ رکھے- اس آیت میں اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض لوگوں کے مقاصد کافی حقیر ہوتے ہیں جو صرف دنیاوی زندگی تک محدود ہوکر رہ جاتے ہیں اور انہیں آخرت کی یاد ہی نہیں رہتی، اسی کے برعکس کچھ لوگوں کے ارادے کافی بلند ہوتے ہیں جو صرف طلب دنیا پر اکتفاء نہیں کرتے ، بلکہ ان کے ارادے اور آگے آخرت کے لیے ہوتے ہیں، اور اپنی دعاؤوں میں اسی کو طلب کرتے اور اسی کی توفیق چاہتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جو دنیا اور آخرت دونوں طلب کرتا وہ اللہ تعالی کا محبوب بندہ ہے، اس سے یہ بھی مستفاد ہے کہ دنیا و آخرت اللہ تعالی کی ملکیت ہے، اور بندہ اسے اس کے مالک اللہ تعالی سے ہی حاصل کرسکتا ہے، اس لیے اللہ تعالی ہی سے اس کی طلب ہونی چاہیے۔ اس دعا میں بہت سارے فوائد ہیں: یہ دعا ہر قسم کے خیر وبھلائی کی جامع ہے ، کیوں کہ لفظ (حسنة) میں تمام اقسام خیر شامل ہیں، اور اس کے طلب کا تقاضا ہے کہ تمام شر سے حفاظت بھی ہو، چنانچہ جب بندہ مومن اس کو دنیا وآخرت کے لیے طلب کرتا ہے تو وہ دنیا وآخرت

کی تمام بھلائیوں کو طلب کرتا ہے اور ساتھ ہی جہنم تک لے جانے والی ہر برائی سے پناہ بھی چاہتا ہے، کیا ہی عظیم دعا ہے یہ؟! یہ دعا نبی صلی اللہ علیہ وسلم بکثرت پڑھا کرتے تھے، جیسا کہ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بکثرت یہ دعا ہوا کرتی تھی: "رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِي ٱلدُّنۡيَا حَسَنَةً وَفِي ٱلۡأٓخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ "(١)۔

آگے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمۡ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُواْۚ وَٱللَّهُ سَرِيعُ ٱلۡحِسَابِ﴾" یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے ان کے اعمال کا حصہ ہے اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے "۔ تفاسیر میں ہے کہ اس کا مرجع دوسرے قسم کے لوگ ہیں، یعنی مسلمانوں کی جماعت، یعنی ان کے لیے حج اور دعا کا ثواب ہے، کیوں کہ مومن کی دعا بھی عبادت ہے، اور یہ بھی ایک قول ہے کہ أُوْلَٰٓئِكَ مراد دونوں فریق ہیں، چنانچہ مومن کو اس کے عمل اور دعا کا ثواب اور کافر کو اس کے شرک اور محض دنیا طلبی کا عقاب ہے(٢)۔ دونوں قول کے ذکر سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی بعض آیات کی دلالت میں کئی مفاہیم کا استیعاب ہوتا ہے ،تاکہ صراحتا اور بالنص اس کے فوائد زیادہ ہوں۔ اس کے بعد آیت کے اختتام پر اللہ تعالی اپنے بندے کے حساب میں سرعت کا بیان کر رہا ہے: ﴿وَٱللَّهُ سَرِيعُ ٱلۡحِسَابِ﴾ " اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے "۔ تاکہ مومن کو یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالی کے حساب کو بندوں کے حساب پر قیاس نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کے طریقہ حساب پر، کیوں کہ اللہ تعالی علیم وقدیر ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالی مکرر ذکر الہی کی اہمیت بیان کر رہا ہے: ﴿وَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ فِيٓ أَيَّامٖ مَّعۡدُودَٰتٖۚ﴾" اور اللہ تعالیٰ کی یاد ان گنتی کے چند ایام (ایام تشریق) میں کرو "۔ یعنی ایام تشریق میں فرض نمازوں کے بعد اللہ کی تکبیر بیان کرو، اور یہ ایام منی عید الاضحی کے بعد کے تین دن ہیں، اور ان ایام میں خصوصیت سے ذکر الہی ان کے فضیلت کی دلیل ہے، اس لیے ان ایام میں ایک مسلم کو زیادہ سے زیادہ ذکر رالہی کا حریص ہونا چاہیے، دوسری جانب اس سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ خصوصیات کی وضاحت اور تعلیم، اور توجیہ وارشاد کے وقت جن امور کی حاجت ہو ان کا بیان بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد ایام منی سے واپسی میں جو جلدی

(١) بخاري ١٦٩/٤ حديث نمبر (٦٣٨٩).

(٢) تفسير قرطبي ٢٨٧/٢.

کرناچاہے اس کی اجازت میں اس دین کی رواداری اور وسعت ظرفی کا اظہار ہے: ﴿فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ﴾" دو دن کی جلدی کرنے والوں پر بھی کوئی گناہ نہیں"۔ یعنی اللہ تعالی نے جلدی کرنے والے کی جلد بازی کا گناہ ختم کر دیا ہے۔ اور جو تاخیر کرے یہاں تک کہ تین دن مکمل کر لے اس کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَمَن تَأَخَّرَ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ ٱتَّقَىٰ ۗ﴾" اور جو پیچھے رہ جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ، یہ پرہیزگار کے لئے ہے "۔ اس میں تینوں دن تک ٹھہرے رہنے کی حوصلہ افزائی ہے ﴿لِمَنِ ٱتَّقَىٰ ۗ﴾" یہ پرہیزگار کے لئے ہے "۔اس کے بعد اللہ تعالی تقوی کا حکم دے رہا ہے: ﴿وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٠٣﴾﴾"اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو تم سب اس کی طرف جمع کئے جاؤ گے"۔ اس میں دو چیزوں کا حکم اور یاد دہانی ہے ،اول: تقوی کا حکم، دوم: اس کی طرف لوٹنے کی یاد دہانی ، کیوں کہ اللہ تعالی کی طرف رجوع کا تصور ایک مومن کے تقوی کا سبب ہے جو اس کو خیر کے افعال پر آمادہ کرنے والا اور برائی سے دور رکھنے والا ہے۔ اس سے یہ فائدہ اخذ ہوا کہ تعلیمی، دعوتی اور تربیتی مجالات میں کسی چیز کے انجام کار اور آخری نتیجہ کی وضاحت کافی اہمیت کی حامل ہے ، ساتھ ہی ایسے امور کی نصیحت بھی ہو جو آدمی کو افادہ اور التزام پر آمادہ کرے ، کیوں کہ انسانی طبیعت سستی اور تساہل کا شکار ہو جایا کرتی ہے اس لیے اس کو نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری اللہ تعالی سے خود کے لیے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے توفیق وہدایت اور ثبات قدمی کی دعا ہے۔

﴿وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُۥ فِي ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَيُشْهِدُ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِۦ وَهُوَ أَلَدُّ ٱلْخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي ٱلْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ ٱلْحَرْثَ وَٱلنَّسْلَ ۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ ٱلْفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُ ٱتَّقِ ٱللَّهَ أَخَذَتْهُ ٱلْعِزَّةُ بِٱلْإِثْمِ ۚ فَحَسْبُهُۥ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ ٱلْمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَشْرِى نَفْسَهُ ٱبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ ٱللَّهِ ۗ وَٱللَّهُ رَءُوفٌۢ بِٱلْعِبَادِ ﴿٢٠٧﴾﴾

ترجمہ:

"بعض لوگوں کی دنیاوی غرض کی باتیں آپ کو خوش کر دیتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ کرتا ہے حالانکہ دراصل وہ زبردست جھگڑالو ہے (۲۰۴)۔ جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین پر فساد پھیلانے کی

اور کھیتی اور نسل کی بربادی کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند کرتا ہے (۲۰۵)۔ اور جب اسے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو تکبر اور تعصب اسے گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ایسے کے لئے بس جہنم ہی ہے اور یقیناً وہ بدترین جگہ ہے (۲۰۶)۔ اور بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی طلب میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں ، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑی مہربانی کرنے والا ہے (۲۰۷)"۔

سابقہ آیت دنیا طلبی کے تعلق سے لوگوں کے احوال کا بیان ہوا، اب ان آیات میں اللہ تعالی بعض ان لوگوں کے احول بیان کر رہا ہے جو اپنے اندر کفر چھپائے پھرتے ہیں اور اوپر سے اسلام کا اظہار کرتے ہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُعۡجِبُكَ قَوۡلُهُۥ فِى ٱلۡحَيَوٰةِ ٱلدُّنۡيَا وَيُشۡهِدُ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا فِى قَلۡبِهِۦ وَهُوَ أَلَدُّ ٱلۡخِصَامِ ﴾ " بعض لوگوں کی دنیاوی غرض کی باتیں آپ کو خوش کر دیتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ کرتا ہے حالانکہ دراصل وہ زبردست جھگڑالو ہے "۔ اللہ تعالی اپنے رسول کو منافقین کی حقیقت سے باخبر کر رہا ہے، اگرچہ یہ آیت منافقین کے ایک خاص گروہ کے بارے میں انزل ہوئی ہے لیکن یہ حکم تمام منافقین کے لیے عام ہے ، اور یہ لوگوں کی وہ قسم ہے جن کا ظاہر باطن کے خلاف ہوتا ہے، وہ باتیں تو بہت اچھی کرتے ہیں اور اپنے قول کو خوبصورت بنا کر ظاہر کرتے ہیں، اور دین اسلام کی موافقت کا اظہار بھی کرتے ہیں، حالانکہ وہ اپنے سامنے والے کو محض دھوکہ دیتے ہیں، کیوں کہ وہ سچائی کے دعوے کرتے ہیں مگر جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں، اور وہ اپنے قول میں دل کی سچائی ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالی کو بطور گواہ کے پیش کرتے ہے ، جبکہ وہ جھوٹے منافق ہیں ، بلکہ وہ سخت جھگڑالو ہیں ، جھگڑتے وقت فسق وفجور پر اتر آتے ہیں، ایسے لوگوں کی ظاہری باتین تو بڑی دلچسپ ہوتی ہیں اور باطن میں باطل اور برائی چھپی ہوتی ہے۔

یہ آیت منافقین کے احوال کی پول کھول رہی ہے جن کی اتنی خبیث روش ہوتی ہے کہ زبان سے تو اسلام اور اسلام کی نصرت ومعیت کا اظہار کرتے ہیں، اور دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے تئیں بغض و حسد اور کراہت لیے پھرتے ہیں ، اس سے معلوم ہوا کہ باتوں سے دھوکہ میں نہیں آنا چاہیے بلکہ افعال و کردار پر نظر ہونی چاہیے ، کیوں کہ عمل اور تطبیق ہی حقیقی کسوٹی اور مسلم اور کافر کے مابین وجہ امتیاز

ہے اور افعال ہی اقوال اور احوال کے صحیح اور غلط کی دلیل ہیں، اللہ تعالی کی طرف سے یہ انکشاف مومنوں کو ان منافقین کی حقیقت جاننے کے لیے کافی مفید ہے تاکہ وہ ان سے بچ کر رہیں۔

اسی طرح منافقین کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ ﴿ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي ٱلْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ ٱلْحَرْثَ وَٱلنَّسْلَ ﴾ " جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین پر فساد پھیلانے کی اور کھیتی اور نسل کی بربادی کی کوشش میں لگا رہتا ہے"۔ یعنی جس طرح منافق کی بات میں کجی ہوتی ہے اسی طرح اس کے افعال بھی برے ہوتے ہیں، کیوں کہ جب وہ مسلمانوں کے پاس سے مڑ کر واپس جاتا ہے تو اس کی ساری کوشش اور محنت زمین میں فساد پھیلانے کی ہوتی ہے: ﴿ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي ٱلْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا ﴾ " جب وہ لوٹ کر جاتا ہے تو زمین پر فساد پھیلانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے "۔ اس کا فساد عام اور مختلف قسم کا ہوتا ہے، اپنے قول سے بھی فساد پھیلاتا ہے اور عمل سے بھی، انہیں فسادات میں سے ہے: ﴿ وَيُهْلِكَ ٱلْحَرْثَ ﴾ " کھیتی کی بربادی"۔ یعنی جہاں پھل اور اناج کی پیداوار ہوتی ہے، ﴿وَٱلنَّسْلَ ﴾ " نسل کی بربادی"۔ یعنی حیوانات کی افزائش، چونکہ لوگوں کی زندگی کی خوراک اور بقاء کے یہی دو اسباب ہیں، اس لیے یہ منافقین لوگوں کے اصل پیداوار کی جگہ کو برباد کرنے کے درپے ہوتے ہیں، اور تعالی اس حرکت کا سخت مخالف ہے اور اللہ تعالی اس چیز کو بالکل پسند نہیں کرتا: ﴿ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ ٱلْفَسَادَ ﴾ " اور اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند کرتا ہے "۔ اور اللہ تعالی کے فرمان ﴿ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ ٱلْفَسَادَ ﴾ میں یہ وضاحت اور بیان ہے کہ دین اسلام میں فتنہ وفساد بالکل ناپسندیدہ ہے، وہ اسے کبھی تسلیم نہیں کرتا اور نہ ہی اس کا حکم دیتا ہے، بلکہ اس سے منع کرتا اور فسادی کو سزا دیتا ہے، لہذا اس عظیم دین سے زیادہ بہتر اور کونسا دین ہے؟!

منافقین کی ایک اور صفت گناہ کے ذریعہ حق کے خلاف مدد کرنا: ﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُ ٱتَّقِ ٱللَّهَ أَخَذَتْهُ ٱلْعِزَّةُ بِٱلْإِثْمِ ﴾ " اور جب اسے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو تکبر اور تعصب اسے گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے "۔ یعنی وہ اس توجیہ کو قبول نہیں کرتا جو اسے فعل قبیح کے ارتکاب اور برے سلوک و کردار سے باز رکھے۔ چنانچہ جب اس کو نصیحت کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ جو قبیح اور برے اعمال انجام دے رہے اور فسادی باتیں کرتے ہو اس تعلق سے اللہ سے ڈرتے ہوئے حق وصواب اور ایمان کی طرف لوٹ آؤ، تو وہ

نہیں مانتا اور انکار کر دیتا ہے اور تعصب اس پر غالب ہوتا ہے اور حق کے خلاف برائی کا ساتھ دیتا ہے ،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین اس امت کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں ،اور کبر و غرور پند و نصائح کے لیے انتہائی خطرناک ہے،اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ناصح اور نصیحت کے لیے تواضع بڑی چیز ہے۔ منافقین کو اللہ تعالی نے جہنم کی دھمکی دے رکھی ہے: ﴿ فَحَسْبُهُۥ جَهَنَّمُ ۚ وَلَبِئْسَ ٱلْمِهَادُ ﴾ " ایسے کے لئے بس جہنم ہی ہے اور یقیناً وہ بدترین جگہ ہے "۔یعنی سزا اور ٹھکانے کے لیے جہنم ان کے لیے کافی ہے،اور جہنم بدترین مسکن، ٹھکانہ اور جائے قرار ہے۔

اللہ تعالی نے ان منافقین کی نفسیاتی اور عملی حقیقتوں سے پردہ ٹھایا ہے اور ان کے درپردہ برے طریقہ کار کی نقاب کشائی کی ہے کہ باتیں بڑی میٹھی کرتے ہیں اور باطن میں شر اور حقد و حسد چھپا ہوا ہے، اسلام اور مسلمانوں کو ناپسند کرتے ہیں ،اسی طرح ان کی عملی کارستانی کو بھی اللہ تعالی نے بیان کر دیا کہ روئے زمین پر عموما اور لوگوں کی روزی روٹی کی جگہوں پر خصوصا فتنہ و فساد پھیلانا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے، یہ ان کے حقد و حسد کا نتیجہ ہے جو انہیں اس روش پر آمادہ کرتا ہے ،کیوں کہ ایسی حرکات کا صدور ایک فاسد و حاسد اور خبیث المزاج سے ہی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالی نے ان کی حقیقت بالکل واضح کر دی کہ یہ لوگ حق کے سامنے جھکنے والے نہیں ہیں، چاہے ان کو جتنی بھی نصیحت کر دی جائے ،کیوں کہ تقوی کے حکم کے بعد اب کوئی نصیحت نہیں ہے: ﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُ ٱتَّقِ ٱللَّهَ أَخَذَتْهُ ٱلْعِزَّةُ بِٱلْإِثْمِ ۚ ﴾ " اور جب اسے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو تکبر اور تعصب اسے گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے "۔ چنانچہ وہ برائی کا ساتھ دیتا ہے حالانکہ اسے اپنی اس خبیث عادت کا خوب علم ہے،اور یہ سارے فسادات جان بوجھ کر عمدا انجام دیتا ہے،اسی لیے اللہ تعالی نے اس کی سزا یہ دی کہ اس کا ٹھکانہ جہنم بنا دیا،اس آیت میں مومنوں سے منافقین کی صفات اور احوال اس لیے بیان کئے گیے ہیں تاکہ وہ ان سے بچ کر ان کی روش سے دور رہیں،اور تواضع مومنوں کی صفت اور علامت ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالی لوگوں کی ایک دوسری قسم کے احوال بیان کر رہا ہے: ﴿ وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَشْرِى نَفْسَهُ ٱبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ ٱللَّهِ ۗ ﴾ " اور بعض لوگ وہ بھی ہیں کہ اللہ تعالی کی رضامندی کی طلب میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں "۔ یہ بھی لوگوں کہ ایک قسم ہے جو اللہ تعالی کی رضامندی کے

واسطے اپنی سب سے قیمتی اور مہنگی چیز کی قیمت لگا دیتے ہیں، چنانچہ کفر اور نفاق سے بچنے کے لیے اپنی جان تک بیچ دیتے ہیں یہاں تک کہ اللہ تعالی کی رضامندی کے بدلے میں جان ومال کا نقصان سہنا پڑے تو بھی پیچھے نہیں رہتے ، کیوں کہ اللہ تعالی کی رضامندی کے بدلے میں کوئی بھی قیمت ہو وہ کم ہے، اسی کے برعکس پہلی قسم کے لوگ اپنے آپ کو حقیر چیز یعنی نفاق کے بدلے حقیر قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں اور نفاق کی وجہ سے خود کو ہلاک کر بیٹھتے ہیں۔

اس آیت میں عظیم مقام درس ہے جس میں انسان یہ سیکھتا ہے کہ اگر اللہ تعالی کی رضا کے لیے بطور قیمت اپنی جان بیچنے کی باری آجائے تو بیچ ڈالے ، صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے اس کا بہترین نمونہ پیش کیا اور یہ آیت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہی نازل ہوئی ، قصہ کچھ یوں ہے کہ صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کرنے کے بعد ہجرت کا ارادہ کیا تو لوگوں نے ان کو روک لیا کہ وہ اپنے مال ودولت کے ساتھ نہیں جاسکتے ، اور اگر وہ سارے مال چھوڑ کر ہجرت کے لیے جانا چاہیں تو اجازت ہے، چنانچہ صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے سارا مال ان کے حوالے کر کے ان سے چھٹکارا حاصل کیا، جب اس کی خبر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو لگی تو فرمانے لگے : (رَبِحَ صُهَيْبٌ رَبِحَ صُهَيْبٌ)(۱)۔ "صہیب فائدے میں رہا، صہیب فائدے میں رہا"۔ عمر بن الخطاب اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کی ایک جماعت کی ان سے حرہ کے کنارے ملاقات ہوئی تو لوگ پکار اٹھے : تجارت نفع بخش رہی(۲)۔

آیت اللہ تعالی کی ایک صفت پر ختم ہوتی ہے: ﴿وَٱللَّهُ رَءُوفُۢ بِٱلۡعِبَادِ﴾ "اور اللہ تعالی اپنے بندوں پر بڑی مہربانی کرنے والا ہے"۔ اللہ تعالی کی بندوں پر مہربانی ہی ہے کہ اس نے ان کو ہدایت وتوفیق بخشی ، اور اس کی مہربانی ہی ہے کہ وہ کافر ومنافق اور گنہگاروں پر حلیم ہے ، اگر ایسا نہ ہوتا کافر ونافرمان اور بہت سارے لوگ ہلاک ہوجاتے۔ تمام حمد وثنا اللہ تعالی کے لیے ہے کہ وہ ہم پر اور تمام لوگوں پر مہربان ہے۔

---

(۱) صحيح ابن حبان حديث نمبر (۷۰۸۲).

(۲) تفسير ابن كثير ۱/۲۵٤.

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱدۡخُلُواْ فِي ٱلسِّلۡمِ كَآفَّةً وَلَا تَتَّبِعُواْ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيۡطَٰنِۚ إِنَّهُۥ لَكُمۡ عَدُوّٞ مُّبِينٞ ﴿٢٠٨﴾ فَإِن زَلَلۡتُم مِّنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ ٱلۡبَيِّنَٰتُ فَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٠٩﴾ هَلۡ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن يَأۡتِيَهُمُ ٱللَّهُ فِي ظُلَلٖ مِّنَ ٱلۡغَمَامِ وَٱلۡمَلَٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ ٱلۡأَمۡرُۚ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرۡجَعُ ٱلۡأُمُورُ ﴿٢١٠﴾ ﴾

ترجمہ:

"ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو ، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے(۲۰۸)۔اگر تم باوجود تمہارے پاس دلیل آجانے کے بھی پھسل جاؤ تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ غلبہ والا اور حکمت والا ہے(۲۰۹)۔ کیا لوگوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ ان کے پاس خود اللہ تعالیٰ بادل کے سائبانوں میں آجائے اور فرشتے بھی اور کام انتہا تک پہنچا دیا جائے، اللہ ہی کی طرف سے تمام کام لوٹائے جاتے ہیں(۲۱۰)"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ مومنوں سے مخاطب ہے ، فرمایا: ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱدۡخُلُواْ فِي ٱلسِّلۡمِ كَآفَّةً ﴾" ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ"۔ آیت کی ابتداء صیغہ نداء کے ذریعہ مومنوں کو خطاب کرکے ہوئی ہے،اور اسی طرح ان کو ایمان کی صفت سے خطاب کیا گیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا کرم واحسان ہے کہ اپنے مومن بندوں کو اتنے اعلیٰ لقب سے خطاب کر رہا ہے، یہ اسلوب اور طریقہ خطاب مومنوں کو متنبہ اور متوجہ کرنے کے لیے ہے ،اس کے بعد انہیں صیغہ امر کے ذریعہ ہدایت اور ہنمائی کر رہا ہے: ﴿ ٱدۡخُلُواْ فِي ٱلسِّلۡمِ كَآفَّةً ﴾"اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ"۔یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں داخل ہو کر ایمان کے تمام شعبوں اور اور اسلامی شرائع پر بغیر کسی استثناء کے کاربند ہو جاو، دین کے تمام اعمال اور نیکی کی تمام اقسام کی بجاآوری کرو، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک مکمل مجموعے کا نام ہے ، اور اس مجموعہ کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا، اور ایمان کے ہر شعبے اور پوری شریعت پر عمل کرنا واجب ہے، اس میں خواہش نفس کی بنا پر اختیار اور تقسیم کی کوئی گنجائش نہیں کہ ایک چیز لی جائے اور دوسری چیز چھوڑ دی جائے، کسی چیز پر کبھی عمل کیا جائے اور کسی وقت غفلت برتی جائے، بلکہ اسلام ایک مجموعہ کا نام ہے اسے الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نیز لفظ (کافۃ) تمام افراد پر بھی دلالت کرتا

ہے ،یعنی تم سب کے سب شعب ایمان اور شرائع اسلام پر عمل کرو، اور کوئی بھی اسلام کی کسی چیز سے پیچھے نہ رہے[1] ۔

چاہے لفظ (کافۃ) کا تعلق مومنوں سے ہو یا اسلام ہے، دونوں صورتوں میں لفظ کی دلالت اور معنی درست اور مقصد اہم ہے اور یہ ہمارے رب کے کلام کی عظمت اور اس کے بیان کا اعجاز ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی مومنوں کو شیطان کی پیروی سے دور رہنے کا حکم دے رہا ہے: ﴿وَلَا تَتَّبِعُواْ خُطُوَٰتِ ٱلشَّيۡطَٰنِۚ﴾ " اور شیطان کے قدموں کی تابعداری نہ کرو ، "۔ لفظ (خطوات) میں اس بات کی دلیل ہے کہ شیطان انسان کو معصیت اور گناہ کی طرف قدم بہ قدم دھیرے دھیرے گھسیٹتا ہے۔ جب ایک چال میں اس کی پیروی ہونے لگتی ہے تو دوسری چال کی طرف لے جاتا ہے، اس لیے مومنوں کو ان کے دشمن سے ڈرایا گیا ہے ، کیوں کہ وہ انہیں ایک گناہ سے دوسرے گناہ پر بتدریج آمادہ کرتا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اپنے گنہگاروں کو دھمکی دے رہا ہے: ﴿ فَإِن زَلَلۡتُم مِّنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ ٱلۡبَيِّنَٰتُ ﴾" اگر تم باوجود تمہارے پاس دلیل آجانے کے بھی پھسل جاؤ" یہ تحذیر ہے کہ کہیں تم علم ہو جانے اور مطلوب ومقصود اور ممنوعات کے واضح ہوجانے کے بعد بھی پھسل نہ جاؤ۔ (زَلَلۡتُم) کے لفظ میں استقامت سے ہٹ جانے کا مفہوم پایا جاتا ہے، اور زلل عمومی طور پر ثبات اور استقامت کے بعد ہوتا ہے اور وہ اس لیے کہ مخلوق اپنے اصل مقصود سے پھسل جایا کرتی ہے، چنانچہ اللہ حکیم وعلیم زلل کے عام انواع واقسام کے حساب سے متنبہ کر رہا ہے اور ہماری توجہ اس بات کی طرف کر رہا ہے کہ کہیں تم اللہ تعالی کی اطاعت اور اس کے اوامر سے پھسل نہ جانا جب کہ تمہارے پاس واضح دلائل آچکے ہیں۔ ﴿فَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾" تو جان لو کہ اللہ تعالی غلبہ والا اور حکمت والا ہے"اس میں اللہ تعالی کے مقام ومرتبے کا بیان ہے کہ وہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے، اور اس بات کا علم کہ اللہ تعالی عزیز وحکیم ہے یہ انسان کے لیے اطاعت الہی سے پھسل جانے اور معصیت کے ارتکاب سے

---

(۱) ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں مختلف اقوال کی تفصیل ذکر کی ہے (۱/۲۵۵) اور اسی طرح ابن الجوزی نے بھی زاد المسیر میں (۱/۲۰۵)

بچاؤ کا سبب ہے، کیوں کہ عزیز وہ ہے جس کے سامنے تمام چیزیں ذلیل وحقیر ہوں ،عزیز وہ ہے جو قاہر ہو اور مقہور نہ ہو، عزیز وہ ہے جس میں انتقام کی قوت ہو، عزیز بہت ہی اعلی اور ارفع مقام ہے ، جس میں رفعت وبلندی، قوت وعلو اور قدرت مطلق کے معانی پائے جاتے ہیں۔ اور اللہ تعالی حکیم ہے شریعت سازی میں، امر ونہی اور تدبیر میں، لہذا اللہ کے سوا کوئی عزیز نہیں اور اللہ کے سوا کوئی حکیم نہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اس اللہ کے حق میں پھسلنے سے بچا جائے جس کی صفت عزیز وکریم ہے، یہ اسلوب بیک وقت حیاء اور خوف دونوں پر ابھارتا ہے اور آگاہی اور زلل سے احتیاط کے عوامل واسباب کو مستحکم کرتا ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالی کا اسلوب بیان کیا ہی عظیم وعمدہ اور خوبصورت ہے؟! خصوصا اس کے پہلے والی آیت میں ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ﴾ کے ذریعہ اللہ تعالی کے خطاب کی ابتداء ہوتی ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ اس خطاب کی دلالت سے مومن کے ایمانی پوشیدگیوں کو ابھارنا مقصود ہے، یعنی کہ تم لوگ مومن ہو تمہارے پاس واضح دلائل آجانے کے بعد تم کو زیب نہیں دیتا کہ راہ حق سے پھسل جاؤ۔

اس کے بعد جو لوگ دخول اسلام میں تاخیر کرتے ہیں ان لوگوں کے متعلق اللہ تعالی استفہام انکاری کے اسلوب میں فرما رہا ہے: ﴿ هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن يَأْتِيَهُمُ ٱللَّهُ فِى ظُلَلٍ مِّنَ ٱلْغَمَامِ وَٱلْمَلَـٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ ٱلْأَمْرُ ۚ وَإِلَى ٱللَّهِ تُرْجَعُ ٱلْأُمُورُ ﴾ " کیا لوگوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ ان کے پاس خود اللہ تعالیٰ بادل کے سائبانوں میں آجائے اور فرشتے بھی اور کام انتہا تک پہنچا دیا جائے، اللہ ہی کی طرف سے تمام کام لوٹائے جاتے ہیں "۔ یعنی یہ لوگ جن پر کہ حجت قائم ہو چکی ہے اس کے باوجود وہ اپنی معصیت وکفر اور شیطانی چالوں کی اتباع میں میں پڑے ہوئے حق سے لوگوں کو روکتے ہیں تو کیا وہ لوگ قیامت کے دن کے فیصلے کا انتظار کر رہے ہیں ،تاکہ ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کا بدلہ دے دیا جائے تو کیا اس وقت یہ لوگ ایمان لائیں گے جب ان کا ایمان لانا کچھ بھی سود مند نہ ہوگا، کیوں کہ سارے معاملے ختم اور مخلوقات کے درمیان فیصلے ہو چکے ہوں گے، تو کیا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالی نے ان سے جس حساب وکتاب کا وعدہ کیا ہے اس کو لے کر آجائے۔

دخول اسلام سے پیچھے ہٹنے والوں سے اللہ تعالی کی جانب سے یہ اسلوب خطاب غور وفکر اور تدبر پر آمادہ کرتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالی نے اس خطاب کی ابتداء استفہام انکاری سے کی ہے اور اس سے وہ عقلیں

مخاطب ہیں جو آخرت سے بے پرواد نیامیں مشغول اور اٹکی ہو ئی ہوئی ہیں ،اور یہ اسلوب غور وفکر اور حقیقت کی طرف رجوع کے لیے ان کی ذہنی تحریک کا سبب ہو سکتا ہے جو انہیں جلد از جلد دخول اسلام پر آمادہ کرے، کیوں کہ اللہ تعالی نے جزاء وسزا اور فیصلے والے دن ہونے والے والی بعض چیزوں کا اس انداز میں ذکر کیا ہے کہ عقل اور عاطفت اس ہولناک دن کی صورت حال کے خوف سے حرکت میں آئیں۔آیت کا اختتام اللہ تعالی کے اس قول سے ہوتا ہے : ﴿وَإِلَى ٱللَّهِ تُرۡجَعُ ٱلۡأُمُورُ﴾" اللہ ہی کی طرف سے تمام کام لوٹائے جاتے ہیں " ۔یعنی تمام امور کو اللہ تعالی ہی کی طرف لوٹنا ہے، تمام مخلوقات بھی اسی اللہ سبحانہ وتعالی کی طرف لوٹیں گی، پھر حساب وکتاب اور جزاء وسزا ہو گی۔ بڑی پاکیزہ ہے اللہ کی ذات جس نے اپنی کتاب عزیز کو ایسی تعلیمات سے بھر دیا ہے جو عقل ونفوس کو بندوں کی مصلحت کی جانب آمادہ کرتی ہیں، امر ونہی، توجیہ وارشاد، بیان وتوضیح،اور تعلیم وتذکیر ہر اعتبار سے مختلف اسالیب اور پیرائے میں بیان کر دیا جن سے عقل وعاطفت بیداری اور آمادگی آتی ہے۔

﴿سَلۡ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ كَمۡ ءَاتَيۡنَٰهُم مِّنۡ ءَايَةِۭ بَيِّنَةٖۗ وَمَن يُبَدِّلۡ نِعۡمَةَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ فَإِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلۡعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُواْ ٱلۡحَيَوٰةُ ٱلدُّنۡيَا وَيَسۡخَرُونَ مِنَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْۘ وَٱلَّذِينَ ٱتَّقَوۡاْ فَوۡقَهُمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِۗ وَٱللَّهُ يَرۡزُقُ مَن يَشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٖ ﴿٢١٢﴾﴾

ترجمہ:

"بنی اسرائیل سے پوچھو تو کہ ہم نے انہیں کس قدر روشن نشانیاں عطافرمائیں ،اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنے پاس پہنچ جانے کے بعد بدل ڈالے (وہ جان لے) کہ اللہ تعالیٰ بھی سخت عذابوں والا ہے(۲۱۱)۔کافروں کے لئے دنیا کی زندگی خوب زینت دار کی گئی ہے،وہ ایمان والوں سے ہنسی مذاق کرتے ہیں ، حالانکہ پرہیزگار لوگ قیامت کے دن ان سے اعلیٰ ہونگے، اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے(۲۱۲)"۔

خطاب اور سیاق قرآنی پھر سے بنی اسرئیل کی طرف لوٹ رہا ہے،اس میں اللہ تعالی بنی اسرائیل سے اپنی نعمتوں کا تذکرہ کر رہا ہے جنہوں نے ان نعمتوں کو نافرمانیوں میں بدل ڈالا: ﴿سَلۡ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ كَمۡ ءَاتَيۡنَٰهُم مِّنۡ ءَايَةِۭ بَيِّنَةٖۗ وَمَن يُبَدِّلۡ نِعۡمَةَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ فَإِنَّ ٱللَّهَ شَدِيدُ ٱلۡعِقَابِ﴾" بنی اسرائیل

سے پوچھو توکہ ہم نے انہیں کس قدر روشن نشانیاں عطافرمائیں ،اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنے پاس پہنچ جانے کے بعد بدل ڈالے (وہ جان لے) کہ اللہ تعالیٰ بھی سخت عذابوں والا ہے "۔آیت کی ابتداء﴿سَلۡ بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ﴾ سے ہو رہی ہے ،یعنی "بنی اسرائیل سے پوچھو"۔یہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے ،اور بنی اسرئیل سے یہ سوال ڈانٹ اور توبیخ کے طور پر ہے(۱) ۔اور عظیم اور واضح دلائل آجانے کے باوجود بنی اسرائیل اگرایمان نہیں لاتے ہیں تو ان کی سرکشی وہٹ دھرمی اور تبدیل نعمت کے خصائل واحوال بیان کرکے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے۔اور آیت میں لفظ (کم) دلائل وبراہین کی کثرت بیان کرنے کے لیے ہے: ﴿كَمۡ ءَاتَيۡنَٰهُم مِّنۡ ءَايَةِۭ بَيِّنَةٖ﴾ "ہم نے انہیں کس قدر روشن نشانیاں عطافرمائیں "مثلا: عصائے موسی،ید بیضاء، سمندر میں راستہ بن جانا، من وسلوی کا نزول، پر ان ساری واضح اور روشن دلیلوں اور نشانیوں کے باوجود انہوں نے اپنی کتابوں میں تحریف کرکے دین کو بدل ڈالا ، یہاں آیت میں یہ اشارہ دیا گیاہے کہ بنی اسرائیل اتنی ساری نشانیاں ملنے کے باوجود ان سے کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھاسکے، لہذا ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ونبوت کے ساتھ بھی ان کا ایسا ہی معاملہ ہے ، اگرچہ ان میں سے گنتی کے چند لوگ اسلام میں داخل ہوئے، لیکن اکثریت پر یہی حکم لاگو آتاہے۔

اس میں ہر شخص کے لیے تنبیہ اور تحدیر ہے جو اللہ کی نعمتوں کو بدل ڈالتاہے، اور دین بھی انہیں نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا عذاب ایسے لوگوں کے لیے بہت سخت ہے۔آیت سے یہ بھی معلوم ہواکہ دین ایک عظیم اور جلیل القدر نعمت ہے ،اور اعتقاد وعمل اور شکر گذاری ہر اعتبار سے اس کی کماحقہ پابندی ضروری ہے،اسی طرح اس میں تبدیلی کرنے والوں کو عذاب شدید کی وعید اس کے عظمت اور اس میں ردوبدل کے خطرناکی کی دلیل ہے،اس لیے اس کی حفاظت واجب ہے اور یہی عذاب الہی سے نجات کا واحد راستہ ہے۔

﴿وَمَن يُبَدِّلۡ نِعۡمَةَ ٱللَّهِ مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُ﴾ " اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنے پاس پہنچ جانے کے بعد بدل ڈالے "۔اس کی تفسیر میں امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ لفظ تمام

---

(۱) تفسي قرطبي ۳/۲۰.

لوگوں کے لیے عام ہے، اگرچہ اس میں اشارہ بنی اسرائیل کی طرف ہے، اس لیے کہ انہوں نے ہی اپنی کتابوں میں ردوبدل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تھی، چنانچہ یہ لفظ ہر اس شخص پر فٹ آئے گا جو اللہ تعالی کی نعمت میں تبدیلی کرنے والا ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہاں نعمت سے مراد اسلام ہے، یہ معنی بھی پہلے معنی کے قریب قریب ہے، اور اس لفظ کا مصداق کفار قریش بھی ہیں، کیوں کہ ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ان کے لیے بڑی نعمت ہے، پر انہوں نے قبول اور شکر گذاری کی بجائے کفر کر کے اس نعمت کو بدل ڈالا(١) ۔اس آیت کے تعلق سے علماء کی تفاسیر علماء کے وضع کردہ اصولی قاعدہ (الاعتبار بعموم اللفظ لا بخصوص السبب) کی دلیل ہیں، یعنی اصل اعتبار لفظ کے عموم کا ہے خصوص سبب کا نہیں۔ آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں جو کچھ بھی بیان کیا ہے اس کا مقصد علم کے مطابق عمل ہے، محض اطلاع اور جانکاری مقصود نہیں۔ اور قرآن کریم میں گزشتہ اخبار پند وموعظت اور عمل کے لیے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا ﴾ "کافروں کے لئے دنیا کی زندگی خوب زینت دار کی گئی ہے"۔ اللہ تعالی خبر دے رہا ہے کہ جن لوگوں نے کفر اور اللہ کی شریعت کا نکار کیا ان کے لیے دنیا کی زندگی خوب مزین کر دی گئی ہے اور یہ دنیا ان کے قلب وجگر اور آنکھوں میں خوب رچ بس گئی ہے چنانچہ وہ اسی سے رضامند اور مطمئن ہو گئے، اس لیے ان کی تمام خواہشات، ارادے اور اعمال اسی کے حصول کے لیے ہوتے ہیں نیز وہ مومنوں کو حقیر سمجھتے اور ان کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں(٢)۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے عذاب کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ شریعت الہی کے بیان اور واضح ہو جانے کے باوجود انکار کرنے والے کی آنکھوں اور دلوں میں یہ دنیا اس حد تک مزین ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالی کے مومن بندوں کا مذاق اڑانے لگتے ہیں: ﴿وَيَسْخَرُونَ مِنَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ﴾ "وہ ایمان والوں سے ہنسی مذاق کرتے ہیں "۔ معلوم ہوا کہ دنیا کے فتنوں اور آلائشوں سے خود کو محفوظ رکھنا چاہیے، اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ جو لوگ آخرت کے مقابلے میں دنیا کو اچھا سمجھتے ہیں وہ ان لوگوں کا مذاق

---

(١) مرجع سابق.

(٢) تفسير ابن السعدي ١/١٦٧.

اڑاتے ہیں جو دنیا کے مقابلے میں آخرت کو اچھا سمجھتے ہیں ، پتہ چلا کہ استہزاء ہمیشہ سے کفار ومشرکین کا شیوہ رہا ہے،اس سے اللہ تعالی نے آگاہ کر دیا ہے،اس لیے مسلمانوں کو چاہئے کہ کفار کے استہزاء سے بے اعتنائی برتیں اوران کے اس مذاق کو معمولی سمجھ کر ان سے اظہار تعلق نہ کریں،اسی طرح اس سے یہ بھی فائدہ ماخوذ ہے کہ اللہ تعالی کی راہ سے لوگوں کو روکنے کے لیے استہزاء کا یہ اسلوب کفار کے من جملہ ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے، چنانچہ مومن اس سے ہوشیار رہیں تاکہ ان کو وہ مقام ومرتبہ حاصل ہو جس کا تذکرہ اللہ تعالی آگے کر رہا ہے: ﴿وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾" حالانکہ پرہیزگار لوگ قیامت کے دن ان سے اعلیٰ ہونگے "۔ یعنی متقی لوگ اعلی مقامات میں ہوں گے، دائمی نعمتوں سے لطف اندوز ہورہے ہوں گے،اس کے برعکس کفار ومشرکین انتہائی نچلے طبقے میں ہوں گے اور مختلف قسم کے عذاب اور بدبختی سے دوچار ہوں گے۔ دین کے معاملے میں مومنوں کو کفار کی جن ایذاءرسانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان ایذاؤں پران کے صبر کو یہ آیت تقویت فراہم کرتی ہے، نیز انجام کار اور نتیجہ تقوی کے التزام پر مومنوں کی حوصلہ افزائی کا سب سے بہتر وسیلہ ہے جس تقوی کے حصول کے بعد بندہ اللہ کی توفیق اور حمت سے بہتر اوراعلی درجات سے ہم کنار ہوتا ہے۔

اس کے بات اللہ تعالی ایک بہت ہی اہم بات بیان کر رہا ہے،اور وہ یہ رزق کا مصدر: ﴿وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾" اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے "۔ یہاں آیت میں رزق کی حقیقت اوراس کے اصل مصدر کا بیان ہے،اس میں مومنوں کواس بات پر ابھارا جارہا ہے کہ وہ رزق کو اس کے مالک حقیقی سے ہی طلب کریں، کیوں کہ دنیوی اور اخروی سارارزق اللہ تعالی ہی کے ہاتھ میں ہے،اور یہ حقیقت اس بات کا متقاضی ہے کہ بندہ مومن دنیوی اوراخروی رزق اور دین پر ثبات قدمی کا سوال اپنے رب تبارک وتعالی سے کرے، اس لیے کہ وہی عطا کرنے والا ہے، آیت کا فائدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی جس کو چاہتا ہے بندے کے اعمال کی برابری کئے بغیر بے حساب روزی دیتا ہے، جب عطا کرتا ہے تو پوری سخاوت سے دیتا ہے ،اس کی نوازشیں بے انتہا اور بے حساب ہیں،اور بندہ چاہے جتنا بھی عمل اور نیکیاں کرلے اللہ تعالی کے حق میں وہ سب کافی حقیر اور تھوڑی ہیں،اور اللہ تعالی کی نوازشیں

بندے کی نیکیوں سے بہت زیادہ ہیں، دونوں کے مابین مقابلہ کی کوئی صورت ہی نہیں بنتی۔ ہم اللہ تعالی کے فضل وکرم اور رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

﴿كَانَ ٱلنَّاسُ أُمَّةً وَٰحِدَةً فَبَعَثَ ٱللَّهُ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ فِيمَا ٱخْتَلَفُوا۟ فِيهِ ۚ وَمَا ٱخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا ٱلَّذِينَ أُوتُوهُ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ ٱلْبَيِّنَٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِمَا ٱخْتَلَفُوا۟ فِيهِ مِنَ ٱلْحَقِّ بِإِذْنِهِۦ ۗ وَٱللَّهُ يَهْدِى مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢١٣﴾﴾

ترجمہ:

"دراصل لوگ ایک ہی گروہ تھے ،اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبریاں دینےاورڈرانے والا بنا کر بھیجا اوران کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں، تاکہ لوگوں کے ہر اختلافی امر کا فیصلہ ہو جائے۔ صرف ان ہی لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی، اپنے پاس دلائل آچکنے کے بعد آپس کے بغض وعناد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا ، اس لئے اللہ پاک نے ایمان والوں کی اس اختلاف میں بھی حق کی طرف اپنی مشیت سے رہبری کی ، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھی راہ کی طرف رہبری کرتا ہے (۲۱۳)"۔

اللہ تعالی آدم علیہ السلام کے بعد سے رسولوں کی بعثت تک کے لوگوں کے احوال بیان کررہاہے ، چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿كَانَ ٱلنَّاسُ أُمَّةً وَٰحِدَةً فَبَعَثَ ٱللَّهُ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾ " دراصل لوگ ایک ہی گروہ تھے ،اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبریاں دینےاورڈرانے والا بنا کر بھیجا"۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اصلا تمام لوگ آدم علیہ السلام کی ملت پر ایک ہی امت تھے ، پھر لوگ بڑھتے گیے اور ان میں اختلاف بھی زیادہ ہوتا گیا، اور دین سے انحراف اور بتوں کی پوجا تک نوبت پہنچ گئی تو اللہ تعالی نے نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، اس طرح سے وہ اللہ تعالی کے سب سے پہلے رسول تھے جنہیں اللہ تعالی نے لوگوں کی طرف بھیجا۔

اس آیت کے من جملہ فوائد میں سے ہے کہ اللہ تعالی نے لوگوں کی حالت صرف دو کلموں میں بیان کی: (أُمَّةً وَٰحِدَةً) پھر ان کے احوال کی مزید وضاحت بعثت رسل کے اسباب ودواعی سے کردی: ﴿

﴿فَبَعَثَ ٱللَّهُ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾ " اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبریاں دینےاورڈرانے والا بنا کر بھیجا"۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان رسولوں کی رسالت کا مضمون صرف دو کلموں میں واضح کردیا جن میں دو ذمہ داریاں بتائی گئیں: ﴿مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾ " خوشخبریاں دینےاور ڈرانے والا"۔ بیان وتفصیل کے تعلق سے یہ قرآن کی بلاغت وبیان کا اعجاز ہے۔ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نوح اور آدم علیہماالسلام کے درمیان دس صدی کا عرصہ ہے، سب کے سب حق شریعت پر تھے،اس کے بعد ان میں اختلاف نے جنم لیاتواللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبریاں دینےاور ڈرانے والا بنا کر بھیجا(١) ۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کو ہمیشہ ایسی شخصیات کی ضرورت رہی جو ان کے دین کی تجدید واصلاح کرے ، کیوں کہ لوگوں میں بگاڑاوران کے مابین اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: (إنَّ اللهَ يَبْعَثُ لهذه الأُمَّةِ على رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ من يُجَدِّدُ لَهَا دِينَهَا)(٢) "بیشک اللہ ذوالجلال ہر سو سال کے شروع میں یاآخر میں اس امت کے اندر ایک آدمی پیدا کرتارہے گاجواس کے دین کواز سر نو قائم اور مضبوط کرتارہے گا"۔ جب دین کے معاملے میں لوگوں کے اس قدر اختلاف ہوتے ہیں تو دین سے معمولی امور دنیا، سماجی تعلقات، پیشہ اور آپسی مصلحتوں میں توان کے اختلافات بدرجہ اولی ہونے ہیں،اس لیےاس کی اہمیت کو سمجھناہے تاکہ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے لوگوں کے ساتھ ایسا تعامل ہو جس سے اختلاف کا خاتمہ اور امت میں اتفاق واتحاد لوٹ آئے ، لوگوں کو وقتاًوفوقتاًاس کی شدید ضرورت ہے، خواہ ملی پیمانے پر ہو یاسماجی وخاندانی پیمانے پر، نیز پیشہ وارانہ معاملات اور مصلحت عامۃ میں بھی لوگ اس کے محتاج ہیں۔

نبیوں کے متعلق ارشاد ربانی : ﴿مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ﴾ سے نبیوں کے فرض منصبی کی وضاحت ہوتی ہے، وہ یہ کہ فرمابرداروں کو جنت کی بشارت اور نافرمانوں کو جہنم سے ڈرانااور اس کے بعد اس کے متعلق منہج ربانی کابیان،اس سے معلوم ہواکہ علماء ودعاۃ کی وہی ذمہ داری ہے جوانبیاء کرام کی ذمہ داری ہے یعنی لوگوں کو تعلیم دینا،اور چاہے انبیاء ہوں یاعلماء ودعاۃ وہ مخلوق کی ہدایت توفیق کے مالک نہیں

(١) تفسير ابن كثير ١/٢٥٧.

(٢) ابو داود ٤/٤٨٠ حديث نمبر (٤٢٩١)

ہیں،ان کا کام اللہ تعالی کی طرف سے نازل شدہ کتابوں کی تعلیمات کے ذریعہ لوگوں کو حق کے راستے کی رہنمائی کردینا ہے ، جیساکہ اللہ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَأَنزَلَ مَعَهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ﴾ "اوران کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں "یعنی وہ تمام آسمانی کتابیں جنہیں اللہ تعالی نے اپنے نبیوں پر اتارا،اس سے معلوم ہواکہ انبیاء دینی امور میں اپنی طرف سے کوئی اجتہاد نہیں کرتے ، بلکہ جو کچھ ان پر نازل ہوتا ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کرتے ہیں، ٹھیک اسی طرح علماء ربانی کے لیے بھی اجتہاد کے میدان میں نازل شدہ نصوص کو سامنے رکھنے کا التزام کرنا ہے۔اس سے یہ بھی مستفاد ہے کہ اللہ تعالی کا دین بالکل منظم اور منضبط ہے کیوں کہ یہ دین حق کے ساتھ اللہ تعالی کی جانب سے نازل شدہ ہے۔ فرمایا﴿وَأَنزَلَ مَعَهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ﴾ "اوران کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں "۔

اس کے بعد اللہ تعالی نبیوں کی ذمہ داری بیان کررہا ہے کہ وہ لوگوں کے مختلف فیہ امور میں ان کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کردیں تاکہ وہ پھر سے سابقہ اتفاق واتحاد کی طرف لوٹ آئیں: ﴿وَأَنزَلَ مَعَهُمُ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ ٱلنَّاسِ فِيمَا ٱخۡتَلَفُواْ فِيهِۚ﴾ " اور ان کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں تاکہ لوگوں کے ہر اختلافی امر کا فیصلہ ہوجائے "۔اس سے معلوم ہواکہ لوگوں کا اتفاق واتحاد اسی صورت میں ممکن ہے جب لوگ اس چیز کی طرف لوٹ آئیں جو انہیں خود متحد کردے اور وہ چیز ہے اللہ تعالی کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ،یہی ان کے اتحاد واتفاق کی علامت اور منہج ہے۔ اللہ تعالی کی نازل کردہ کتابیں مکمل حق ہیں،اللہ تعالی نے ان کو حق کے ساتھ نازل فرمایا۔

اس کے بعد اللہ تعالی بیان کررہا ہے کہ کتابیں نازل ہوجانے کے بعد بھی جن لوگوں نے حق میں اختلاف کیا اس کا سبب محض بغض وعناد ہے: ﴿وَمَا ٱخۡتَلَفَ فِيهِ إِلَّا ٱلَّذِينَ أُوتُوهُ مِنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ ٱلۡبَيِّنَٰتُ بَغۡيَۢا بَيۡنَهُمۡۖ﴾ " صرف ان ہی لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی،اپنے پاس دلائل آچکنے کے بعد آپس کے بغض وعناد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا "۔ (بغی) کہتے ہیں ایک کو دوسرے پر اختلاف کے لیے آمادہ کرنا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ "بغی" لوگوں اور امت کے بیچ اختلاف وانتشار کا سب سے خطرناک سبب ہے،اس سے امت کا شیرازہ منتشر اور بکھر کررہ جاتا ہے، کیوں کہ لفظ بغی میں فسق وفجور ، حد سے تجاوز، ظلم،دست درازی اور گھمنڈ جیسے معانی پائے جاتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی اس امت پر اپنا احسان جتلا رہا ہے کہ سابقہ امتیں جس چیز میں اختلاف وانتشار کا شکار ہوئیں ان میں اللہ تعالی نے تم کو ہدایت نصیب فرمائی: ﴿ فَهَدَى ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِمَا ٱخۡتَلَفُوا۟ فِيهِ مِنَ ٱلۡحَقِّ بِإِذۡنِهِۦ ﴾ "اس لئے اللہ پاک نے ایمان والوں کی اس اختلاف میں بھی حق کی طرف اپنی مشیت سے رہبری کی "۔ یعنی اولا تو ہدایت اللہ تعالی کا فضل ہے: ﴿فَهَدَى ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ﴾"اس لئے اللہ پاک نے ایمان والوں کی رہبری کی "۔ دوسرے یہ کہ یہ ہدایت اللہ تعالی کے علم وارادے سے حاصل ہوئی: ﴿بِإِذۡنِهِۦ ﴾ "اپنی مشیت سے"۔ یعنی لوگوں کے متعلق اپنے علم ، ہدایت وتوفیق اور ارادے سے ان کی رہبری کی۔ اللہ تعالی کی تعریف اور اس کا شکر ہے۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سابقہ امتوں میں سے جنہوں نے اختلاف کیا حق ہی ان کے اختلاف کا محور تھا۔ ﴿لِمَا ٱخۡتَلَفُوا۟ فِيهِ مِنَ ٱلۡحَقِّ ﴾ یعنی جس حق میں ان لوگوں نے اختلاف کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بغی اور بغض عناد انسان کو اللہ تعالی کی طرف سے نازل شدہ واضح اور روشن حق میں بھی اختلاف کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اس کا سبب ہے حسد، ظلم کبر وغرور، بالادستی کی لالچ، دوسروں پر ظلم اور دست درازی۔ جب ان کا اللہ کے دین کے بارے میں یہ حال ہے تو لوگوں کے آپسی حقوق کے بارے میں اختلاف وتنازع کی کیا کیفیت ہوگی، اس لیے معلوم ہوا کہ حق اور تواضع کی تربیت کو کافی اہمیت حاصل ہے اسی طرح نفس کو بغی جیسی صفت سے پاک وصاف رکھنا بھی ضروری ہے جو کہ اپنے اندر ظلم وغرور اور گھمنڈ جیسے اوصاف سموئے ہوئے ہے ۔

ان کے اختلاف کی مختلف صورتیں ہیں، انہوں نے یوم جمعہ میں اختلاف کیا، چنانچہ یہود نے سنیچر اور نصاری نے اتوار کے دن کو اپنایا، اس لیے اللہ تعالی نے امت محمدیہ کو یوم جمعہ کی رہبری کی، قبلہ کے بارے میں اختلاف کیا، نصاری مشرق کو اور یہود نے بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنایا، اور اللہ تعالی نے امت محمدیہ کو صحیح قبلہ کی بھی رہنمائی فرمائی، لوگوں نے نماز میں بھی اختلاف کیا، ان میں کچھ وہ تھے جو رکوع کرتے تو سجدہ نہیں کرتے اور کچھ سجدہ کرتے تو رکوع نہیں کرتے، اور کچھ نماز میں باتیں کر رہے ہوتے، کچھ چلتے پھرتے نماز پڑھ رہے ہوتے، پر اللہ تعالی نے امت محمدیہ کو اس میں حق کی ہدایت نصیب فرمائی، لوگ روزہ کے بارے میں بھی اختلاف کا شکار ہوئے، کوئی آدھے دن کا روزہ رکھتا، کوئی بعض کھانوں سے

روزہ رکھتا اور بعض سے نہیں، اس میں بھی امت محمدیہ کو اللہ تعالی کی طرف سے ہدایت ملی، لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام کے بارے اختلاف کیا، یہودی کہتے کہ وہ یہودی تھے، اور نصاری دعوی کرتے کہ وہ نصرانی تھے، اور اللہ تعالی نے ان کو دین حنیف اور اسلام کا پیروکار قرار دے کر امت محمدیہ کو حق کی رہنمائی کی، لوگوں نے عیسی علیہ السلام کے بارے میں بھی اختلاف کیا، یہود نے ان کو سرے سے جھٹلادیا، اور ان کی والدہ پر بڑی بہتان تراشی کی، اور نصرانیوں نے ان کو معبود اور اللہ کا بیٹا بناڈالا، اس میں بھی اللہ تعالی نے امت محمدیہ کو حق کی توفیق بخشی اور عیسی علیہ السلام کو اللہ کی روح اور کلمہ بتلایا(۱) ۔ چنانچہ اس امت میں بھی جتنا اختلاف رونما ہوتا ہے یا ہوگا وہ سب انہی مغضوب علیہم اور ضالین یہود ونصاری کے نقش قدم کی پیروی کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اس توضیح کو یوں ختم کر رہا ہے کہ وہی ہدایت اور توفیق دینے والا ہے: ﴿وَٱللَّهُ يَهۡدِي مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٖ مُّسۡتَقِيمٍ﴾" اور اللہ تعالی جس کو چاہے سیدھی راہ کی طرف رہبری کرتا ہے"۔ یعنی اللہ تعالی اپنی مخلوقات میں سے جس کو چاہتا ہے حق کی ہدایت نصیب کرتا ہے، اس سے نعمت ہدایت کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، نیز ہدایت یافتہ کو چاہیے کہ وہ اپنی ہدایت کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کرے، بلکہ تمام نعمتوں کی نسبت اسی کی طرف ہونی چاہیے ،اسی طرح ہر ضرورت اور مطلب جس کو وہ اللہ تعالی سے طلب کرتا اور ناپسندیدہ امور جن سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہے سب کی نسبت اسی ذات باری تعالی کی طرف کرے۔ اسی لیے ماثورہ دعا میں ایک مسلم کہتا ہے: (اللَّهُمَّ اهْدِنِي فِيمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِي فِيمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنِي فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِي فِيمَا أَعْطَيْتَ، وَقِنِي شَرَّ مَا قَضَيْتَ، إِنَّكَ تَقْضِي وَلَا يُقْضَى عَلَيْكَ، وَإِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَالَيْتَ، وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ، تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ)(۲) ۔"اے اللہ! جن لوگوں کو تونے ہدایت دی ہے مجھے بھی ان کے ساتھ ہدایت دے۔ اور جن کو تونے عافیت دی ہے مجھے بھی ان کے ساتھ عافیت دے (یعنی ہر قسم کی برائیوں اور پریشانیوں وغیرہ سے) اور جن کا تو والی (دوست اور محافظ) بنا ہے ان کے ساتھ میرا بھی والی بن۔ اور جو

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۲۵۷-۲۵۸.

(۲) ابو داود ۲/۱۳۳-۱۳٤ حدیث نمبر (۱٤۲۵).

نعمتیں تونے عنایت فرمائی ہیں ان میں مجھے برکت دے۔اور جو فیصلے تونے فرمائے ہیں ان کے شر سے مجھے محفوظ رکھ۔بلاشبہ فیصلے توہی کرتاہے، تیرے مقابلے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوتا۔اور جس کا تو والی اور محافظ ہو وہ کہیں ذلیل نہیں ہو سکتا۔اور جس کا تو مخالف ہو وہ کبھی عزت نہیں پاسکتا، بڑی برکتوں (اور عظمتوں)والاہے تواے ہمارے رب!اور بہت بلند و بالاہے"۔

﴿ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ ٱلْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ ٱلَّذِينَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ ٱلْبَأْسَآءُ وَٱلضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُواْ حَتَّىٰ يَقُولَ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَهُۥ مَتَىٰ نَصْرُ ٱللَّهِ ۗ أَلَآ إِنَّ نَصْرَ ٱللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾ ﴾

ترجمہ:

"کیاتم یہ گمان کئے بیٹھے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ اب تک تم پر وہ حالات نہیں آئے جو تم سے اگلے لوگوں پر آئے تھے انہیں بیماریاں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ یہاں تک جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ کے ایمان والے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سن رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے(۲۱۴)"۔

اللہ تعالی ابتلاء اور آزمائش کے بارے میں اپنی سنت بیان کر رہاہے: ﴿ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ ٱلْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ ٱلَّذِينَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ ٱلْبَأْسَآءُ وَٱلضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُواْ حَتَّىٰ يَقُولَ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَهُۥ مَتَىٰ نَصْرُ ٱللَّهِ ۗ أَلَآ إِنَّ نَصْرَ ٱللَّهِ قَرِيبٌ ﴾ "کیاتم یہ گمان کئے بیٹھے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ اب تک تم پر وہ حالات نہیں آئے جو تم سے اگلے لوگوں پر آئے تھے انہیں بیماریاں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ یہاں تک جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ کے ایمان والے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ سن رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے"۔

آیت کی ابتداء سوال تقریری سے ہو رہی ہے، تاکہ اس کے واسطے سے اس ابتلاء اور پرکھ کو ثابت کیا جائے جس سے ممکن ہے مومن لاعلم ہوں، یعنی کیا تم گمان کر رہے ہو کہ جنت میں داخلہ بغیر ابتلاء اور آزمائش کے ہو جائے گا، یہ اس لیے ہے تاکہ مومن کو بندوں کے بارے سنت الٰہی کی حقیقت کا ادراک ہو جائے۔اور جاننے کے بعد اسے بخوبی قبول کر لیں، بلکہ یہ اللہ تعالی کا لطف و کرم اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے ان آزمائشوں کے متعلق مومنوں کو تسلی کی بات بھی بتائی وہ یہ کہ اے مومنو! یہ ابتلاء اور آزمائش

صرف تمہارے ساتھ خاص نہیں، بلکہ یہ اللہ کی سنت ہے، اور یہ آزمائشیں تم سے پہلے کے لوگوں کے ساتھ بھی پیش آئیں: ﴿وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ ٱلَّذِينَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُمۖ مَّسَّتْهُمُ ٱلْبَأْسَآءُ وَٱلضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُواْ﴾ "حالانکہ اب تک تم پر وہ حالات نہیں آئے جو تم سے اگلے لوگوں پر آئے تھے انہیں بیماریاں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ یہاں تک جھنجھوڑے گئے" یہ تسلی اس لیے ہے تاکہ مومن کو قلبی سکون حاصل ہو، صبر کرے اور فقر وغیرہ کی مصیبت اور آزمائش کو بخوشی قبول کرلے: (ٱلْبَأْسَآءُ) سے مراد فقر اور بیماریاں اور (وَٱلضَّرَّآءُ) سے مراد مصیبتیں اور دشمن کا خوف ہے، (وَزُلْزِلُواْ) اور وہ جھنجھوڑ دیے گیے۔ یا آزمائشیں مومن کی پاکیزگی کا باعث اور جنت میں بلندی درجات کا سبب ہیں، اس سے معلوم ہوا کی جنت میں جانے کا راستہ آزمائشوں سے گھرا ہوا ہے، اور مومن یہ جان لینے کے بعد صبر کرتا ہے اور ابتلاء کے تئیں رضامند رہتا ہے ،اور اللہ تعالی سے عافیت اور ہر مصیبت سے نجات کی دعا کرتا ہے اور یہ کہ اللہ تعالی اس کے انجام کو بہتر بنائے، اور اگر اس کو کوئی آزمائش اور مصیبت آن پڑتی ہے تو یقین کرلیتا ہے کہ یہ سب اس کے رب کے پاس پہلے سے لکھا ہوا ہے۔

سابقہ لوگوں کی آزمائشوں کے ذکر میں مومنوں کے لیے تسلی ہے، تاکہ ان کو یہ نہ لگے کہ صرف وہی لوگ ہیں جن کو اللہ تعالی نے آزمائشوں میں ڈال رکھا ہے، حتی کہ رسولوں پر بھی آزمائشیں آئیں: ﴿وَزُلْزِلُواْ حَتَّىٰ يَقُولَ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَهُۥ مَتَىٰ نَصْرُ ٱللَّهِۗ﴾ " وہ یہاں تک جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور ان کے ساتھ کے ایمان والے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟" یعنی اللہ تعالی سے دشمنوں پر فتح اور شدت کرب سے جلد نجات اور چھٹکارے کی دعا کرنے لگے۔ لفظ (وَزُلْزِلُواْ) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کپکپاہٹ بہت شدت اور خوفناک تھی، اور شدت خوف کے مارے ان کے دل تھرا اٹھے، چنانچہ رسول اور ان کے مومن ساتھی گھبرائے ہوئے دعا کی طرف متوجہ ہوئے کہ اللہ تعالی ان کو اس مصیبت سے نجات دلادے، اسی طرح کے حالات رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے ساتھ غزوہ احزاب کے دن پیش آئے ، جیساکہ سورہ احزاب میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿إِذْ جَآءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ ٱلْأَبْصَٰرُ وَبَلَغَتِ ٱلْقُلُوبُ ٱلْحَنَاجِرَ﴾ [سورة الأحزاب: ١٠]۔ "جب کہ (دشمن) تمہارے پاس اوپر اور نیچے سے چڑھ آئے ، اور

جب کہ آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آگئے"۔اس کے بعد آیت کا اختتام ہو رہا ہے: ﴿أَلَآ إِنَّ نَصۡرَ ٱللَّهِ قَرِيبٌ﴾ " سن رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہی ہے "۔ پتہ چلا کہ آزمائشیں ختم ہو جاتی ہیں، اس لیے مومن کو صبر ہی کرنا چاہیے،اسی لیے صحابہ کرام نے جب دشمنوں کی کثرت تعداد کا مشاہدہ کیا اور ان کے کلیجے منہ کو آگئے تو پکار اٹھے: ﴿هَٰذَا مَا وَعَدَنَا ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ وَصَدَقَ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥۚ وَمَا زَادَهُمۡ إِلَّآ إِيمَٰنًا وَتَسۡلِيمًا﴾ [سورة الأحزاب:٢٢]۔ "کہ انھیں کا وعدہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول نے دیا تھا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے سچ فرمایا ، اور اس (چیز) نے ان کے ایمان میں اور شیوہ فرماں برداری میں اور اضافہ کردیا"۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دشمنوں پر تیز کی آندھی اور ایسے دشمن بھیجے جو دیکھائی نہیں دے رہے تھے،اور تمام گروہ شکست کھا گئے، پس اللہ کی مدد ان سے قریب ہی تھی۔

﴿ يَسۡـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَۖ قُلۡ مَآ أَنفَقۡتُم مِّنۡ خَيۡرٍ فَلِلۡوَٰلِدَيۡنِ وَٱلۡأَقۡرَبِينَ وَٱلۡيَتَٰمَىٰ وَٱلۡمَسَٰكِينِ وَٱبۡنِ ٱلسَّبِيلِۗ وَمَا تَفۡعَلُواْ مِنۡ خَيۡرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٌ ﴿٢١٥﴾ ﴾

ترجمہ:

"آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ آپ کہہ دیجئے جو مال تم خرچ کرو وہ ماں باپ کے لئے ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے ، اور تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے(۲۱۵)"۔

اس کے بعد کا سیاق اس سوال کے جواب کے متعلق ہے جو صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نفلی صدقات اور اس کے مجالات کو لے کر کیا تھا چنانچہ اللہ تبارک وتعالی کا فرمان ہے: ﴿ يَسۡـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَۖ ﴾ "آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں "۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے صحابہ کرام تقرب الہی کے لیے صدقات کے انواع واقسام کی معرفت کا کس قدر اہتمام کرتے تھے،اور پھر قرآن کریم کی بلاغت دیکھیے کہ اس نے ایک عام قسم ذکر دی: ﴿قُلۡ مَآ أَنفَقۡتُم مِّنۡ خَيۡرٍ﴾ " آپ کہہ دیجئے جو مال تم خرچ کرو"یعنی عام خیر،اگرچہ عموما خیر سے مال مراد ہوتا ہے، لیکن یہاں پر اس لفظ کا استعمال عموم پر دلالت کرنے کے لیے ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے مجال مفتوح رکھا ہے کہ وہ اپنی استطاعت

بھر جتنااور جو کچھ بھی اللہ تعالی نے اسے نوازا ہے چاہے کھانا ہو مال ہو کپڑا ہو، کم ہو ہو یا زیادہ ہو اس میں سے خرچ کرے۔اس کے بعد اللہ تعالی صدقات اور انفاق کی ترتیب بیان کر رہا ہے: ﴿قُلْ مَآ أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ وَٱلْيَتَٰمَىٰ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱبْنِ ٱلسَّبِيلِ﴾" آپ کہہ دیجئے جو مال تم خرچ کرو وہ ماں باپ کے لئے ہے اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے" چنانچہ نفقات کے سب سے پہلے اور قریبی حقدار والدین ہیں اور ان کے بعد رشتہ دار، اس سے معلوم ہوا کہ رشتہ داروں میں بھی ترتیب ہے، کیوں کہ آیت میں ترتیب بیان کی گئی ہے، اور اس ترتیب میں قربت اور حاجت کا اعتبار کیا جائے گا، لہذا قریبی رشتہ دار جو محتاج بھی ہو وہ ترتیب میں غیر محتاج قریبی کی طرح نہیں ہے، اسی طرح محتاجی بھی مختلف ہوتی ہیں، اور قرابت داری کے درجات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور قرآن کریم کے الفاظ میں یہ تمام لوگ شامل ہیں، اس کے بعد ترتیب میں یتیم آتے ہیں جو خود سے کما نہیں سکتے اور جو اپنی مصلحت اور مفاد کے لیے کچھ کر نہیں سکتے اور نہ ہی کام کی ضروری تدابیر کا پتہ ہوتا ہے، اس لیے ان کے لیے تاکیدی حکم ہے کیوں کہ ان کے حاجت مند ہونے کا زیادہ گمان ہے، اس کے بعد ترتیب میں مساکین آتے ہیں یعنی ایسے ضرورت مند جنہیں اپنی حاجتیں پوری کرنے کے لیے ضروری اشیاء میسر نہیں، اس کے بعد مسافر ہیں جن کے منزل تک رسائی کے سارے وسائل منقطع ہو گئے ہوں اور اس کو مددگار کی ضرورت ہو۔ یہ سارے امور بندوں کے ساتھ اللہ تعالی کی عنایت اور لطف کرم پر دلالت کرتے ہیں ، کیوں کہ اس نے لوگوں کو حکم دے رکھا ہے کہ وہ اللہ تعالی کی نعمتوں سے لوگوں کی ضرورتیں پوری کریں ، اس سے یہ بھی مستفاد ہے کہ دین اسلام ایک مکمل نظام پر قائم ہے کیوں کہ اس نے نفلی اخراجات وصدقات کے مقامات کی ایسی عمدہ ترتیب بیان کی جس کا صدور علم وحکمت اور لطف وکرم والی ذات کے علاوہ سے ممکن ہی نہیں ہے، اور ان نفقات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ قریب تو قریب بعید بھی چاہے جتنا بھی دور کا ہو اس میں شامل ہے جیسے: یتیم، مسکین اور مسافر۔

اس آیت کے فوائد میں سے کہ خرچ کرنے والے کو اس بات کا علم ہو کہ جس ذات نے اس کو مال ودولت کی فراوانی دی اسی ذات نے اس میں سے کچھ خرچ کرنے کا حکم بھی دیا ہے، اسی نے دوسروں کو اس کا محتاج اور اس کو دوسروں سے بے نیاز کیا ہے، وہ ذات اس بات پر بھی قادر ہے کہ اس خرچ کرنے

والے کو دوسرے کا محتاج اور دوسرے کو اس سے بے نیاز کردے، پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ خرچ کرنے والے کے اجر وثواب کو بیان کر رہا ہے: ﴿وَمَا تَفۡعَلُواْ مِنۡ خَيۡرٖ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٞ﴾" اور تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے "۔اس میں دو چیزوں کا اظہار ہے، اول: بندے کا فعل ﴿وَمَا تَفۡعَلُواْ مِنۡ خَيۡرٖ﴾" اور تم جو کچھ بھلائی کرو گے "۔دوسرے: اللہ کا فعل "﴿فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٞ﴾" اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے "۔ اس تنویہ ربانی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے تمام افعال واعمال کا علم واحاطہ کئے ہوئے ہے، اس کو بخوبی معلوم ہے بندے نے کیا کچھ خرچ کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اس کو اور اس کے خرچ کو جانتا ہے، اور وہ اسے محفوظ رکھے گا اور پھر اس کو اس کا پورا پورا اجر دے گا، اس بات کی جانکاری مومنوں کو خوب اچھی طرح ہے۔اس آیت کا ایک بلاغی پہلو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کے شروع میں کہا: :﴿مَآ أَنفَقۡتُم مِّنۡ خَيۡرٖ﴾" جو مال تم خرچ کرو"۔اور آخر میں کہا: ﴿وَمَا تَفۡعَلُواْ مِنۡ خَيۡرٖ﴾" اور تم جو کچھ بھلائی کرو گے "۔ پہلے میں بندے کے مال خرچ کرنے پر آمادگی کا اظہار ہے اور دوسرے میں اس بھلائی کے علم واحاطے کا بیان ہے، اس میں اجر وثواب کا کوئی ذکر نہیں جو کہ مومن کے یہاں ثابت شدہ ہے، بلکہ آیت میں صرف اس بات کے اظہار پر اکتفاء کیا گیا کہ مومن جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے وہ سب اللہ کے علم میں ہے :﴿وَمَا تَفۡعَلُواْ مِنۡ خَيۡرٖ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٞ﴾ "اور تم جو کچھ بھلائی کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے"۔ چنانچہ قرآن کریم کے ہر لفظ میں بیان کا اعجاز ہے۔

﴿كُتِبَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡقِتَالُ وَهُوَ كُرۡهٞ لَّكُمۡۖ وَعَسَىٰٓ أَن تَكۡرَهُواْ شَيۡـٔٗا وَهُوَ خَيۡرٞ لَّكُمۡۖ وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّواْ شَيۡـٔٗا وَهُوَ شَرّٞ لَّكُمۡۗ وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ وَأَنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ ٢١٦﴾

ترجمہ:

تم پر جہاد فرض کیا گیا گو وہ تمہیں دشوار معلوم ہو، ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بری جانو اور دراصل وہی تمہارے لئے بھلی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھی سمجھو، حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہو حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، تم محض بے خبر ہو(۲۱۶)۔

اس آیت میں اللہ تعالی جہاد فی سبیل اللہ کی فرضیت سے باخبر کر رہا ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِتَالُ﴾ "تم پر جہاد فرض کیا گیا"۔ آیت کی ابتداء فرضیت جہاد فی سبیل اللہ کے بیان سے ہوئی ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے جہاد کی اجازت نہیں تھی، لیکن جب آپ نے ہجرت کی تو صرف ان مشرکین سے جنگ کی اجازت دے دی گئی جو آپ سے قتال پر تلے ہوئے تھے، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَـٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا۟﴾ [سورة الحج:٣٩]۔ "جن (مسلمانوں) سے (کافر) جنگ کر رہے ہیں انھیں بھی مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں"۔ بعد میں عام مشرکین سے جنگ کی اجازت دی گئی ،اس بارے میں اختلاف ہے اس آیت سے کون لوگ مراد ہیں ، چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ اس سے خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مراد ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر جنگ لڑنا ان کے حق میں فرض عین تھا، اور جب اسلام کو استقرار اور استحکام حاصل ہو گیا تو یہ فرض کفایہ ہو گیا، یہ عطاء اور اوزاعی کا قول ہے۔ آیت میں فرضیت جہاد کا اس تدریجی منہج واسلوب میں حکمت الہی کارفرما ہے جس میں لوگوں کے احوال کی پوری رعایت کی گئی ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کی دعوتی، معاشرتی اور دفاعی اعتبار سے سنتیں ہیں جن کا التزام ضروری ہے تاکہ اللہ تعالی کے حکم سے ہر چیز کا بہترین نتیجہ برآمد ہو، اسی لیے اللہ تعالی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ جو صحابہ مسلمان ہوئے انہیں مکہ میں جنگ کی اجازت نہیں دی، کیوں کہ اس میں قلت وکثرت اور قوت وضعف کی رعایت کارفرما تھی، لہذا اللہ تعالی نے انہیں خطرہ مول لینے کا حکم نہیں دیا، حالانکہ اللہ تعالی ان کی قلت تعداد اور دشمن کی کثرت تعداد کے باوجود ان کی مدد کرنے پر قادر تھا، لیکن اللہ تعالی کے اوامر کا تقاضا ہے کہ وہ کثرت وقلت اور قوت وضعف کے اصول سنن کونیہ الہیہ کے موافق ہوں، اس سے معجزات کے وقوع کی ممانعت لازم نہیں آتی، جیسا کہ غزوہ بدر میں ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اس منہج ربانی سے مستفید ہو اور پوری باریکی سے جہاد کے تمام امور تقاضے اور متطلبات میں سنن الہی کی رعایت کرے تاکہ یہ امت حکمت والی امت ہو جس کو کتاب وحکمت سے نوازا گیا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نفس بشری اور طبیعت انسانی کی حقیقت بیان کر رہا ہے: ﴿وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ﴾ " گو وہ تمہیں دشوار معلوم ہو " ، قرآن کریم نے ایک عملی حقیقت عطا کی جس کو سمجھنا اور اپنانا لازم ہے ، اللہ تعالی نے پوری حقیقت کھول کر بیان کر دی ایک ایسے امر میں جس کو انسانی طبیعت پسند نہیں کرتی ، بلکہ وضاحت کے ساتھ اس کو ثابت کیا ہے ، اس سے یہ معلوم ہوا کہ افراد کی توجیہ وارشاد ، اصلاح اور ترقی کے معاملے میں تربیتی ، دعوتی ، اور نفسیاتی اعتبار سے تعمیر و ترقی اور اصلاح کے وقت نفسیاتی حقائق اور طبیعت انسانی سے تغافل نہیں برتنا چاہیے ، بلکہ ضروری ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو جس طبیعت اور جبلت پر پیدا کیا ہے اس کو تسلیم کرتے ہوئے مطلوب و مقصد کو بیان کیا جائے ، اگر چہ وہ مطلوب انسانی طبیعت اور جبلت کے مخالف ہو ، کیوں کہ یہ چیز اصلاح اور قبول کے لیے زیادہ مؤثر ثابت ہو گی ، اور طبیعت انسانی کو ایسی چیزوں سے دھوکہ نہ دیا جائے جس کو وہ ناپسند کرے یا واضح ہونے پر انکار کر دے ، یا اس پر صبر نہ کر پائے ، صرف اس سبب سے کہ اس کا درست اور صحیح طریقے سے معالجہ نہیں ہو سکتا جو نفسیاتی اور طبعی حقائق کے موافق و مناسب ہو۔

آیت میں کرہ اور ناپسندیدگی کا تعلق جہاد کی فرضیت سے نہیں ہے ، بلکہ یہ وہ کراہت ہے جو نفس انسانی میں جنم لیتی ہے ، کیوں کہ جہاد کے لیے نکلنے کا مطلب اہل وعیال ، گھر و بار اور مال و دولت سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے ، اور ساتھ ہی ساتھ جسم کو ہر طرح کی پیش آنے والی تکلیف یا موت کے لیے تیار رکھنا پڑتا ہے ، اس لیے اس انسانی طبیعت اور جبلت بلکہ فکر کا ربانی حل یہ نکالا گیا کہ مومن کے لیے قابل قبول حقائق پیش کیے گیے ایسی نعمت کی شکل میں جسے اللہ تعالی اپنے بندوں پر فرض کر رہا ہے : ﴿وَعَسَىٰٓ أَن تَكْرَهُوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّوا۟ شَيْـًٔا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ﴾ " ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو بری جانو اور دراصل وہی تمہارے لئے بھلی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو اچھی سمجھو ، حالانکہ وہ تمہارے لئے بری ہو " یہ ایک ایمانی تقابل اور موازنہ ہے اگر مومن اس کو اچھی طرح سمجھ لے اور جان جائے تو اللہ تعالی کے فرائض و تقدیر کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارے ، قضاء وقدر کی ہر صورت میں وہ اللہ کا شکر گذار رہے ، ہر معاملہ اور ہر حال میں اللہ کا تابع فرمان ہو ، حالات کے بدلاؤ سے راضی برضا ، صبر کرنے والا اور اسباب پر عمل کرنے والا ہو جو جالب خیر اور دافع شر ہوں ، اس اللہ پر توکل کر کے ارتقاء اور

بلندی کے منازل طے کرے، جو اللہ کہ توکل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی ایک دوسری آیت میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلْمُتَوَكِّلِينَ ﴿١٥٩﴾﴾ [سورة آل عمران:١٥٩]۔ "بیشک اللہ تعالی توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ بسا اوقات ناپسندیدہ چیز ہی خیر کا باعث ہوتی ہے،اور کسی چیز کی محبت بعینہ شر ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل کہ انسان مکروہ یا محبوب شے کے انجام اور نتیجہ کی معرفت سے عاجز ہے،اس لیے اس پر یہ واجب ہے کہ وہ حتمی طور پر اس ذات کی پناہ میں آجائے جو غیب کا مالک اور تمام امور کے نتائج کی تفصیلی خبر رکھتا ہے: ﴿وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ " حقیقی علم اللہ ہی کو ہے، تم محض بے خبر ہو"۔ وہی غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے، اس لیے تمام امور اللہ سبحانہ وتعالی کے حوالے کر دینا چاہیے اور اس کے قضاء وقدر اور حکم کو رضامندی سے قبول کر لینا چاہیے، خصوصا جب کہ یہ آیت کریمہ اللہ تعالی کے علم واحاطہ کو ثابت کر رہی اور بندے سے مکروہ ومحبوب اشیاء کے نتائج وانجام کے علم کی نفی کر رہی ہے، لوگوں میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں کہ اگر بیان کرنا چاہیں تو اس کی کثرت اور مختلف اقسام کے باعث ختم نہ ہوں۔

جہاد فی سبیل اللہ کے تعلق سے مزید قلبی اور عملی اصلاح ومعالجہ کا بیان دوسری آیات میں ہے، جیسا کہ اسی سورہ میں اللہ عز وجل کا فرمان ہے: ﴿وَلَا تَقُولُوا۟ لِمَن يُقْتَلُ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتٌۢ ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ﴿١٥٤﴾﴾ [سورة البقرة:١٥٤]۔ "اور اللہ تعالی کی راہ کے شہیدوں کو مردہ مت کہو، وہ زندہ ہیں، لیکن تم نہیں سمجھتے"۔اور سورہ آل عمران میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ ٱلَّذِينَ قُتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتًۢا ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾ فَرِحِينَ بِمَآ ءَاتَىٰهُمُ ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِٱلَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا۟ بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾[سورة آل عمران:١٦٩-١٧٠]۔ "جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کئے گئے ان کو ہر گز مردہ نہ سمجھیں، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزیاں دیئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فضل جو انہیں دے رکھا ہے ان سے وہ بہت خوش ہیں اور خوشیاں منا رہے ہیں ان لوگوں کی بابت جو اب تک ان کو نہیں ملے ان کے پیچھے ہیں ،اس پر انہیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگیں ہونگے"۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اس امر یعنی جہاد سے کراہت کا حل ایسی چیز

سے پیش کیا جو انسانی فطرت کے مناسب ہے ،اور وہ ہے مستقبل میں خیر کی محبت ،اس لیے اس نے مجاہد فی سبیل اللہ سے ایسے عظیم اجر کا وعدہ کیا کہ مجاہد راہ جہاد میں اپنی جان کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور خود کو جہاد کے لیے تیار کر لیتا ہے ،اس حقیقت اور ربانی حل اور معالجہ سے مجاہد جہاد کی رغبت اور محبت کے ذریعہ اپنی فطری اور طبعی کراہت پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے ، باوجود اس کے کہ وہ اس راہ میں پہنچنے والی مصیبتوں اور تکلیفوں کو ناپسند کرتا ہے ، گویا کہ جہاد میں مجاہد کے اندر مشقت اور اللہ تعالی کے اطاعت کی محبت دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں ، لیکن اطاعت کی محبت مشقت پر غالب آجاتی ہے اور مجاہد جہاد کے لیے دوڑ جاتا ہے جیسے محبت کرنے والا اپنے رب کی طرف دوڑتا ہے۔

ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ نے اس آیت ﴿وَعَسَىٰٓ أَن تَكۡرَهُواْ شَيۡـٔٗا وَهُوَ خَيۡرٞ لَّكُمۡۖ وَعَسَىٰٓ أَن تُحِبُّواْ شَيۡـٔٗا وَهُوَ شَرّٞ لَّكُمۡۚ﴾ کے فوائد میں بڑی عمدہ بات ذکر کی ہے ، فرماتے ہیں : اس آیت میں بندوں کے لیے کئی ایک حکمتیں ،اسرار ورموز اور مصلحتیں ہیں ، کیوں کہ جب بندہ کو یہ معلوم ہو کہ مکروہات بسا اوقات محبوب چیزوں کا باعث اور محبوب چیزیں کبھی کبھی مکروہ کا سبب ہوتی ہیں ، تو وہ اس بات سے مامون اور محفوظ نہیں رہ سکتا کہ فائدہ کے بعد اس کو نقصان کا سامنا کرنا پڑے ،اور وہ اس بات سے مایوس بھی نہیں ہو گا نقصان کے بعد خوشی آنی ہے کیوں کہ اس کو انجام کا پتہ نہیں ،اور اللہ تعالی کو ان نتائج کا علم ہے جن کو بندہ نہیں جانتا ،اس لیے بندے پر چند امور واجب ہوتے ہیں :

اول یہ کہ بندے کے لیے حکم کی بجاآوری سے زیادہ مفید کچھ نہیں ، اگرچہ وہ چیز شروع شروع میں اس پر شاق گزرے ، کیوں کہ تمام اوامر کا نجام اور نتیجہ خیر وبھلائی ، فرحت وسرور اور خوشگواری ہے ، اگر طبیعت پر ناگوار گزرے تو بھی وہ بہتر اور مفید ہی ہے ، اور اسی کے برعکس اس کے لیے نہی کے ارتکاب سے زیادہ کوئی چیز نہیں ہے اگرچہ اس کی طبیعت اس کو پسند کرے اور اس کی طرف مائل ہو ، کیوں کہ تمام منہیات کا انجام اور نتیجہ الم وتکلیف حزن وملال ، شر اور مصیبت ہے ، اور اس آیت کریمہ کے فوائد میں سے ہے کہ بندے سے اس آیت کا تقاضا ہے کہ خود کو اس ذات کے حوالے کر دے جو انجام کار سے واقف ہے ،اور وہ ذات اس کے لیے جو پسند کرے اور جو اس کے حق میں جو فیصلہ کرے اس سے راضی ہو جائے ، کیوں کہ اسی میں بہتر انجام کی امید ہے۔

دوم یہ کہ اپنے رب کو کوئی اقتراح اور مشورہ نہ دے، اور نہ اس پر اپنی پسند تھوپے، اور جس چیز کا اس کو علم نہیں اس کا سوال نہ کرے کیوں کہ ممکن ہے اس کا نقصان اور اس کی ہلاکت اسی میں ہو اور اس کو اس کا علم نہ ہو، لہذا اپنے رب کے خلاف کوئی چیز پسند نہ کرے، بلکہ وہ اللہ سے اپنے لیے اچھی پسند کی دعا کرے، اور جو اللہ تعالی اس کے لیے اختیار کرلے اس پر راضی ہو جائے، اس کے حق میں اس سے زیادہ نفع بخش کچھ نہیں۔

سوم یہ کہ جب بندہ اپنے معاملے کو اللہ کے حوالے کردے اور اپنے لیے اس کی پسند پر راضی ہو جائے تو اللہ تعالی نے جو اس کے لیے اختیار کیا ہے اس میں پوری قوت و عزیمت اور صبر کے ساتھ اس تفویض اور رضامندی میں مزید اضافہ کرے، اور اس سے ان تمام آفتوں کو دور کرے جن سے بندہ اپنی پسند کی زد میں آسکتا ہو ، اور اللہ تعالی نے جو اس کے لیے اختیار کیا ہے خود کو اس کے بہتر انجام کا اعتراف کرائے جس بہتر انجام کا کچھ حصہ بھی اپنی خود کی پسند کی بدولت نہیں پا سکتا تھا(۱) ۔

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلشَّهْرِ ٱلْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَكُفْرٌۢ بِهِۦ وَٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِۦ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ ٱللَّهِ ۚ وَٱلْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ ٱلْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَـٰتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ ٱسْتَطَـٰعُوا۟ ۚ وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِۦ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَـٰلُهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْـَٔاخِرَةِ ۖ وَأُو۟لَـٰٓئِكَ أَصْحَـٰبُ ٱلنَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَـٰلِدُونَ ﴿٢١٧﴾ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَٱلَّذِينَ هَاجَرُوا۟ وَجَـٰهَدُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أُو۟لَـٰٓئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ ٱللَّهِ ۚ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾ ﴾

ترجمہ:

"لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی بابت سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان میں لڑائی کرنا سخت گناہ ہے لیکن اللہ کی راہ سے روکنا اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے ، یہ لوگ تم سے لڑائی بھڑائی کرتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تمہیں

---

(۱) الفوائد ١٤٦-١٤٧.

تمہارے دین سے مرتد کردیں ، اور تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے پلٹ جائیں اور اسی کفر کی حالت میں مریں، ان کے اعمال دنیاوی اور اخروی سب غارت ہوجائیں گے۔ یہ لوگ جہنمی ہونگے اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے(۲۱۷) ۔البتہ ایمان لانے والے، ہجرت کرنے والے، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہی رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں، اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بہت مہربانی کرنے والا ہے(۲۱۸)"۔

آیت کریمہ سے پتہ چلتاہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حرام مہینے ذوالقعدہ، ذوالحجہ محرم اور رجب میں جنگ کرنے سے متعلق ایک یا کئی سوال کئے گیے تھے ،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلشَّهْرِ ٱلْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ﴾"لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کی بابت سوال کرتے ہیں "۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی قیادت میں صحابہ کرام کی جماعت کے ساتھ وادی نخلہ کی جانب دشمن کے احوال کی خبر گیری کے لیے ایک سریہ بھیجا، اللہ کی مشیئت سے قریش کے ایک قافلہ سے ان کی ملاقات ہوگئی ،اوران میں جنگ چھڑ گئی اور مسلمانوں نے قریش کے عمرو بن الحضرمی نامی آدمی کو قتل، دو کو قید اور سارے قافلہ پر قبضہ کرکے مدینہ واپس لوٹے، یہ واقعہ جمادی الثانیۃ کے آخری دن پیش آیا اور وہ رجب کی پہلی رات تھی، چنانچہ مشرکین مسلمانوں سے کہنے لگے: تم نے شہر حرام میں قتل کیاہے، اور قریش نے شور مچایا کہ محمد اور اس کے ساتھیوں نے تو شہر حرام کو حلال کردیا اور اس میں خون ریزی کی اور خود ان کے مسلمان بھائیوں نے بھی ان کو ملامت کی ، چنانچہ مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اس سریہ میں انہوں نے عمرو بن الحضرمی کو قتل کرکے صحیح کیا یا غلط؟اور وہ یہ نہ جان سکے کہ وہ رجب کا مہینہ تھا یا جمادی الآخرۃ کا، اس پر مشرکوں نے عار دلایا کہ تم نے تو شہر حرام میں قتل کیاہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1] ۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہر اس چیز کا اہتمام کرتے تھے جس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتا کہ ہر اس چیز سے دور رہ سکیں جو اللہ تعالیٰ کے غضب کا سبب بنیں۔ چنانچہ جب مسلمان اس سریہ سے واپس ہوئے تو ان کو کافی غم لاحق ہوا اور انہیں یہ گمان ہوا کہ اب تو وہ ہلاک و برباد ہوگئے، ساتھ ہی ان کے مسلمان بھائیوں کی

---

(۱) زاد المسير ۱/۲۱٤.

جانب سے اطاعت کی شدت حرص کے باعث ان کو ملامت بھی سننی پڑی ، اسی طرح قریش نے بھی عار دلائی کہ محمد اور اس کے ساتھیوں نے تو شہر حرام کو حلال کر دیا اور اس میں خون ریزی کی[1] ۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ، فرماتے ہیں: میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا، انہوں نے آپ سے تیرہ سوالوں کے علاوہ کوئی سوال نہیں کیا، اور ان سارے سوالوں کا ذکر قرآن میں ہے، وہ آپ سے اسی چیز کے متعلق سوال کرتے تھے جو ان کے لیے نفع بخش ہوتی[2] ۔ یہ صحابہ کرام کی خیر وصلاح اور رضائے الٰہی کی حرص کی دلیل ہے، رضی اللہ تعالی عنہم۔

قرآن کریم کی وہ آیات جو سوال یعنی (يَسْـَٔلُونَكَ) سے شروع ہوئی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْأَهِلَّةِ ۖ﴾ [سورة البقرة:١٨٩]. "لوگ آپ سے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں"۔ ﴿ يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ﴾ [سورة البقرة:٢١٥]. "آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟" ﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلشَّهْرِ ٱلْحَرَامِ ﴾ [سورة البقرة:٢١٧]. "لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں کی بابت سوال کرتے ہیں"۔ ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ ۖ﴾ [سورة البقرة:٢١٩]. "لوگ آپ سے شراب اور جوئے کا مسئلہ پوچھتے ہیں"۔ ﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْيَتَـٰمَىٰ ۖ﴾ [سورة البقرة:٢٢٠]. "اور تجھ سے یتیموں کے بارے میں بھی سوال کرتے ہیں"۔ ﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْمَحِيضِ ﴾ [سورة البقرة:٢٢٢]. "آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں"۔ ﴿يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَآ أُحِلَّ لَهُمْ ﴾ [سورة المائدة:٤]. "آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا کچھ حلال ہے؟"

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلسَّاعَةِ ﴾ [سورة الأعراف:١٨٧، سورة النازعات:٤٢]. " لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں"۔ ﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْأَنفَالِ ۖ﴾ [سورة الأنفال:١]. "لوگ آپ سے غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے ہیں"۔ ﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلرُّوحِ ﴾ [سورة الإسراء:٨٥]. "اور یہ

---

(١) تفسير ابن كثير ١/٢٦١.

(٢) تفسير قرطبي ٣/٢٨.

لوگ آپ سے روح کی بابت سوال کرتے ہیں"۔﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَن ذِى ٱلْقَرْنَيْنِ﴾ [سورة الكهف:٨٣]- آپ سے ذوالقرنین کا واقعہ یہ لوگ دریافت کرتے ہیں"۔﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْجِبَالِ﴾ [سورة طه:١٠٥]۔ "وہ آپ سے پہاڑوں کی نسبت سوال کرتے ہیں"۔﴿يَسْـَٔلُكَ ٱلنَّاسُ عَنِ ٱلسَّاعَةِ﴾ [سورة الأحزاب:٦٣]۔ "لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں"۔ خواہ ان آیات کا نزول صحابہ کرام کے سولات کے سبب ہو یا مشرکین کے انکار کے سبب، یہ قرآن کریم کے قسط وار نازل ہونے کا فائدہ ہے، جس میں پیش آمدہ واقعات کا حل اور ان کی حقیقت بیان کردی گئی، سوال کرنے والوں کو اپنے سوالوں کے جوابات مل گیے اور دینی و دنیاوی معاملات میں مسلمانوں کے فرض منصبی کی توجیہ بھی ہوگئی، ان میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے لیے تسلی ہے اور بالتدریج ان کی تربیت بھی، ان آیات کے اور بھی بہت سارے فوائد ہیں جو مستقل تفصیلی دراسہ کے محتاج ہیں۔

شہر حرام میں جنگ سے متعلق سوال کے جواب میں اللہ تعالی فرمارہاہے: ﴿قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَكُفْرٌۢ بِهِۦ وَٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِۦ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ ٱللَّهِ ۚ وَٱلْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ ٱلْقَتْلِ﴾" آپ کہہ دیجئے کہ ان میں لڑائی کرنا سخت گناہ ہے لیکن اللہ کی راہ سے روکنا اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے "۔ اس آیت میں ایک ایسی سچائی کا بیان ہے جس سے مشرکین یا تو جان بوجھ کر غفلت برت رہے ہیں یا حقیقی طور سے غافل ہیں لیکن اللہ تعالی اس حقیقت سے باخبر ہے، چنانچہ حرام مہینوں میں قتال بڑا گناہ تو ہے ہی: ﴿قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ﴾" آپ کہہ دیجئے کہ ان میں لڑائی کرنا سخت گناہ ہے"۔ لیکن اللہ کے دین سے روکنا، اللہ تبارک وتعالی کا انکار کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو مسجد حرام سے نکالنا ان حرام مہینوں میں قتال کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے ،اس میں ان کی اور ان کے قول کی مذمت ہے کہ کیسے تم لوگ شہر حرام میں قتال کی نکیر کررہے ہو حالانکہ تم نے اس سے بڑے گناہ اور جرم کا ارتکاب کیا ہے، تم نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا، اللہ اور اللہ کی جانب سے نازل شدہ حق کا انکار کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کو ان کے شہر مسجد حرام سے نکالا، یہ اسلوب قرآنی ذہن وفکر کو جوش دلاتا اور معاملے کی سچائی جاننے اور جس چیز کو لے کر وہ

مسلمانوں پر نکیر کرتے ہیں اور خود کفر، مسلمانوں کو ان کے دین سے روکنے اور ان کے شہر سے نکالنے کی جو قباحتیں کرتے ہیں دونوں کے درمیان مقارنہ اور موازنہ پر ابھارتا ہے، نیز یہ اسلوب قرآنی دونوں امر کے درمیان موازنہ کرکے ان کے جرم کی ضخامت سے آگاہ کر رہا ہے۔ یہ ایک تربیتی اور دعوتی اسلوب ہے جس کی ضرورت ایک داعی، مربی اور حقوق کا دفاع کرنے والے کو پڑتی ہے بایں طور کہ ایک غلط فکر کو دوسری فکر اور سر توڑ دلیل سے ذریعہ ایسی مات دی جائے کہ کسی صاحب عقل میں اس کے انکار کی طاقت نہ ہو۔

آیت میں واقع حال کے بارے میں غور وفکر پر ابھارنے کا تعلیمی اسلوب بھی ہے جن میں عموما انسان ایک ہی حقیقت سے واقف ہوتا ہے، وہی ایک حقیقت اس کی دلیل کو مضبوط کرتی ہے اور اسی کو اپنی دلیل بناتا ہے اور جان بوجھ کر یا انجانے میں حقیقت کی دوسری صورت سے غافل رہتا ہے جس میں اس کے خلاف دلیل ہوتی ہے، چنانچہ اللہ تعالی اپنے نبی کو اسی حقیقت کے بیان کرنے کا حکم دے رہا ہے: ﴿قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ﴾ " آپ کہہ دیجئے کہ ان میں لڑائی کرنا سخت گناہ ہے لیکن اللہ کی راہ سے روکنا اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے "۔

اس اسلوب قرآنی میں حقائق کا اقرار واثبات ہے اور یہ کہ ان سے غفلت نہ برتی جائے اور کسی بھی صورت میں ان حقائق کی صحیح اصلیت سے سر مو انحراف نہ کیا جائے، جیسا کہ اللہ تعالی نے اشہر حرام کی حرمت کو ثابت کیا ہے، اور پیش آمدہ واقعہ کے دفاع میں ان مہینوں کی حرمت کی نفی نہیں کی بلکہ ثابت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ﴾ " آپ کہہ دیجئے کہ ان میں لڑائی کرنا سخت گناہ ہے"۔ اور اس سے بڑے گناہ اور جرم کو بھی بیان کر دیا یعنی مسلمانوں کو مسجد حرام سے نکالنا۔ اس سے یہ بھی مستفاد ہے کہ حق کو ثابت کرنے کے لیے مخالف کے مغالطات کو سمجھنا بہت اہم ہے، اسی طرح مخالف جس چیز سے غافل ہو اسی کے ذریعہ ان پر حجت قائم کرنے کا اسلوب بھی اس آیت میں ہے ۔ اس میں یہ بھی ہے کہ انسان کبھی کبھی حق کو صرف اسی ناحیہ سے دیکھتا ہے جس میں اس کا فائدہ ہو اور اس ناحیے سے غفلت

برتتا یا غافل رہتا ہے جس میں اس کا فائدہ نہ ہو، اور حجت کے قیام کے وقت اسی کو بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔

پھر ان کی فتنہ انگیزی کے بارے میں ان پر مزید حجت قائم ہو رہی ہے: ﴿وَٱلۡفِتۡنَةُ أَكۡبَرُ مِنَ ٱلۡقَتۡلِ﴾ " فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے" خواہ یہ کفر کا فتنہ ہو یا مسلمانوں کو ان کے دین کے متعلق فتنہ میں ڈالنا ہو، یہ سب شہر حرام میں قتال سے زیادہ شدید جرم ہے ، یہ اس مفہوم کی تصحیح یا صحیح مفہوم کو تقویت دینا ہے جس میں دو فتنوں کے مابین تفریق اور الگ الگ کر کے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی گئی ہے، یعنی مومن کا کسی فتنہ پرور کو قتل کرنا اور کسی مومن کو اس کے دین کے معاملے میں فتنہ میں ڈالنا ، چنانچہ مشرک کا کسی مومن کو اس کے دین کے سلسلے میں فتنہ میں ڈالنا کسی فتنہ پرور مشرک کو کسی مومن کے ہاتھوں قتل کرنے سے زیادہ بڑا جرم ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ گناہوں میں جرم اور شدت کے اعتبار سے تفاوت اور فرق ہے اور بعض گناہ بعض دوسرے گناہ سے بڑے ہوتے ہیں ، اس سے یہ بھی مستفاد ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ انسان ایک جرم پر تو دھیان دے اور دوسرے اس سے بڑے جرم سے غفلت برتے ، اور صغیرہ گناہوں سے تو بچتا رہے اور کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کو بھول جائے ، اسی طرح اس سے یہ بھی فائدہ اخذ ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو اپنی روزانہ کے رہن سہن اور سلوک و کردار کا جائزہ لینا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے تو بچ رہا ہو اور کبیرہ گناہوں پر اس کی نظر ہی نہ ہو، بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ خود کا محاسبہ کرتا رہے، کیوں کہ انسان کو سیدھی راہ پر چلنے کے لیے جانچ پرکھ اور تمحیص بہت اہم ہے۔

مشرکین کی جانب سے مسلمانوں کو ان کے دین سے روکنے اور دوبارہ شرک کی طرف لوٹانے کی کوشش کے فتنہ سے یہ مستفاد ہے کہ کفار و مشرکین ہر آن اور ہر لمحہ مسلمانوں کو ان کے دین سے روکنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اسی لیے فرمایا: ﴿وَلَا يَزَالُونَ يُقَٰتِلُونَكُمۡ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمۡ عَن دِينِكُمۡ إِنِ ٱسۡتَطَٰعُواْۚ﴾ " یہ لوگ تم سے لڑائی بھڑائی کرتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان سے ہو سکے تو تمہیں تمہارے دین سے مرتد کر دیں "۔ یعنی یہ لوگ برابر کوشش میں لگے رہتے ہیں اور جتنا ان سے ہو سکتا ہے فتنے کے تمام وسائل کا استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے دین کے متعلق فتنہ میں

ڈالنے سے ذرا بھی توقف نہیں کرتے۔اس لیے مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ صوتی، مرئی، فکری، شہوات وشبہات جیسے فتنے کے تمام وسائل واسالیب سے متنبہ اور بچ کر رہیں۔اس کے بعد آیت کریمہ میں اللہ تعالی کی طرف سے مومنوں کے لیے تحذیر ہے: ﴿وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِۦ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَٰلُهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْءَاخِرَةِ﴾" اور تم میں سے جو لوگ اپنے دین سے پلٹ جائیں اوراسی کفر کی حالت میں مریں، ان کے اعمال دنیاوی اور اخروی سب غارت ہوجائیں گے "۔ معلوم ہوا کہ کفر تمام اعمال صالحہ کو برباد کر دیتا ہے۔ پس ہم اللہ تعالی سے سلامتی اور ثبات قدمی کی دعا کرتے ہیں۔اسی لیے پھر اس کا بدلہ بھی وہی ہوگا کہ: ﴿وَأُولَٰٓئِكَ أَصْحَٰبُ ٱلنَّارِ هُمْ فِيهَا خَٰلِدُونَ﴾" یہ لوگ جہنمی ہونگے اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے "۔ لہذا جو دین اسلام سے مرتد ہو گیا اور کافر ہو کر مرا اس کا نتیجہ اور آخری انجام خلود فی النار ہے۔یہ آیت ہر آن اور ہر وقت میں مومنوں کے لیے بطور تحذیر ہے کہ کہیں وہ اللہ تعالی کے دین سے مرتد نہ ہو جائیں۔

ابن السعدی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے، بلکہ یہ حمل المطلق علی المقید کے قبیل سے ہے یعنی مطلق کو مقید پر محمول کیا گیا ہے، اور یہ آیت قتال کے مطلق اور عام حکم کو مقید کرتی ہے ، کیوں کہ حرام مہینوں کی خوبیوں میں سے ایک خوبی بلکہ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں قتال کرنے کو حرام کیا گیا ہے، اور ان مہینوں میں قتال کی حرمت کا یہ حکم تب ہے جب خود سے جنگ کی ابتداء کی جائے، رہی بات دفاعی جنگ کی تو جس طرح مسجد حرام میں جائز ہے اسی طرح حرام مہینوں میں بھی جائز ہے(١)۔

اس آیت اور اس کے علاوہ دوسری آیات سے یہ نتیجہ نکلا کہ اپنے ذہن کو غور وفکر کے مختلف ناحیوں میں استعمال کرنا چاہئے، اس کی سب سے واضح مثال علماء، فقہاء اور مفسرین ہیں جنہوں نے مختلف آیات کو جمع کر کے ان سے فقہی مسائل کی معرفت کے لیے اپنی عقل وفکر کا استعمال کیا، مثال کے طور پر اسی آیت کو لے لیں: حرام مہینوں میں جنگ کی حرمت اور عدم حرمت کا مسئلہ ، مطلق کو مقید پر یا عام کو

(١) تفسیر ابن السعدی ١/١٧٢.

خاص پر محمول کرنے کی کیفیت میں غور فکر، جس کے نتیجے میں فقہ وتفسیر کے باب میں مختلف علمی مکاتب فکر وجود میں آئے۔

جب اللہ تعالی کی جانب سے قرآن کریم میں یہ وضاحت نازل ہوگئی کہ سریہ والوں سے قتل کا جو واقعہ پیش آیا اس پر کوئی گناہ نہیں ہے تو عبداللہ بن جحش اوران کے ساتھیوں میں اجر وثواب کی خواہش پیدا ہوئی، چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا ہم ایسے غزوہ کی خواہش رکھ سکتے ہیں جن میں ہم کو ایک مجاہد کا اجر وثواب ملے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی(۱) : ﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَٱلَّذِينَ هَاجَرُواْ وَجَٰهَدُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ أُوْلَٰٓئِكَ يَرۡجُونَ رَحۡمَتَ ٱللَّهِۚ وَٱللَّهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ﴾ " البتہ ایمان لانے والے، ہجرت کرنے والے، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ہی رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں، اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بہت مہربانی کرنے والا ہے "۔ یہ اللہ تعالی کا لطف کرم ہے کہ اس نے اس سریہ والوں کے اطمینان کے لیے یہ آیت نازل فرمائی، اوران کو گناہ سے بری کردیا، مزید یہ کہ ان کے لیے اللہ تعالی کی طرف سے رحمت ومغفرت بھی ہے۔

اس آیت کریمہ میں ایمان کا مقام، ہجرت اور مہاجرین کی عظمت ، جہاد فی سبیل اللہ اور عبد اللہ بن جحش اوران کے ساتھیوں کی فضیلت کا بیان ہے، نیز آیت کے فوائد میں سے ہے اخلاص کا مقام ومرتبہ، کیوں کہ اللہ تعالی نے جہاد کو سبیل اللہ کے ساتھ مربوط کررکھا ہے: ﴿وَجَٰهَدُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ ﴾ " جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا "۔ آگے اللہ تعالی اخلاص کی مزید وضاحت کررہا ہے: ﴿أُوْلَٰٓئِكَ يَرۡجُونَ رَحۡمَتَ ٱللَّهِ ﴾ "یہی لوگ رحمت الٰہی کے امیدوار ہیں "۔یعنی ان کے جہاد کا مقصد رحمت الٰہی کے سوامال غنیمت، ریاونمود یا کسی دوسری چیز کا حصول نہیں تھا۔ اس کے بعد آیت کریمہ کے اختتام میں ان کے مقصد کی کامیابی کا بیان یوں کردیا گیاہے کہ اللہ تعالی گناہوں کو بخش دینے والا اوران پر اور تمام بندوں پر بڑامہربان ہے: ﴿وَٱللَّهُ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ﴾ "اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا اور بہت مہربانی کرنے والا ہے "۔

---

(۱) تفسير ابن كثير ١/٢٦٢.

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ ٱلْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلْـَٔايَٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١٩﴾ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْـَٔاخِرَةِ ۗ ﴾

ترجمہ:

"لوگ آپ سے شراب اور جوئے کا مسئلہ پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے ، اور لوگوں کو اس سے دنیاوی فائدہ بھی ہوتا ہے، لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت زیادہ ہے، آپ سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں، تو آپ کہہ دیجئے حاجت سے زیادہ چیز ، اللہ تعالیٰ اس طرح سے اپنے احکام صاف صاف تمہارے لئے بیان فرما رہا ہے تاکہ تم سوچ سمجھ سکو(٢١٩)۔امور دینی اور دنیاوی کو"۔

آیت کریمہ میں صحابہ کرام کے اپنے دین کے بارے میں اہتمام کا بیان ہے ، جیسا کہ ان کے شراب اور جوا سے متعلق سوال سے ظاہر ہے۔

(خمر) سے مراد نشہ آور اشیاء، اور میسر سے مراد جوا ہے۔ آیت کے سبب نزول سے متعلق کتب تفسیر میں مذکور ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے دعا کی کہ : اے اللہ! ہمارے لیے شراب کا حکم واضح طور پر بیان کردے، چنانچہ یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْخَمْرِ وَٱلْمَيْسِرِ ۖ ﴾ ، عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا اور ان پر یہ آیت تلاوت کی گئی تو انہوں نے پھر وہی دعا کی : اے اللہ! ہمارے لیے شراب کا حکم واضح طور بیان کردے ۔ اس پر سورہ کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقْرَبُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَنتُمْ سُكَٰرَىٰ ﴾ [سورة النساء:٤٣]۔ "اے مومنو! جب تم نشے میں مست ہو نماز کے قریب مت جاؤ" پھر عمر رضی اللہ عنہ نے تیسری بار وہی دعا کی: اے اللہ! ہمارے لیے شراب کا حکم واضح طور بیان کردے۔ اس پر سورہ مائدہ کی یہ آیت نازل ہوئی(١) : ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِنَّمَا ٱلْخَمْرُ وَٱلْمَيْسِرُ وَٱلْأَنصَابُ وَٱلْأَزْلَٰمُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ ٱلشَّيْطَٰنِ فَٱجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾ [سورة المائدة: ٩٠]۔ "اے ایمان

---

(١) مرجع سابق.

والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور تھان اور فال نکالنے کے پانسے سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم فلاح یاب ہو"

اس سے ان دو چیزوں خمر اور میسر کے متعلق صحابہ کی فہم وفراست کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو پہلے ہی سے اس بات کا شعور تھا کہ یہ دونوں اچھی چیز نہیں ہیں، کیوں کہ شراب سے عقل جاتی رہتی ہے اور جوا میں ظلما دوسروں کے مال کو کھانا ہوتا ہے، اور حرمت شراب کے نزول میں تدریج کا لحاظ مومنوں کے ساتھ رحمت الہی کی دلیل ہے، کیوں کہ لوگ زمانہ جاہلیت میں شراب اور جوا کے عادی بن چکے تھے اور عادت ان میں اس حد تک سرایت کر چکی تھی کہ بعض لوگوں کے لیے اس کا چھوڑنا آسان نہیں تھا، چنانچہ حرمت کا یہ حکم قسط وار نازل ہوا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے وہاں طبیعت انسانی اور حالات کی کافی رعایت ہے، اور اللہ تعالی انسانوں کے ساتھ ان کی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے معاملہ کرتا ہے، لہذا ہر حال میں اللہ تعالی کی ذات بابرکت ہے، اس سے یہ فائدہ اخذ ہوا کہ توجیہ وارشاد اور دعوت وتعلیم کے میدان میں انسانی طبیعت اور خصائص کی رعایت کافی اہم ہے، تاکہ ان کے تقاضوں کے مطابق لوگوں کے ساتھ تعامل کیا جائے اور انسانی طبیعتوں سے غفلت نہ برتی جاتے تاکہ وہ توجیہ ارشاد بار آور ہو، چنانچہ بھول جانا، غافل ہو جانا، طبیعت کی کمزوری وغیرہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے، اسی لیے اس کو برابر نصیحت کی ضرورت ہوتی ہے، خاص طور سے طبیعت انسانی جب کچھ انحراف کا شکار ہو جائے تو اس کو بدلنے اور مجاہدے کی ضرورت ہوتی ہے جس سے شہوات کو مغلوب کیا جائے اسی طرح فضلیتوں کے حصول میں بھی مجاہدے اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے، اور ان تمام امور میں تدریج کا سلوب کارفرما ہونا چاہیے، احادیث نبویہ میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: (العلم بالتَّعَلُّم والحِلْمُ بالتَّحَلُّمِ)(١) "علم سیکھنے اور محنت کرنے سے آتا ہے اور حلم کی صفت بھی اس کوشش اور مجاہدے سے حاصل ہوتی ہے" اسی طرح دوسری حدیث میں ہے: (لا يزال الرّجلُ يصدُقُ ويتحرّى

(١) مجمع الزوائد ١/١٣٣.

الصدقَ حَتَّى يُكتَبَ صِدِّيقًا)(۱) "آدمی برابر سچ بولتااور سچ بولنے کی کوشش میں رہتاہے یہاں تک کہ اللہ تعالی کے پاس سچالکھ دیا جاتاہے"۔

آیت کریمہ بتدریج تعلیمی طریقہ کار پر مشتمل ہے، بایں طور کہ سب سے پہلے شراب اور جوئے کی حقیقت اور ان سے متعلق گناہ کا بیان ہوا ساتھ ہی ان سے حاصل ہونے والے منافع کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا، اس کے بعد ان کے نفع اور گناہ کے مابین موازنہ کیا گیا﴿قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ﴾" آپ کہہ دیجئے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے "۔اللہ تعالی نے اس میں ثابت کیا ہے کہ شراب اور جوا میں گناہ ہے اور گناہ بھی معمولی نہیں ہے بلکہ بہت بڑا گناہ ہے، کیوں کی شراب میں مدہوش شخص سے قولی و فعلی فحاشیوں کا صدور عام بات ہے اور اس کی وجہ سے بڑی بڑی گناہوں کا مرتکب ہو جاتا ہے، اسی طرح واجبات و فرائض جیسے نماز وغیرہ کی ادائیگی کا اسے ہوش نہیں ہوتا، اور جوا حرام کمائی ہے، ساتھ ہی آپسی بغض وحسد اور کینہ کپٹ کا سبب اور غلط جگہ میں مال کی بربادی ہے، یہ سارے نقصانات اور گناہ ان دونوں چیزوں سے بچنے کی دعوت دیتے ہیں۔اس کے بعد اللہ تعالی لوگوں کے ان میں فوائد کو ثابت کر رہا ہے: ﴿وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾"لوگوں کو اس سے دنیاوی فائدہ بھی ہوتا ہے "۔ خواہ یہ فائدہ شراب نوش کی ذاتی لذت کی شکل میں ہو یا اس کی خرید و فرخت سے حاصل ہونے والی کمائی کی شکل میں، اور اسی طرح جوا میں بھی بڑی آسانی سے بغیر کسی محنت کے مال و دولت حاصل ہو جاتی ہے، لیکن ان منافع اور ان کے گناہ آپس میں موازنہ کرنے پر مکمل جانکاری حاصل ہوتی ہے، اور مکمل قناعت اور اطمینان ہو جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی ان کے گناہ اور منافع کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے فرما رہا ہے: ﴿وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا﴾"لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت زیادہ ہے "۔ یہ اللہ تعالی کی طرف سے شراب اور جوئے کے حکم کا بیان ہے ، اور اسلوب بیان ایسا ہے کہ عقل روشن اور دل مطمئن ہو جائے، حالانکہ اگر اللہ تعالی چاہتا تو یہ ساری تفصیل بیان کئے بغیر ڈائرکٹ حرمت کا حکم نازل فرما دیتا، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس طرح سے سیکھایا اور سمجھایا جائے کہ ان کے ذہن و دماغ تابناک ہوں تاکہ بعد میں دینی یا دنیاوی مسائل کے حل میں اسی علمی طریقہ کار اور منہج کو بروئے کار لائیں جس سے ان کی

(۱) مسند احمد ٦/٢٧٣ حديث نمبر (٣٨٢٧)

فکر و نظر میں بہتری پیدا ہو، نیز اس علم کو آپس میں یا دوسرں تک پوری معرفت اور سمجھ کے ساتھ پہنچا سکیں۔

اس حکم کے ثابت کرنے میں منہج الٰہی سے یہ بھی مستفاد ہے کہ امر واقع اور صورت حال کو ثابت کیا جائے اور بعض حقائق سے تجاہل برتتے ہوئے مخاطب کو مغالطے میں ڈال کر مقصد کو نہیں منوانا چاہیے ، کیوں کہ شراب اور جوا چھڑوانے کے لیے قرآن کریم نے لوگوں کو ان سے حاصل ہونے والے نفع کی حقیقت سے تجاہل نہیں کیا ہے ، بلکہ حقیقت اور معروف و مشہور امر واقع کو بیان کیا، یعنی کہ ان میں لوگوں کے لیے فائدے ہیں، اور یہ بھی نہیں کہا کہ ایک فائدہ ہے بلکہ جمع کا صیغہ (منافع) استعمال کیا: ﴿ وَمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ ﴾ ،امر واقع کے بیان کے بعد ان کے گناہ اور نفع کے درمیان موازنہ کو واضح کیا جس سے یہ لازم آتا ہے کہ ان کے نفع سے اجتناب کرکے گناہ سے بچا اور دور رہا جائے۔ اور دفع اثم کو جلب نفع پر مقدم رکھا جائے، یہ ایسا اسلوب سے جس پر طبیعت آمادہ ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں حقیقت بیانی ہے اور یہ کہ نصیحت کرنے والا اور حکم دینے والا ان کے نفع سے باخبر ہے، نیز اس کی حقیقت سے وہ غافل نہیں ہے، اسی طرح اللہ تعالی نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ لوگوں کے پاس حقائق کی معرفت ناقص ہے، اور اس کی وجہ سے گناہ کا صدور ہوتا ہے، کیوں کہ خطرات اور نقصانات اچھائیوں سے زیادہ ہیں: ﴿ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ﴾"، لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے بہت زیادہ ہے "۔ یہ ایسا تربیتی اور دعوتی اسلوب ہے کہ اللہ تعالی کے حکم سے اس کا ہدف برآمد ہوتا ہے، اللہ تعالی محبوب یا غیر محبوب چیزوں کے حقائق سے تغافل نہیں کرتا، بلکہ حقائق کی تصحیح اور توضیح کرتے ہوئے بہتر اور افضل اور راہ نجات کی نشاندہی کرتا ہے، کیوں کہ اسی میں عقل وادراک کا احترام ہے جس سے مخاطب اور توجیہ وارشاد کے مضمون میں اعتماد پیدا ہوتا ہے اور پورے غور وفکر کے ساتھ بات کو سننے، ترغیب وترہیب، فاضل ومفضول، صحیح وغلط، اور حرام و حلال کے درمیان موازنہ اور مقارنہ کے لیے غور وفکر کا سبب ہے، اللہ تعالی کے لیے ہی تمام تعریف ہے کہ اس کی طرف سے ہم کو یہ وضاحت وبیان اور تعلیم ملی۔

آیت سے موازنہ، مقارنہ اور ترجیح کے اسلوب کی اہمیت مستفاد ہوتی ہے جس کے ذریعہ مخاطب کی ناواقف حقیقت تک رسائی ہوتی ہے، آیت کے فوائد میں سے ہے حقائق سے عدم تغافل اور عدم تجاوز

،اسی طرح عقل کی اہمیت، لوگوں کی عقل وسمجھ کے حساب سے بات چیت کی اہمیت، کیوں کہ یہ کسی چیز قبولیت کے لیے زیادہ محرک ہے۔

اس آیت میں مومنوں کی طرف سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مزید ایک سوال کا بیان ہے: ﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ﴾" آپ سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں"۔ یہ سوال خرچ کی مقدار کو لے کر تھا، چنانچہ اللہ رحمن ورحیم نے اس میں بھی ان کے لیے سہولت اور آسانی دی: ﴿قُلِ ٱلْعَفْوَ﴾" تو آپ کہہ دیجئے حاجت سے زیادہ چیز "۔یعنی نفقہ میں جو مطلوب ہے وہ اپنی ضرورت سے زائد چیز ہے، جس کے خرچ کرنے میں سہولت اور آسانی ہو اور خرچ کرنے والے پر گراں نہ گزرے، لہذا جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو وہ خرچ کرو اور اس میں خود کو اتنی تکلیف نہ دو کہ خود تنگ دست ہو جاؤ(۱)۔﴿كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلْأَيَٰتِ﴾ " اللہ تعالیٰ اس طرح سے اپنے احکام صاف صاف تمہارے لئے بیان فرما رہا ہے "۔یعنی اللہ تعالی نے اسی طرح حق کے دلائل اور اپنی پسندیدہ امور کی معرفت کے منافع بیان کیا ہے: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢١٩﴾ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْأَخِرَةِ﴾ " تاکہ تم سوچ سمجھ سکو امور دینی اور دنیاوی کو"۔ آیت کریمہ میں مومنوں کو دنیا اور آخرت کے امور میں غور و فکر کی توجہ دلائی گئی ہے، یہ مختصر توجیہ بہت ہی وسیع اور عظیم امر کے لیے ہے، چنانچہ دنیا میں غور و فکر کا مطلب اس کا آغاز وانجام، محنت و کوشش اور ٹھہراو، نفع ونقصان، مالداری اور فقیری ، اس کا زوال واختتام اور بھی ان کے علاوہ دنیا کے احوال و تقلبات سب شامل ہیں۔اسی طرح آخرت جو کہ اصل ٹھکانہ ہے اس میں غور و فکر کا مطلب: اس کی لازوال اور لافانی زندگی ،اس میں مومنوں کی سعادت، کافروں کی شقاوت و بد بختی اور عذاب اور ان کے علاوہ غور و فکر کے دیگر امور اخروی۔ایسے ہی دنیوی اور اخروی امور میں غور و فکر کی اس توجیہ ربانی کے بموجب دونوں زندگیوں میں موازنہ اور مقارنہ ہوگا اور پھر دائمی انجام آخرت کو دنیوی فنا ہونے والی زندگی پر فوقیت اور فضیلت کا اعتراف لازما کرنا ہوگا۔ اس جانب توجہ دلانے کے لیے انتہائی آسان اور بلیغ اسلوب استعمال کیا گیا ہے جس سے ذہن جو جلا ملتی ہے، خاص طور سے جبکہ مومنوں کے ان سوالوں کے بعد یہ

---

(۱) تفسير قرطبي ٣/٤٢.

بات کہی گئی جن کا تعلق آخرت کی فلاح کے لیے دنیاوی امور سے تھا۔اسی طرح اس آیت میں علم و تعلیم کے تعلق سے اللہ تعالی کے لطف وکرم کا ثبوت ملتا ہے، کیوں کہ سوالوں کے یہ جوابات ضرورت سے زیادہ وسعت کے ساتھ دیئے گیے، جس سے یہ فائدہ ملا کہ تعلیم اور سوالوں کے جواب میں لطف وکرم کو کافی اہمیت حاصل ہے، اور یہ اہمیت تمام مجالات میں ہے خاص طور سے علم کے مجال میں، اور علم دین میں اس کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے کیوں کہ اسی علم دین کی بدولت آخرت تک رسائی ہوتی ہے۔

﴿وَيَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلۡيَتَٰمَىٰۖ قُلۡ إِصۡلَاحٞ لَّهُمۡ خَيۡرٞۖ وَإِن تُخَالِطُوهُمۡ فَإِخۡوَٰنُكُمۡۚ وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ ٱلۡمُفۡسِدَ مِنَ ٱلۡمُصۡلِحِۚ وَلَوۡ شَآءَ ٱللَّهُ لَأَعۡنَتَكُمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٞ ۝٢٢٠﴾

ترجمہ:

"اور تجھ سے یتیموں کے بارے میں بھی سوال کرتے ہیں ، آپ کہہ دیجئے کہ ان کی خیر خواہی بہتر ہے، تم اگر ان کا مال اپنے مال میں ملا بھی لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، بدنیت اور نیک نیت ہر ایک کو اللہ خوب جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا ،یقیناً اللہ تعالیٰ غلبہ والا اور حکمت والا ہے"۔

اس آیت کریمہ میں یتیموں کے مال کو لے کر بیان ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کافی پریشان اور فکر مند تھے یہاں تک انہوں نے اپنے اور ان کے کھانے الگ الگ کر لیے ،اس ڈر سے کہ کہیں ساتھ رکھنے سے ان کے مال بھی نہ کھالیں، چنانچہ انہوں نے اس کی بابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا جس کے جواب میں اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿وَيَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلۡيَتَٰمَىٰۖ قُلۡ إِصۡلَاحٞ لَّهُمۡ خَيۡرٞۖ وَإِن تُخَالِطُوهُمۡ فَإِخۡوَٰنُكُمۡۚ وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ ٱلۡمُفۡسِدَ مِنَ ٱلۡمُصۡلِحِۚ﴾"اور تجھ سے یتیموں کے بارے میں بھی سوال کرتے ہیں ، آپ کہہ دیجئے کہ ان کی خیر خواہی بہتر ہے، تم اگر ان کا مال اپنے مال میں ملا بھی لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، بدنیت اور نیک نیت ہر ایک کو اللہ خوب جانتا ہے"۔ چنانچہ اللہ تعالی نے یتیموں کے معاملہ کو اپنے بندوں سے صرف ایک لفظ (اصلاح) میں بیان کر دیا، جس میں ان کے مال کی حفاظت ورعایت اور نشو ونما وغیرہ اصلاح کی تمام صورتیں آ گئیں ،اور لفظ اصلاح فساد کی ضد ہے۔ ﴿قُلۡ إِصۡلَاحٞ لَّهُمۡ خَيۡرٞۖ﴾" آپ کہہ دیجئے کہ ان کی خیر

خواہی بہتر ہے "۔ اور خیر خواہی کا مطلب ان کے مالوں میں جس طرح سے بھی خیر ممکن ہو اسے انجام دیا جائے، اور یہ اصلاح کا طریقہ کار ہی ان کے لیے بہتر ہے بجائے اس کے کہ ان کے مال کو اپنے مال سے الگ کر دیا جائے اور پھر ان میں کوئی اصلاح اور نشوونما نہ ہو سکے۔ بلکہ اللہ تعالی نے مزید ان کی مشقت اور پریشانی دور کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَٰنُكُمْ﴾ " تم اگر ان کا مال اپنے مال میں ملا بھی لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں "۔یعنی اللہ تعالی نے ان کے لیے یتیموں کے مال و کھانے اور دیگر اشیاء جن مین ان کی مصلحت ہو اور مشقت نہ اٹھانی پڑے، ان تمام میں شرکت کو جائز قرار دیا ، اور اصلاح کی اس کوشش کو اخوت کی صفت کی طرف منسوب کیا ہے: ﴿وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَٰنُكُمْ﴾ " تم اگر ان کا مال اپنے مال میں ملا بھی لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں "۔ (فَإِخْوَٰنُكُمْ) کی تعبیر ان یتیموں سے تعلق، ان کے لیے خیر کی محبت، ان کے مال کی نشوونما اور حفاظت کے معانی پر دلالت کرتی ہے اور اس کے برعکس فساد اور بگاڑ کے تمام انواع واقسام زائل ہو جاتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اخوت کا یہ تعلق خیر کی محبت اور شر سے نفرت کی ایک مثال ہونا چاہیے۔اس کے بعد اللہ تعالی نے خفیہ ذاتی مقاصد کی طرف اشارہ کیا جنہیں اللہ سبحانہ وتعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا: ﴿وَٱللَّهُ يَعْلَمُ ٱلْمُفْسِدَ مِنَ ٱلْمُصْلِحِ﴾ "بدنیت اور نیک نیت ہر ایک کو اللہ خوب جانتا ہے "۔ یعنی ان یتیموں کے مال کو اپنے مال سے ملانے یا تصرف کرنے میں تمہارے مقاصد سے اللہ تعالی بخوبی واقف ہے، اللہ تعالی کا یہ فرمان بلاشبہ حرص وخوف کا موجب ہے، آدمی جو کچھ بھی کرتا ہے اس میں اللہ تعالی کی نگہبانی ساتھ ہوتی ہے، اور خصوصا آیت کریمہ کے محور یتیموں کے مال میں۔

اللہ تعالی کا فرمان: ﴿وَٱللَّهُ يَعْلَمُ ٱلْمُفْسِدَ مِنَ ٱلْمُصْلِحِ﴾ "بدنیت اور نیک نیت ہر ایک کو اللہ خوب جانتا ہے "۔ یہ آیت کریمہ سلوک کے باب میں ایک اصول کی حیثیت رکھتی ہے، زندگی کے وہ تمام امور و معاملات جن میں بالیقین کوئی بات نہیں کہی جا سکتی اور ظاہری قرائن و دلائل اور سلوک و کردار سے اصل مقصد کی معرفت نہیں ہو سکتی، جن کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور جنہیں اللہ تعالی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا جو حاضر و غائب سے واقف ہے ، اب یہاں پر اللہ تعالی کے اس فرمان کو سامنے رکھتے ہوئے آدمی اپنے سلوک و کردار کا ہمہ وقت جائزہ لے۔ اگر کسی کو اپنے اخلاص میں شک ہو تو اس کی

اصلاح کرتے ہوئے اللہ تعالی کے اس فرمان ﴿وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ ٱلۡمُفۡسِدَ مِنَ ٱلۡمُصۡلِحِ﴾ "بدنیت اور نیک نیت ہر ایک کو اللہ خوب جانتا ہے "۔ سے خود کو اطمینان دلائے، اگر کسی کو اپنے کردار و سلوک میں شک ہو تو ﴿وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ ٱلۡمُفۡسِدَ مِنَ ٱلۡمُصۡلِحِ﴾ سے خود کی اصلاح کرے، اگر کوئی دوسرے کے معاملات کی اصلاح کی کوشش کرے اور غیر ارادی طور پر کچھ غلطیاں ہو جائیں تو ﴿وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ ٱلۡمُفۡسِدَ مِنَ ٱلۡمُصۡلِحِ﴾ اس کا حل ہے، اور اگر دوسروں کی نیتوں میں شک کرنے لگے تو خود سے کہے: ﴿وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ ٱلۡمُفۡسِدَ مِنَ ٱلۡمُصۡلِحِ﴾ "بدنیت اور نیک نیت ہر ایک کو اللہ خوب جانتا ہے "۔

اسی منہج ربانی پر قیاس کرتے ہوئے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ زندگی میں کچھ امور ایسے بھی ہیں جن کے تمام اجزاء کا احاطہ مشکل ہے، خاص طور سے ایسے امور جن کا تعلق دوسروں سے ہے، ایسے میں پہلے تو ان امور کے اصلاح کی کوشش اور دوسرے یہ کہ اس اصلاح میں اخوت اور بھائی چارگی کا لحاظ ہونا چاہئے اور تیسرے اس بات کا یقین ہو کہ اللہ تعالی بندوں کے سارے اعمال و نیات اور مقاصد سے باخبر ہے۔ اس منہج ربانی کا فائدہ اداری قواعد و قوانین میں بھی ہے: جیسے اداری امور، اداری تعلقات اور عام روابط، اسی طرح معاشرتی اور خاندانی تعلقات میں بھی، بایں طور کہ ان تمام میدانوں میں انسان اصلاح کا کام کرے اور یہ اصلاح اخوت اور بھائی چارگی کی اساس پر ہو، ساتھ ہی اللہ تعالی کی نگہبانی اور نیت و مقاصد کے معرفت کا شعور و احساس بھی ہو۔ چنانچہ یہ سلوک کے باب میں ایک مکمل ضابطہ ہے جس کی قوت وسیع تر اور صاحب فکر و نظر کے لیے اس کے ثمرات و فوائد انتہائی دوررس ہیں۔ الحمد للہ رب العالمین۔

اس کے بعد اللہ تعالی مومنوں پر اس توجیہ ارشاد کا احسان جتلا رہا ہے، فرمایا: ﴿وَلَوۡ شَآءَ ٱللَّهُ لَأَعۡنَتَكُمۡۚ﴾ "اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا "۔ یعنی اگر اللہ تعالی تم کو مشقت میں ڈالنا چاہتا تو یہ رخصت نہ دے کر ایسا کر سکتا تھا، لیکن اللہ تعالی نے اس رخصت کے ذریعہ تم سے حرج اور مشقت کو دور کر دیا، بلکہ اس رخصت کے ساتھ ساتھ خیر خواہی اور یتیموں کے فائدے کے اسباب اور راستے بھی نکالے، اللہ تعالی نے اس مسئلہ کو بیان کرکے مومنوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ یہ شریعت اسلامیہ ان کے لیے عظیم نعمت ہے اور اسی میں ان کی خیر و بھلائی ممکن ہے۔ اور اس مشقت سے عافیت کی طرف

توجہ دلانے میں اس کے برعکس کا ذکر کرنا اس نعمت کے احساس کو مزید تقویت دیتا ہے، اور یہ ایک تربیتی انداز بیان ہے کہ توجیہ کے وقت اس کے مقابل اور ضد کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے جس سے نعمتوں کا احساس ہو۔

اس کے بعد آیت کا اختتام اللہ تعالی کے اس فرمان سے ہو رہا ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾" یقیناً اللہ تعالیٰ غلبہ والا اور حکمت والا ہے"۔ (عزت) کا مفہوم قوت کاملہ اور قدرت قاہرہ کو شامل ہے، لہذا اللہ تعالی اپنے امر میں غالب ہے اور اپنے امر و نہی، شریعت سازی، قضاء وقدر، تخلیق، زندگی اور موت دینے اور تمام امور میں وہ حکمت والا، اور چیزوں کو اس کا اصل مقام دینے والا ہے، کیوں کہ حکمت کا مفہوم ہے کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا، اور حکمت عبث کی ضد ہے۔ اور آیت میں ان دونوں صفتوں (عزیز، حکیم) کو ایک ساتھ ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی اپنی بادشاہت، قوت کاملہ اور قدرت قاہرہ کے باوجود اپنی اس صفت میں حکمت والا بھی ہے، چنانچہ وہ اپنے تمام امر وتدبیر میں حکمت والا ہے، اور وہ اپنے اسماء وصفات کے تقاضے کے مطابق اس کو مناسب مقام دیتا ہے، جیسے رحمت وشفقت، نصرت، مظلوم کے لئے مکر اور اس کی مدد، ظالم کے ساتھ مکر اور اس کو سزا دینا وغیرہ۔ اور حکمت بڑی عظیم الشان اور جلیل القدر صفت ہے ، اللہ تعالی نے دوسرے مقام پر اس صفت سے متصف اپنے بندوں کی تعریف کی ہے ، فرمایا: ﴿ وَمَن يُؤْتَ ٱلْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ﴾ [سورة البقرة: ٢٦٩]۔ "جو شخص حکمت اور سمجھ دیا گیا وہ بہت زیادہ بھلائی دیا گیا"۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بندوں کی حکمت اس کے عطا کرنے والے اللہ سبحانہ وتعالی کی حکمت جیسی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ اللہ تعالی کی حکمت کامل ہے، اور مخلوق کی حکمت کو بشری تقاضے کے مطابق نقص اور کمی لاحق ہوتی ہے ، لیکن انسانوں میں سے جس کو حکمت دے دی گئی وہ اس سے بہت افضل اور بہتر ہے جو اس حکمت سے محروم ہو ، چنانچہ انسانوں میں سے جو حکمت سے نوازا گیا وہ اپنی قوت وطاقت اور معروف اور بھلائی کو اس کا مناسب مقام دیتا ہے۔ پس تمام تعریف اس ذات کے لئے ہے جس کی یہ اعلی صفات اور عمدہ نام ہیں۔ یہ تفصیل اس اعتبار سے ہے کہ حکمت کا مفہوم وضع الشیء فی موضعه ہے۔

﴿وَلَا تَنكِحُواْ ٱلْمُشْرِكَٰتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْۗ وَلَا تُنكِحُواْ ٱلْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُواْۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْۗ أُوْلَٰٓئِكَ يَدْعُونَ إِلَى ٱلنَّارِۖ وَٱللَّهُ يَدْعُوٓاْ إِلَى ٱلْجَنَّةِ وَٱلْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِۦۖ وَيُبَيِّنُ ءَايَٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴿٢٢١﴾﴾

ترجمہ:

"اور شرک کرنے والی عورتوں سے تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لائیں تم نکاح نہ کرو ، ایماندار لونڈی بھی شرک کرنے والی آزاد عورت سے بہتر ہے، گو تمہیں مشرکہ ہی اچھی لگتی ہو اور نہ شرک کرنے والے مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں، ایماندار غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے، گو مشرک تمہیں اچھا لگے، یہ لوگ جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت کی طرف اور اپنی بخشش کی طرف اپنے حکم سے بلاتا ہے وہ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان فرما رہا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں"۔

آیت کریمہ میں دین کے اعتبار سے شوہر اور بیوی کے انتخاب کا حکم بیان ہو رہا ہے: ﴿وَلَا تَنكِحُواْ ٱلْمُشْرِكَٰتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّۚ﴾ " اور شرک کرنے والی عورتوں سے تاوقتیکہ وہ ایمان نہ لائیں تم نکاح نہ کرو "۔آیت میں مشرکہ عورتوں سے نکاح کی ممانعت بیان کی گئی ہے تاآں کہ وہ ایمان لائیں، اس کے بعد اللہ تعالی نے اس ممانعت کا سبب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْۗ﴾" ایماندار لونڈی بھی شرک کرنے والی آزاد عورت سے بہتر ہے، گو تمہیں مشرکہ ہی اچھی لگتی ہو"۔ آیت کریمہ میں دو چیزوں کے مابین مقارنہ کیا گیا ہے، اور ان دونوں چیزیں میں سے ایک انسان کی اپنی پسند ہے اور دوسری جو اس کے حق میں بہتر اور خیر ہے، کیوں کہ جو چیز انسان کی نظر میں محبوب اور پسندیدہ ہو بسا اوقات وہ اس کے حق میں افضل اور بہتر نہیں ہوتی ، اس لیے فکر و نظر کا معیار ایسی چیز کو بنایا جائے جس میں خیر ہو، یہ بڑا ہی عمدہ اصول ہے جس کے فوائد سے ایک مومن اپنے تمام امور میں رہنمائی پاتا ہے۔ آیت میں یہ فائدہ بھی ہے کہ پسند کے مختلف ناحیے ہوتے ہیں، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے آگاہ کیا ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے: (تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ

لِأَرْبَعٍ لِمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَجَمَالِهَا وَلِدِينِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ تَرِبَتْ يَدَاكَ)(١) "عورت سے نکاح چار چیزوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اس کے مال کی وجہ سے اور اس کے خاندانی شرف کی وجہ سے اور اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے اور تو دیندار عورت سے نکاح کر کے کامیابی حاصل کر ،اگر ایسا نہ کرے تو تیرے ہاتھوں کو مٹی لگے گی (یعنی اخیر میں تجھ کو ندامت ہو گی)"۔ چنانچہ عورت کو پسند کرنے کی یہی چار پیمانے ہیں۔

اس لیے اللہ تعالی نے اس پیمانے کو واضح کر دیا جس کو بیوی کے انتخاب میں بروئے کار لایا جائے اور وہ ایمان کی اچھائی کا پیمانہ ہے: ﴿وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ﴾ " ایماندار لونڈی بھی شرک کرنے والی آزاد عورت سے بہتر ہے، گو تمہیں مشرکہ ہی اچھی لگتی ہو"۔ کیوں کی اس کی اچھائی ایمان کے وجود اور آثار ونتیجے میں ہو گی ،اور اس ایمان کی بدولت عورت کے تمام تصرفات اور تعلقات منضبط اور محفوظ ہوں گے خواہ ان کا تعلقات اس کی ذات سے ہو یا اس کے شوہر، اولاد اور اس کے مال سے ہو، ایک مومنہ عورت اپنے شوہر کی اطاعت اور خدمت کے ذریعہ اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی کی طالب ہوتی ہے، اور یہ چیز ایک مشرکہ عورت میں نہیں ہوتی کیوں کہ اس کا سرے سے اللہ تعالی پر ایمان ہی نہیں ہوتا، جب کہ ایک مومنہ کے دل میں ایمان کے مقاصد رچے بسے ہوتے ہیں جن کے ذریعہ دنیا وآخرت دونوں جگہ وہ سربلندی کے منازل طے کرتی ہے۔

یہ قاعدہ ایک عورت کے لیے شوہر کے انتخاب پر بھی منطبق ہوتا ہے، ارشادی ربانی ہے: ﴿وَلَا تُنكِحُواْ ٱلْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُواْۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ﴾ " اور نہ شرک کرنے والے مردوں کے نکاح میں اپنی عورتوں کو دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں، ایماندار غلام آزاد مشرک سے بہتر ہے، گو مشرک تمہیں اچھا لگے "۔ پسند اور خیریت وانتخاب کی وہی مماثلت یہاں بھی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اچھائی اور اختیار کی ایک اور وجہ بیان کر رہا ہے: ﴿أُوْلَٰٓئِكَ يَدْعُونَ إِلَى ٱلنَّارِۖ﴾ " یہ لوگ جہنم کی طرف بلاتے ہیں"۔ یعنی یہ مشرکین جہنم کی طرف بلاتے ہیں ، غور وفکر کرنے والے کو یہ بخوبی احساس ہو گا کہ مشرکین ہر جانب سے جہنم کی طرف بلاتے ہیں: شرک، اخلاقی برائیاں،

---

(١) صحيح بخاري ٣/٢٦٠ حديث نمبر (٥٠٩٠)

ایذاءرسانی، اسلام اور مسلمانوں سے ناپسندیدگی، دوسروں کو کفر کی دعوت، خود اللہ کے راستے سے رک کر دوسروں کے لیے بھی رکاوٹیں کھڑی کرنا، یہ ساری چیزیں اللہ تعالی کی دعوت کے برعکس ہیں: ﴿ وَٱللَّهُ يَدْعُوٓا۟ إِلَى ٱلْجَنَّةِ وَٱلْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِۦ ﴾ " اور اللہ جنت کی طرف اور اپنی بخشش کی طرف اپنے حکم سے بلاتا ہے"۔ یعنی یہ لوگ جس چیز کی طرف بلاتے اور دعوت دیتے ہیں اللہ تعالی اس کے برعکس بلاتا ہے، اور دونوں میں کافی فرق ہے اس لیے یہ پسند چاہے جتنی بھی زیادہ ہو ایک صاحب ایمان کے لیے اس کو اختیار نہ کرنا اور چھوڑدینا واجب ہوتا ہے۔ آیت میں ایک اہم توجہ طلب بات یہ ہے کہ جنت اور مغفرت اللہ تعالی کے حکم اور ارادے سے ہے: ﴿ وَٱللَّهُ يَدْعُوٓا۟ إِلَى ٱلْجَنَّةِ وَٱلْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِۦ ﴾ " اور اللہ جنت کی طرف اور اپنی بخشش کی طرف اپنے حکم سے بلاتا ہے"۔ اس لیے بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ برابر اللہ تعالی سے حق پر ثبات قدمی کی دعا کرتا رہے یہاں کہ وہ اپنے رب سے جاملے، کیوں کہ اللہ کے حکم اور اجازت کے بغیر آدمی کو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿ وَيُبَيِّنُ ءَايَٰتِهِۦ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ﴾ " وہ اپنی آیتیں لوگوں کے لئے بیان فرمارہا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں "۔ اللہ تعالی بیان کررہا ہے کہ وہ بندوں کے لیے اپنے احکامات اور اپنی مرضی واضح کررہا ہے اور ان کو وہ سب کچھ بتلارہا ہے جن سے وہ نابلد ہیں، تاکہ وہ اس کے احکامات پر عمل پیرا ہوں اور اس کے اوامر و نواہی کو بجالائیں، اور جب وہ کبھی بھول اور نسیان کا شکار ہوں تو ان آیات سے ان کی یاددہانی ہو سکے۔

﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَٱعْتَزِلُوا۟ ٱلنِّسَآءَ فِى ٱلْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ ٱللَّهُ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلتَّوَّٰبِينَ وَيُحِبُّ ٱلْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا۟ حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا۟ لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّكُم مُّلَٰقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾ ﴾

ترجمہ:

"آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دیجئے کہ وہ گندگی ہے، حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو، اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں ان کے قریب نہ جاؤ ہاں جب وہ پاک

ہوجائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے ،اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے(۲۲۲)۔ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں، اپنی کھیتوں میں جس طرح چاہو آؤ اور اپنے لئے (نیک اعمال) آگے بھیجو اور اللہ تعالی سے ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ تم اس سے ملنے والے ہو اور ایمان والوں کو خوشخبری دیجئے(۲۲۳)"۔

اس کے بعد اللہ تعالی عورتوں کے حیض سے متعلق بعض مسلمانوں کے سوال کا جواب دے رہا ہے، کیوں کہ یہود کی عورتیں جب حیض سے ہوتیں تو وہ لوگ ان کے ساتھ کھانا پینا ترک کر دیتے اور گھروں میں ان کے ساتھ نہیں رہتے تھے ، اس تعلق سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا، اس پر اللہ تعالی کا یہ فرمان نازل ہوا : ﴿ وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْمَحِيضِ ﴾" آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں"۔ چنانچہ اللہ تعالی کا جواب انتہائی واضح اور بلاغت والا رہا: ﴿قُلْ هُوَ أَذًى ﴾ "کہہ دیجئے کہ وہ گندگی ہے "اللہ تعالی نے اس کو صرف ایک وصف کے ساتھ ذکر کیا کہ وہ گندگی ہے ، اور یہ لفظ بہت سارے مفاہیم کو شامل ہے، اور اللہ تعالی نے اس گندگی کی کوئی تفصیل ذکر نہیں کی، جس میں ایک طرح سے عورتوں کے شعور واحساس کا خیال، اور ان کے شرم وحیاء کا لحاظ ہے اور وہ چاہتی ہے کہ ان کی ان خصوصیات کو ان کے علاوہ کوئی اور نہ جان سکے، اس لیے اللہ تعالی نے ایسی چیزوں کی تفصیل لوگوں سے بیان نہیں کی جو ان عورتوں کی تکلیف کا سبب ہوں۔ شرم وحیاء اور عورتوں کے خصوصی مسائل کے پاس ولحاظ کی قرآن کریم میں بہت ساری جگہ رعایت ہے، علی سبیل المثال مطلقہ کے احوال بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: :﴿ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَٰثَةَ قُرُوٓءٍ ﴾ [سورۃ البقرۃ:۲۲۸]۔ "(طلاق والی عورتیں) اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں"۔ اسی طرح جن کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہو ان کے متعلق فرمایا :﴿ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ﴾ [سورۃ البقرۃ:۲۳۴]۔ "وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس عدت میں رکھیں"۔ آیت میں (اذی) سے اشارہ ہے ہر اس چیز کی طرف جس سے عورت اس حالت میں اذیت محسوس کرتی ہے، خواہ وہ نفسیاتی تکلیف ہو یا حسی، اس لیے شوہر کے لیے بھی لازم ہے کہ وہ اس اذیت سے دوری بنائے رکھیں، کیوں کہ اذیت زدہ نفسیاتی طور پر بھی اس اذیت سے متاثر ہوتا ہے، اس لیے ایسی حالت میں ان سے ہونے والی بعض لغزشوں کی رعایت ضروری ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان حیض والی عورتوں سے الگ رہنے کا حکم دے رہا ہے: ﴿فَٱعۡتَزِلُواْ ٱلنِّسَآءَ فِي ٱلۡمَحِيضِ﴾ "حالت حیض میں عورتوں سے الگ رہو"۔ اس کے بعد اللہ تعالی اس کی تفصیل بیان کر رہا ہے: ﴿وَلَا تَقۡرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطۡهُرۡنَ﴾ " اور جب تک وہ پاک نہ ہوجائیں ان کے قریب نہ جاؤ "۔ چنانچہ اللہ تعالی نے ان سے جماع کی دوری بنائے رکھنے کا حکم دیا، اور حیض کی حالت میں جماع کی حرمت پر اجماع امت ہے ، اور حالت حیض میں جماع سے دور رہنے کی تخصیص اس بات کی دلیل ہے کہ حالت حیض میں جماع کے علاوہ دوسری جائز جگہوں میں عورتوں سے مباشرت جائز ہے(۱) ۔ اس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے: (اصنعوا كل شيء إلا النكاح) (۲) "یعنی جماع کے علاوہ تم سب کچھ کر سکتے ہو"۔ اس آیت کے فقہی مسائل کے فوائد میں سے ہے کہ سنت مطہرہ نے اس آیت کی تفصیل بیان کی ہے، چنانچہ فقہاء کرام اور مفسرین عظام نے غور وفکر کیا اور قرآنی آیت کے مفہوم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو باہم جمع کیا اور پھر اس تعلق سے بہت سارے اہم مسائل کا استنباط کی۔

آیت کے من جملہ فوائد میں سے قرآن کریم کا یہ عمدہ اسلوب بھی ہے جس میں پورے ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دیا گیا ہے، جس کی طرف اشارہ گزر چکا ہے اور حکم کا مفہوم ومقصود مکمل طور پر ادا بھی ہو گیا بغیر کسی ایسی تفصیل کے جو مخاطب کی ناگواری اور کبیدہ خاطری کا سبب ہو، اس سے تعلیم وتوجیہ اور دوسروں کے ساتھ بات چیت میں اس اسلوب قرآنی کو اختیار کرنے کی اہمیت مستفاد ہوتی ہے، اس اسلوب قرآنی سے ہمیں گفتار میں شرم وحیاء اور دوسروں کے شعور واحساسات کا بھرپور لحاظ ، عمدہ الفاظ وتعبیرات اور باادب کلمات کے انتخاب کا سبق ملتا ہے، اور نئی نسل کو بھی اسی اسلوب کا عادی بنانا چاہیے۔

اس کے بعد اللہ تعالی حیض ختم ہونے اور اغتسال کے بعد جماع کی اجازت اور عارضی احوال کا اپنی طبعی کیفیت کی طرف لوٹ آنے کو بیان کر رہا ہے: ﴿فَإِذَا تَطَهَّرۡنَ﴾ " جب وہ پاک ہوجائیں" اس کے دو جانب ہیں: ایک یہ کہ حیض ختم ہو کر طہر کی شروعات ہو جائے، دوسرے یہ کہ عورت غسل مکمل

---

(۱) تفسير ابن السعدي ۱/۱۸۷.

(۲) مسلم ۱/۲٤٦ حديث نمبر (۳۰۲)

کرلے، جس کی تفصیل سنت نبوی سے ملتی ہے: ﴿ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ ٱللَّهُ ﴾ " ہاں جب وہ پاک ہوجائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے " ۔ یہ بیان اور جانکاری بھی پورے ادب واحترام کے دائرے میں دی جارہی ہے، چنانچہ جب پاکی حاصل ہوجائے تو شوہر اپنی بیوی کے پاس جائز راستے سے جاسکتا ہے، حرام اور ناجائز طریقے سے نہیں ۔ تعلیم کے باب میں یہ اخلاقی اسلوب ایک طرز ادب اور طریقہ تربیت ہے جس کو آداب تعلیم کے مناہج میں طالب علم کی نوعیت کے اعتبار سے اختیار کیا جاسکتا ہے۔اسی طرح آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ شرم وحیاءاس دین اسلامی کی علامت ہے جس کو اختیار کرنااور لوگوں کواس پر ابھارنالازمی ہے۔

اس کے بعد مسئلہ ہذاکے ضمن میں اللہ تعالی بندوں سے اپنی پسند بیان کررہاہے: ﴿ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلتَّوَّٰبِينَ وَيُحِبُّ ٱلْمُتَطَهِّرِينَ ﴾ " اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے "۔ یعنی اللہ تعالی بہت زیادہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، کیوں کہ انسان کوتاہی، بھول اور گناہوں سے لازمی طور پر دوچار ہوتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی اس قسم کے مومنوں کو محبوب رکھتا ہے ،اسی طرح جو لوگ جنابت، حیض اور غلاظت وغیرہ جن سے صفائی اور غسل واجب ہے نہادھل کر حسی گندگیوں سے پاک وصاف رہتے ہیں وہ بھی اللہ کے محبوب ہیں، چنانچہ اللہ تعالی کی محبت حسی گندگی اور معنوی گندگی (گناہ) سے پاک وصاف رہنے والوں کے لیے ہے۔

آیات کے فقہی فوائد میں سے ہے کہ علماءنے اس آیت کی دلالات سے انتہائی دقیق مسائل مستنبط کئے جن سے عقلیں غور وفکر اور استنباط کی گیرائی سے روشن ہوگئیں، مثال کے طور پر اللہ تعالی کا فرمان: ﴿ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ ٱللَّهُ ﴾ " ہاں جب وہ پاک ہوجائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں اجازت دی ہے "۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ آیت میں غسل کے بعد عورتوں سے جماع کے استحباب کا بیان ہے، ابن حزم رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ہر حیض کے بعد جماع کرنا واجب ہے، اور اصول فقہ کے علماء کے بعض اقوال کے مطابق اس میں امر وجوب کے لیے ہے، اور بعض دیگر علماء اباحت کے قائل ہیں، اور اس کے پہلے نہی کا آنا اس وجوب کے لیے قرینہ صارفہ ہے۔ان تمام اقوال کے ذکر کرنے کے بعد ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: دلیل سے جس قول کو تقویت ملتی ہے وہ

یہ ہے کہ حکم اسی حالت پر لوٹ آئے گا جو حکم نہی سے پہلے تھا، اگر نہی سے پہلے واجب تھا تو واجب رہے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالی کے فرمان اس فرمان میں ہے: ﴿ فَإِذَا ٱنسَلَخَ ٱلْأَشْهُرُ ٱلْحُرُمُ فَٱقْتُلُوا۟ ٱلْمُشْرِكِينَ ﴾ [سورة التوبة:٥]۔ پھر حرمت والے مہینوں کے گزرتے ہی مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو"۔ اور اگر نہی سے پہلے مباح تھا تو نہی کے بعد بھی مباح رہے گا، اس کی مثال اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَٱصْطَادُوا۟ ﴾ [سورة المائدة:٢]۔ "ہاں جب تم احرام اتار ڈالو تو شکار کھیل سکتے ہو" نیز اس آیت میں: ﴿ فَإِذَا قُضِيَتِ ٱلصَّلَوٰةُ فَٱنتَشِرُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ ﴾ [سورة الجمعة:١٠]۔ "پھر جب نماز ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ"۔ اس قول کی بنیاد پر تمام دلیلوں کے مابین جمع کی صورت بنتی ہے، یہی قول امام غزالی وغیرہ نے نقل کیا ہے، اور اسی کو بعض متأخرین علماء نے اختیار کیا ہے اور یہی قول صحیح بھی ہے(١) ۔ اس کا علمی، فکری اور تربیتی ناحیے سے بھی فائدہ ہے کہ فقہ اور اصول فقہ کے ظہور میں قرآن کریم کے استنباطات اور دلالات کا کافی اثر رہا ہے، کیوں کہ استنباط کا طریقہ کار انہی قواعد وضوابط پر مبنی ہے جنہیں علماء نے کتاب وسنت کی شرعی نصوص کو سامنے رکھتے ہوئے اخذ کیے ہیں، اور ان کے اختلاف کا دار ومدار بھی ان کی گہری سوچ، نصوص کے مابین جمع وتطبیق اور عمیق استنباط پر ہے، اس کی وجہ سے ان کی فہم وفراست اور فکر ونظر میں ترقی ہوتی گئی اور نصوص کی دلالتوں کو سمجھنے میں اس حد تک پہنچے جسے آج ہم دیکھ رہے ہیں، اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم سوچ اور سمجھ کو نشو ونما فراہم کرتا ہے اور نص کے سامنے اسے ثابت وجامد نہیں چھوڑتا بلکہ نص کے حدود میں اس کو متحرک رکھتا ہے۔

حائضہ عورتوں کے متعلق سوال کرنے والوں کے متعلق اللہ تعالی نے جو کچھ پیچھے بیان کیا اسی مناسبت سے میاں بیوی کے ایک امر کے متعلق جس کے بارے میں لوگ سوال کیا کرتے تھے اللہ تعالی مزید بیان کر رہا ہے، معاملہ کچھ یوں ہے کہ مدینہ کے اہل کتاب یہود کا کہنا تھا کہ اگر آدمی اپنی بیوی سے اس کے پیچھے سے اس کے فرج میں جماع کرے گا تو بچہ بھینگا پیدا ہوگا(٢) ، اس پر اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا۟ حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ﴾" تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں، اپنی کھیتوں میں جس

---

(١) تفسير ابن كثير ٢٦٧/١.

(٢) تفسير قرطبي ٦١/٣

طرح چاہو آؤ "۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اس آیت کے ذریعہ اس باطل اور غلط عقیدے کی تردید کی، اور لوگوں کے درمیان جو غلط اعتقاد منتشر تھا اس کا حل نکل آیا، یہ قرآن کریم کے قسط وار نزول کا فائدہ ہے جس کے ذریعہ لوگوں کے مختلف مسائل کا علاج اور حل نکل آتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں ابن کثیر اور دیگر مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ: یعنی جیسے چاہو خواہ آگے سے ہو یا پیچھے سے لیکن ایک ہی اصل جگہ یعنی صرف فرج میں ہونا چاہیے، اس کے ثبوت میں کئی احادیث بھی وارد ہیں(۱) ۔ ایک آدمی کے سوال کرنے پر ابن عباس رضی اللہ عنہمانے بھی اس کی یہی تفسیر بیان کی، فرمایا: کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، آگے سے، پیچھے سے، بشرط کہ ان کے فرج میں ہو، اس کے علاوہ کسی دوسری جگہ نہ بڑھا جائے(۲) ۔ جمہور صحابہ کرام، تابعین اور ائمہ عظام کے نزدیک بھی یہی تفسیر ہے: یعنی جس جانب سے بھی تم چاہو، آگے سے پیچھے سے، پر ان کے فرج میں ہی ہو(۳) ۔

اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اسلام میں ان تمام دقیق امور کا اہتمام کیا گیا ہے جن کے وضاحت کی ایک مسلمان کو ضرورت پڑ سکتی ہے، اور اس کے لیے پورے ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے بالکل واضح اور مکمل اسلوب میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، اور نصوص کتاب وسنت ایسے عناصر سے پر ہیں جو خطابی اور تعلیمی میدان میں اسلوب حیاء کو پروان چڑھاتے اور سیکھاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تلاوت کرنے والا چھوٹے بڑے اور عورتوں کے سامنے ان آیات کی تلاوت میں تھوڑا بھی جھجھک محسوس نہیں کرتا۔ یہ قرآن کریم کے بیان کا اعجاز ہے، چنانچہ اس کو قرآن نے یوں تعبیر کیا ہے: ﴿نِسَآؤُكُمۡ حَرۡثٞ لَّكُمۡ﴾ " تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں "(حرث) بونے اور اگانے کی جگہ کو کہتے ہیں، اسی طرح رحم مادر میں بھی جنین اگتا اور دھیرے دھیرے تخلیق پاتا ہے۔ اس کے بعد آدمی کے اس کی بیوی سے جماع کے بارے میں اللہ تعالی ارشاد فرمارہا ہے: ﴿فَأۡتُواْ حَرۡثَكُمۡ أَنَّىٰ شِئۡتُمۡۖ﴾ " اپنی کھیتوں میں جس طرح چاہو آؤ "اس میں ادب بھرا اسلوب بیان بالکل واضح ہے جس میں مرد وعورت کے شرم وحیاء

---

(۱) تفسير ابن كثير ١/ ٢٧٠.

(۲) مرجع سابق.

(۳) تفسير قرطبي ٣/٦٢.

کے احساس کی پوری حفاظت ہے ، اور یہ اللہ تعالی کے اسماء وصفات کا تقاضا ہے، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے: (إنَّ اللهَ حَيِيٌّ سِتِّيرٌ) (۱) "اللہ تعالی بہت زیادہ حیاء کرنے والا پردہ پوشی کرنے والا ہے"۔ ایک طرف تو یہ ہے ، دوسری طرف وہ یہ بھی فرمارہا ہے: ﴿ وَٱللَّهُ لَا يَسْتَحۡيِۦ مِنَ ٱلۡحَقِّ ﴾ [سورة الأحزاب: ۵۳]۔ "اور اللہ تعالی (بیان) حق میں کسی کا لحاظ نہیں کا کرتا" یعنی اللہ تعالی حق کے بیان اور اظہار کرنے اور حق بات کا حکم کرنے میں حیا نہیں کرتا، اس سے معلوم ہوا کہ حیا حق کے اظہار وبیان میں رکاوٹ نہیں بن سکتی، لیکن یہ بیان بھی ایسے اسلوب میں ہوتا ہے جس میں حیاء کا پاس ولحاظ ہو جو کہ اللہ تعالی کی صفت ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ شرم وحیا پر نشوونما اور تربیت کو کافی اہمیت حاصل ہے، گفتگو میں مناسب الفاظ کا اختیار اور نازیبا الفاظ سے اجتناب چاہے اس کی کوئی بھی صورت ہو حیا کا تقاضا ہے، اس میں صورت حال، مقام گفتگو اور ادب کے اعلی معیار کی بھرپور رعایت ضروری ہے، یہی نیک اور صالح بندوں کی علامت ہے، ان میں سب سے اعلے مقام ومرتبے والی ہستی سید المرسلین ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، آپ کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت ہے، چنانچہ پڑھنے والوں کو ان کے کلام میں کوئی فحش اور نازیبا الفاظ نہیں ملیں گے، بلکہ وہ الفاظ کو ایسے چنتے تھے جیسے کوئی حریص کسی چیز کو چنتا ہے، مثلا: ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول اس شخص کے لیے جو آپ سے سوال کرنے آیا تھا جس کا بیان گزر چکا ہے جیسا کہ انہوں نے فرمایا: (قائمة وقاعدة ومقبلة ومدبرة في أقبالهن ، لا تعدوا ذلك إلى غيره) "یعنی کھڑے بیٹھے آگے پیچھے ان کے فرج میں ، یہ کام کہیں اور نہ ہو"۔ یہی اعلی وارفع ادب علماء کے کلام میں بھی دیکھنے کو ملے گا، حق کا بیان ان کی کتابوں میں انتہائی خوبصورت الفاظ میں بالکل واضح طور پر مذکور ہے، ان کو حقیر عبارات اور کلمات کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اے اللہ تو ہمیں اپنے محبوب اور پسندیدہ ادب کی توفیق دے۔

---

(۱) مسند احمد ۲۲۴/٤ ، ابو داود حدیث نمبر (٤٠١٣)

سیاق آیت کے فوائد میں سے لفظ (أنّى) کا انتخاب ہے، (أَنَّى شِئْتُم) کے جملہ میں، چنانچہ لفظ (أنّى) کبھی سوال کے لیے آتا ہے اور کبھی ایسے امر کی خبر کے لیے آتا ہے جس کی جہتیں ہو، گویا یہ لفظ عربی میں (کیف)، (أین) اور (متی) کے معانی کے لیے عام ہے[1]۔

اس کے بعد اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿وَقَدِّمُواْ لِأَنفُسِكُمْ﴾ " اور اپنے لئے (نیک اعمال) آگے بھیجو "۔ایک مسلم کو اپنی بیوی کے ساتھ کون سی چیز آگے نیکی کے طور پر بھیجنی چاہیے یہ اسی پر آمادہ کرنے کے لیے ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس سے مراد جماع کے وقت بسم اللہ پڑھنا ہے[2]۔ اسی طرح اس کی تفسیر یہ بھی ہے کہ تم وہ چیز آگے بھیجو جو کل کے دن تمہارے لیے فائدے مند ثابت ہو ،اس کی تفسیر یہ بھی ہے کہ: تم اپنے لیے طاعت اور عمل صالح کو آگے بھیجو، اس کی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اولاد اور نسل کی خواہش کرنا ہے[3]۔ یہاں پر آیت کے ان تمام مذکورہ مفاہیم پر مشتمل ہونے میں کو چیز مانع نہیں ہے، یہ قرآن کریم کی بلاغی خاصیت اور اس کا امتیاز ہے کہ اس کی الفاظ کی بعض دلالتیں مختلف مطلوبہ مقاصد کو شامل ہوتی ہیں۔ آیت کے فوائد میں سے ہے میاں بیوی کی دنیاوی اور اخروی مقاصد کی خواہشات کو بسم اللہ کے ذریعہ اللہ کے ذکر سے مربوط کرنا کیوں کہ اس کی اہمیت اور فضیلت بہت زیادہ ہے، اس میں اللہ تعالی کے حکم کی تعمیل کر کے اس کی عبادت بھی ہو رہی ہے، یہ خیر برکت کے حصول کا سبب بھی ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ کی حدیث ہے: (لوأن أَحَدَكُمْ إِذَا أَرَادَ أَن يَأْتِيَ أَهْلَهُ، قَالَ: بِسْمِ اللَّهِ، اللَّهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا، فَرُزِقَا وَلَدًا لَمْ يَضُرَّهُ الشَّيْطَانُ) "جب کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس آتا ہے اور یہ دعا پڑتا ہے " اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں، اے اللہ! ہم سے شیطان کو دور رکھ اور جو کچھ ہمیں تو دے (اولاد) اس سے بھی شیطان کو دور رکھ۔ " پھر اگر ان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو شیطان اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا"۔

---

(١) تفسير قرطبى ٦٢/٣.

(٢) تفسير ابن كثير ٢٧٣/١.

(٣) تفسير قرطبي ٦٤/٣.

اس کے بعد آیت کا اختتام تقوی کے حکم سے ہو رہا ہے: ﴿وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ﴾ " اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو"۔ یہ تاکیدی حکم قرآن کریم میں بار بار دہرایا گیا ہے، تاکہ اس سے مومن ہمہ وقت آگاہ رہے ،اور اس کی اہمیت اس کے نزدیک متحقق ہو جائے اور ہر آن و لمحہ اس کی یاداشت میں رہے، کیوں کی تقوی کا لزوم تمام خیر و بھلائی کے حصول کا سبب اور شر اور برائی سے بچاؤ کا ذریعہ ہے، تقوی سے بندہ اللہ تعالی کی منہیات سے رک جاتا ہے اور اس کے اوامر واحکام کو بجالاتا ہے، تقوی ہی تقصیر اور بھول کے وقت اللہ کا خوف دلاتا ہے اور اسی خوف کی بدولت ایک مومن خطا اور بھول کے وقت توبہ اور استغفار کی طرف بھاگتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالی یہ یاد دلا رہا ہے کہ ان کو اسی کی طرف لوٹنا ہے: ﴿وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّكُم مُّلَٰقُوهُۗ﴾ "اور جان رکھو کہ تم اس سے ملنے والے ہو"۔ اس ملاقات کے نتیجہ میں مومن کو یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا محاسبہ ہونا ہے اور اس کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہا ہے: ﴿وَبَشِّرِ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ﴾ " اور ایمان والوں کو خوشخبری دیجئے" آیت میں اس چیز کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جس کی بشارت دینا ہے، تاکہ اس میں اللہ تعالی کی طرف سے ملنے والی دنیا و آخرت کی ساری اچھائیاں شامل ہو جائیں، یہ عظیم بھلائیوں کا شوق دلانے کا انداز بیان ہے، جب ایک انسان دوسرے انسان کو اس کی محبوب اور پسندیدہ چیز کا شوق دلاتا ہے تو اس کی طبیعت اس کے حصول کی مشتاق ہو جاتی ہے، تو پھر خالق کریم کی بشارت کا کیا کہنا؟! اس سے دعوتی اور تربیتی اعتبار سے بشارت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، کیوں کہ یہ ایک فعال اور مؤثر اسلوب ہے، اسی طرح آیت میں تذکیر بالتقوی اور مخاطب کی سماعتوں پر بار بار دہرانے کی اہمیت کا بیان بھی ہے تاکہ مخاطب نصیحت حاصل کرے اور اس کے کانوں کو بھلائی کی انجام دہی کی آواز لگ جائے۔

﴿وَلَا تَجۡعَلُواْ ٱللَّهَ عُرۡضَةٗ لِّأَيۡمَٰنِكُمۡ أَن تَبَرُّواْ وَتَتَّقُواْ وَتُصۡلِحُواْ بَيۡنَ ٱلنَّاسِۚ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٞ ﴿٢٢٤﴾ لَّا يُؤَاخِذُكُمُ ٱللَّهُ بِٱللَّغۡوِ فِيٓ أَيۡمَٰنِكُمۡ وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتۡ قُلُوبُكُمۡۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٞ ﴿٢٢٥﴾﴾

ترجمہ:

"اور اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کا (اس طرح) نشانہ نہ بناؤ کہ بھلائی اور پرہیزگاری اور لوگوں کے درمیان کی

اصلاح کو چھوڑ بیٹھو ،اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے(۲۲۴)۔اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری ان قسموں پر نہ پکڑے گا جو پختہ نہ ہوں ، ہاں اس کی پکڑ اس چیز پر ہے جو تمہارے دلوں کا فعل ہو، اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بردبار ہے(۲۲۵)"۔

ان آیات میں انسانوں کا اپنے خالق اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ادب واحترام کے وجوب کا بیان ہے،اور اسی طرح حلف باللہ کے موضوع اور اس کے متعلق آداب اور منہیات کا بیان ہے،اللہ تعالیٰ ارشاد فرمارہا ہے: ﴿ وَلَا تَجْعَلُواْ ٱللَّهَ عُرْضَةً لِّأَيْمَٰنِكُمْ أَن تَبَرُّواْ وَتَتَّقُواْ وَتُصْلِحُواْ بَيْنَ ٱلنَّاسِۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴾ "اور اللہ تعالیٰ کو اپنی قسموں کا(اس طرح) نشانہ نہ بناؤ کہ بھلائی اور پرہیز گاری اور لوگوں کے درمیان کی اصلاح کو چھوڑ بیٹھو ،اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے" ،جب انسان کو اپنی بات، یا جو کچھ دیکھتا سنتا یا جانتا ہے ان کی سچائی کے ثبوت میں ، یا مستقبل میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے، یا کسی تہمت اور بہتان کی نفی یا کسی بھی امر کی تاکید کے لیے قسم کی ضرورت پڑتی ہے، اور وہ دوسروں کے لیے اللہ کی قسم دے کر اپنی بات میں تاکید پیدا کرتا ہے، تو ایسی صورت میں کبھی کبھی وہ اپنی قسموں میں حد سے آگے بڑھ جاتا ہے،اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس امر کی وضاحت کردی اور قسم کے متعلق مختلف امور اور مفاہیم ومعانی کو مکمل طور سے بیان کردیا،اور اس نص قرآنی کو علمائے صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد کے علماء نے اس کے تمام محتمل مفاہیم کو مختلف نواحی وجوانب سے سمجھنے کو شش کی،اور یہ قرآن کریم کے بیان کا اعجاز ہے کہ ایک مختصر نص مطلوبہ مقاصد کے تمام جوانب پر مشتمل ہو۔ اور یہ اعجاز بیان صرف اسی میں نہیں کہ کم مختصر الفاظ میں بہت زیادہ معانی بیان کردیئے گئے، بلکہ یہ اعجاز ترکیب کلام میں بھی ہے جس میں بہت سارے مطلوبہ مقاصد کا احاطہ کیا گیا ہے، چنانچہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے آیت کی تفسیر میں کئی اقوال ذکر کئے ہیں جن کا خلاصہ کچھ یوں ہے: تم کسی بھلائی سے اس لیے نہ رک جاؤ کہ تم نے اس کے نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے ،اس کے قائل ابن عباس رضی اللہ عنہما، نخعی، مجاہد، ربیع وغیرہ ہیں،اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:اس سے مراد وہ شخص ہے جو نیکی، صلہ رحمی اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کرنے کی قسم کھالے اور جب اس سے کہا جائے کہ نیکی کرو تو کہتا ہے کہ میں

نے تو نیکی نہ کرنے کی قسم کھار کھی ہے، بعض مفسرین کا کہنا ہے :اس کا مفہوم ہے کہ تم جب نیکی، تقوی اور اصلاح کاارادہ کرو تو جھوٹی قسمیں نہ کھاو۔

اسی طرح آیت کے مفاہیم میں سے یہ بھی ہے کہ تم قسمیں کم کھاؤ،اس لیے کہ اسی میں تقوی اور بھلائی ہے، کیوں کہ زیادہ قسمیں کھانے سے آدمی حانث بھی زیادہ ہوتا ہے،اور حقوق اللہ کی رعایت نہیں ہو پاتی،اسی طرح قسموں کو بالکل حقیر اور معمولی نہ سمجھو کہ ہر حق و باطل میں کھاتے پھرو ،اسی طرح کسی شخص سے کوئی بھلائی کرنے کو کہا جائے تو وہ اللہ کا واسطہ دے کر اعتذار کرلے اور کہے کہ میں تو قسم کھائے ہوئے ہوں حالانکہ وہ قسم نہیں کھائے ہوتا ہے۔اسی طرح آیت کا مفہوم یہ بھی ہے کہ جب تم صلہ رحمی نہ کرنے، صدقہ نہ کرنے اور اصلاح نہ کرانے یااسی طرح کے دوسرے خیر و بھلائی کے کام نہ کرنے کی قسمیں کھالو تواپنی قسموں کا کفارہ ادا کرو(۱) ۔

آیت کریمہ خیر و بھلائی کے بہت سارے اہم اقسام پر مشتمل ہے جن کے کرنے میں قسم رکاوٹ نہیں بنی چاہیے ان میں بھلائی، تقوی اور لوگوں کے درمیان اصلاح جیسے امور شامل ہیں، فرمایا: ﴿وَلَا تَجۡعَلُواْ ٱللَّهَ عُرۡضَةٗ لِّأَيۡمَٰنِكُمۡ أَن تَبَرُّواْ وَتَتَّقُواْ وَتُصۡلِحُواْ بَيۡنَ ٱلنَّاسِۗ﴾ " اور اللہ تعالی کو اپنی قسموں کا(اس طرح) نشانہ نہ بناؤ کہ بھلائی اور پرہیزگاری اور لوگوں کے درمیان کی اصلاح کو چھوڑ بیٹھو " ،اس لیے قسم کا کفارہ دے کر بھلائی، تقوی اور اصلاح بین الناس زیادہ اہم ہیں بجائے اس کے کہ قسم پوری کی جائے، اس سے معلوم ہوا کہ معاملات اور امور کے مابین افضلیت کے عوامل واسباب کی معرفت ،غور وفکر، اخذ نتائج اور استنباط مسائل کا معیار وہنر،اور ایک فرد مسلم کے تئیں اولویات امور کی ترتیب ، بلندئ فکر اور اعلی فہم وفراست، معاشرتی واخلاقی تعمیر وترقی کی پذیرائی، دنیا کے مقابلے میں آخرت کی ترجیح، یہ سارے امور فوائد قرآن کی فہم ومعرفت سے حاصل ہوتے ہیں،اسی سے عقل وشعور کو ترقی ملتی ہے اور آدمی اسے اعمال انجام دیتا ہے جو اس تابندہ شریعت اسلامیہ کے مصالح ومقاصد کے عین موافق ہوتے ہیں اور تعلیمی مناہج،اور تربیتی ودعوتی طرز عمل، نیز اداری نظام میں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔

---

(۱) تفسي قؤطبي ٣/٦٤-٦٥.

آیت کے من جملہ فوائد میں سے ہے کہ قسم کسی بھی بھلائی کے کام میں رکاوٹ نہ بنے، بلکہ اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ قسم کا کفارہ ادا کر کے بھلائی کے عمل کو انجام دیا جائے، کیوں کہ بھلائی، صلہ رحمی اور خیر کے دیگر اعمال اللہ تعالی کی نزدیک بہ نسبت قسم کے کافی اہمیت کے حامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے قسم کا کفارہ ادا کرنے کی رہنمائی فرمائی۔ اسی طرح آیت کریمہ میں آپسی تعاون اور رشتہ داری اور تعلقات کی پاس داری اس حد تک اہم ہے کہ ان کو قسم پر مقدم رکھا جائے گا اور قسم کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ شریعت اسلامیہ کی روشن تعلیمات میں ہر اس چیز کی رعایت ہے جس میں مسلمانوں کے لیے اور ان کے سماج و معاشرے کے لیے باعث خیر و نفع ہے، چنانچہ اس شریعت نے ان کے لیے خیر کے ان تمام دروازوں کو کھول دیا ہے جن کو وہ قسم اٹھا کر بند کر لیتے ہیں۔

اس کے بعد آیت کا اختتام ارشاد ربانی سے یوں ہو رہا ہے: ﴿وَٱللَّهُ سَمِيعٌ﴾ " اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے" یعنی جو کچھ تم کہتے ہو اس کو سننے والا اور جو کچھ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو اس کو جاننے والا ہے، چنانچہ بعض قسمیں ایسی ہوتی ہیں جن کو صرف قسم کھانے والا ہی جانتا ہے اور جس کے لیے قسم کھائی جاتی ہے اس کو اس قسم کا کوئی علم نہیں ہوتا، اس لیے اللہ تعالی نے یہ واضح کر دیا کہ اللہ تعالی وہ ساری چیزیں سنتا اور جانتا ہے جو اس شخص کی جانکاری میں نہیں ہیں جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے، اس میں ایک طرح سے اس بات کی آگاہی ہے کہ اللہ تعالی کو نیتوں کا بخوبی علم ہے، جس کے لیے قسمیں کھائی جاتی ہیں اگرچہ وہ ان قسموں سے ناواقف ہو لیکن اللہ تعالی سنتا جانتا ہے، جب ایک مسلمان تمام امور کی انجام دہی کے وقت اللہ تعالی کی صفات کو اپنے ذہن و دماغ میں حاضر رکھتا ہے تو یہ چیز اس کو عند اللہ محبوب امور پر آمادہ کرتی اور منہیات سے روکتی اور دور رکھتی ہے۔ اسی طرح اس آیت میں یہ ادب سکھلایا گیا ہے کہ مسلمان اپنے رب کو اپنی قسموں کا نشانہ اور بچاؤ کا سامان نہ بنائیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی قسم کے متعلق مزید تعلیمات بیان کر رہا ہے: ﴿لَّا يُؤَاخِذُكُمُ ٱللَّهُ بِٱللَّغۡوِ فِيٓ أَيۡمَٰنِكُمۡ﴾ "اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری ان قسموں پر نہ پکڑے گا جو پختہ نہ ہوں" اللہ تعالی نے ان قسموں کے متعلق گناہ کو معاف کر دیا ہے جو زبان زد ہوں، یعنی جو لوگوں کی زبان پر بغیر قصد و ارادہ کے آجاتی ہیں جن کا تعلق لغو یمین سے ہے۔ علماء کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ لغو یمین سے مراد وہ قسمیں ہیں جنہیں

آدمی دوران گفتگو بلا ارادہ کھالیتا ہے ، مثال کے طور پر کہتا ہے : "اللہ کی قسم ، نہیں" ، "ہاں ، اللہ کی قسم" اور اس کا مقصد وارادہ قسم کا نہیں ہوتا(۱)۔ یہ اللہ تعالی کا بہت بڑا فضل ہے کہ اس نے اس جیسی قسموں کا گناہ معاف فرمادیا جو انسانوں سے بلا قصد وارادہ بکثرت صادر ہوجایا کرتی ہیں ، البتہ لائق مؤاخذہ وہ قسمیں ہیں جن کو اللہ تعالی آگے بیان کر رہا ہے: ﴿وَلَٰكِن يُؤَاخِذُكُم بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ﴾ "ہاں اس کی پکڑ اس چیز پر ہے جو تمہارے دلوں کا فعل ہو"۔ بایں طور کہ وہ کسی چیز پر جانتے بوجھتے جھوٹی قسم کھائے۔ اس میں وہ قسم شامل نہیں ہوگئی جو کسی گذرے ہوئے واقعہ پر اٹھائی جائے اور قسم اٹھانے والا خود کو سچا تصور کرتا ہو اور وہ واقعہ اس کی قسم کے خلاف ہو۔ اس کے بعد آیت کریمہ کا اختتام یوں ہو رہا ہے: ﴿وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ "اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بردبار ہے" یعنی اللہ تعالی اپنے بندوں کو بخشنے والا اور ان پر بردبار ہے ، یہ بخشش اور بردباری اللہ تعالی کی عظیم نعمت ورحمت ہے کہ ان کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا، اور استغفار اور توبہ کرنے والوں کو معاف کردیتا ہے، لہذا اس عظیم نعمت اور اس کے اوصاف حمیدہ پر تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔

﴿ لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِن فَآءُو فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَإِنْ عَزَمُوا۟ ٱلطَّلَٰقَ فَإِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٢٧﴾ ﴾

ترجمہ:

"جو لوگ اپنی بیویوں سے (تعلق نہ رکھنے کی) قسمیں کھائیں، ان کی چار مہینے کی مدت ہے پھر اگر وہ لوٹ آئیں تو اللہ تعالیٰ بھی بخشنے والا مہربان ہے(۲۲۶)۔ اور اگر طلاق کا ہی قصد کرلیں تو اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے (۲۲۷) "۔

یہاں سے سیاق قرآنی میاں بیوی کے مابین قطع تعلق کے مسئلہ کی طرف منتقل ہو رہا ہے، فرمایا: ﴿ لِّلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِن فَآءُو فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾ "جو لوگ اپنی بیویوں سے (تعلق نہ رکھنے کی) قسمیں کھائیں، ان کی چار مہینے کی مدت ہے پھر اگر وہ لوٹ آئیں تو اللہ تعالیٰ بھی بخشنے والا مہربان ہے"۔ اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں ایک ایسی قسم کا حل بیان کیا جارہا

(۱) مرجع سابق ٦٦/٣

ہے جو بسا اوقات شوہر سے اپنی بیوی کے متعلق صادر ہو جاتی ہے جس میں وہ اپنی بیوی سے جماع نہ کرنے کی قسم کھالیتا ہے۔ چنانچہ جو کوئی اپنے بیوی سے نہ ملنے کی چار مہینہ سے کم کی قسم کھائے تو اس کا حکم دیگر قسموں ہی کی طرح ہے، یا تو قسم کا کفارہ ادا کر کے اپنی بیوی سے مجامعت کرے یا اپنی قسم پوری کرے، ایسی صورت میں بیوی کو اپنے شوہر کے خلاف چارہ جوئی کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے اس لیے کہ قسم کی مدت چار ماہ سے کم ہے، اور اگر قسم کی مدت چار ماہ سے زیادہ ہو تو بیوی چار ماہ انتظار کرے گی: ﴿فَإِن فَآءُو فَإِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ " پھر اگر وہ لوٹ آئیں تو اللہ تعالیٰ بھی بخشنے والا مہربان ہے"۔یعنی اگر وہ اپنی قسم سے لوٹ آئیں تو اللہ تعالی ان کے سابقہ عمل کو در گذر کر دیتا ہے، اور اس نے قسم کا کفارہ مقرر کر کے ان پر رحم فرمایا ہے۔ اور اگر وہ اپنی قسم سے باز نہیں آتے ہیں اور چار مہینے کی مدت بھی پوری ہو جاتی ہے تو بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے شوہر سے جماع کا مطالبہ کرے، چار ماہ بعد یہ اس کا حق ہے، چنانچہ اگر شوہر جماع کر لیتا ہے تو قسم کا کفارہ اس پر واجب ہوگا، اور اگر شوہر مطالبہ کے باوجود بھی جماع نہیں کرتا تو بیوی کو اختیار ہے یا تو صبر کرے یا اس سے طلاق کا مطالبہ کرے، اور اگر شوہر طلاق نہیں دیتا تو تو اس سے جبرا طلاق لی جائے گی(۱)۔

اس قرآنی بیان میں بہت سارے فوائد جمع ہیں، ان فوائد میں سے ہے تعبیر کا پاس ولحاظ اور ادب جس میں کہ زوجین کے مابین وقوع پذیر امور کی لفظی پردہ پوشی کے ذریعہ پورے طور پر حفاظت کا خیال رکھا گیا ہے بایں طور کہ کم عمر بچے اس کی تلاوت کرتے ہیں اور وہ اس کا ادراک نہیں کر پاتے، اور جب بڑے اس کو پڑھتے ہیں تو صورت معاملہ کو خوب بھانپ لیتے ہیں اور ان کے شرم وحیا پر کوئی آنچ بھی نہیں آتی، یہ صرف قرآنی اسلوب بیان کی شان ہے جو انسانی عقل وشعور اور ذوق کو اخلاق وآداب اور بلاغت وبیان کے اعلی مقام تک پہنچاتا ہے، اور تمام جوانب سے حیا کی تربیت کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے، حیا کے انہی جوانب میں سے ہے کہ تعبیراتی الفاظ کے اختیار میں یہ امر ملحوظ خاطر ہونا چاہیے جس سے شرم وحیا پر کوئی ضرب نہ پڑے۔ اسی طرح آیت کے من جملہ فوائد میں سے قدرت اور خصائص کے لحاظ سے زوجین کے مابین حقوق کی تعظیم بھی ہے تا کہ ان کے درمیان باہمی تعلقات برقرار رہیں، چنانچہ اللہ تعالی نے چار ماہ

---

(۱) تفسیر ابن السعدی ۱/ ۱۸۰.

کی مدت متعین کردی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شوہر اپنی بیوی سے سفر وغیرہ کی صورت میں چار ماہ سے زیادہ الگ نہ رہے، اس تعلق سے بیوی کا یہ واجبی حق ہے، اگر شوہر اس سے باز نہیں آتا تو بیوی اپنے اس حق کا مطالبہ کر سکتی ہے، حد سے تجاوز کی صورت میں طلاق کا مطالبہ بھی کر سکتی ہے۔ آیت سے ایک فائدہ یہ بھی ملتا ہے کہ حسی اور معنوی دونوں طرح کی ایذاء رسانی سے باز رہنا چاہیے اور زوجین کے مابین حقوق کی ادائیگی کی جائے، اور باہمی اختیارات کی شریعت کی جانب سے ایک متعینہ حد ہے، اسی طرح شریعت اسلامیہ میں زوجین کے مابین تعلقات کے انتہائی دقیق امور کی رعایت کی گئی ہے، جیسا کہ چار ماہ کی تحدید میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے اس میں اس امر کی یہ دلیل ہے کہ قرآن اس ذات کی جانب سے ہے جو عورتوں کی فطرت سے واقف اور باخبر ہے، کسی اور سے یہ ممکن ہی نہیں کہ اس تعلق سے کوئی مدت متعین کر سکے اور اس کا حکم دے سکے، یہ صرف اور صرف اللہ تعالی کا خاصہ ہے جو ہر چیز کا سننے والا اور علم رکھنے والا ہے، بلکہ عورتوں کو چھوڑے رکھنے کی تادیبی کاروائی بھی چار ماہ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے، سورہ نساء میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَٱهۡجُرُوهُنَّ فِي ٱلۡمَضَاجِعِ﴾ [سورة النساء: ٣٤]۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عورتوں کی ایک جماعت کو بلا کر ان سے (شوہروں سے فرقت کے متعلق) دریافت فرمایا تو انہوں نے چار مہینے کا ذکر کیا، اس لیے اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آدمی کے مسلسل غزوہ میں رہنے کی زیادہ سے زیادہ مدت چار مہینے مقرر کر دی، چنانچہ جب یہ مدت پوری ہو جاتی تو جنگجوؤں کو واپس بلا لیتے اور ان کی جگہ دوسروں کو روانہ کر دیتے(١)۔ ایک مسلمان کے لیے غور طلب بات یہ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اللہ تعالی کے احکامات کے کس کر قدر پابند تھے اور ان کے یہاں لوگوں کے احوال کا اور ان جان وعزت کی حفاظت کا کتنا پاس ولحاظ تھا، نیز اسی طرح نظم ونسق کا طریقہ کار اور اس کے لیے استدلال کا طرز بھی قابل ملاحظہ ہے۔

اس کے بعد اسی حالت کے مناسبت سے آیت کریمہ بھی پوری ہو رہی ہے: ﴿وَإِنۡ عَزَمُواْ ٱلطَّلَٰقَ فَإِنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٞ﴾ "اور اگر طلاق کا ہی قصد کر لیں تو اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے"۔ یعنی اگر ان کا ارادہ طلاق کا ہو اور وہ اس کا پکا قصد کر لیں تو اللہ تعالی تمہاری باتوں کو سننے والا اور اس امر کے

---

(١) تفسير قرطبي ٣/٧٢

متعلق تمہارے احوال اور ارادوں کو جاننے والا ہے کہ ایا تم دوسرے کو نقصان، مشقت اور تکلیف دینا چاہتے ہو یا تمہارا اس کے علاوہ کچھ اور ارادہ ہے۔ اس فرمان سے دل کے اندر اس ذات کی نگہبانی کا احساس جاگتا ہے جو کہ علم والی، سننے والی اور ہر چیز کی خبر رکھنے والی ہے۔ اس سے زوجین کے مابین نقصان نہ پہنچانے کا جزبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر کسی کو نقصان پہنچتا ہے تو الحمد للہ شریعت میں حقوق کے ابواب بڑے منظم انداز سے متعین ہیں جن کی رعایت سے ان نقصانات سے بچا جا سکتا ہے، اس شریعت کو نازل فرما کر اللہ تعالی نے اپنے بندوں پر بہت بڑا انعام کیا ہے۔

﴿ وَٱلْمُطَلَّقَـٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَـٰثَةَ قُرُوٓءٍ ۚ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ ٱللَّهُ فِىٓ أَرْحَامِهِنَّ إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ ۚ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِى ذَٰلِكَ إِنْ أَرَادُوٓا۟ إِصْلَـٰحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ ٱلَّذِى عَلَيْهِنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَٱللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٢٨﴾ ﴾

ترجمہ:

"طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں ، انہیں حلال نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو پیدا کیا ہوا سے چھپائیں ، اگر انہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہو، ان کے خاوند اس مدت میں انہیں لوٹا لینے کے پورے حقدار ہیں اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو، اور عورتوں کو بھی ویسے ہی حق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں اچھائی کے ساتھ، ہاں مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے"۔

اس کے بعد آیت کا سیاق دوسری جانب منتقل ہو رہا ہے جس کا تعلق مطلقہ عورتوں سے ہے: ﴿ وَٱلْمُطَلَّقَـٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَـٰثَةَ قُرُوٓءٍ ﴾ "طلاق والی عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں"۔ چنانچہ مطلقہ عورتوں کی عدت حیض سے تین طہر تک ہے لہذا وہ اتنی مدت تک انتظار کریں گی جس کا بیان اللہ تعالی کے فرمان ﴿ يَتَرَبَّصْنَ ﴾ میں ہے، اور قروء کا لفظ طہر اور حیض دونوں معنی کو شامل ہے، اور یہ قرآن کے بیان کا اعجاز ہے کہ ایک ہی لفظ لا کر دونوں حالت کو بیان کر دیا گیا، اس کے متعلق امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد تین دور یا ایک حالت سے دوسرے حالت کی تین بار

تبدیلی مراد ہے، اور مطلقہ کی صرف دو ہی حالتیں ہیں: کبھی حیض سے طہر کی طرف منتقل ہوتی ہے اور کبھی طہر سے حیض کی طرف ،اس طرح سے آیت کی دلالت حیض اور طہر دونوں معنی پر درست ہوگی اور قرء کا لفظ دونوں معنی کو مشترک ہوگا(۱)۔ عدل وانصاف اور حقوق کی حفاظت کا تقاضا ہے کہ مطلقہ اتنی مدت تک انتظار کرے تاکہ اس بات کی تاکید ہو جائے کہ عورت حمل سے نہیں ہے اور نسب میں کسی طرح کے اختلاط سے بچا جاسکے، اور اگر طلاق دینے والے شوہر کی اس سے کوئی اولاد ہونے والی ہو تو اس تعلق سے اس کی کوئی حق تلفی نہ ہو، اسی طرح دوسرے ہونے والے شوہر کے حقوق کی بھی حفاظت ہو اور اس کے نسب میں کوئی غیر نسب کا دوسرا داخل نہ ہو، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں نسب اور نسل کے حفاظت اور پاکیزگی کی کافی اہمیت ہے، اور اس میں شریعت اسلامیہ کے عدل وانصاف اور اس کے عظیم الشان احکامات کی گیرائی کا بھی ثبوت ہے۔

بلکہ عورتوں کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اگر طلاق دینے والے شوہر سے اس کے پیٹ میں کوئی حمل ہے تو وہ اپنے اس حمل کو واضح طور پر بیان کردے ،ارشاد الہی ہے: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ ٱللَّهُ فِىٓ أَرْحَامِهِنَّ﴾ " انہیں حلال نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو پیدا کیا ہو اسے چھپائیں "، یہ نہی اس بات کی متقاضی ہے کہ عورت کا اپنے پیٹ میں جنین کا چھپائے رکھنا حرام ہے، کیوں کہ یہ طلاق دینے والے شوہر کا حق ہے اور وہی اس لڑکے کا باپ اور وہ لڑکا بھی اس کے نسب کا اور اپنے اسی باپ کی طرف نسبت مستحق ہے۔ آیت کریمہ میں توحید ربوبیت کی تاکید ہے، کیوں کہ اللہ تعالی فرماتا ہے کہ وہی اس جنین کا خالق ہے، اور یہ تخلیق اللہ تعالی کی خاص صفت ہے، فرمایا: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ ٱللَّهُ فِىٓ أَرْحَامِهِنَّ﴾ " انہیں حلال نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو پیدا کیا ہو اسے چھپائیں "۔ یعنی وہ صرف اللہ تعالی کی ذات ہے جو رحم مادر میں جنین کی تخلیق کا عمل انجام دیتی ہے۔ تاکہ تخلیق کا یہ عمل میاں بیوی کی طرف منسوب نہ کیا جائے، وہی اللہ پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے، بیوی تو صرف اس کو یا تو بیان کر سکتی یا چھپا سکتی ہے، اس لیے اللہ تعالی نے اس حمل کو چھپانے سے منع کیا اور اسے ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کا ثمرہ قرار دیا، اس سے معلوم ہوا کہ دعوتی

---

(۱) تفسیر قرطبی ۳/۷۶.

اور تربیتی میدان میں یہ ایمان کافی نتیجہ خیز اور بار آور ہے،اسی طرح حق وغیرہ کی وصولی میں ایمان باللہ والیوم الآخر اس ناحیے سے کافی اہم ہے کہ اس کی وجہ سے انسان کے اندر اللہ تعالی کا خوف اجاگر اور ایمانی پختگی حاصل ہوتی ہے اور ایک صاحب ایمان اللہ تعالی کے خوف کی وجہ سے امانت کی ادائیگی کے لیے تیار رہتا ہے جس نے کہ اس کو نعمت ایمان سے نوازا اور اس کے اندر یہ صفت پیدا کی۔ایمان اور خوف الہی کی یہ صفت اس کے حق گوئی کا سب سے بڑا سبب ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ اپنی طبیعت پر ناگوار امور میں بھی سچ سے گریز نہیں کرتا اور ساتھ ہی اس میں اللہ تعالی پر اور حساب وجزاء والے دن پر ایمان کے باوجود حقیقت بیانی سے گریز کرنے پر وعید بھی ہے: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ ٱللَّهُ فِيٓ أَرْحَامِهِنَّ إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْآخِرِۚ﴾ "انہیں حلال نہیں کہ اللہ نے ان کے رحم میں جو پیدا کیا ہوا سے چھپائیں ، اگر انہیں اللہ تعالی پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہو"۔ لہذا مومنہ عورتوں کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ حقیقت نہیں چھپاتیں، کیوں کہ اللہ تعالی پر ان کا ایمان ہوتا ہے اور اس کی بدولت وہ کتمان حق سے دور رہتی ہیں،اسی طرح قیامت کے دن پر ایمان بھی ان کو کتمان حق سے دور رکھتا ہے جس کے بارے ان کو بخوبی علم ہے کہ وہ حساب وکتاب اور جزاء کا دن ہے۔اس آیت کریمہ سے یہ فائدہ ماخوذ ہے کہ ایسے اوصاف وخصائص جو کار خیر کے لیے تشجیع اور برائی سے بچنے کا سبب ہوں ان سے استفادہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی شوہر کے لیے اپنی بیوی کو دوبارہ اپنے نکاح میں لوٹانے کے جواز کا حکم بیان کررہا ہے: ﴿وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ﴾ " ان کے خاوند اس مدت میں انہیں لوٹا لینے کے پورے حقدار ہیں"۔یہ اس روشن شریعت اسلامیہ کی آسانی اور اللہ تعالی کی بے پناہ رحمت ہے کہ بیوی جب تک عدت میں ہے اس نے شوہر کے لیے اپنی اس بیوی کو دوبارہ نکاح میں لوٹا لینے کا موقع فراہم کیا ، معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ کا مقصد تفرقہ کو دور کرنا ہے اور اس کے لیے اس کی ہر ممکن کوشش ہے۔ آیت میں اللہ تعالی نے شوہر کے لیے "بعل" کا لفظ استعمال کیا، اور یہ بھی ایک فائدے کے تحت ہے کیوں شوہر کو اپنی بیوی پر بلندی حاصل ہوتی ہے، کیوں کہ عورت کی زوجیت کی ملکیت کا حق اللہ تعالی نے شوہر ہی کو عطا کیا ہے ،اور بعل کا لفظ رب کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان

ہے: ﴿ أَتَدۡعُونَ بَعۡلًا ﴾ [سورة الصافات:١٢٥]۔ "کیا تم بعل (نامی بت) کو پکارتے ہو" بعل کے اصلی معنی رب اور مالک کے ہیں، اوراس کو بعل (مشرکین کے نزدیک) اس کے بلندیٔ مقام کی وجہ سے کہتے ہیں۔ آیت کریمہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کو لوٹانے اور اس سے رجوع کا قصد وارادہ اصلاح اور خیر خواہی کی غرض سے ہو نہ کہ اس کو کوئی تکلیف دینا اور ایذاء پہنچانے کی غرض سے۔ ارشاد الہی ہے: ﴿وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنۡ أَرَادُوٓاْ إِصۡلَٰحًا ﴾ " ان کے خاوند اس مدت میں انہیں لوٹا لینے کے پورے حقدار ہیں اگر ان کا ارادہ اصلاح کا ہو" اس فرمان سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ منہج اسلام کی بنیاد نیک نیتوں پر قائم ہے اور فریق ثانی کو تکلیف دینے کی غرض سے غلط نیتوں کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے، اس لیے ایک شوہر کے لیے قطعا جائز نہیں کہ وہ اپنی بیوی کو تکلیف اور ایذاء پہنچانے کی غرض سے رجعت کرے، اور ظاہر ہے اس چیز کا تعلق اس کی نیت سے ہے جس کو صرف وہی جانتا ہے اس کے علاوہ دوسرا کوئی اس سے واقف نہیں ہوتا، لیکن ایک ذات ہے جو اس سے بھی پہلے جاننے والی اور حکمت والی ہے، یعنی اللہ سبحانہ وتعالی کی ذات ، اس لیے اس بات کا امکان ہی نہیں کہ یہ چیز کسی غیر منہجی نظام کے تحت ہو اس لیے ایک مسلم کو چاہیے کہ شریعت اسلامیہ اور ایمان کی نعمت کو سمجھے جس کے اثرات اس کے سلوک ورہن سہن اور آپسی تعلقات پر بھی عیاں ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ اللہ تعالی نے اس شریعت کی حفاظت ایک منہج کے تحت کی جس کے بنا اس کا تحقق ممکن نہ تھا، لہذا تمام تعریفیں اور شکر اللہ تعالی کے لیے ہیں۔ نیز اس آیت کریمہ کے مفاہیم کے اور بھی ڈھیر سارے فوائد ہیں، اس موضوع اور باب میں یا دوسرے ابواب میں دقیق اور باریک مسائل و احکام کا ایک ذخیرہ اسلامی فقہ میں موجود ہے، چنانچہ علماء اسلام نے اس آیت کریمہ اور اس کے علاوہ دیگر آیات سے میاں بیوی کی زندگی کے متعلق بہت سارے پر اثر احکامات ومسائل کا استنباط کیا ہے ، جو ان احکامات ومسائل کی معرفت کا خواہاں ہے اس کو کتب فقہ اور تفسیر کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اس کے بعد زوجین کے مابین حقوق کے متعلق ایک بڑی منصفانہ بات بیان کی جارہی ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَهُنَّ مِثۡلُ ٱلَّذِي عَلَيۡهِنَّ بِٱلۡمَعۡرُوفِ ﴾" اور عورتوں کو بھی ویسے ہی حق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں اچھائی کے ساتھ"۔ یعنی جس طرح کے حقوق مردوں کے ہیں اسی طرح

کے حقوق ان مردوں پر عورتوں کے بھی ہیں، چنانچہ ہر کوئی ایک دوسرے کے حقوق کے ذمہ دار ہیں اور ہر ایک کو چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کے حقوق بحسن وخوبی ادا کریں۔اس کے بعد اللہ تعالی شوہر کی زائد فضیلت کا ذکر کر رہا ہے: ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾" ہاں مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے "۔یعنی مردوں کو عورتوں پر ایک حد تک فضیلت اور برتری حاصل ہے ،اس کی وجہ یہ کہ مرد ہی سارے اخراجات کے ذمہ دار ہوتے ہیں، نیز مرد ہی کے اندر انتظام وتدبیر اور حفاظت ونگرانی کا خاصہ پایا جاتاہے،اس لیے ضروری ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر برتری اور قیادت کا حق حاصل ہو اور اس برتری سے کسی دوسرے کے حق کی تنقیص مقصود نہیں، ہاں اللہ تعالی نے ولایت وسرپرستی کا حق مردوں کو دیا ہے کیوں کہ انسانی طبیعت وفطرت اسی بات کی متقاضی ہے کیوں کہ لوگوں کے امور زندگی کسی کی سرپرستی کے بغیر نہیں چل سکتے،اسی امر کی وضاحت اللہ تعالی نے سورۃ النساء کی آیت میں فرمائی : ﴿الرِّجَالُ قَوَّٰمُونَ عَلَى ٱلنِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ ٱللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَآ أَنفَقُواْ مِنْ أَمْوَٰلِهِمْ﴾ [سورة النساء:٣٤]۔"مرد عورت پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے مال خرچ کئے ہیں"۔یہ فضیلت اور بلندی مقام بھی اللہ تعالی کا انعام ہے تاکہ خانگی امور اور خاندانی بقا کے وسائل بہتر رہیں جس کے نتیجے میں ذریت ونسل پروان چڑھتی ہے، اوران مسائل وامور کی رعایت ، حل اور ذمہ داری کا عمل عمدہ طریقے سے انجام پاسکے ۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس آیت کریمہ کا اختتام یوں کر رہا ہے: ﴿وَٱللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾" اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے"۔یہ اس بات کی وضاحت وتاکید ہے کہ اللہ تعالی ہی غالب ہے اور اسی کو ساری طاقت اور قدرت کاملہ حاصل ہے اور اس وصف کا لازمی تقاضا ہے کہ اس کی نافرمانی اور احکامات کی خلاف ورزی کرنے والا اللہ تعالی کے انتقام سے ڈرے ۔آیت میں اللہ تعالی کی دوسری صفت حکیم (حکمت والا) ہے یعنی اللہ تعالی نے جو بھی تشریعی قوانین اور احکامات نازل فرمائے اس میں اس کی حکمت کارفرما ہے۔اللہ تعالی کے ان صفات کی معرفت اور اس آیت کریمہ کے موضوع سے اس کا تعلق اس بات کا متقاضی ہے کہ اللہ تعالی کے احکامات کی خلاف ورزی سے بچا جائے اور اس کے کسی بھی حکم پر اعتراض نہ

کیا جائے، کیوں کہ وہ حکمت والا ہے اس نے جو کچھ بھی مشروع کیا وہ حکمت سے خالی نہیں، وہ اپنی مخلوق یعنی انسانوں کے متعلق وہ سب جانتا ہے جس کا علم انسان کو خود اپنے بارے میں نہیں ہے، وہ انسانوں کا خالق ہے اور وہ انسانوں سے سب سے زیادہ قریب ہے حتی کہ انسان بھی اپنی ذات سے اتنا قریب نہیں۔

﴿ٱلطَّلَٰقُ مَرَّتَانِۖ فَإِمۡسَاكُۢ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ تَسۡرِيحُۢ بِإِحۡسَٰنٖۗ وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ أَن تَأۡخُذُواْ مِمَّآ ءَاتَيۡتُمُوهُنَّ شَيۡـًٔا إِلَّآ أَن يَخَافَآ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِۖ فَإِنۡ خِفۡتُمۡ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيمَا ٱفۡتَدَتۡ بِهِۦۗ تِلۡكَ حُدُودُ ٱللَّهِ فَلَا تَعۡتَدُوهَاۚ وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ ٱللَّهِ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿٢٢٩﴾ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُۥ مِنۢ بَعۡدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهُۥۗ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ أَن يَتَرَاجَعَآ إِن ظَنَّآ أَن يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِۗ وَتِلۡكَ حُدُودُ ٱللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٖ يَعۡلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾﴾

ترجمہ:

"یہ طلاقیں دو مرتبہ ہیں پھر یا تو اچھائی سے روکنا، یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دینا، اور تمہیں حلال نہیں تم نے انہیں جو دیا ہے اس میں سے کچھ بھی لو، ہاں یہ اور بات ہے کہ دونوں کو اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکنے کا خوف ہو اس لئے اگر تمہیں ڈر ہو کہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت رہائی پانے کے لئے کچھ دے ڈالے، اس میں دونوں پر گناہ نہیں، یہ اللہ کی حدود ہیں خبردار ان سے آگے نہیں بڑھنا اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کر جائیں وہ ظالم ہیں (۲۲۹)۔ پھر اگر اس کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو اب اس کے لئے حلال نہیں جب تک کہ وہ عورت اس کے سوا دوسرے سے نکاح نہ کرے، پھر اگر وہ بھی طلاق دے دے تو ان دونوں کو میل جول کر لینے میں کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ جان لیں کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے، یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں جنہیں وہ جاننے والوں کے لئے بیان فرما رہا ہے (۲۳۰)۔

یہاں سے طلاق اور اس کے آداب کا بیان ہو رہا ہے، فرمایا: ﴿ٱلطَّلَٰقُ مَرَّتَانِۖ﴾ "یہ طلاقیں دو مرتبہ ہیں"۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی اور دوسری طلاق کے بعد رجعت کو جائز قرار دیا ہے بشرط یہ کہ عورت عدت کے اندر ہو، اور تیسری بار میں وہ بائنہ یعنی شوہر سے جدا ہو جائے گی، اس طلاق رجعی میں ﴿

فَإِمۡسَاكُۢ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ تَسۡرِيحُۢ بِإِحۡسَٰنٍۗ ﴾" پھر یا تو اچھائی سے روکنا، یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دینا"۔ یہی رجعت یا آخری جدائی کا ضابطہ ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ پہلی طلاق ہو جانے کے بعد غور و فکر کی پوری گنجائش رکھی گئی ہے اور یہ گنجائش دوسری طلاق کے بعد بھی باقی رکھی گئی، تاکہ طلاق کے معاملہ میں دو بار کے تجربہ کے بعد تیسری طلاق میں جلد بازی سے کام نہ لے، اسی طرح یہ موقع ان دونوں کے لیے بھی ہے جو اس بات پر متفق نہ ہو سکیں کہ یہ ازدواجی تعلقات بہتر طریقے سے ختم ہو جائیں یعنی جدائی کے حسن تعامل پر ان کا اتفاق نہ ہو سکے، یہ آیت کریمہ انتہائی اعلی قسم کے ادب اور رحم و کرم کی حامل ہے ، شوہر کے لیے یہ حکم ساتویں آسمان کے اوپر سے نازل ہوا ہے تاکہ وہ اپنی مطلقہ بیوی کے حقوق کا پاس و لحاظ رکھے اور وہ اس کو یا تو بھلائی کے ساتھ اپنی زوجیت میں روک رکھے اور اس کے ساتھ حسن صحبت و معاشرت کا خیال کرتے ہوئے اس کے عام حقوق ادا کرے اور اس کے ساتھ بہتر طریقے سے رہے سہے، یا پھر عمدگی کے ساتھ اس کو چھوڑ دے، احسان کے لفظ میں ہر طرح کی خوبصورتی اور عمدگی کا مفہوم پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ ہر طرح کے ظلم اور زیادتی سے بچا جا سکتا ہے، بلکہ صرف یہی نہیں کہ اس پر ظلم کرنے سے بچا جائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر احسان کی حد تک برتاؤ کرنے کی بات کہی گئی ہے، کیوں کہ احسان کے لفظ میں تین معانی اور اخلاقی مفاہیم پائے جاتے ہیں، اول: ظلم کی ممانعت، کیوں کہ ظلم احسان کے منافی ہے۔ دوم: عورت کے مادی اور معنوی حقوق کی ادائیگی کیوں کہ یہ احسان کا لازمی حصہ ہے۔ سوم: مادی اور معنوی حقوق میں اضافہ کے ساتھ ادائیگی اور یہی کامل درجے کا احسان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت الہی کا دار و مدار احسان ور حم و کرم اور معروف طریقے سے حقوق کی ادائیگی پر ہے بایں طور کہ کسی کو نقصان نہ پہنچایا جائے، اس لیے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے زوجین کے لیے ضروری ہے کہ ان اخلاق فاضلہ سے خود کو آراستہ کریں، کیوں کہ اس کا اثر اولاد کے اخلاق و کردار اور نفسیات پر پڑتا ہے اور انہی اولاد پر خاندانی ترقی اور افزائش کا دار و مدار ہے، بلکہ اسی نہج پر ان کی پرورش و پرداخت ہوتی ہے اور مستقبل میں اسی طرز حیات کے اثرات ان کے خاندانی وجود پر نمایاں ہوتے ہیں، کیوں کہ اسی ایک خاندان سے دیگر خاندان وجود میں آتے ہیں اور دوسرے خاندان اسی ایک بنیادی خاندان کا حصہ ہوتے ہیں۔

آیت کریمہ کے طرز بیان کے اعجاز میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالی نے عورت کو روک رکھنے میں خیر وبھلائی کی تمام خصلتوں کو صرف ایک لفظ میں سمیٹ دیا ہے اور وہ (معروف) کا لفظ ہے، اسی طرح (احسان) کے لفظ میں بھلائی کے سارے پہلوؤں کا احاطہ کر لیا گیا ہے جس کا استعمال عورت کو چھوڑنے کے تعلق سے کیا گیا ہے، ان دونوں لفظوں میں اس قدر وسعت اور گنجائش ہے کہ اخلاقیات کا مکمل بیان کر دیا گیا، یہ صرف قرآن کریم کا بلاغی معجزہ ہے اور اس کے مضامین اعلی اخلاق کے حامل ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی مردوں کو حکم دے رہا ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق میں ظلم وزیادتی نہ کریں، فرمایا: ﴿وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَأْخُذُواْ مِمَّآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ شَيْـًٔا﴾ "اور تمہیں حلال نہیں تم نے انہیں جو دیا ہے اس میں سے کچھ بھی لو"۔ یعنی شوہر کے لیے بیوی کے مہر میں سے کچھ بھی لینا حرام ہے (وَلَا يَحِلُّ) کا مطلب یہ ہے کہ مہر کا یہ مال عورت کی ملکیت ہے اور اس میں کسی طرح کی زیادتی جائز نہیں، اور شوہروں کا اسے لینا ظلم وزیادتی کی قبیل سے ہے اور یہ حرام ہے، یہ شریعت اسلامیہ کی دین ہے کہ اس نے حقوق کے متعلق دقیق سے دقیق امور کی حفاظت فرمائی۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے زوجین کے لیے ایک استثنائی حکم بیان فرمایا جس کے ذریعہ زوجین کے درمیان بغیر کسی طرح کے آپسی نقصان کے جدائی کا عمل انجام پاتا ہے، ارشاد ہے: ﴿إِلَّآ أَن يَخَافَآ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِ﴾ "ہاں یہ اور بات ہے کہ دونوں کو اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکنے کا خوف ہو"۔ اللہ تعالی کی جانب سے خطاب زوجین کے لیے ہے، یعنی اگر میاں اور بیوی کو یہ خوف اور ان کا یہ غالب گمان ہو کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ضروری حقوق ادا نہیں کر سکتا تو اس کا حل اللہ تعالی کے اس فرمان میں پیش کیا جا رہا ہے: ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا ٱفْتَدَتْ بِهِۦ﴾ "اس لئے اگر تمہیں ڈر ہو کہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو عورت رہائی پانے کے لئے کچھ دے ڈالے، اس میں دونوں پر گناہ نہیں" اس آیت میں خطاب حاکموں، اصلاح کرانے والوں اور بھلائی کی نیت سے مسئلہ کے حل کے لیے بیچ میں پڑنے والوں کو کیا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے ان سے یہ بیان کیا کہ عورت کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ چھٹکارا پانے کے لیے اپنے شوہر کو کچھ دے اور شوہر کے لیے بھی اس کا لینا جائز ہے، اسی کا نام شریعت میں "خُلَع" ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے حدود کا قیام ضروری ہے اور زوجین کے باہمی

تعلقات کادار و مدار انہی حدود کے قیام پر ہے،اسی سے یہ تعلقات برقرار رہتے یا ختم ہوتے ہیں،جب تک حدود اللہ کے قیام کی قوت کا فقدان ہوگا ان تعلقات کے بقااور استمرار کے لیے کوئی دوسرا سبب کار گر نہیں ہو سکتا۔اور حدود اللہ سے مراد وہ مقام ہے جہاں بندہ رک جائے اور اس سے آگے نہ بڑے،اس ضمن میں تمام اوامر ونواہی، فرائض و حقوق، واجبات اور ذمہ داریاں شامل ہیں۔ معلوم ہوا کہ خاندان کا قیام پورے طور پر اللہ تعالی کی حفظ ورعایت میں ہے ،اس کے وجود وبقا یا ختم ہو جانے کے اسباب کی تفصیل اللہ تعالی نے بیان کر دی ہے،اب ایک مسلمان کا فرض بنتا ہے کہ اس عظیم خاندانی وجود کا احترام کرے۔

اس آیت کے الفاظ پر غور کریں تو اس سے ایک فائدہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کے فرمان ﴿إِلَّآ أَن يَخَافَآ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِ﴾ میں خطاب کا تعلق زوجین سے ہے اور یہ ان ہی کے ساتھ خاص ہے کیوں کہ اس کا تعلق ایسے امور سے ہے جنہیں صرف وہی دونوں جان اور سمجھ سکتے ہیں، بطور ظن غالب یہ ان دونوں کا آپسی معاملہ ہے،اور ماضی کے رہن سہن سے وہ اپنے آپسی حالات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ وہ دونوں اللہ تعالی کے حدود کو قائم نہیں رکھ پائیں گے،اور ان کے مابین کسی بھی طرح کی ناپسندیدگی کے وقوع کا خطرہ لگا ہو گا،اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ ہونے کی اجازت دے دی گئی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے میاں بیوی کو حدود اللہ سے تجاوز کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا:﴿تِلْكَ حُدُودُ ٱللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا﴾" یہ اللہ کی حدود ہیں خبردار ان سے آگے نہیں بڑھنا"،آیت کریمہ میں پہلے یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالی نے ان حدود کو بیان کر دیا ہے﴿تِلْكَ حُدُودُ ٱللَّهِ﴾ " یہ اللہ کی حدود ہیں "،اس کے بعد ان حدود سے آگے بڑھنے سے روکا:﴿فَلَا تَعْتَدُوهَا﴾" خبردار ان سے آگے نہیں بڑھنا"، چنانچہ جملے کی ساخت میں ترتیب کی خاص رعایت کی گئی ہے کہ پہلے ان حدود کو بیان کیا گیا پھر ان حدود سے آگے بڑھنے سے منع کیا گیا۔

حدود اللہ سے مراد اللہ تعالی کی عظیم شریعت ہے جو امر ونواہی، واجبات و حقوق اور مسؤولیات پر مشتمل ہے،اللہ تعالی نے ان حدود کو بیان کرنے کے بعد ان حدود کے تئیں میاں بیوی کے فرض منصبی

سے آگاہ کیا کہ وہ ان حدود کی پابندی کرتے ہوئے اللہ تعالی کے احکامات کو بجالائیں ،اور ان احکامات کی مخالفت و کوتاہی اور زیادتی کرکے حد سے تجاوز نہ کریں ، کیوں کہ ان حدود سے تجاوز کرنے والا خود پر ظلم کے ساتھ دوسروں پر ظلم کا مرتکب ہوتا ہے۔ ﴿وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ ٱللَّهِ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴾ "اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کر جائیں وہ ظالم ہیں"۔یعنی جو حلال کو چھوڑ کر حرام کا مرتکب ہو ، فرائض وواجبات کی ادائیگی میں کوتاہی برتے اور نیکی کی بجائے برائی اختیار کرے وہی ظالم ہے اور ایسا شخص سزا کا مستحق ہے ، یہ آیت ظلم کے حرمت کی دلیل ہے کیوں کہ اللہ تعالی نے اس آیت میں حدود اللہ سے تجاوز کرنے والے کو ظالم کے وصف سے پکارا ہے۔ ہم اللہ تعالی سے سلامتی اور توفیق کی دعا کرتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی ایسی صورت کا بیان کر رہا ہے جس میں مطلقہ عورت طلاق بائن کے بعد طلاق دینے والے شوہر کے پاس واپس لوٹ سکتی ہے، فرمایا: ﴿ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُۥ مِنۢ بَعۡدُ ﴾ "پھر اگر اس کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو اب اس کے لئے حلال نہیں"۔یعنی جب طلاق بائن ہو جائے تو وہ بیوی اس شوہر کے لیے حلال نہیں رہتی، حرام ہو جاتی ہے، ہاں اس کی ایک شکل ہے جس کو اللہ تعالی بیان کر رہا ہے: ﴿ فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُۥ مِنۢ بَعۡدُ حَتَّىٰ تَنكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهُۥۗ ﴾ "پھر اگر اس کو (تیسری بار) طلاق دے دے تو اب اس کے لئے حلال نہیں جب تک کہ وہ عورت اس کے سوا دوسرے سے نکاح نہ کرے"۔یعنی کوئی دوسرا شخص اس سے نکاح کرے، پھر از خود طلاق دے دے یا اس کا انتقال ہو جائے تو ایسی صورت میں نئے سرے سے سابقہ میاں بیوی کے درمیان نکاح جائز ہے۔ ﴿فَإِن طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ أَن يَتَرَاجَعَآ ﴾ "پھر اگر وہ بھی طلاق دے دے تو ان دونوں کو میل جول کر لینے میں کوئی گناہ نہیں"۔ آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اگر دوسرا شوہر طلاق دے دے تو طرفین یعنی پہلے شوہر اور دوسرے شوہر سے طلاق یافتہ عورت کے درمیان رجعت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

(أَن يَتَرَاجَعَآ) کے لفظ یہ پتہ چلتا ہو کہ رجوع کرنے کی خواہش میاں وبیوی دونوں میں ہونی چاہیے ، نیز اس رجعت کی بھی ایک شرط ہے جس سے وہ دونوں بخوبی واقف ہوں اور وہ شرط ہے حدود اللہ کا قیام: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ أَن يَتَرَاجَعَآ إِن ظَنَّآ أَن يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِۗ ﴾ "ان دونوں کو میل جول کر لینے میں کوئی گناہ

نہیں ، بشرطیکہ جان لیں کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے "۔یعنی ان کا ظن غالب ہو کہ وہ اللہ تعالی کی حدود کو قائم کر سکیں گے ، اس شرط کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تعلقات محض آپسی رغبت کی بنیاد پر نہیں ہونے چاہئیں ، بلکہ ساتھ میں اللہ تعالی کے حدود کے قیام کی قدرت اور طاقت بھی ہونی چاہیئے جس میں زوجیت کے تمام حقوق کی ادائیگی بھی شامل ہے ، کیوں کہ ازدواجی حقوق کی ادائیگی ہی خوشحال زندگی کا واحد راستہ اور بہتر خاندان کی بنیاد ہے ، اسی میں آنے والی نسلوں کی حفاظت ہے ، معلوم ہوا کہ ازدواجی حقوق کی قدر و تعظیم کافی اہمیت رکھتی ہے ، کیوں کہ زوجین کو باقاعدہ ان حقوق کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے ، یہ محض استحبابی معاملہ نہیں جسے ایک دوسرے کے لیے انجام دیا جائے اور نہ ہی ایک دوسرے پر احسان جتلانے کا مجال ہے ، بلکہ یہ اللہ تعالی کا احسان ہے کہ اس نے یہ احکامات اور ازدواجی زندگی کے شرعی قوانین بنائے۔اس کے برعکس یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جب زوجین کا غالب گمان یہ ہو کہ وہ دونوں حدود اللہ کی پاسداری نہیں کر پائیں گے تو ایسی صورت میں ان کے لیے رجعت کی کوشش کرنا جائز نہیں جب تک کہ ان کی آپس کی ناگوار زندگی میں سدھار نہ آجائے یا وہ خود اس میں سدھار نہ کر لیں ، کیوں کہ ایسی حالت میں رجعت کی بنیاد پر بہت سارے بگاڑ اور مفاسد کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

فرمان الہی: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَن يَتَرَاجَعَآ إِن ظَنَّآ أَن يُقِيمَا حُدُودَ ٱللَّهِ﴾ "ان دونوں کو میل جول کر لینے میں کوئی گناہ نہیں ، بشرطیکہ جان لیں کہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے "۔اس سے ایک فائدہ یہ بھی ماخوذ ہے کہ معاملات کا فیصلہ ظن غالب کی بنیاد پر ہونا چاہیے ، اس لیے جب آدمی کسی معاملہ میں تردد کا شکار ہو اور اس کے لیے سوائے گمان کی بنیاد پر عمل کرنے کے دوسرا کوئی چارہ کار نہ ہو تو ایسی صورت میں اس کو وہی عمل اختیار کرنا چاہیے جس کے بہتر ہونے کا گمان غالب ہو ، تاکہ شک کے دائرے سے نکل کر پختہ ارادہ کرتے ہوئے اللہ پر بھروسہ کرے ، کیوں کہ اسلام میں شک کی گنجائش نہیں ، اس لیے کہ شک انسان میں وسوسے پیدا کرتا ہے ، اور یہ وسوسہ ایک مسلم کے لیے تکلیف کا باعث اور مختلف قسم کے شر و فساد کا سبب ہے ، مثال کے طور پر کوئی شخص وضو کرے اور پھر اس کو وضو کے ٹوٹ جانے کا شک لاحق ہو جائے تو اصل پر قائم رہتے ہوئے شک کو ختم کر دے تاکہ شک کا سرے سے خاتمہ ہو جائے۔

اس کے بعد آیت کا اختتام اللہ تعالی کے اس فرمان سے ہوتا ہے: ﴿وَتِلْكَ حُدُودُ ٱللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾ "یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں جنہیں وہ جاننے والوں کے لئے بیان فرمارہا ہے"۔ یعنی شادی، ازدواجی زندگی اور طلاق کے مسائل کے متعلق یہ اللہ تعالی کے شرعی احکامات ہیں جن کو ہمارے رب نے بیان کیا ہے، اس میں اس بات کی تاکید ہے کہ ان احکامات کا علم حاصل کرنا اور عملی میدان میں ان کو نافذ کرنا اور بجالانا اور ان احکامات کے تجاوز سے پرہیز لازمی ہے، کیوں کہ یہ وہ احکامات ہیں جنہیں اللہ تعالی نے نہایت واضح انداز میں بیان کر دیا ہے۔ ﴿لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾ "جاننے والوں کے لئے" یعنی جن میں سیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں ہیں ، اس کے بعد ان پر حجت قائم ہو جاتی ہے، کیوں کہ جب اللہ تعالی نے انسان کو سوچنے سمجھنے اور علم کی صلاحیت دی ہے جس کے ذریعہ وہ زوجین کے فرائض وواجبات کے بارے میں اپنی لاعلمی اور جہالت دور کر سکتا ہے تو وہ ان احکامات سے لاعلم نہیں مانے جائیں گے، اور ان احکامات کی بجاآوری ان کے لیے لازم ہے، اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ ازدواجی حقوق وواجبات کی جانکاری میاں وبیوی پر واجب ہے کیوں کہ ان کی جانکاری کے بغیر عمل ناممکن ہے، بلکہ ان کی معرفت اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ ان کی ادائیگی اس انداز میں ہو سکے جس طرح سے اللہ تعالی نے فرض کیا ہے ، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ میاں بیوی کے ایک دوسرے کے حقوق وواجبات کا علم اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ ان کا شمار ظالموں میں سے نہ ہو، کیوں کہ اللہ تعالی نے سابقہ آیت کے اخیر میں حدود اللہ سے تجاوز کرنے والوں کو ظالم گردانا ہے: ﴿وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ ٱللَّهِ فَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ﴾ "اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کر جائیں وہ ظالم ہیں"۔

﴿وَتِلْكَ حُدُودُ ٱللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾ "یہ اللہ تعالیٰ کی حدود ہیں جنہیں وہ جاننے والوں کے لئے بیان فرمارہا ہے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان حدود کا علم حاصل کرنا میاں بیوی کے لیے ضروری ہے۔

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ ٱلنِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا۟ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُۥ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوٓا۟ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ هُزُوًا ۚ وَٱذْكُرُوا۟ نِعْمَتَ ٱللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ ٱلْكِتَٰبِ وَٱلْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِۦ ۚ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾﴾

ترجمہ:

"جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت ختم کرنے پر آئیں تو اب انہیں اچھی طرح بساؤ یا بھلائی کے ساتھ الگ کر دو ، اور انہیں تکلیف پہنچانے کی غرض سے ظلم اور زیادتی کے لئے نہ روکو جو شخص ایسا کرے اس نے اپنی جان پر ظلم کیا تم اللہ کے احکام کو ہنسی کھیل نہ بناؤ اور اللہ کا احسان جو تم پر ہے یاد کرو اور جو کچھ کتاب و حکمت اس نے نازل فرمائی ہے جس سے تمہیں نصیحت کر رہا ہے اس سے بھی۔ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے (۲۳۱)۔

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ طلاق کے آداب اور طریقہ بیان کر رہا ہے، فرمایا: ﴿وَإِذَا طَلَّقۡتُمُ ٱلنِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ أَجَلَهُنَّ ﴾" جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت ختم کرنے پر آئیں" (فَبَلَغۡنَ أَجَلَهُنَّ)اس جملے سے معلوم ہوا کہ مطلقہ کے لیے ایک وقتی مدت مقرر ہے، اور یہ طلاق رجعی یعنی پہلی اور دوسری طلاق کے بعد ہے، کیوں کہ ان دونوں طلاقوں کی ایک مقررہ مدت ہے جس کو عدت کہا جاتا ہے اور اس مدت کے دوران آدمی کو دو اختیارات حاصل ہیں، یا تو وہ اپنی بیوی سے رجوع کر لیں یا اس کو چھوڑ دیں، ان دونوں اختیارات کے بھی کچھ ضروری آداب ہیں اور یہ آداب اختیاری نہیں کہ چاہیں تو بجالائیں اور چاہیں تو ترک کر دیں ، فرمایا: ﴿فَأَمۡسِكُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٖۚ ﴾ "تو اب انہیں اچھی طرح بساؤ یا بھلائی کے ساتھ الگ کر دو "۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جاب سے واجبی حکم ہے کہ رجوع ازدواجی تعلقات کے حقوق واجبات کی ادائیگی کے مقصد وارداے سے ہونا چاہیے ، اچھی طرح بسانے کا یہی مطلب ہے ، اسی طرح بیوی سے علیحدگی اس طرح سے ہو کہ اس کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے ، بھلائی کے ساتھ علیحد گی کا یہی مفہوم ہے ، دونوں صورتوں میں کسی طرح کی شدت اور ضرر رسانی مقصود نہ ہو ، چنانچہ رجوع کی صورت میں بھی بیوی کو تکلیف دینا مقصود نہ ہو ، اس لیے فرمایا: ﴿وَلَا تُمۡسِكُوهُنَّ ضِرَارٗا لِّتَعۡتَدُواْۚ ﴾" اور انہیں تکلیف پہنچانے کی غرض سے ظلم اور زیادتی کے لئے نہ روکو" یعنی ظلم اور تکلیف دینے کی نیت سے رجوع نہ کرو ، مثال کے طور پر شوہر محض عدت لمبی کرنے کی غرض سے رجوع کرے یا کسی دوسرے برے ارادے سے ۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ضرر

رساں شخص کے بارے میں فرمایا کہ وہ خود پر ظلم کرنے والا ہے: ﴿وَمَن يَفۡعَلۡ ذَٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهُۥ﴾ "جو شخص ایسا کرے اس نے اپنی جان پر ظلم کیا" یعنی اللہ تعالی کے فرائض واحکامات کے ساتھ زیادتی کرنے والا اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے کیوں کہ اپنی مطلقہ بیوی پر ظلم اللہ کے فرائض کے ساتھ زیادتی ہے،اس طرح سے وہ دوہرے ظلم کا ارتکاب کرتا ہے ، نیز بیوی پر ظلم اپنے آپ پر ظلم کرنا اس اعتبار سے بھی ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے اس ظلم کی سزا اسی کو ملنے والی ہے،اور اپنی جان پر ظلم میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اس کا اپنی بیوی کو تکلیف دینا اس کے نزدیک متحقق ہے لیکن وہ جان بوجھ کر یا انجانے میں یہ بھولا ہوا ہے کہ یہ ظلم خود اس کی ذات کے ساتھ ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے وہ خود کو عذاب الہی کا مستحق کرلیتا ہے۔

یہاں پر ان آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں خطاب مردوں کو ہے، کیوں کہ انہی کو فوقیت اور برتری حاصل ہے اور وہی معاملات کے ذمہ دار ہوتے ہیں،اور چاہے بیوی کو روک رکھنے کا معاملہ ہو یا الگ کردینے کا شوہر کی خفیہ نیتوں سے دوسرا کوئی واقف نہیں ہوتا، ہاں صرف اللہ تعالی کی ذات ہے جو اس کی نیت سے پہلے ہی سے آگاہ ہوتا ہے، اسی لئے خطاب کا رخ اور تحذیر شوہروں کے لیے ہی ہے اور سزاوار بھی انہی کو ٹھہرایا گیا ہے، اس لیے اللہ تعالی نے اس کے علاج کے لیے ان ہی لوگوں کو خطاب کیا جن کو قوامیت اور سرپرستی کا حق دیا گیا ہے، اگر آدمی اس بات پر غور کرے تو اس کو اپنے مخاطب یعنی اللہ تعالی سے شرم محسوس ہوگی اور وہ اپنی نیت کی اصلاح کرلے گا اور پھر وہی بیوی اس کی تابع فرمان اور قلبی سکون کا باعث ہوگی، اس لیے اس نعمت اور مقام ومرتبہ کے ہوتے اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ اللہ تعالی کا فرمابردار بندہ بن کر رہے جس نے اس کو یہ عزت عطا کی۔ اسی طرح آیت کریمہ کے دونوں جملوں ﴿فَأَمۡسِكُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٍ﴾ اور ﴿سَرِّحُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٖ﴾ میں ایجاز کا بلاغی پہلو بھی ہے، چنانچہ دونوں جملے آپس میں متضاد ہیں، یعنی روک رکھنا اور چھوڑنا، لیکن دونوں کے ساتھ معروف کے وصف کو جمع کیا گیا ہے اور دونوں معروف کا مطلب بھی ایک ہے، یعنی دونوں صورتوں میں احسان کی پاس داری ہو چاہے معاملہ روک رکھنے کا ہو یا الگ کرنے کا۔ اسی طرح (معروف) ایک ایسا لفظ ہے جس میں خیر وبھلائی کی ساری خصلتیں یکجا ہیں چاہے وہ واجب ومستحب ہوں یا واجب کے علاوہ مزید احسان مندی ہو۔

اسی طرح (ضرارا) کے لفظ میں بھی بلاغت کا پہلو ہے، کیوں کہ اس ضرر اور نقصان کی نوعیت اور درجے کی کوئی تعیین نہیں کی گئی تاکہ اس کے تحت نقصان کی تمام صورتیں اور درجات آجائیں اور شوہر کسی ادنی قسم کے نقصان کی نیت و قصد میں اللہ سے ڈرے۔ سبحان اللہ! اس کا کلام تمام معانی ومفاہیم کا جامع ہے، اور جس طرح سے اللہ تعالی نے مردوں کے حق برتری کی حفاظت کی اسی طرح شوہر کے گھر میں رہ کر ان عورتوں کے معیشت کے سارے حقوق کی حفاظت فرمائی۔

اس کے بعد اللہ تبارک وتعالی اپنی آیتوں کے ساتھ کھلواڑ کرنے منع کر رہا ہے: ﴿وَلَا تَتَّخِذُوٓاْ ءَايَٰتِ ٱللَّهِ هُزُوٗاۚ﴾ " تم اللہ کے احکام کو ہنسی کھیل نہ بناؤ"۔ یہ نہی وجوب کے لیے اور اس بات سے بچنے اور دور رہنے کے لیے ہے کہ انسان اللہ تعالی کے احکامات کے سامنے کسی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی حکم عدولی کرے، کیوں کہ یہ احکامات ایک منظم قانون شریعت ہیں اور اس کے تقاضے کے مطابق عمل نہ کرنا استہزاء اور کھلواڑ کے مترادف ہے، گویا کہ اس کو ان احکامات کی کوئی پرواہی نہ ہو۔ اور یہ نہی تحذیر کے طور پر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کوئی ان کے ساتھ ہنسی کھیل کرتا ہے وہ اس نہی کی مخالفت کرکے اللہ تعالی کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے اور ایسا شخص سزا کا مستحق ہے۔ آیت کریمہ میں استہزاء (هُزُوٗا) کا لفظ ایک مسلم کو یہ احساس دلاتا ہے کہ اللہ تعالی کے احکامات کی پابندی نہ کرنا انتہائی قبیح کارنامہ ہے، اس لیے دل سے ان احکامات کی تعظیم، ان کی بجاآوری اور عملی زندگی میں ان کا نفاذ ضروری ہے۔

اس تحذیر کے بعد اس نعمت کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے ارشاد الہی ہے: ﴿وَٱذۡكُرُواْ نِعۡمَتَ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡ﴾ " اور اللہ کا احسان جو تم پر ہے یاد کرو" چاہے اسلام کی نعمت ہو یا بیویوں کی تسخیر کی نعمت ہو یا ان احکامات کی نعمت ہو جن میں ہر طرح کی شفقت ورحمت کارفرما ہے۔ اس آیت کے ذریعہ ان نعمتوں کی یاد دہانی مقصود ہے تاکہ لوگ اللہ تعالی کا شکر بجالاتے ہوئے اس کی حمد وثنا اور فرمابرداری کریں، اور شکران نعمت شکر گزاروں اور ذکر الہی کا التزام کرنے والوں کے حق میں رضائے الہی کا موجب ہے۔

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ﴾" اور اللہ کا احسان جو تم پر ہے یاد کرو"اس آیت سے تمام قسم کی نعمتیں مراد ہیں، اس کے بعد حسب حال بعض خاص نعمتوں کا ذکر کیا گیا: ﴿وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ﴾" اور جو کچھ کتاب و حکمت اس نے نازل فرمائی ہے"یہ قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نعمت ہے، کیوں کہ یہی دونوں شریعت کے اصل ماخذ ہیں اور ان ہی میں انسانی طرز زندگی کا منظم بیان ہے، چاہے ان کا تعلق عبادات وعقائد سے ہو یا خانگی، مالی، اولاد اور سماجی یا ان کے علاوہ دیگر مسائل واحکامات سے ہو جن کا انفرادی یا اجتماعی طور پر اور حاکم ومحکوم کی حیثیت سے سامنا ہوتا ہے، نیز وہ تمام امور جن کے ذریعہ انسان اپنی آخرت سنوارتا اور بناتا ہے، لہذا یہ مخاطب کے لیے بطور نصیحت ہے، اس لیے فرمایا: ﴿يَعِظُكُم بِهِ﴾ "جس سے تمہیں نصیحت کر رہا ہے" کیوں کہ اس میں ترغیب وترہیب، قصص، احکام، امر، نہی، تحثیث ، بیان حکمت وغیرہ کی بہت ساری نصیحتیں ہیں جن سے مخاطب مستفید ہو سکتا ہے، اس سے یہ فائدہ اخذ ہوتا ہے کہ دعوتی اور تربیتی میدان میں تعلیم وبیان کے بعد پند ونصیحت کو کافی اہمیت حاصل ہے، اس لیے تعلیمی ودعوتی مواقف کے انتہا میں ایسے پند ونصائح ضرور ہونے چاہئیں جو قلب وجگر کو لگنے والے اور جوش دلانے والے ہوں، اور پند ونصائح کے سب سے بہترین ماخذ قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن میں کافی نصیحتیں واضح انداز میں موجود ہیں۔اسی طرح سلوک وکردار کی حفاظت واصلاح میں ترغیب وترہیب کی اہمیت بھی مسلم ہے، نیز اللہ تعالی کے نعمتوں کی یاددہانی بھی ضروری ہے کیوں کہ آدمی کو اس کی نعمتوں کے سامنے اصل منعم کی یاد دہانی کرانے سے اس کا کبر وغرور چکنا چور ہو جاتا ہے، انسان جب نعمتوں کا عادی ہو جاتا ہے تو اس سے ان نعمتوں کا احساس ختم ہو جاتا ہے، اس لیے اس کو ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو وہ بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائے۔

اس کے بعد اللہ تعالی تقوی کے حکم کے ساتھ آیت کریمہ کا اختتام کر رہا ہے: ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾" اور اللہ تعالی سے ڈرتے رہا کرو" ۔ کیوں کہ جو اللہ تعالی کا تقوی اختیار کرتا ہے اللہ تعالی اس کی حفاظت فرماتا اور اس کی مدد کرتا ہے۔اس کے بعد مولائے کریم سبحانہ وتعالی اپنے علم سے متنبہ اور آگاہ کر رہا ہے جو کہ ہر شئے کو محیط ہے: ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾" اور جان رکھو کہ اللہ تعالی ہر چیز کو جانتا

ہے"۔ تو جو ذات ہر چیز کو جانتی ہے اس پر ضرر رسانی یا اصلاح و بھلائی کی نیتیں ہر گز ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتیں، چہ جائے کہ ظاہری اعمال اس سے مخفی رہیں۔ اس امر کا یہ تقاضا ہے کہ بندے کے اندر اللہ سبحانہ وتعالی کا خوف اور اس کی ہیبت جاں گزیں ہو جو اس کو اللہ تعالی کی طاعت پر ابھارے اور معصیت سے محفوظ رکھے۔

﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ ٱلنِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَٰجَهُنَّ إِذَا تَرَٰضَوْا۟ بَيْنَهُم بِٱلْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِۦ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْـَٔاخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَٱللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾﴾

ترجمہ:

"اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انہیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق رضامند ہوں ، یہ نصیحت انہیں کی جاتی ہے جنہیں تم میں سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر یقین و ایمان ہو اس میں تمہاری بہترین صفائی اور پاکیزگی ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (۲۳۲)۔

آیت کا سیاق ابھی طلاق اور رجعت کے مسائل کے متعلق ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا طَلَّقْتُمُ ٱلنِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ﴾ "اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں " ۔ آیت کریمہ میں یہ بیان کیا جارہا ہے کہ جب عورت کو ایک طلاق یا دو طلاق ہو چکی ہو یعنی پہلی اور دوسری طلاق اور عدت بھی پوری ہو جائے: (فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ) یعنی " وہ اپنی عدت پوری کر لیں"۔ اس چیز کا تعلق میاں بیوی سے ہے ، اسی لیے اس کے بعد اللہ تعالی کی جانب سے خطاب عورت کے اولیاء کو کیا گیا ہے کہ وہ میاں بیوی کی رجعت کے سلسلے میں رکاوٹ نہ بنیں: ﴿فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَٰجَهُنَّ إِذَا تَرَٰضَوْا۟ بَيْنَهُم بِٱلْمَعْرُوفِ ۗ﴾ "تو انہیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق رضامند ہوں"۔ اللہ تعالی نے گھر والوں کو اس بات سے منع فرمایا کہ وہ ان عورتوں کو روکیں اور تنگ کریں اور ان کو ان کے خاوندوں سے روک رکھیں اگر بھلائی اور حقوق کی ادائیگی کے ساتھ دونوں آپس میں ازدواجی رشتہ میں لوٹ آنے کا قصد کر لیں اور متفق ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ منہج

اسلام بنیادی طور پر رہن سہن میں خاندانی تعمیر و ترقی کو فروغ دیتا ہے، اور خاندان کے سرپرستوں سے بھی اس کا یہی مطالبہ ہے کہ رضائے الٰہی کے مطابق وہ اس تعمیر و ترقی میں مدد و معاون ہوں۔

اسی طرح اس بیان و خطاب میں عورتوں کے سرپرستوں کے لیے نصیحت ہے جس کا التزام ضروری ہے: ﴿ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِۦ﴾ " یہ نصیحت انہیں کی جاتی ہے"۔اور اس نصیحت الٰہی کا التزام ایمان کی دلیل قرار دیا، فرمایا: ﴿ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِۦ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ﴾ " یہ نصیحت انہیں کی جاتی ہے جنہیں تم میں سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر یقین و ایمان ہو"۔ اللہ تعالی پر ایمان اس کی اطاعت کو مستلزم ہے، اور آیت میں قیامت کے دن کا بالخصوص ذکر ہے کیوں کہ اسی دن سب کو لوٹ کر جانا ہے اور اسی دن حساب و کتاب اور جزاء و سزا مرتب ہو گی، چنانچہ احکام اور طریقہ رجعت کے بیان کے بعد بطور نصیحت ایمان اور یوم آخرت کی یاد دہانی کرائی گئی، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ تعلیم و تربیت اور اصلاح و دعوت کے طریقہ کار میں محض جانکاری دینا مقصود نہ ہو، بلکہ اس کے لیے ایسے عوامل ذکر کیے جائیں جو ایمان کو اجاگر کریں جس کی وجہ سے متعلم ان تعلیمی اور نصوص کی عملی تطبیق پر آمادہ ہو۔ ایسا ہی کچھ معاملہ ابو رباح رضی اللہ عنہ کی مطلقہ بیوی کے ساتھ پیش آیا جو اس آیت کے سبب نزول کے سلسلے میں مذکور ہے، واقعہ یوں ہے کہ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی بہن ابو رباح رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں اور ابو رباح رضی اللہ عنہ نے ان کو طلاق دے دیا یہاں تک کہ ان کی عدت بھی پوری ہو گئی، پھر وہ شرمندہ ہوئے اور اپنی مطلقہ بیوی کو پیغام نکاح بھیجا اور وہ نکاح پر رضامند بھی ہو گئیں، لیکن ان کے بھائی (معقل بن یسار) نے ان کی شادی کرنے سے انکار کیا اور قسم کھالی کہ اگر تم نے ان سے نکاح کیا تو میرا اور تمہارا سامنا حرام ہو گا، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معقل رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے عرض کیا کہ "اگر تم مومن ہو تو اپنی بہن کو ابو رباح کے ساتھ نکاح سے نہ روکو"، یہ سن کر معقل رضی اللہ عنہ پکار اٹھے: میں اللہ پر ایمان لایا، اور اپنی بہن کا نکاح ابو رباح رضی اللہ عنہ سے کر دیا(١)۔

---

(١) تفيسر قرطبي٣/١٠٤.

اس کے بعد اللہ تعالی اس توجیہ وارشاد اور حکم کی پابندی کا فائدہ بیان کر رہا ہے، فرمان الٰہی ہے: ﴿ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ﴾" اس میں تمہاری بہترین صفائی اور پاکیزگی ہے"۔یعنی اللہ تعالی کا یہ حکم اور ارشاد سب سے بہتر اور پاکیزہ ہے، یہاں پر آیت میں افضل کے مقابلے میں مفضول کا کوئی ذکر نہ کرکے مد مقابل کو حذف کر دیا گیا ہے، جس سے مراد سرپرستوں کی طرف سے عورت کے مصلحت کی خاطر اس کے شوہر کی طرف اس کو نہ لوٹانے کی کوششیں ہیں۔ کیوں کہ اس مقصد کے لیے بسااوقات سخت غصہ، کبر وغرور اور بدلہ لینے کا پہلو غالب ہوتا ہے،اور ساری کوششیں صحیح مقصد سے ہٹ کر انجام دی جاتی ہیں۔ لہذااللہ تعالی کا یہ حکم تمہاری ان کوششوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر، پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے ،کیوں کہ تمہاری اپنی کوششیں عیوب ونقائص سے خالی نہیں ہوتیں۔ نیز﴿ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ﴾ کے جملہ سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کا حکم اور نظام ہر طرح کے ایسے عیب اور نقص سے پاک ہے جو بیوی کے حق میں تمہارے اپنے فیصلوں میں پائے جاتے ہیں ،اسی طرح اس میں تمہاری اپنی پاکیزگی بھی ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے تم اس گناہ سے بچ جاتے ہو جو بیویوں کو ان کے شوہروں کے پاس رجعت سے روک رکھنے کی پاداش میں لاحق ہو سکتا ہے۔ نیز اس میں میاں بیوی کی بھی پاکیزگی ہے کیوں کہ اس میں ان کی زندگی کے لیے سب سے عمدہ طریقہ کا انتخاب اور اختیار ہے بشرطیکہ وہ اپنی زندگی میں احسان وبھلائی کا پاس ولحاظ رکھیں،اس کی وجہ سے اختلاف وانتشار اور جدائی کے اسباب ناپید ہو جاتے ہیں،اسی طرح یہ نظام الٰہی اولاد کے حق میں بھی بہتر ثابت ہوگا ،کیوں کہ اس طرح سے والدین گھر کے اندر موجود ہوں گے۔ یہ حکم پوری خاندان کے حق میں ہر طرح کے ایسے عیوب ونقائص سے پاک صاف ہے جس کی وجہ سے میاں بیوی میں رجوع کا معاملہ نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ آیت کریمہ میں مفضول کو ذکر نہ کرنا فائدے کے تحت ہے تاکہ نص آیت مختلف ابواب کو شامل ہو ،جیسا کہ اللہ کے فضل وکرم اور احسان سے ابھی ان کا ملاحظہ ہوا۔

اس کے بعد اللہ تعالی حکم الٰہی کو عقلی اجتہادات پر مقدم کرنے کا سبب بیان کر رہا ہے: ﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾" اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے"۔اس سے معلوم ہوا کہ نصوص شرعیہ کو عقلی اجتہادات پر مقدم کرنا ضروری ہے، کیوں کہ شرعی نصوص کا صدور اس ذات باری تعالی کی جانب

سے ہے جس کا علم ہر چیز کو محیط ہے، جب کہ انسانی عقل غیبات کے علم سے قاصر ہے اور بہت ساری ایسی چیزیں جو اس کی نگاہوں سے او جھل ہیں ان کی معرفت عقل انسانی کے ذریعہ ممکن نہیں، اسی طرح دلوں کی خفیہ نیتوں تک بھی عقل نہیں پہنچ سکتی، لیکن ان تمام اشیاء میں سے کوئی بھی شئے اللہ سبحانہ وتعالی سے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے، وہ علام الغیوب ہے، لہذا نصوص کتاب وسنت کو عقلی اجتہادات پر مقدم رکھنا اور ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔ ایک مومن کا طرۂ امتیاز ہے: ﴿سَمِعۡنَا وَأَطَعۡنَاۖ﴾ "ہم نے سنا اور اطاعت کی"۔

آیت کریمہ کے بعض فوائد عامہ: اللہ تعالی کی جانب سے قرآنی نصوص میں خاندانی اساسیات کی رعایت۔ خاندانی مشکلات کا منظم حل۔ بسا اوقات جدائی کے بعد دوبارہ ملاقات پہلے سے زیادہ گہری ہوتی ہے، کیوں کہ طلاق کے بعد میاں بیوی کے رجوع کی خواہش سابقہ واقعات پر ان کی ندامت اور افسوس کی دلیل ہے، اور اس کے بعد احسان و بھلائی کی پابندی کی قوی رغبت ہوتی ہے۔ چونکہ غلطی اور جلد بازی انسان کا خاصہ ہے، اس کے نفسیات اور دل کی کیفیت میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، اس لیے شریعت اسلامیہ نے اس کے حل کے دو مواقع مرحمت فرائے ہیں۔ دوسری جانب اگر میاں بیوی کے آپسی تعلقات میل نہ کھائیں اور یہ بالکل واضح ہو جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناقابل قبول ہیں تو ان دونوں کو یہ موقع دیا کہ احسان اور بھلائی کے ساتھ، چاہے جتنا بھی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہے اس کا احترام کرتے ہوئے دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

اللہ تعالی کی شریعت میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے یہاں پر اور بھی عظیم فوائد نظر آئیں گے، ان میں سب سے عیاں وہ فوائد ہیں جو علماء کرام کی فہم و فراست کی شکل میں دیکھائی دیتی ہے جو فقہ، تفسیر، حدیث اور عقیدہ جیسے علوم سے منسلک رہے، جن کی فکر و فراست کے نتیجے میں کتاب وسنت کی تدریس و تفہیم کے ذریعہ علوم و معارف کا عظیم ذخیرہ وجود میں آیا۔

﴿وَٱلۡوَٰلِدَٰتُ يُرۡضِعۡنَ أَوۡلَٰدَهُنَّ حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِۖ لِمَنۡ أَرَادَ أَن يُتِمَّ ٱلرَّضَاعَةَۚ وَعَلَى ٱلۡمَوۡلُودِ لَهُۥ رِزۡقُهُنَّ وَكِسۡوَتُهُنَّ بِٱلۡمَعۡرُوفِۚ لَا تُكَلَّفُ نَفۡسٌ إِلَّا وُسۡعَهَاۚ لَا تُضَآرَّ وَٰلِدَةُۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوۡلُودٌ لَّهُۥ بِوَلَدِهِۦۚ وَعَلَى

ٱلۡوَارِثِ مِثۡلُ ذَٰلِكَۗ فَإِنۡ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٖ مِّنۡهُمَا وَتَشَاوُرٖ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۗ وَإِنۡ أَرَدتُّمۡ أَن تَسۡتَرۡضِعُوٓاْ أَوۡلَٰدَكُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ إِذَا سَلَّمۡتُم مَّآ ءَاتَيۡتُم بِٱلۡمَعۡرُوفِۗ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرٞ ﴿٢٣٣﴾

ترجمہ:

مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو، اور جن کے بچے ہیں ان کے ذمہ ان کا روٹی کپڑا ہے جو مطابق دستور کے ہو، ہر شخص اتنی ہی تکلیف دیا جاتا ہے جتنی اس کی طاقت ہو ماں کو اس بچے کی وجہ سے یا باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے، وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری ہے، پھر اگر دونوں (یعنی ماں باپ) اپنی رضامندی سے باہمی مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں ،اور اگر تمہارا ارادہ اپنی اولاد کو دودھ پلوانے کا ہو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، جب کہ تم ان کو مطابق دستور کے جو دینا ہو وہ ان کے حوالے کر دو، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جانتے رہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی دیکھ بھال کر رہا ہے(۲۳۳)۔

یہاں سے قرآنی سیاق اولاد کی طرف منتقل ہو رہا ہے جو کہ شادی کا ثمرہ ہے اور جس کی محبت والدین کے دلوں میں جاں گزیں ہوتی ہے،اس تعلق سے اللہ تعالی نے جو کہ بڑا مہربان نہایت رحم و کرم والا اور غیب کا علم رکھنے والا ہے، قرآن کریم میں کافی تفصیلی بیان کیا ہے ، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿ وَٱلۡوَٰلِدَٰتُ يُرۡضِعۡنَ أَوۡلَٰدَهُنَّ حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِ ﴾ " مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں"۔ یہ خبر کے اسلوب میں ماؤوں کو حکم دیا گیا ہے اور یہ حکم واجب کے درجے میں ہے، اور اس خطاب کا واجبی تقاضا ہے کہ مائیں اپنے شیر خواروں کا خاص خیال رکھیں اور انہیں مکمل دو سال دودھ پلائیں اور شوہر پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس کے لیے تیار کرے، اسی طرح بیوی اگر مطلقہ ہو تو اس کے سرپرستوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو اس بیٹے کی شیر خواری کے لیے تیار کریں۔ معلوم ہوا کہ اس قرآنی خطاب نے اپنے اس عظیم بلاغی اسلوب بیان میں تمام مقاصد و مضامین اور تعلیمات کو قلت الفاظ کے باوجود سمیٹ لیا ہے تاکہ دودھ پلانے کے معاملہ میں ہر طرح سے ان تمام افراد کو دوٹوک فیصلہ سنادے جن کا اس

رضاعت سے کوئی تعلق ہے، پاکی ہے اس ذات کے لیے جس کے کلام مبارک نے تمام بولنے والوں کی بولتی بند کردی۔

اس کے بعد مدت رضاعت متعین کردی گئی تاکہ کوئی اختلاف نہ ہو اور کسی کو کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے: ﴿ وَٱلۡوَٰلِدَٰتُ يُرۡضِعۡنَ أَوۡلَٰدَهُنَّ حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِ ﴾" مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں"۔ (كَامِلَيۡنِ) کے لفظ سے ہر غلط تفسیر وتوجیہ کرنے والے کی تفسیر وتوجیہ کا قلع قمع کردیا گیا، کیوں کہ کبھی کبھی (حول) یعنی سال کا اطلاق اس کے اکثر مدت پر بھی ہوتا ہے۔ اس میں ایک طرح سے بچوں کے حقوق کی حفاظت ہے تاکہ باہمی اختلافات اور طلاق کے نتیجے میں یا حولین کا غیر مکمل اور ناقص مفہوم لینے سے یا کسی بھی دوسرے سبب کی بناپر بچے کے حق میں کسی طرح کی کوتاہی نہ ہو اور بچے کو کوئی نقصان نہ پہونچے۔ اسی طرح اللہ تعالی نے رضاعت کی ذمہ داری ماں کو سونپی ہے کیوں کہ ایک ماں اپنے بچے پر سب سے زیادہ مہربان، توجہ دینے والی اور اس کے حالات سے واقف ہوتی ہے۔ وقت کی اس تحدید سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ دو سال کے بعد رضاعت کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور دو سال کے بعد بچے کو رضاعت کی کوئی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی ۔ اس کے بعد اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿لِمَنۡ أَرَادَ أَن يُتِمَّ ٱلرَّضَاعَةَۚ ﴾" جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو"۔ اس سے معلوم ہوا کہ دو سال کی یہ مدت رضاعت کی مکمل مدت ہے، اور جو شخص اللہ تعالی کے حکم کی کماحقہ تعمیل کرنا چاہے تو یہی اصل حکم الہی ہے، اور مفسرین علماء نے اس آیت ﴿لِمَنۡ أَرَادَ أَن يُتِمَّ ٱلرَّضَاعَةَۚ ﴾" کی تفسیر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دو سال مکمل رضاعت ضروری نہیں ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی دودھ چھڑایا جاسکتا ہے۔ اسی سے علماء نے یہ مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے کہ دو سال ہو جانے کے بعد رضاعت سے رضاعی رشتہ ثابت نہیں ہوتا، ہاں یہ دو سال کی مدت بچے اور اس کی ماں کا حق ہے اس تعلق سے کسی کا اختلاف قابل قبول نہیں ہوگا چاہے وہ کوئی بھی تاویل پیش کرے، کیوں کہ یہ اللہ تعالی کا صریح فرمان ہے۔

اور بطور فائدہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالی کا فرمان: (لِمَنۡ أَرَادَ) ایا تاکید کے لیے ہے یا اختیار کے لیے؟ کیوں کہ اللہ تعالی نے جب رضاعت کی مدت دو سال متعین کردی اور اس کے مکمل کرنے کا صراحت کے ساتھ حکم بھی دیا تو اس بناپر یہ تاکید ہی کے لیے ہے، یعنی نومولود کے رضاعت کی مدت مکمل

دو سال ہے، اگر تم مکمل رضاعت چاہتے ہو، اسی کا اللہ تعالی نے حکم دیا ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آیت دونوں مفہوم کو شامل ہو، یعنی اصلا تو بطور تاکید ہو، لیکن کسی ایسے سبب کی بناپر جو دو سال مکمل کرنے میں مانع ہو تو ایسی صورت میں یہ اختیاری حکم ہے، تاکہ کسی حرج کا سامنانہ کرنا پڑے، اس کی تائید اسی آیت کریمہ میں آگے اللہ تعالی کے اس قول سے ہوتی ہے: ﴿فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾" پھر اگر دونوں (یعنی ماں باپ) اپنی رضامندی سے باہمی مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں"۔ یعنی بچے کے دودھ چھڑانے میں کوئی گناہ نہیں۔ یہ سب اللہ تبارک وتعالی کے کلام کا اعجاز ہے کہ آیت کریمہ کے الفاظ تمام ممکنہ صورتوں کو شامل ہوتے ہیں اور اصل حکم کی برتری بھی برقرار رہتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی رضاعت کے تعلق سے باپ کی ذمہ داری بیان کر رہا ہے، ارشاد ہے: ﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ "اور جن کے بچے ہیں ان کے ذمہ ان کا روٹی کپڑا ہے جو مطابق دستور کے ہو"۔ (وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ) اس سے مراد باپ ہے اور اس جملے میں ایک لغوی فائدہ ہے، اور اس کا مفہوم ہے: (عَلَى الذّي وُلِدَ لَهُ) یعنی اس کے ذمہ جس کے لیے وہ جنم دیا گیا ہے(۱) ۔ یعنی جس کے لیے کسی بچہ کی پیدائش ہو تو دودھ پلانے والی کے کھانے پینے اور کپڑے کا نظام اس کے ذمہ ہے۔ (بِالْمَعْرُوفِ) دستور اور وسعت کے مطابق، اس سے معلوم ہوا کہ نان ونفقہ اور لباس کی ذمہ داری بھی باپ کے حسب حال اور حیثیت وعمل کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس ارشاد باری تعالی سے بہت سارے فقہی احکامات اور عظیم مفاہیم منسلک ہیں، اور بہت سارے ان اہم مسائل کا استیعاب ہے جن کا تعلق شیر خوار بچوں اور دودھ پلانے والی عورتوں کے مختلف حالات سے ہے۔ مثال کے طور پر عورت اگر مطلقہ ہو یا اس کا شوہر انتقال کر گیا ہو، اسی طرح سے مرضعہ کی اجرت کا مسئلہ وغیرہ۔ (بِالْمَعْرُوفِ) کے اس لفظ سے یہ واضح ہو گیا کہ مردوں کے حسب حال اور رزق کی فراوانی یا تنگی کے فرق کا لحاظ ضروری ہے، کیوں کہ بعض باپ مالدار ہوتے ہیں اور بعض کی معیشت تنگ ہوتی ہے، اور جو مالدار ہوتے ہیں وہ بھی مالداری میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، لہذا معروف کے اس لفظ میں بندوں کے رزق کے تمام درجات کا

---

(۱) اكتب الحاشية هنا

احاطہ ہو گیا، یہ صرف قرآن کی بلاغت اور اعجاز بیان ہے کہ اس کے الفاظ مختلف اور متعدد حالات کے جامع ہوتے ہیں۔اسی طرح لفظ معروف کے ذریعہ باپ سے مشقت کو دور کیا گیا ہے، یہ محض اللہ تبارک وتعالی کی رحمت ہے جس رحمت کی مزید تاکید اس کے اگلے فرمان سے ہوتی ہے: ﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا﴾ " ہر شخص اتنی ہی تکلیف دیا جاتا ہے جتنی اس کی طاقت ہو"۔وسع یعنی طاقت جس میں ہر کوئی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، اور یہی طاقت نان ونفقہ کی مقدار کا معیار ہے، پاکی ہے اس اللہ کی جس کی آیات ایجاز کے ساتھ اس کی مراد، احکامات، رحمت، اور بیان سب کا استیعاب کیے ہوئے ہیں جس تک بڑے سے بڑے ماہر فن وبلاغت کی رسائی ناممکن ہے، بلکہ ایک آیت لانے پر وہ اکٹھا ہو جائیں تب بھی وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد آیت کریمہ میں کسی بھی طرح کی ضرر رسانی سے منع کیا جارہا ہے: ﴿لَا تُضَآرَّ وَٰلِدَةُۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُۥ بِوَلَدِهِۦ﴾ " ماں کو اس بچے کی وجہ سے یا باپ کو اس کی اولاد کی وجہ سے کوئی ضرر نہ پہنچایا جائے"۔چونکہ ضرر رسانی کی مختلف شکلیں اور درجات ہیں اس لیے شریعت حکیمہ نے ان تمام پر روک لگادی چاہے وہ ضرر جتنا اور جس قسم کا بھی ہو، اور اس کے لیے صرف ایک لفظ (لَا تُضَآرَّ) کا استعمال کیا گیا، لہذا کوئی ماں اپنے بچے کی وجہ سے اور اسی طرح کوئی باپ اپنے بچے کو وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے اور یہ نقصان جانبین میں سے ایک دوسرے کے لیے کسی کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے ۔اور جب ماں باپ دونوں کی طرف سے نقصان کی نفی کردی گئی تو بچے کے احوال خود بخود سلامت رہیں گے ،اس لیے آیت کریمہ میں بچے کے نقصان میں پڑنے کی بطور صراحت ذکر کی کوئی ضرورت نہیں رہی، یہ بھی انتہائی درجے کی بلاغت ہے کہ کلام میں بلاوجہ کسی لفظ کی زیادتی سے بچا جائے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں کوئی لفظ زائد اور بے معنی نہیں۔(تُضَارّ) کا لفظ صیغۂ مجہول ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ہر وہ شخص شامل ہوگا جس کا نقصان دہی میں کوئی ہاتھ ہو۔ چاہے وہ ماں باپ ہوں، چاہے بیوی اور فوت شدہ شوہر کے اولیاء ہوں، یا ان کے مابین اصلاح اور فیصلہ کرنے والے دیگر لوگ ہوں۔

ضرر رسانی کی بہت ساری صورتیں ہوسکتی ہیں، مثال کے طور پر ماں پر اس کے بچے کو دودھ پلانے کے لیے کسی بھی قسم کی پابندی لگادی جائے، یا اس کو مناسب اور حسب ضرورت نان ونفقہ اور لباس نہ دیا جائے، اسی طرح ماں کی طرف سے باپ کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے، مثلاً ماں محض باپ کو نقصان پہنچانے کی غرض سے بچے کو دودھ نہ پلائے، یا ضرورت سے زیادہ اجرت نان ونفقہ اور لباس کا مطالبہ کرے، ان کے علاوہ ضرر رسانی کی اور بھی بہت ساری صورتیں اور قسمیں ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان امور کا ذکر کر رہا ہے خاندان میں جن کے وقوع پذیر ہونے کے احتمالات پائے جاتے ہیں، جیسے کہ باپ کی وفات ہو جائے، چنانچہ ایسی صورت کے علاج اور حل کے لیے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَعَلَى ٱلْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ﴾ " وارث پر بھی اسی جیسی ذمہ داری ہے"۔ یعنی باپ کی عدم موجودگی میں بچے کے پاس مال نہ ہونے کی صورت میں بچے کے وارثین پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو باپ پر تھیں یعنی دودھ پلانے والی کے حقوق کی ذمہ داری۔ چنانچہ اللہ تعالی نے ان مفید اور جلیل القدر وعظیم احکامات کے ذریعہ ذمہ داریوں کو مرتب کرکے بچے اور ماں کے حق کی حفاظت فرمائی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس روشن شریعت میں تمام باریک سے باریک مسائل کا احاطہ ہے، اور ان ہی مسائل میں سے بچے اور دودھ پلانے والی ماں کے حقوق کا مسئلہ بھی ہے۔

اس کے بعد رضاعت ہی کے متعلق بچے اور والدین کے بارے میں مزید بیان ہو رہا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا﴾ "پھر اگر دونوں (یعنی ماں باپ) دودھ چھڑانا چاہیں"۔ (فصال) فصل سے ہے جس کے معنی بچے کو ماں کی پستان سے الگ کرنے کے ہیں(۱)۔ یعنی اگر ماں اور باپ دو سال کی مدت مکمل ہونے سے پہلے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو اس کے لیے اللہ تعالی نے والدین کی باہمی رضامندی اور اتفاق کی شرط لگائی ہے، فرمایا: ﴿فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ﴾ " پھر اگر دونوں (یعنی ماں باپ) اپنی رضامندی سے باہمی مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں" ، یعنی (قبل از وقت) اس دودھ چھڑانے کی یہ شرط ہے کہ والدین میں سے کوئی ایک تن تنہا اس کا فیصلہ نہ کرے، بلکہ اس کے لیے دو چیزیں کافی اہمیت رکھتی ہیں، ایک تو دونوں کی باہمی رضامندی، اور دوسری چیز

---

(۱) تفسير قرطبي ۳/۱۱۳.

آپسی مشورہ اور اتفاق رائے، کیوں کہ باہمی رضا مندی اور اتفاق ہی میں والدین اور بچے دونوں کی ایک ساتھ مصلحت ہے اور اسی سے بچے کو پہنچنے والے ممکنہ نقصانات سے بچا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اس ارشاد ربانی میں خاندانی مسائل کو لے کر ایک عظیم مسئلہ کو سلجھانے کا منہج اور طریقہ کار پیش کیا گیا ہے، اگر غور کریں تو در حقیقت تحقیق مقاصد کے ان نتائج کو بروئے کار لا کر بہت ساری انفرادی اور اجتماعی مشکلات اور پیچیدگیاں دور کی جاسکتی ہیں۔ یایوں کہیں کہ منظم اور محکم روش صحیح مقصد کی پہچان ہے اور اسی میں زندگی کی مسائل و معاملات کے متعلق کسی بھی اداراتی طریقہ کار اور نظام کو کامیابی مل سکتی ہے، چاہے وہ گھریلو اور پیشہ وارانہ مسائل ہوں یا سماجی و معاشرتی معاملات ہوں یا ان کے علاوہ روز مرہ کے مختلف امور ہوں۔

بچے کے دودھ چھڑانے کے متعلق جب سابقہ دونوں شرطیں متوفر ہوں تو اللہ تعالی نے واضح فیصلہ سنادیا: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۗ﴾ "تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں"۔یعنی جب والدین باہم رضا مند اور متفق ہوں تو ان سے اللہ تعالی نے گناہ کی نفی کی ہے،اس نص قرآنی کا مفہوم یہ نکلا کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک اپنے طور پر کوئی فیصلہ لے تو ایسی صورت میں دودھ چھڑانا جائز نہیں ، کیوں کہ بچہ دونوں کا ہے اس لیے اس کی مصلحت کا خیال رکھنا دونوں کی ذمہ داری ہے،اور والدین میں سے کسی ایک کو اور اسی طرح بچے کو نقصان پہنچانا درست نہیں۔اس حکم میں بچے کی مصلحت کو لے کر کافی احتیاط برتا گیا ہے ، یہ اللہ تعالی کی بچوں کے ساتھ عنایت اور اس کا رحم و کرم ہے کہ اس نے یہ نظام اور حکم نازل فرمایا اور نقصان پہنچانے والے کو گناہ کا سزاوار ٹھرایا،اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فرد بشر کے تمام حالات زندگی کے ساتھ اللہ تعالی کی عنایت شامل ہے حتی کہ بچپن کی حالت میں بھی جب کہ بندہ کو اپنی مصلحت کا پتہ نہیں رہتا اور نہ ہی وہ کچھ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ایسے وقت میں اللہ تعالی نے تشریعی اور تنظیمی اعتبار سے اس کی حفاظت و عنایت فرمائی۔

اس سے اس بات کی بھی تاکید ہوتی ہے کہ دودھ پلانے کی مدت کا حکم اصل میں مکمل دو سال ہے ،اور صرف مذکورہ شروط کی بنیاد پر اس حکم سے استثناء کی صورت بن سکتی ہے،اور یہ استثنائی صورت مختلف حالات اور اندیشوں کی رعایت کرتے ہوئے رکھی گئی ہے ،تاکہ والدین بچے کی مصلحت کو سامنے رکھتے

ہوئے اس معاملے میں غور وفکر سے کام لیں۔اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ میں مختلف حالات اور نت نئے مسائل کا پورا استیعاب ہے۔اسی طرح دودھ پیتے بچے کے متعلق یہ بھی پتہ چلا کہ اس کے اندر دودھ چھوڑنے اور دودھ کے بدلے دوسری غذاؤوں کے استعمال کی صلاحیت موجود ہوتی ہے، نیز وقت کے ساتھ ساتھ جدید ایجادات سے بھی مختلف مصلحتیں پوری ہو سکتی ہیں، یہ تمام امور اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ یہ شریعت اللہ تعالی کا قانون اور نظام ہے جس کے پاس باطل پھٹک نہیں سکتا، نہ اس کے آگے سے اور نہ اس کے پیچھے سے، یہ حکمتوں والے اور خوبیوں والے اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے زمانہ رسالت میں نزول قرآن کے وقت کے احوال بیان کیے ہیں ، چنانچہ قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رضاعت پہلے پہل مکمل دوسال واجب تھی اور اس سے پہلے دودھ چھڑانا حرام تھا، پھر اس میں کچھ تخفیف کردی گئی اور فرمان الٰہی ﴿فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا﴾ کے ذریعہ دوسال سے کم کی رضاعت جائز قرار دی گئی(۱)۔

اس آیت کریمہ سے یہ فائدہ بھی ملا کہ ایسے عام معاملات جن کے نفع ونقصان میں کئی لوگ شریک ہوں تو بغیر باہمی مشورہ کے کسی کو اپنے طور پھر اس معاملہ سے الگ نہیں ہونا چاہئے، بلکہ مشورہ کے بعد الگ ہونا چاہیے، کیوں کہ باہمی مشورے سے بغض واختلاف نہیں ہوتا بلکہ آپس میں پیار ومحبت کی فضا قائم رہتی ہے، اور افراد ومجتمعات اور خاندان وسماج میں الفت ومحبت کا فروغ شریعت اسلامیہ کے عظیم مقاصد میں سے ہے، اور یہ منہج تربیتی اعتبار سے بہت وسیع ہے، اس معنی میں کہ اولاد اپنی گھریلو زندگی میں ان مقاصد کو جانیں اور سیکھیں ، اور تربیتی اور تعلیمی جہات بھی اپنے تعلیمی دائرے کار میں اس جانب توجہ دیں۔

اسی طرح آیت کریمہ کے من جملہ فوائد میں ایک فائدہ اجتہاد کے متعلق بھی ہے، امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ احکام میں اجتہاد کرنا جائز ہے، کیوں کہ اللہ

---

(۱) تفسير قرطبي ۳/۱۱۳.

تعالی نے والدین کے لیے بچوں کی مصلحت کے لیے صلاح ومشورہ کو جائز قرار دیا ہے ،اور ظاہر ہے یہ والدین کے ظن غالب پر موقوف ہے،نہ کہ یقینی بنیاد پر (۱)۔

اس کے بعد قرآن کریم کا سیاق رضاعت کی ایک دوسری صورت کی طرف منتقل ہو رہا ہے : ﴿وَإِنۡ أَرَدتُّمۡ أَن تَسۡتَرۡضِعُوٓاْ أَوۡلَٰدَكُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ﴾ "اور اگر تمہارا ارادہ اپنی اولاد کو دودھ پلوانے کا ہو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں"۔ یہ رضاعت کی دوسری شکل ہے،یعنی اگر تم بچے کے لیے کسی دودھ پلانے والی کو لگانے کا ارادہ کرو، تقدیری عبارت یوں ہے: (أن تسترضعو ا أجنبية لأولادكم) آیت میں گناہ کی نفی سے اس امر کا جواز مقصود ہے، ساتھ ہی اس کے معاوضہ کا ذکر کیا: ﴿إِذَا سَلَّمۡتُم مَّآ ءَاتَيۡتُم بِٱلۡمَعۡرُوفِۗ﴾ " جب کہ تم ان کو مطابق دستور کے جو دینا ہو وہ ان کے حوالے کر دو"۔ آیت میں لفظ (سَلَّمۡتُم) کے دو مفہوم ہیں: پہلا مفہوم یہ ہے کہ تم اس اجنبی دودھ پلانے والی کی اجرت ان کے حوالے کر دو، اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تم دوسرے سے دودھ پلانے کے ارادے کو تسلیم کر لو، یعنی والدین میں سے ہر ایک باہمی اتفاق اور خیر و بھلائی کے ارادے سے یہ بات تسلیم کر لے اور اس پر راضی ہو جائے (۲) ۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ہی مفہوم مقصود ہیں ،اور ایک ہی پیرائے میں اس جملہ کے دونوں مفہوم شامل ہیں، اور دونوں مفہوم کافی اہمیت رکھتے ہیں، یہ قرآن کریم کے بیان کا معجزہ ہے۔

اس کے بعد آیت کا اختتام اس امر سے ہو رہا ہے جس پر مخاطب کو مضبوطی سے قائم رہنا چاہیے : ﴿وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرٞ﴾ " اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جانتے رہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی دیکھ بھال کر رہا ہے"۔ یہ تمام خیر و بھلائی کی جامع نصیحت ہے ، یعنی تم ہر حالت میں اللہ تعالی سے ڈرتے رہو ، اس کے بعد مومنوں کے نزدیک معروف امر کی یاد ہانی کرائی جا رہی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالی پر کوئی بھی بات اور حالت مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے، اس لیے اس نصیحت کا ہمہ وقت استحضار ہونا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم وتدریس ، پند و نصائح، ارشاد و توجیہ اور توضیح و بیان

---

(۱) مرجع سابق.

(۲) مرجع سابق (امام قرطبي رحمه الله کے کلام کا مفہوم ہے)

کے اختتام پر ناصحانہ کلمات کی کافی اہمیت ہے، کیوں کہ نصیحت ایک مومن کے لیے حق کی طرف لوٹنے اور غفلت سے بیداری کا باعث ہے۔

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٣٤﴾﴾

ترجمہ:

"تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں ، پھر جب مدت ختم کرلیں تو جو اچھائی کے ساتھ وہ اپنے لئے کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں ، اور اللہ تعالیٰ تمہارے عمل سے خبردار ہے(۲۳۴)"۔

اس کے بعد قرآن کا سیاق ایک دوسرے خاندانی مسئلہ کی طرف منتقل ہو رہا ہے جس کا تعلق شوہر کی وفات سے ہے: ﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾ " تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں "۔آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس عورت کا حکم بیان کیا ہے جس کا شوہر وفات پا جائے کہ اس کی عدت مطلقہ کی عدت سے مختلف ہے اور وہ چار مہینہ دس دن ہے، تاکہ اگر وہ حمل سے ہو تو اس کا حمل واضح ہو جائے۔ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اس انتظار اور نکاح اور اس کے متعلقہ امور سے رکے رہنے کو اجمالا صرف ایک کلمہ (يَتَرَبَّصْنَ) کے ذریعہ بیان کیا ہے یعنی کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرنے سے وہ رکی رہیں یہاں تک کہ یہ متعینہ مدت ختم ہو جائے۔ اس سیاق میں ایک طرح سے خاتون مسلم کے مشاعر کی حفاظت ہے، کیوں کہ اس کی شرم وحیاء اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اس مسئلہ میں زیادہ تفصیل برداشت نہیں کر سکتی، اس لیے قرآن نے اس کو ایسے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ تلاوت کرنے والا اس آیت کی تلاوت کرتا ہے اور عورت اپنے متعلق ان آیات کو سن کر کوئی خجالت محسوس نہیں کرتی۔

اس عدت کی تعیین کے ذریعہ فوت شدہ شوہر کے حق کی حفاظت اور اگر عورت حاملہ ہے تو حمل ونسب کی حفاظت مقصود ہے، اسی طرح اس عورت کی بھی حفاظت ہے تاکہ دو نسبوں کے مابین خلط ملط نہ ہو جائے، نیز نئے شوہر کی بھی حفاظت ہے تاکہ اس کے نسب میں وہ بچہ شامل نہ ہو جو اس کے نسب کا یا اس

کا بچہ نہیں ہے، اس طور سے اللہ تعالی نے تمام لوگوں کے حقوق محفوظ کردیے۔ متوفی عنہا زوجہا کے متعلق تفصیلی احکامات احادیث نبویہ میں مکمل طور سے مذکور ہیں، تاکہ ایک مسلم یہ سمجھ سکے کہ مکمل منہج اسلام قرآن کریم اور سنت نبویہ کے مجموعے کا نام ہے۔ اسی طرح فوائد میں سے فقہی احکامات کا وہ مجموعہ بھی ہے جن کو علماء نے تحریر کیا ہے جن کے استنباط میں خاص وعام، مطلق ومقید اور ان کے متعلق سنت نبویہ کی رعایت کی گئی ہے۔ جیسے حاملہ اور غیر حاملہ کی عدت، لونڈی کی عدت وغیرہ، چنانچہ کتاب وسنت کے ان دونوں مصادر سے علماء کی فکر ونظر کے نتیجے میں عظیم علمی ذخیرہ وجود میں آیا جن کے ذریعہ فہم وفراست کو ارتقاء اور سربلندی نصیب ہوئی۔

آگے آیت میں اللہ تعالی متوفی عنہا زوجہا کی عدت مکمل ہو جانے کے بعد کا حکم بیان کر رہا ہے: ﴿فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ﴾ "پھر جب مدت ختم کرلیں"، یعنی جب عدت پوری ہو جائے: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِيٓ أَنفُسِهِنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ﴾ " تو جو اچھائی کے ساتھ وہ اپنے لئے کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں"۔ یہ حکم ہر اس شخص کے لیے ہے جس کا متوفی عنہا زوجہا سے کوئی تعلق ہو، یعنی اس کے اولیاء اور سرپرست، یا جن کا اس کے معاملہ میں کوئی کردار ہو، جیسے کہ قاضی اور شوہر کے سرپرست حضرات، اور یہ حکم اس عورت کی شادی اور زیب وزینت کے متعلق ہے، اور اس چیز کو بھی (معروف) کے لفظ کے ذریعہ منضبط کر دیا گیا ہے، اور اس معروف کا تعلق احکام شریعت سے ہے، چنانچہ حرام اور مکروہ کو چھوڑ کر شریعت جس چیز کی اجازت دے وہ معروف سمجھا جائے گا، اس کے بالمقابل یہ مفہوم نکلا کہ اگر عورت شرعی طور پر ناجائز امور کی زیادتی کرے تو اس کے ولی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کو اس کام سے منع کردے، کیوں کہ ولی کے لیے جو روکنے کی نہی وارد ہے اس کا تعلق ﴿فِيمَا فَعَلْنَ فِيٓ أَنفُسِهِنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ﴾ سے ہے، یعنی "جو اچھائی کے ساتھ وہ اپنے لئے کریں"۔ چنانچہ اگر وہ اس معروف سے تجاوز کریں تو ایسی صورت میں ولی کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس کو معروف کے تجاوز کرنے سے منع کرے، اور ایسا کرنا واجبی حکم ہے، اور ماتحت کے حق میں اس کی بجا آوری اور پابندی مطلوب ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام نے عورت کو اپنے تشخص کی حفاظت کے دائرے میں رہتے ہوئے اس معاملہ میں پوری آزادی دی ہے، تاکہ اس کو کوئی نقصان نہ ہو اور وہ بھی کسی کو نقصان نہ پہنچائے، یہ اس

حکیمانہ شریعت اسلامیہ کی نعمت اور اس کے توجیہات وارشادات کی گیرائی ہے جس نے عورت کے مقام کی حفاظت کا خیال رکھا اور اس کے متعلق تمام مسائل بیان کئے۔ عورت کے ساتھ یہ اہتمام مذہب اسلام میں اس کے مقام ومرتبہ کی واضح دلیل ہے۔ اس کے بعد تمام لوگوں کے لیے ناصحانہ کلمات کے ساتھ آیت مکمل ہو رہی ہے: ﴿وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ خَبِيرٞ﴾ " اور اللہ تعالیٰ تمہارے عمل سے خبردار ہے"۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے سارے اعمال کو جاننے والا ہے جس کا لازمی تقاضا ہے کہ ایسے اعمال اور ارادوں سے بچا جائے جو احکام الٰہی کے مخالف ہیں۔ اسی طرح اس سے یہ فائدہ بھی ملا کہ توجیہ وارشاد اور تعلیم وتدریس کے اخیر میں پند ونصائح کے تذکرہ کی کافی اہمیت ہے کیوں کہ نصیحت کا طبیعت پر اچھا اثر پڑتا ہے، اور ایسا بار بار کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، کیوں کہ قرآنی آیات میں نصیحتوں کی یہ تکرار موجود ہے۔

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيمَا عَرَّضۡتُم بِهِۦ مِنۡ خِطۡبَةِ ٱلنِّسَآءِ أَوۡ أَكۡنَنتُمۡ فِيٓ أَنفُسِكُمۡۚ عَلِمَ ٱللَّهُ أَنَّكُمۡ سَتَذۡكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّآ أَن تَقُولُواْ قَوۡلٗا مَّعۡرُوفٗاۚ وَلَا تَعۡزِمُواْ عُقۡدَةَ ٱلنِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡكِتَٰبُ أَجَلَهُۥۚ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ يَعۡلَمُ مَا فِيٓ أَنفُسِكُمۡ فَٱحۡذَرُوهُۚ وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٞ ٢٣٥﴾

ترجمہ:

"تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اشارۃً ان عورتوں سے نکاح کی بابت کہو، یا اپنے دل میں پوشیدہ ارادہ کرو اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ تم ضرور ان کو یاد کروگے، لیکن ان سے پوشیدہ وعدے نہ کرلو ، ہاں یہ اور بات ہے کہ تم بھلی بات بولا کرو ، اور عقد نکاح جب تک عدت ختم نہ ہو جائے پختہ نہ کرو، جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی باتوں کا بھی علم رکھتا ہے تم اس سے خوف کھاتے رہا کرو اور یہ بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ بخشش اور حلم والا ہے (۲۳۵)"۔

اس آیت میں بھی قرآن کریم وہی احکامات بیان کر رہا ہے جن کا تعلق فوت شدہ شوہر کی عدت گزارنے والی عورت ہے، فرمایا: ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ فِيمَا عَرَّضۡتُم بِهِۦ مِنۡ خِطۡبَةِ ٱلنِّسَآءِ﴾ "تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اشارۃً ان عورتوں سے نکاح کی بابت کہو"۔ اس ارشاد میں اللہ تعالیٰ نے شوہر کی

وفات کیوجہ سے عدت میں رہنے والی عورت کے انتہائی دقیق مسئلہ میں رہنمائی فرمائی ہے،اوراس حکم میں ان تمام لوگوں کو خطاب کیا گیاہے جن کواس مذکورہ عورت سے نکاح کی رغبت ہوسکتی ہے، حکم یہ ہے کہ ایسا شخص جواس وفات شدہ شوہر کی بیوی سے نکاح کا خواہشمند ہو تو(دوران عدت) بغیر کسی صراحت کے اشارہ اور کنایہ میں اس کے ساتھ شادی کی رغبت کا اظہار کرنے میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔اس ارشاد ربانی میں کئی فائدے ہیں: سماج میں رہتے ہوئے شرم وحیاء اور خشیت کی تربیت، متوفی عنہا زوجہا کے مشاعر کاادب واحترام، فوت شدہ شوہر کی وجہ سے ہونے والی عدت کا پاس ولحاظ، ساتھ ہی خواہشمند کی خواہش کی رعایت بایں طور کہ اشارۃ اس کی رغبت کا اظہار ہوجائے اوراس کی کوئی حتمی صراحت نہ ہو۔ (تعریض) کا مطلب کسی چیز کے مفہوم اور مقصد کو اشارہ میں سمجھادیناہے۔آیت سے معلوم ہوا کہ عدت گزارنے والی سے صراحۃ شادی کی رغبت کا ظہار ناجائز ہے، کیوں کہ شریعت میں صرف اشارے کی حد تک اجازت ہے ،اس لیے اس کا واضح مفہوم ہے کہ عدت گزارنے والی سے خواہشِ نکاح کا صراحت کے ساتھ اظہار ممنوع ہے۔اس سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوا کہ منہج اسلام کا قاعدہ ہے کہ تعبیرات کی نزاکت کا پاس ولحاظ رکھا جائے اور ایسی تعبیرات ہی استعمال میں لائی جائیں جن کے معنی ومفہوم اعلی معیار کے ہوں،اور ایسی تعبیرات سے گریز کیا جائے جن میں صورت حال اور شرم وحیاء کا پہلوملحوظ نہ ہو، کیوں کہ اسلام شرم وحیاءاوراعلی آداب واخلاق کوفروغ دیتاہے۔

آیت کریمہ کے فوائد میں سے ہے: اسلامی طرز حیات میں نفسیاتی پہلوؤں کی رعایت، بنابریں خواہشمند حضرات کے لیے تعریض کو جائز قرار دیا۔اسی طرح متوفی عنہا زوجہااور فوت شدہ مرد کے اہل خانہ اوراگر مرنے والا صاحب اولاد ہے تواس کی اولاداور ان تمام لوگوں کے مشاعر واحساسات کااحترام جن کااس عورت سے کوئی رشتہ یا تعلق ہے،اسی طرح اس میں فوت شدہ شوہر کااحترام بھی ہے جس کی بیوی ابھی عدت کے ایام میں ہے، چنانچہ انسانی حالات زندگی کے تمام پہلوؤں اوران کے پوشیدہ ترین معاملات کی اللہ تعالی نے اپنے احکام میں پوری رعایت کی ہے۔مطلقہ عورت جو طلاق رجعی کی عدت میں ہواس کے متعلق تعریض کے مسئلہ پر بھی علماء نے گفتگو کی ہے، جن کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ

مطلقہ کے حق میں تعریض جائز نہیں ہے، کیوں کہ جب تک وہ طلاق رجعی کی عدت میں ہے اس وقت تک اس کی حیثیت ایک بیوی جیسی ہے۔

اسی طرح ایسی خواہشات جو ابھی دل کے اندر پوشیدہ ہوں اور ظاہر نہ ہوئی ہوں اور عدت گزارنے والی سے نکاح کی اس خواہش کا سرے سے اظہار نہ کیا ہو، بلکہ چھپائے رکھے، تو ایسی صورت میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے، فرمایا: ﴿أَوۡ أَكۡنَنتُمۡ فِيٓ أَنفُسِكُمۡۚ﴾ "یا اپنے دل میں پوشیدہ ارادہ کرو"۔ یعنی اللہ تعالی نے اس شخص سے گناہ کی نفی کی ہے جو متوفی عنہا زوجہا سے شادی کا ارادہ رکھے، چاہے اشارۃ اس کا اظہار کرے یا سرے سے پوشیدہ رکھے، (إکنان) کے معنی ہے پوشیدہ رکھنا۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے اس معاملہ میں پڑنے والے لوگوں سے اپنے اس علم کو بیان کیا جو علم ان کے ظاہر و مخفی امور کو محیط ہے: ﴿عَلِمَ ٱللَّهُ أَنَّكُمۡ سَتَذۡكُرُونَهُنَّ﴾ "اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ تم ضرور ان کو یاد کروگے"۔ انسانوں کی طبیعت ہی ایسی ہے کہ وہ ضرور خواہشِ نکاح کا ذکر ان عدت والی عورتوں سے جہری طور پر زبانوں سے کریں گے یا اپنے دلوں میں چھپائے رکھیں گے اسی لیے اللہ تعالی نے انسانی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے یہ رخصت مرحمت فرمائی، اور یہ محض اللہ تعالی کی رحمت کا فیضان ہے، کیوں کہ آیت کے مفہوم سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تمہارے ساتھ یہ اللہ تعالی کی رحمت ہی ہے کہ جس کے نتیجے میں اس نے تم سے گناہ کو درگذر کرتے ہوئے تعریض اور اخفاء کو جائز قرار دیا کیوں کہ اس کو تمہاری طبیعت اور نفسیات کا بخوبی علم ہے۔ معلوم ہوا کہ انسان کی ایمانی قوت کو کافی اہمیت حاصل ہے، وہ ایمانی قوت جس کا یہ مطالبہ ہے کہ اللہ تعالی دلوں کے خیالات سے بھی باخبر ہے اور اس کی شریعت نے ان پہلوؤں کی رعایت بھی کی ہے اور اس نے تمام پہلوؤں اور مصلحتوں کے مابین موازنہ کرتے ہوئے اعلی اور معیاری آداب واخلاق کی تعلیم دی۔

آگے اسی حکم کے مزید پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے شرعی آداب بتلائے جارہے ہیں، چنانچہ اللہ تعالی نے اس بات سے منع کیا ہے کہ چپکے سے نکاح کا وعدہ کرلیا جائے، ارشاد ہے: ﴿وَلَٰكِن لَّا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا﴾ "لیکن ان سے پوشیدہ وعدے نہ کرلو"۔ یعنی آدمی اس عورت سے چپکے سے نکاح کا وعدہ نہ کرے، اور یہ تعریض سے تجاوز کرتے ہوئے صراحت کے ساتھ نکاح کی بات کرنا ہے، یا آدمی

اس عورت سے یہ پختہ عہد وپیمان کرلے کہ وہ کسی دوسرے سے شادی نہیں کرے گی، یااس طرح کی کوئی بات کرے تو ایسا کرنا حرام ہے۔ امام قرطبیؒ رحمہ اللہ تعالی بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ عظام کے حوالے سے فرماتے ہیں: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس عدت گزارنے والی عورت سے یہ نہ کہے کہ تم مجھ سے ہی نکاح کرنا، بلکہ اگر نکاح کا ارادہ ہی ہے تو اس سے صرف اشارہ کرے، اور چپکے سے خفیہ طور پر اس سے یہ عہد وپیمان نہ لے کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرے گی (۱)۔ مزید فرماتے ہیں: اسی طرح دوران عدت عورت کا بذات خود، اور باپ کا اپنی باکرہ بیٹی اور مالک کا اپنی لونڈی کے متعلق عہد وپیمان کی کراہیت پر علماء امت کا اجماع ہے (۲) ۔اس حکم سے یہ بات مستثنی ہے کہ: ﴿إِلَّآ أَن تَقُولُواْ قَوۡلٗا مَّعۡرُوفٗاۚ﴾" ہاں یہ اور بات ہے کہ تم بھلی بات بولا کرو "۔اس سے مراد وہی تعریض ہے جس کی اجازت ہے۔ ان احکامات وارشادات باری تعالی میں ہی سماجی معاملات واحوال کی صلاح اور بہبودگی مضمر ہے، خاص طور سے متوفی عنہا زوجہا کے متعلق احکامات میں جس کے عقد نکاح کے مسئلہ کی مزید تاکید اور وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَعۡزِمُواْ عُقۡدَةَ ٱلنِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡكِتَٰبُ أَجَلَهُۥۚ﴾" اور عقد نکاح جب تک عدت ختم نہ ہوجائے پختہ نہ کرو"۔ یعنی جب تک عدت پوری نہ ہوجائے اس وقت تک تم عقد نکاح نہ کرو، اور علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ دوران عدت نکاح صحیح نہیں ہے (۳) ۔اور ﴿حَتَّىٰ يَبۡلُغَ ٱلۡكِتَٰبُ أَجَلَهُۥۚ﴾ سے مراد عدت کا پورا ہونا ہے، اور کتاب سے مراد وہ حد اور مقدار ہے جو عدت کے لیے متعین کی گئی ہے اور اللہ تعالی نے اس کو کتاب اس اعتبار سے کہا ہے کیوں کہ کتاب اللہ ہی نے اس کو متعین اور فرض کیا ہے، جیسا کہ دوسرے مقام پر اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿كِتَٰبَ ٱللَّهِ عَلَيۡكُمۡۚ﴾ [سورة النساء: ٢٤]۔ "اللہ تعالی نے احکام

(١) تفسير قرطبي ٣/١٢٥.

(٢) مرجع سابق.

(٣) تفسير ابن كثير ١/٢٩٤.

تم پر فرض کر دیے ہیں"۔ معنی یہ ہے کہ جب تک یہ مفروضہ مقدار اپنے وقت اور حد کو نہ پہنچ جائے[1]
۔

آیت کا اخری حصہ اس آیت کے مخاطبین کے لیے نصیحت پر مشتمل ہے: ﴿وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ يَعۡلَمُ مَا فِيٓ أَنفُسِكُمۡ فَٱحۡذَرُوهُۚ﴾ " جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی باتوں کا بھی علم رکھتا ہے تم اس سے خوف کھاتے رہا کرو"۔ اللہ تعالی مومنین کو یاد دلا رہا ہے کہ تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ اللہ تعالی تمہارے دل کے اسرار سے واقف ہے، لہذا جو دل کے اسرار واحوال سے واقف ہو وہ لوگوں کے ظاہری اعمال سے بدرجہ اولی باخبر ہوگا جس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس ذات سے ڈرتے رہا جائے، اسی لیے فرمایا: ﴿فَٱحۡذَرُوهُ﴾ "اس سے خوف کھاتے رہا کرو"۔ یعنی اس کے عذاب سے بچو، اور اس کے عذاب سے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ اس کے حدود کی حفاظت کرتے ہوئے ان سے آگے نہ بڑھا جائے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی کے اس علم کے واسطے سے نصیحت کی جارہی جس کا تعلق دلوں سے ہے اور یہ خاص علم ہے، تاکہ ساتھ ہی اس سے اللہ تعالی کے عمومی علم کو بھی سمجھ لیا جائے جس کا تعلق ظاہری اعمال وافعال سے ہے۔ ﴿فَٱحۡذَرُوهُ﴾ کے جملہ کا لازمی تقاضا ہے کہ اس کے ہر انواع واقسام کے عذاب سے بچا جائے، اور اس کی وجہ سے دل میں اس بات کا خوف لاحق ہو کہ کوئی اس کی حدود کے بارے میں جرأت دیکھائے۔ اس کے بعد اس نصیحت کا اختتام اللہ تعالی کے فرمان سے ہو رہا ہے: ﴿وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ﴾ "اور یہ بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ بخشش اور حلم والا ہے"۔ اللہ تعالی نے یہاں پر ایک طرف بیان وتوضیح اور خوف دلایا تو دوسری جانب عدم مایوسی کے لیے اپنی مغفرت اور بردباری -یعنی عذاب میں جلدی نہ کرنے کا تذکرہ کیا تاکہ بندہ اللہ تعالی سے اپنے گناہوں اور غلطیوں سے توبہ واستغفار کرے اور اس کے عفو ومغفرت سے مایوس نہ ہو۔ یقینا عذاب میں جلدی نہ کرنا اللہ جل شانہ کی بردباری کی وجہ سے ہے، اور اللہ کی قسم یہ اللہ تعالی کی اپنے بندوں کے ساتھ شفقت ورحمت ہے، کیوں کہ ایک طرف تو وہ ان کو بتلا رہا اور اپنے حدود میں تجاوز سے ڈرا رہا اور خوف دلا رہا اور ساتھ ہی ان کو اپنی مغفرت سے مایوس اور ناامید ہونے سے منع کر رہا ہے۔ لہذا اس سے زیادہ اس کی رحمت ومغفرت اور حلم کے بارے میں پر امید

---

(١) تفسير قرطبي ١٢٧/٣.

بیان نہیں ہو سکتا ہے۔ پس تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو ساری کائنات کا رب ہے۔ اس اسلوب سے یہ فائدہ ماخوذ ہوتا ہے کہ تربیتی اعتبار سے ترغیب و ترہیب کو کافی اہمیت حاصل ہے، اور یہ کہ ایک داعی اور مربی کو کبھی اللہ تعالی کی رحمت اور مغفرت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، اسی طرح اللہ کا حلم ایک گناہ گار و نافرمان اور قصور وار کے لیے نعمت ہے تاکہ وہ اپنی گناہ سے توبہ اور استغفار کر لے۔

﴿لَّا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ إِن طَلَّقۡتُمُ ٱلنِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوهُنَّ أَوۡ تَفۡرِضُواْ لَهُنَّ فَرِيضَةٗۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى ٱلۡمُوسِعِ قَدَرُهُۥ وَعَلَى ٱلۡمُقۡتِرِ قَدَرُهُۥ مَتَٰعَۢا بِٱلۡمَعۡرُوفِۖ حَقًّا عَلَى ٱلۡمُحۡسِنِينَ ٢٣٦﴾

ترجمہ:

"اگر تم عورتوں کو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر مہر مقرر کئے طلاق دے دو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں، ہاں انہیں کچھ نہ کچھ فائدہ دو۔ خوش حال اپنے انداز سے اور تنگ دست اپنی طاقت کے مطابق دستور کے مطابق اچھا فائدہ دے بھلائی کرنے والوں پر یہ لازم ہے (۲۳۶)"۔

اس کے بعد قرآن کریم کا سیاق طلاق کی ایک دوسری صورت کی طرف منتقل ہو رہا ہے: ﴿لَّا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ إِن طَلَّقۡتُمُ ٱلنِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوهُنَّ أَوۡ تَفۡرِضُواْ لَهُنَّ فَرِيضَةٗۚ﴾ "اگر تم عورتوں کو بغیر ہاتھ لگائے اور بغیر مہر مقرر کئے طلاق دے دو تو بھی تم پر کوئی گناہ نہیں"۔ اللہ تعالی نے اس آیت کریمہ میں اس شخص سے گناہ کی نفی کی ہے جو نکاح کے بعد اور دخول یعنی جماع سے پہلے طلاق دے دے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں ان لوگوں کو موقع دیا جا رہا ہے جن کے نکاح کے بقا کے متعلق رجحانات رخصتی اور جماع سے پہلے تبدیل ہو گئے ہوں۔ (مَا لَمۡ تَمَسُّوهُنَّ) یعنی رخصتی اور جماع سے پہلے۔ اس نکاح کے عدم استمرار کے بے شمار اسباب ہو سکتے ہیں، اور بسا اوقات طلاق کی یہی صورت زیادہ بہتر اور مفید ہوتی ہے بہ نسبت جماع کے بعد طلاق کے۔ اور چونکہ اس میں ایک طرح سے مطلقہ کا دل ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے مہر نہ دیئے جانے کی صورت میں اللہ تعالی نے بطور فائدہ اس کو کچھ دے دینے کا حکم دیا، فرمایا: ﴿أَوۡ تَفۡرِضُواْ لَهُنَّ فَرِيضَةٗۚ﴾ "اور بغیر مہر مقرر کئے"۔ یعنی اس عورت کو کچھ معاوضہ دینا ہے جس کی ادائیگی حسب حال شوہر کی جانب سے ہو گی، لہذا خوش حال اپنے انداز سے اور تنگ دست اپنے حساب سے دے۔ ﴿عَلَى

ٱلْمُوسِعِ قَدَرُهُۥ وَعَلَى ٱلْمُقْتِرِ قَدَرُهُۥ﴾(۱) "ہاں انہیں کچھ نہ کچھ فائدہ دو۔ خوش حال اپنے انداز سے اور تنگ دست اپنی طاقت کے مطابق"۔

اس میں اللہ تعالی کی لطف ومہربانی ظاہر ہے کہ اس نے اس طرح کے مصیبت کے حالات میں انسانوں کی دل جوئی کا بندوبست فرمایااوراس تابندہ شریعت اسلامیہ میں نفسیاتی پہلوؤں کے احکامات کو یوں ہی رائیگاں نہیں جانے دیا بلکہ اس جانب بھی نہایت حکیمانہ اور لطیفانہ رہنمائی فرمائی جیسا کہ الگ الگ مقامات پر اسلام کے موقف سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہے۔ نیز اللہ تعالی کا لطف وکرم اس بات میں ظاہر ہے کہ اس نے اس معاوضہ کی مقدار شوہر کی مالی حیثیت کے حوالے کر دی یعنی یہ معاوضہ شوہر کی وسعت وطاقت کے مطابق دیا جائے گا۔ اور اس اعتبار سے انسانوں کی اصلا دو ہی قسمیں ہیں (الموسع) اور (المقتر)، موسع سے مراد خوش حال، اور مقتر سے مراد تنگ دست اور مالی اعتبار سے کمزور۔ اور ان دونوں کے بیچ تمام لوگ کم وبیش فراخی اور تنگی کے حساب سے مختلف درجات میں بٹے ہوئے ہیں، اسی کی وضاحت لفظ (قَدَرُهُۥ) میں کی گئی ہے، اور یہ شریعت سازی اور توجیہی احکامات کی باریکی ہے کہ مختصر سے الفاظ میں مختلف لوگوں کی حیثیت کے اعتبار سے اخراجات کی الگ الگ مقدار کا ایک ایسا نظام بنا دیا گیا جس کے تحت مالی حیثیتوں کے مطابق ہر طرح کے لوگ اس میں شامل ہو گئے، یہ قرآن کریم کا عظیم طرز بیان ہے جس سے انسان سیکھ سکتا ہے کہ الفاظ کیسے اپنی مراد پر فٹ اور وضاحت وبیان میں پورے سلیقے کے ساتھ ہوتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی اس حکم کی مزید وضاحت اور تاکید کر رہا ہے: ﴿مَتَٰعًۢا بِٱلْمَعْرُوفِ﴾ "دستور کے مطابق اچھا فائدہ دے"۔ یعنی حتی المقدور واجبی حق کے حساب سے(۲) ۔ لفظ (معروف) ایسی صفت اور پیمانہ ہے جس میں اخلاق اور فراخ دلی وسخاوت کے سارے پہلو شامل ہیں، اور اس کے ذریعہ لوگوں کے جود وسخا اور استطاعت ووسعت کے باہمی فرق کا بھی یہی پیمانہ ہے، اسی سے تمام لوگوں کی حیثیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد باری تعالی ہے: ﴿حَقًّا عَلَى ٱلْمُحْسِنِينَ﴾ " بھلائی کرنے والوں پر

---

(۱) مزید دیکھیں تفسیر ابن کثیر ۱/۲۹۵.

(۲) زاد المسیر ۱/۲٤۷.

یہ لازم ہے"۔اس ارشاد الٰہی میں ایک طرح سے احسان کرنے والوں کی تشجیع ہے،اس لیے کہ اس سے یہی مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ یہ انہی لوگوں پر واجب ہے جو احسان کی صفت سے متصف ہیں،اور ہر مومن کی یہ خواہش ہوتی ہے وہ احسان کی صفت سے متصف ہو،اور کوئی نہیں چاہتا کہ اس میں یہ صفت نہ ہو یا کوئی اسے اس صفت سے عاری گردانے، لہذا یہ ایسی صفت ہے جو لوگوں کو اس صفت کے اختیار کرنے پر آمادہ کرنے والی، نیز خیر کے کام کرنے اور رغبت رکھنے پر ابھارتی ہے ، چنانچہ جو شخص احسان کی صفت سے عاری ہو وہ اس حکم الٰہی پر عمل نہیں کر سکتا،اور ایسا کوئی نہیں چاہے گا۔ معلوم ہوا کہ تربیتی،دعوتی،اداری اور انسانی کارکردگی کے تمام جہات وجوانب میں قرآن کریم کے اسلوبی منہج کو نمونہ بنانا کافی اہم ہے، کیوں کہ قرآن کریم کا منفرد اسلوب خیر وبھلائی کا باعث ہے ،اور قرآن کے توجیہات وارشادات پر عمل ہی کامیابی کا ضامن ہے۔

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے بنی نصر کے قبیلہ کی ایک عورت سے شادی کی،اور زفاف سے پہلے ہی اس کو طلاق دے دی،اور اس کو پوری مہر بھیج کر کہا: میں اس مہر کے معاف کر دینے کا زیادہ حق رکھتا ہوں۔ ذرا غور کریں کہ اس آیت کریمہ کا صحابی جلیل جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کے کردار پر کتنا زیادہ اثر پڑا،اسی طرح ان کا یہ کہنا کہ میں اس مہر کے معاف کر دینے کا زیادہ حق رکھتا ہوں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ پہل مطلقہ بیوی کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے بایں طور کہ وہ بھی اپنا حق مہر معاف کر دے۔

آیت کریمہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس میں جماع کے لیے بطور کنایہ (تَمَسُّوهُنَّ) کا لفظ استعمال ہوا ہے،اور اس سے بھی معنی مقصود مکمل طور سے ادا ہو جا رہا ہے،مزید یہ کہ اس میں عورت کے شرم وحیا کی پاسداری بھی ہے،بجائے اس کے کہ لفظ جماع کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا جاتا اور یہ ایک عورت کے لیے حرج اور شرمندی کا سبب بنتا۔ اس سے پتہ چلا کہ استعمال الفاظ کی تربیت اور اس جانب توجہ اور حالات واشخاص کی رعایت کرتے ہوئے الفاظ کا انتخاب بہت ضروری ہے، لہذا برانگیختہ کرنے والے، نیز ایسے الفاظ سے دور رہنا چاہیے جن میں شرم وحیاء کا مناسب انداز سے خیال،اور گفتگو کے وقت لوگوں کے شعور واحساسات کا لحاظ نہ ہو،اسی طرح تمام سماجی معاملات میں اس کی رعایت ضروری ہے۔

﴿وَإِن طَلَّقۡتُمُوهُنَّ مِن قَبۡلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيضَةٗ فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ إِلَّآ أَن يَعۡفُونَ أَوۡ يَعۡفُوَاْ ٱلَّذِي بِيَدِهِۦ عُقۡدَةُ ٱلنِّكَاحِۚ وَأَن تَعۡفُوٓاْ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوَىٰۚ وَلَا تَنسَوُاْ ٱلۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡۚ إِنَّ ٱللَّهَ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾﴾

ترجمہ:

"اورا گرتم عورتوں کواس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انہیں ہاتھ نہیں لگایاہواور تم نے ان کامہر بھی مقرر کردیاتو مقررہ مہر کا آدھامہر دے دو یہ اور بات ہے وہ خود معاف کردیں ، یا وہ شخص معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے ، تمہارا معاف کردینا تقویٰ سے بہت نزدیک ہے اور آپس کی فضیلت اور بزرگی کو فراموش نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے(۲۳۷)۔

قرآن کاسیاق مزید طلاق کی ایک دوسری قسم کی طرف منتقل ہورہاہے،اللہ تعالی کاارشادہے: ﴿وَإِن طَلَّقۡتُمُوهُنَّ مِن قَبۡلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَهُنَّ فَرِيضَةٗ فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ﴾" اورا گرتم عورتوں کواس سے پہلے طلاق دے دو کہ تم نے انہیں ہاتھ نہیں لگایاہواور تم نے ان کامہر بھی مقرر کردیاتو مقررہ مہر کاآدھامہر دے دو"۔ یہ فرق بیوی کی مہر متعین ہونے کی صورت میں ہے، چنانچہ جب شوہر بیوی کو عقد کے بعداور جماع سے پہلے طلاق دے اوراس کی مہر بھی مقرر ہوچکی ہو، تو طلاق کی صورت میں عورت کو نصف مہر دیناواجب ہوگا۔ مسئلہ ہذامیں علماء کے یہاں فقہی اجتہادات اور کافی تفصیلات پائی جاتی ہیں، یہاں پر صرف اتنا سمجھنافائدے مند ہوگا کہ اس نظام اور قانون سازی میں کافی دقت اور گیرائی ہے کیوں کہ اس آیت اوراس سے پہلے والی آیت کے مابین فرق ہے، سابقہ آیت میں مہر کی تحدید وتعیین سے پہلے طلاق دی جاتی ہے،اس لیےاس کے حق میں یہ حکم ہے کہ اس کواتنادے دیاجائے جس سے اس کی دلجوئی ہوسکے۔ جیساکہ فرمایا: ﴿وَمَتِّعُوهُنَّ﴾ "انہیں کچھ نہ کچھ فائدہ دو"۔اوراس آیت میں مہر کی تعیین ہوچکی ہوتی ہے، توایسی صورت میں اس کی دلجوئی کے لیے نصف مہر دیناواجب قرار دیاگیا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ عورت اس کو نہ لے اور معاف کردے: ﴿إِلَّآ أَن يَعۡفُونَ﴾ "یہ اور بات ہے کہ وہ خود معاف کردیں"۔ چنانچہ شریعت نے بیوی کواپنے حق کے متعلق دست برداری کرتے ہوئے شوہر پر کرم

فرمائی کا ایک موقع عنایت کیا، اور یہ چیز زوجین کے مابین رحم وکرم کے بہترین مواقع میں سے ہے ، کیوں کہ بسااوقات شوہر کو اس کی حالت زار کے پیش نظر اس امر کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے جس کی رعایت کرتے ہوئے شریعت نے بیوی کو اپنے حق سے دست برداری کی اجازت دے رکھی ہے۔ ﴿أَوۡ يَعۡفُوَاْ ٱلَّذِي بِيَدِهِۦ عُقۡدَةُ ٱلنِّكَاحِ﴾" یا وہ شخص معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے "۔اس سے مراد شوہر ہے ،اور اس مسئلہ کے متعلق فقہاء کرام نے کافی تفصیلی گفتگو کی ہے ، لیکن یہاں پر جو بات مستفاد ہے ہے وہ یہ کہ شوہر بھی اگر چاہے تو بیوی کے مہر کا آدھا حصہ معاف کرتے ہوئے مکمل مہر ادا کردے ، جیسا کہ بیوی کے لئے یہ جائز تھا کہ وہ اپنی آدھی مہر کا حق معاف کردے۔اس کے بعد اللہ تعالی نے زوجین کے حق میں معافی کو ہی بہتر قرار دیا ہے ، فرمایا: ﴿وَأَن تَعۡفُوٓاْ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوَىٰۚ﴾ " تمہارا معاف کردینا تقویٰ سے بہت نزدیک ہے "۔اس میں میاں بیوی کے آپسی حق مہر کے متعلق ہر ایک کو دوسرے کے لیے معافی میں سبقت اور مبادرت کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے تاکہ ہر کوئی آگے بڑھ کر مہر سے دست برداری کا اظہار کرے ، زوجین کے مابین جدائی میں اس احسان مندی کے اعلی اخلاق کے اجر وثواب کے حصول یابی کے ساتھ ساتھ خیر وبھلائی اور رحم وکرم اور دوسرے کے خاطر اپنے حق کو چھوڑدینے کے جذبہ کو تقویت حاصل ہوتی ہے ،اور اس اعلی اخلاق وکردار کی بالادستی زوجین کے مابین فرقت اور جدائی کے وقت بھی قائم رہتی ہے ،اور دیکھا دیکھی اس کا اثر دوسروں پر بھی ظاہر ہوتا ہے ، چنانچہ یہ حوصلہ افزائی بہت ہی بااثر ، فعال اور مستحکم خصوصیت کی حامل ہے جس کا تعلق حصول تقوی سے ہے ، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَأَن تَعۡفُوٓاْ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوَىٰۚ﴾ " تمہارا معاف کردینا تقویٰ سے بہت نزدیک ہے "۔ متقی اور پرہیز گار کے عمل کا تقوی کے قریب تر ہونا ایک ایسا اعلی مقام ہے جو مزید تقوی کے حصول کا باعث ہے جس تک رسائی کی آرزو ہر مومن کی ہوتی ہے ،اس سے تربیتی ناحیے سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ انسان کے اندورن کو برانگیختہ کرنا ، اخلاقی تربیت ، عفو ودر گزر ، دوسروں کے خیر کے لیے اپنے حقوق سے دست برداری یہ سارے امور حصول تقوی کے لیے کافی اہمیت رکھتے ہیں جس کے ذریعہ بندہ مومن اللہ تعالی کا تقرب حاصل کر سکتا ہے۔ آگے آیت کریمہ میں مزید تشجیع اور حوصلہ افزائی ہو رہی ہے ، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا تَنسَوُاْ ٱلۡفَضۡلَ

بَيْنَكُمْ ﴾" اور آپس کی فضیلت اور بزرگی کو فراموش نہ کرو "یعنی فضیلت کے حصول کو نہ بھولو جو فضیلت مرد پوری مہرادا کر کے اور عورت اپنی آدھی مہر کو چھوڑ کر حاصل کر سکتی ہے۔ یہ نہج ربانی کتنا خوبصورت اور دور رس ہے! اس ارشاد الہی کے من جملہ فوائد میں سے ہے کہ فضل کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے، اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ آدمی ہمیشہ ماضی کے احسانات اور خیر و بھلائی کو یاد رکھے، اس سے بہت سارے اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا ہے، اور انسان خوش طبعی کے ساتھ فضل و کرم پر از جلد راضی ہو سکتا ہے۔

﴿حَٰفِظُواْ عَلَى ٱلصَّلَوَٰتِ وَٱلصَّلَوٰةِ ٱلْوُسْطَىٰ وَقُومُواْ لِلَّهِ قَٰنِتِينَ ﴿٢٣٨﴾ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُواْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٩﴾﴾

ترجمہ:

"نمازوں کی حفاظت کرو، بالخصوص درمیان والی نماز کی ، اور اللہ تعالیٰ کے لئے با ادب کھڑے رہا کرو (۲۳۸)۔ اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل ہی سہی یا سواری ہی سہی، ہاں جب امن ہو جائے تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح کے اس نے تمہیں اس بات کی تعلیم دی جسے تم نہیں جانتے تھے (۲۳۹)"۔

اس کے بعد آیت کریمہ کا سیاق نماز کے حکم کی طرف منتقل ہوتا ہے، اور پھر دوبارہ متوفی عنہا زوجہا کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی امت مسلمہ کو نماز کی حفاظت کا حکم دے رہا ہے : ﴿حَٰفِظُواْ عَلَى ٱلصَّلَوَٰتِ وَٱلصَّلَوٰةِ ٱلْوُسْطَىٰ وَقُومُواْ لِلَّهِ قَٰنِتِينَ ﴾" نمازوں کی حفاظت کرو، بالخصوص درمیان والی نماز کی ، اور اللہ تعالیٰ کے لئے با ادب کھڑے رہا کرو "۔ نماز کی ادائیگی کی حفاظت پر ابھارنے کے لیے امر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اور حفاظت کا مفہوم یہ ہے کہ اس پر دوام اور ہیشگی برتی جائے، اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی ادائیگی پر مداومت واجب اور ضروری ہے، اور اس میں کسی طرح کی سستی جائز نہیں۔ اس سے نماز اور اس پر مداومت و حفاظت کی عظمت اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے ، اور ساتھ ہی نماز کی پابندی کرنے والے کے مقام و مرتبے کا بھی، کیوں کہ جو اللہ تعالی کے احکامات کو بجالاتا ہے تو اللہ تعالی کے فضل و کرم سے اس کے مقام و مرتبے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے تمام نمازوں میں سے بیچ والی نماز کا خصوصیت کے ساتھ الگ سے ذکر کیا، حالاں کہ

نماز کے عام حکم میں وہ بھی داخل ہے، یہ اس کے شرف و منزلت کو اجاگر کرنے کے لیے ہے۔اس بیچ والی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے، نیز اس کی تعیین میں دیگر اقوال بھی ہیں بلکہ اس کے متعلق دس اقوال ملتے ہیں، ایک قول یہ بھی ہے کہ شب قدر کی طرح اس کو بھی مبہم رکھا گیا ہے تاکہ اس کی تلاش میں بندہ مومن خوب محنت کرے۔امام قرطبیؒ رحمہ اللہ نے اس کے مبہم ہونے کو ہی راجح قرار دیا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام نمازوں کی حفاظت کی جائے اور ان کو ان کے وقت پر ادا کیا جائے۔ واللہ تعالی اعلم (۱)۔اس قول کی خاص بات یہ ہے کہ ایک مسلم تمام نمازوں کی حفاظت پر آمادہ ہوگا، کیوں کہ اولا تو یہ اللہ تعالی کا حکم ہے، دوسرے یہ تاکہ تمام نمازوں کی ادائیگی میں صلاۃ وسطی بھی شامل ہو جائے، اس سے معلوم ہوا کہ ان تمام نمازوں میں کسی ایک نماز کو اللہ تعالی کے نزدیک خاص شرف حاصل ہے، اس لیے ایک مسلم کو چاہیے کہ وہ اس نماز کی جستجو میں تمام نمازوں میں خوب کوشش کرے تاکہ اس نماز میں مزید خیر کے حصول سے ہم کنار ہو سکے۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے نماز کی صفت قیام کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَقُومُوا۟ لِلَّهِ قَـٰنِتِينَ﴾"اور اللہ تعالیٰ کے لئے با ادب کھڑے رہا کرو"۔اللہ تعالی نے ایک نمازی کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی نماز میں فرمابردار، پورے خشوع وخضوع اور سکون کے ساتھ اللہ تعالی کے روبرو کھڑا رہے، جس کا لازمی معنی یہ ہے کہ نماز میں کسی طرح کی گفتگو نہیں کی جاسکتی۔

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم نماز میں بات کر لیا کرتے تھے اور آدمی اپنی بغل میں کھڑے ساتھی سے ہم کلام ہو لیتا تھا، تاآں کہ اس آیت کریمہ کا نزول ہوا اور ہم کو خاموش رہنے کا حکم ہوا چنانچہ ہم بات کرنے سے روک دیئے گئے (۲) ۔لفظ (قانتین) کے تمام مفاہیم و معانی نماز کے اندر مقصود ہیں اور ایک نمازی کو اپنی نماز میں جن امور کی رعایت ضروری ہے یہ لفظ ان تمام معانی اور مفاہیم کو شامل ہے۔

---

(۱) تفسير قرطبي ۳/ ۱٤۰

(۲) مرجع سابق.

غالب اور عام حالات میں نماز کے اندر خشوع وسکون واطمینان کے ساتھ قیام کے حکم کے بعد آگے کی آیت میں اللہ تعالی نے ایک ایسی صورت حال کو حکم بیان کیا ہے جس میں نمازی خوف سے دوچار ہوتا ہے، فرمایا: ﴿ فَإِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا أَوۡ رُكۡبَانٗاۖ ﴾ "اگر تمہیں خوف ہو تو پیدل ہی سہی یا سواری ہی سہی "۔ خوف سے مراد گھبراہٹ اور بے چینی چاہے وہ کسی بھی بے چین کر دینے والے معاملے کی وجہ سے ہو، اسی لیے خوف کو بالکل عام پیرائے میں بیان کیا گیا ہے اور خوف کی وجہ نہیں بیان کی گئی تاکہ ہر طرح کا خوف وخطر اس آیت کے حکم میں شامل ہوسکے۔ اللہ تعالی نے یہ واضح طور پر بیان کر دیا کہ نماز جیسی عبادت کسی بھی حالت میں حتی کہ حالت خوف میں بھی ساقط نہیں ہوسکتی، البتہ حالت خوف میں اس کی ادائیگی کی کیفیت میں رخصت دی گئی ہے بایں طور کہ قدموں پر چلتے چلتے یا سواریوں کی پیٹھوں پر یا اس کے علاوہ گاڑی اور سائیکل وغیرہ پر سوار ہی سہی، جس قدر استطاعت ہو اور جس جانب بھی رخ ہوسکے اس نماز کو ادا کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز کو اس کے وقت میں ادا کرنا ضروری ہے اور نماز کو اس کے وقت سے تاخیر کرنا خوف وخطر کی حالت میں بھی جائز نہیں، چنانچہ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ بغیر کسی مجبوری کے نماز کی ادائیگی میں دیر کرنے سے بچے، کیوں کہ جب ایک خوفزدہ کو تاخیر کی رخصت نہیں دی گئی ہے تو پرامن ماحول میں رہنے والے کے لیے کیسے رخصت ہوسکتی ہے، اسی لیے اللہ تعالی نے آیت میں آگے اس کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَإِذَآ أَمِنتُمۡ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمۡ تَكُونُواْ تَعۡلَمُونَ ﴾ "ہاں جب امن ہو جائے تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح کہ اس نے تمہیں اس بات کی تعلیم دی جسے تم نہیں جانتے تھے"۔ چنانچہ اللہ تعالی نے حالات سازگار ہو جانے پر نماز کو اس کی مکمل کیفیت کے ساتھ ادا کرنے حکم دیا، یعنی حالت امن میں جس طرح سے اللہ تعالی نے تم کو نماز کی ادائیگی کا حکم دیا ہے، مکمل رکوع، سجدہ، قیام، قعود اور خشوع وخضوع کے ساتھ۔ یہ اللہ تعالی کا اپنے بندوں پر محض احسان ہے کہ اس نے انہیں ایمان وعبادات اور اخلاق اور دینی علوم سے مالا مال کیا جن سے وہ پہلے نابلد اور جاہل تھے۔

اللہ تعالی کے فرمان ﴿فَإِذَآ أَمِنتُمۡ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ ﴾ " ہاں جب امن ہو جائے تو اللہ کا ذکر کرو "اس میں ذکر کا حکم ہے تاکہ اس میں نماز اور عام ذکر شکر، تسبیح، تہلیل، تکبیر اور حمد وثنا سب آجائے۔

آیت کی تفسیر میں دونوں قول ہیں۔ تو جس طرح دین کے سارے خیر جن سے تم ناواقف تھے اور اللہ تعالی نے تم کو سیکھایا تو تم بھی اس کا ذکر ہر طرح سے کرو۔

اس آیت کریمہ کے فوائد میں سے ہے کہ اس دین کے احکامات عاجز کرنے والے یا تنگی میں ڈالنے والے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی سبب کی بنا پر مکمل عبادت کی ادائیگی ممکن نہ ہو سکے تو اللہ تعالی اس عبادت کا کچھ حصہ اور کفایتی مقدار بھی قبول کرلیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالی نے خوف کی حالت میں نماز کا کفایتی طریقہ بھی بتلادیا، اور اپنے مومنوں کو خوف کی حالت میں نماز کی ادائیگی کا طریقہ سیکھلایا جس کا علم ان کو نہیں تھا اور یہ چیز اللہ تعالی کے شکر اور ہر طرح سے اس کے ذکر کا تقاضا کرتی ہے ۔اس آیت سے یہ بھی پتہ چلا کہ نماز جب ایک خوف زدہ آدمی سے بھی معاف نہیں، تو دوسرے حالات میں بھی بدرجہ اولی معاف نہیں ہو سکتی، بلکہ جس طرح ممکن ہو سکے اس کو ادا کرنا ہی کرنا ہے، یہی اللہ تعالی کا ارشاد ہے اور یہی حکم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت مطہرہ میں دیا ہے۔ یہ نماز کی کے مقام ومرتبے اور شرف ومنزلت کی مستحکم اور مضبوط دلیل ہے، لہذا ضروری ہے کہ بندہ اس میں کسی طرح کی سستی نہ کرے اور اس کے مقام ومرتبے کا پاس ولحاظ رکھے ،اور یہ چیز اس کی حفاظت ،اس میں خشوع کی کوشش اور اس کے مکمل طور سے ادائیگی کے ذریعہ ممکن ہے۔

﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٤٠﴾ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿٢٤١﴾ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٢٤٢﴾﴾

ترجمہ:

"جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں اور وہ وصیت کر جائیں کہ ان کی بیویاں سال بھر تک فائدہ اٹھائیں ، انہیں کوئی نہ نکالے، ہاں اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے لئے اچھائی سے کریں، اللہ تعالی غالب اور حکیم ہے (۲۴۰)۔طلاق والیوں کو اچھا

فائدہ دینا پرہیزگاروں پر لازم ہے (۲۴۱)۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیتیں تم پر ظاہر فرمارہا ہے تاکہ تم سمجھو(۲۴۲)"۔

نماز کی ادائیگی اور اس کی حفاظت کے وجوب کے بیان کی وجہ سے درمیان میں مطلقہ اور متوفی عنہا زوجہا کے متعلق احکامات کا سیاق منقطع ہوگیا تھا دوبارہ اسی متوفی عنہا زوجہا اور اس کے ساتھ بھلائی کے حکم کا سیاق لوٹ رہا ہے، اور شاید یہ اسلوب بیان کسی اہم معاملہ کی طرف توجہ مبذول کرانے کی قبیل سے ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر موضوع کے تکمیل سے پہلے درمیان ہی میں بات کاٹ دی گئی تاکہ اس امر کی طرف پوری توجہ دی جائے، کیوں کہ کسی موضوع پر گفتگو کرنے والا اپنی بات اسی وقت کاٹتا ہے جب کوئی بہت ہی اہم معاملہ درپیش ہو اور اس کا بیان کرنا ناگزیر ہو، اور پھر نئے سرے سے اپنے سابقہ موضوع کی طرف لوٹتا ہے، ایسا اس لیے ہے کیوں کہ معاملہ نماز کا ہے جو کہ دین کا ستون ہے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ وَٱلَّذِينَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنكُمۡ وَيَذَرُونَ أَزۡوَٰجٗا وَصِيَّةٗ لِّأَزۡوَٰجِهِم مَّتَٰعًا إِلَى ٱلۡحَوۡلِ غَيۡرَ إِخۡرَاجٖ ﴾ " جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں اور وہ وصیت کر جائیں کہ ان کی بیویاں سال بھر تک فائدہ اٹھائیں ، انہیں کوئی نہ نکالے "۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی متوفی عنہا زوجہا کے ساتھ طرز تعامل کو بیان کر رہا ہے، اور یہ اس کے حق میں اللہ تعالی کا تاکیدی فرمان ہے کہ وہ سال بھر تک خود اپنے شوہر کے وہاں باقی رہے اور لوگ بھی اس کو باقی رکھیں اور وہ وہاں رہ کر سال بھر تک فائدہ اٹھائیں، ان کی عزت، نان ونفقہ اور دیگر ضروریات کا انتظام ہو، ایسا محض اس کے شوہر کی وجہ سے بیوی کی تکریم اور بھلائی کے طور پر ہے، لہذا اللہ تعالی نے اس کے حق میں دو چیزیں بیان کی، ایک تو یہ کہ وہ چار مہینہ اور دس دن عدت میں رہے اور ایک سال تک فائدہ اٹھائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منہج اسلام نے انسانی طرز زندگی کے اندورنی اور اخلاقی پہلوؤں کی پاس داری اور محبت وخیر خواہی کی حفاظت کو خوب سراہا ہے ، اور در حقیقت میت جس کو چھوڑ کر گیا ہے اس کی تکریم وعزت میں اس مرنے والے کی تکریم بھی ہے ، اس میں بیوی کی دلجوئی بھی ہے جو کہ اس وفات کے حادثے سے دوچار ہوئی ہے۔ اس توجیہ توجیہ ربانی سے یہ پتہ چلا کہ اخلاقی اور نفسیاتی پہلوؤں کی رعایت کافی اہمیت کی حامل

ہے، اور یہ کہ محض تعلقات کے ٹوٹ جانے پر ہی نظر نہ رکھی جائے بلکہ ماضی کی خیر خواہی بھی مد نظر ہو تاکہ اس کے نتیجے میں مزید بھلائی کی راہ ہموار ہو۔

اگر بیوی پورے سال گزارنے کی خواہش نہیں رکھتی تو اللہ تعالی نے اس کو اس حکم سے مستثنی کر دیا ہے: ﴿فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِيٓ أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ﴾ " ہاں اگر وہ خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے لئے اچھائی سے کریں " ۔یعنی اگر بیوی اپنی عدت پوری کر لینے کے بعد شوہر کے گھر سے جانا چاہے تو اس معاملہ میں اس کو پوری آزادی حاصل ہے، اور اگر وہ اپنے طور پر ایسا کرتی ہے تو میت کے گھر والوں پر کوئی مضائقہ اور گناہ نہیں ہے، اور اس عورت کے لیے شریعت کے دائرے میں رہ کر عام زیب وزینت جائز ہے: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِيٓ أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ﴾" تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے لئے اچھائی سے کریں "۔اس آیت سے حریت اور آزادی کے دائرہ کار کے متعلق منہج اسلام کی وضاحت ہوتی ہے بایں طور کہ یہ آزادی شریعت اسلامیہ کی حدود سے تجاوز نہ کرے، کیوں کہ انسانی آزادی کا سلسلہ اللہ تعالی کی حدود کے پاس پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ اسلام ہی لوگوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق کی حفاظت کا ضامن ہے ، کیوں کہ بسااوقات ایک طرف سے دوسرے کو جب تکلیف پہنچائی جاتی ہے تو دوسرے لوگ بھی ان پر مسلط ہو جاتے ہیں اور پھر سماج میں دوسروں پر شرعی حدود کی پامالی کا ایک سلسلہ چل پڑتا ہے، چاہے اس کی جو بھی صورت ہو۔اسی لیے اللہ تعالی نے لوگوں کے انفرادی حقوق کی حفاظت فرمائی اور اسی طرح ان حقوق کی بھی جو دوسروں کے مابین سماج میں مختلف تعلقات اور مراتب کی بنیاد پر مرتب ہوتے ہیں۔

اس کے بعد آیت کے اختتام میں ایک نصیحت ہے جو مخاطبین کے حق میں بالخصوص اور عمومی طور پر تمام لوگوں کے لیے ہے: ﴿وَٱللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ " اللہ تعالی غالب اور حکیم ہے "۔اللہ تعالی لوگوں کو یاد دلا رہا ہے کہ وہ غالب ہے اور ساری عزت اسی کے لیے ہے جو کہ اس کی قدرت کاملہ اور مکمل غلبہ کو متضمن ہے۔ اور وہ ان احکامات میں حکمت والا ہے جو کہ اس کے عظیم حکمت کا ثبوت ہیں، اور یہ تمام احکامات بالکل اپنے حقیقی مقام پر ہیں۔

متوفی عنہا زوجہا کے متعہ کے ذکر کے بعد مطلقہ کے متعہ کا ذکر ہو رہا ہے: ﴿ وَلِلْمُطَلَّقَٰتِ مَتَٰعٌۢ بِٱلْمَعْرُوفِ ﴾" طلاق والیوں کو اچھا فائدہ دینا ہے"۔ ہر طلاق والی عورت کا اس کے شوہر پر حق ہے کہ وہ اس کو کچھ دے کر فائدہ پہنچائے جس میں شوہر اور بیوی دونوں کے حیثیت کی رعایت ہو، اس کے بعد اللہ تعالی اس متعہ کا حکم بیان کر رہا ہے: ﴿حَقًّا عَلَى ٱلْمُتَّقِينَ ﴾" یہ پرہیز گاروں پر لازم ہے "۔ حق کے لفظ سے مراد وجوب ہے، لہذا یہ لازمی اور ضروری حق ہے جس کی ادائیگی اللہ کے متقی اور پرہیز گار بندے کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو اللہ تعالی کا تقوی اختیار کرتا ہے وہی فرائض کو ادا کرتا ہے، اور فرائض کی ادائیگی آدمی کے تقوی کی دلیل ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمْ ءَايَٰتِهِۦ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴾" اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنی آیتیں تم پر ظاہر فرما رہا ہے تاکہ تم سمجھو" اس آیت میں اللہ تعالی اپنے مومن بندوں پر احسان جتلا رہا ہے کہ اس نے ان کے لیے یہ عظیم آیتیں بیان کیں جن میں واجب و مستحب اور مکروہ و حرام سارے احکامات ہیں اور ساتھ ہی آداب واخلاق کا بیان ہے، تاکہ ان کے ذریعہ سے تم پورے علم و شعور کے ساتھ ان احکامات کی بجاآوری کر سکو۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کے احکامات کی بجاآوری سے انسانی عقل پروان چڑھتی ہے، کیوں کہ ان احکامات پر عمل پیرا لوگوں کے لیے عقلمندی کا وصف استعمال ہوا ہے ، لہذا جو ان احکامات کی ادائیگی میں سستی کا مظاہرہ کریں گے ان کے لیے عقلمندی کی صفت نہیں ثابت ہو گی، اور آیت میں جس عقل و شعور کی بات کی گئی ہے اس سے مراد رشد وہدایت کا شعور ہے، اس سے مراد محض ادراک کا شعور نہیں ہے۔ کیوں کہ ادراک کی عقل سے مراد وہ عقل ہے جس کی وجہ سے انسان شرعی احکامات کا مکلف اور پابند ہوتا ہے، اور اس کے برعکس جنون اور کم سنی ہے جس کی وجہ سے ایک کم سن اشیاء کی حقیقت سے ناواقف رہتا ہے، اور اسی وجہ سے وہ مرفوع القلم ہوتا ہے۔ لیکن عقل رشد عقل ادراک سے آگے کا مرحلہ ہے جس کے ذریعہ سے چیزوں کے انواع واقسام، پیمانے اور ان کی اچھائی یا برائی کی پرکھ ہوتی ہے، جس کے ذریعہ سے آدمی حق تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اس کو اختیار کرتا ہے اور باطل اور غلط کو جان کر اس سے بچتا ہے۔ لہذا جو شخص حق کو جان لینے کے باوجود اس کی پیروی نہیں کرتا اور باطل کی جانکاری کے باوجود اس کے پیچھے لگا رہتا ہے تو ایسا شخص عاقل کہے جانے کا حق نہیں رکھتا یعنی اس کے

پاس رشد وہدایت کی عقل نہیں ہوتی۔ کیوں کہ عقل کا تقاضایہی ہے کہ انسان نفع بخش اور درست چیزوں کااستعمال کرے۔اسی لیے جس شخص کے سامنے خیر وبھلائی بالکل واضح ہواس کے باوجودوہ اس کو اختیار نہ کرے تولوگ اس کومجازی طور کہتے ہیں کہ تم مجنون اور پاگل ہوحالاں کہ وہ درحقیقت پاگل نہیں ہوتاپھر بھی لوگ اس کواس صفت سے یاد کرتے ہیں،ان کا مقصد محض اس پر نکیر کرناہوتاہے، حقیقت میں وہ اس کو پاگل نہیں کہتے، کیوں کہ اس کی کرتوت ایسی ہوتی ہے جیسی کہ نہیں ہونی چاہیے۔

﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ خَرَجُوا۟ مِن دِيَـٰرِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ ٱلْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ ٱللَّهُ مُوتُوا۟ ثُمَّ أَحْيَـٰهُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى ٱلنَّاسِ وَلَـٰكِنَّ أَكْثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿٢٤٣﴾ وَقَـٰتِلُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَّن ذَا ٱلَّذِى يُقْرِضُ ٱللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَـٰعِفَهُۥ لَهُۥٓ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَٱللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٤٥﴾ ﴾

ترجمہ:

"کیاتم نے انہیں نہیں دیکھاجو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ڈر کے مارے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں فرمایا مر جاؤ، پھر انہیں زندہ کردیا ، بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ ناشکرے ہیں(۲۴۳)۔اللہ کی راہ میں جہاد کرواور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سنتا، جانتا ہے(۲۴۴)۔ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے، پس اللہ تعالیٰ اسے بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے گا ، اللہ ہی تنگی اور کشادگی کرتا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے(۲۴۵)"۔

اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے ایک قوم کی حالت بیان کرتے ہوئے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کررہاہے: ﴿ أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِينَ خَرَجُوا۟ مِن دِيَـٰرِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ ٱلْمَوْتِ ﴾ " کیاتم نے انہیں نہیں دیکھاجو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ڈر کے مارے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے تھے "آیت کریمہ میں (ألم تر) کے ذریعہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوہے اور ساتھ ہی اس کے مخاطب عام مومنین بھی ہیں اوراسی طرح مومنوں کے علاوہ وہ تمام لوگ بھی اس کے مخاطب ہیں جو اللہ تعالیٰ کے کلام کو سن رہے ہیں۔ کیوں کہ جب بھی کسی آیت میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جائے

تو اس میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو مومن ہیں جب تک کہ اس خطاب کے آپ کے ساتھ مخصوص ہونے کی کوئی دلیل نہ ہو۔ اور اس قرآن کریم کے ذریعہ اللہ تعالی نے جن وانس دونوں جنسوں کو خطاب کیا ہے ۔

(أَلَم تر) "یعنی کیا تم نے نہیں دیکھا" یہ سوالیہ جملہ اس واقعہ کے اثبات کے واسطے ہے جس کو اللہ تعالی بیان کر رہا ہے، جس میں وہ ایک ایسی قوم کا قصہ بیان کر رہا ہے جو اپنے گھروں سے موت کے خوف کی وجہ سے نکل کھڑے ہوئے، کیوں کہ کوئی بیماری ان میں سے کچھ لوگوں کو لگ گئی اور پھر وہ بیماری ان کے بیچ پھیلنے لگی، یا یہ وجہ تھی کہ ان کے دشمنوں نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔ بطور فائدہ یہ کہ (أَلَم تر) کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ کیا آپ کے علم میں ان لوگوں کی خبر نہیں ہے۔

اور (أَلَم تر) کا معنی ہے کہ کیا ان لوگوں کی خبر آپ کو نہیں معلوم ؟۔ اور جب اللہ تعالی اپنے بندوں سے یوں مخاطب ہو (أَلَم تر) تو اللہ تعالی کے اس خبر میں ایسی صداقت ہوتی ہے کہ گویا مخاطب نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اور فرمان الہی: ﴿وَهُمۡ أُلُوفٌ﴾" جو ہزاروں کی تعداد میں تھے "۔ یعنی ان کی تعداد کئی ہزار تھی اور وہ ایک بہت بڑی تعداد میں تھے۔

وہ بنی اسرائیل کی ایک قوم تھی جو اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے جن میں مہلک بیماری پھیل گئی تھی، اور وہ محض اس لیے بھاگ نکلے تھے کہ کہیں ان کو موت نہ آپڑے۔ جیسا کہ اللہ تعالی فرمایا: ﴿حَذَرَ ٱلۡمَوۡتِ﴾" موت کے ڈر کے مارے "۔ پس اللہ تعالی کا کرنا ایسا ہوا کہ اللہ تعالی نے ان سب کو موت دے دی، تاکہ انسان کو یہ بخوبی معلوم ہو جائے کہ وہ چاہے جس قدر بھی بچاؤ کا راستہ اختیار کر لے تقدیر سے نہیں بچ سکتا ، اور جب بھی انسان اللہ تعالی کی تقدیر اور اس کے حکم سے بھاگنے کی کوشش کرے گا، تو اللہ کے ارادے سے وہ تقدیر اس کو پا کر رہے گی، اگر مومن اس بارے میں اچھی طرح غور وفکر سے کام لے تو اس کو زندگی میں درپیش تاریک اور سیاہ ترین گھڑیوں میں بھی انتہائی سکون واطمینان نصیب ہو گا، کیوں کہ اس کو کچھ بھی ہوتا ہے سب اللہ تعالی کی تقدیر اور اسی کے حکم سے ہوتا ہے ، اور جب اللہ تعالی اپنے بندے کے ساتھ کسی معاملہ کا ارادہ کرے تو ظاہری اسباب اس کو اللہ تعالی کی ذات سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب بھی بندہ مومن کوئی سبب اختیار کرتا ہے تو اس کو اس بات کا یقین

ہوتا ہے کہ یہ اسباب بذات خود کسی کام کے نہیں ہیں، نہ تو یہ اسباب کسی کو بچا سکتے ہیں اور نہ ہی خود سے متحقق ہو سکتے ہیں، یہ اسباب بھی اللہ تعالی کی تقدیر اور اس کی مشیئت وارادے کے تابع ہیں، اور یہ چیز انسان کے تمام حالات اور کیفیات میں کار فرما ہوتی ہے، چاہے اس کی بیماری اور علاج کا معاملہ ہو یا اس کی مالداری اور فقیری کا۔ اس کی مالداری اس کو فقیر ہونے سے نہیں روک سکتی اور اسی طرح اگر اللہ کی مشیئت نہ تو اس کی فقیری اس کو مالدار بننے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اسی طرح انسانی زندگی کے تمام حالات اور امور کا معاملہ ہے۔ جیسا کہ مذکورہ واقعہ میں اللہ تعالی نے ان تمام کو اپنی قدرت وطاقت سے موت دے دی حالانکہ وہ اس وبائی سرزمین سے بھاگ نکلے تھے، لیکن ان کا بھاگ نکلنا انہیں اس موت سے نہ بچا سکا جس کا ارادہ اللہ تعالی نے کر رکھا تھا۔ ﴿فَقَالَ لَهُمُ ٱللَّهُ مُوتُواْ﴾ " اللہ تعالی نے انہیں فرمایا مر جاؤ "۔ چنانچہ سب کے سب اللہ تعالی کے اس حکم سے مر گئے۔ اور جب اللہ تعالی نے ان کو زندہ کرنے کا ارادہ کیا تو ان کو دوبارہ زندہ بھی کر دیا، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿ثُمَّ أَحۡيَٰهُمۡ﴾ "پھر انہیں زندہ کر دیا"۔ لہذا حکم صرف اللہ تبارک وتعالی کا چلتا ہے۔

اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ انسان خود سے شر سے بچاؤ کا راستہ نہ اختیار کرے، کیوں کہ اللہ تعالی کا طریقہ کار یہ ہے کہ اسی نے شر اور نقصان سے بچنے کا حکم بھی دیا ہے، اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب شر سے بچاؤ اور خیر کے حصول کے اسباب اختیار کئے جائیں، مثال کے طور پر جہاد کرنا یہ اسباب اختیار کرنے کے قبیل سے ہے۔ لیکن یہاں پر اللہ تعالی نے اس واقعہ کو اس لیے بیان کیا ہے تاکہ ایک مومن کا اس بات پر یقین کامل ہو کہ جب اللہ تعالی کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسباب اس سے نجات نہیں دلا سکتے اور نہ ہی اس کے ارادے سے کچھ بے نیاز کر سکتے ہیں، تاکہ ایک مومن کو جب خوف زدہ کرنے والے اسباب کا سامنا کرنا پڑے تو اس کو اطمینان وسکون رہے اور اس پر سکون ماحول میں اسباب کو اختیار کرے، اس طریقے سے وہ اپنے پروردگار کے تعلق سے اپنے عقیدے کی حفاظت کر لے گا اور اس کا ایمان اور سکون واطمینان بھی سلامت رہے گا۔

اللہ تعالی کی راہ میں جہاد کرنا اختیار اسباب کی قبیل سے ہے چاہے وہ اقدامی جہاد ہو یا دفاعی جہاد۔ اور محض بذاتہ سبب کی وجہ سے نصرت ومدد میسر نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ اللہ تعالی کی قدرت،

اس کا حکم و فیصلہ، اس کی نصرت و تائید اور مشیئت شامل نہ ہو۔ لہذا اسباب جو کچھ بھی ہوں وہ اللہ تعالی کے مشیئت و ارادے سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اس قوم بنی اسرائیل نیز تمام مخلوقات پر اپنے فضل و احسان کا تذکرہ کر رہا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿إِنَّ ٱللَّهَ لَذُو فَضۡلٍ عَلَى ٱلنَّاسِ﴾ " بیشک اللہ تعالی لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے"۔ یہ اس کا فضل ہی ہے کہ اس نے موت کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کیا، مقصد یہ تھا کہ ان کو اپنے فضل و کرم کا مشاہدہ کرائے اور یہ کہ ناگوار اور مکروہ امور سے وہ کیسے لوگوں کو بچاتا ہے۔ اور اگر انسان اپنی زور مرہ کی زندگی کے بارے میں غور فکر کرے تو اسے بخوبی احساس ہو گا کہ اس کو اللہ تعالی نے بہت سارے ناگوار حالات سے محفوظ رکھا ہوا ہے جب کہ وہ اس سے بچاؤ کا کوئی سبب نہیں اختیار کیا ہوا ہوتا ہے، کیوں کہ یا تو اس پیش آمدہ حادثے کے بارے میں وہ سرے سے ناواقف ہوتا ہے یا وہ حادثہ اس پر اچانک آن پڑتا ہے، یا اس کو اس حادثے کا علم اس وقت ہوتا ہے جب لاشعوری طور پر وہ ٹل چکا ہوتا ہے۔ کتنے ایسے مصائب و حوداث ہیں جو آدمی سے ہو کر گزر جاتے ہیں یا وہ ان حوادث سے گزر جاتا ہے بغیر اس کے کہ وہ اس کو متاثر کریں یا وہ ان سے متاثر ہو، ان حوادث و مصائب کا اس کو پتہ تک نہیں چلتا، وہ لاعلمی میں کتنے ہی ایسے لوگوں سے ملتا جلتا ہے یا لوگ اس سے ملتے جلتے ہیں جو متعدی بیماریوں سے دوچار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کو وہ بیماری نہیں لگتی۔ کتنی بار ایسا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ہی یا اس کے اس جگہ سے جانے کے بعد ہلاکت خیز یا نقصان دہ چیز گرتی ہے، وہ خود تو اس چیز سے نہیں بچتا لیکن اللہ تعالی اس کو بچا لیتا ہے، اور اگر پلک جھپکتے بھی وہ آگے پیچھے ہوتا تو اس کی لپیٹ میں آ سکتا تھا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جس کی وجہ سے اللہ تعالی کا شکر اور حمد و ثنا واجب ہے، لیکن بندہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کی شکر گزاری سے بہت ہی زیادہ غافل ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَلَٰكِنَّ أَكۡثَرَ ٱلنَّاسِ لَا يَشۡكُرُونَ﴾" لیکن اکثر لوگ ناشکرے ہیں "۔ اس سے معلوم ہوا کہ بہت کم لوگ ہیں جو اپنے پروردگار کے شکر گزار ہیں۔ یہ چیز ایک بندہ مومن کو شکر و سپاس کے لیے آمادہ کرتی ہے اللہ تعالی کی ان نعمتوں پر جنہیں وہ جانتا ہے اور ان ظاہری و باطنی نعمتوں پر بھی جو اس کے علم سے مخفی ہیں۔

اس واقعہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے حوادث وواقعات کے سامنے ایک مومن کے اندر دلی شجاعت پیدا ہوتی ہے، چنانچہ وہ ان حوادث کے وقت حواس باختہ نہیں ہوتا جس سے اس کی قوت وشجاعت جاتی رہے اور وہ خود پر قابو نہ پاسکے، اور نہ ہی غصہ میں آکر جزع فزع کرتا ہے جس سے اللہ تعالی ناراض ہو جائے۔ اس کی مثال صحابی رسول خالد بن الولید رضی اللہ عنہ ہیں جنہیں سیف اللہ المسلول (یعنی اللہ تعالی کی سونتی تلوار) کے لقب سے جانا جاتا تھا۔ ہمیشہ میدان کارزار میں پہلی صف میں لڑتے رہے، لیکن موت ہوتی ہے تو کسی نیزہ کے لگنے سے ہوتی ہے نہ ہی تلوار کی ضرب سے۔ وہ کہا کرتے تھے: میں نے فلاں فلاں جنگیں لڑی ہیں ، اور میرے جسم میں ایک بالشت بھی ایسی جگہ نہیں جہاں کسی تلوار کا نشان یا تیر کا گھاؤ نہ ہو، مگر افسوس میں بستر مرگ پر اپنی موت آپ مر رہا ہوں جیسے ایک گدھا مرا کرتا ہے۔ اللہ کرے بزدلوں کی آنکھ میں کبھی نیند نہ آئے(۱) ۔ اس موقف کے پیش کرنے سے ایک مومن کو حوصلہ ملتا ہے اور میدان جنگ میں اس کی ثبات قدمی اور قوت ایمانی میں اضافہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر شر وفساد کا قلع قمع کرتا ہے، اس سے جہاد فی سبیل اللہ کی تشجیع بھی ہوتی ہے، اسی لیے آگے آنے والی آیت میں جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَقَٰتِلُواْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ﴾ "اللہ کی راہ میں جہاد کرو"۔ اللہ تعالی نے اس آیت میں اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا ہے تاکہ اس سے بندے کے اندر شجاعت پیدا ہو اور وہ خوب سمجھ آجائے کہ موت کے خوف بچاؤ کے لیے قتال اور جہاد فی سبیل اللہ سے راہ فرار نہیں اختیار کرنا ہے، جیسا کہ اس قوم بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا کہ وہ موت کے اسباب سے تو بھاگے لیکن پھر بھی ان کو موت آگئی، جس واقعہ کا ذکر گزشتہ آیت میں ہو چکا ہے۔

﴿فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ﴾ "اللہ کی راہ میں" فرمان الہی کے اس جزء میں توحید اور اخلاص کا بیان ہے کہ یہ جہاد خالص اللہ تعالی کی رضا کے لیے ہونا چاہئے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد نہ ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ

---

(۱) سیر أعلام النبلاء ۱/۳۸۲.

سبیل اللہ کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ اللہ کے راستے بہت سارے ہیں اور ان میں سے ہر راہ کی بنیاد پر یا اس کے لیے قتال کیا جائے گا اور ان میں سب سے عظیم راہ دین اسلام ہے (۱)۔

فی سبیل اللہ سے مراد ہر وہ راستہ ہے جس سے اللہ تعالی کی رضا حاصل ہوتی ہے، اور اللہ تعالی کی خوشنودی اور رضا تک پہنچنے کا ایک راستہ جہاد بھی ہے۔ اس کے بعد ایک عظیم ہدایت وبیان کے ساتھ آیت ختم ہورہی ہے: ﴿وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٞ﴾ "اور جان لو کہ اللہ تعالی سنتا، جانتا ہے "۔ اللہ تعالی حکم دے رہا کہ لوگ اس بات کو جانیں کہ اللہ تعالی کی ذات ہر شخص کی مراد و مقصد کو سنتی جانتی ہے ۔ لہذا آدمی جہاد کے بارے میں یا کسی بھی تعلق سے کچھ بھی کہتا ہے تو اللہ تعالی اس کو سنتا جانتا ہے۔ قرآن کے اس سیاق میں آگاہ کیا جارہا ہے کہ بندے اللہ تعالی کی سماعت، علم اور قدرت کے احاطے سے غافل نہ رہیں اور اسی علم کے مطابق عمل بھی کریں۔ ﴿وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٞ﴾ "اور جان لو کہ اللہ تعالی سنتا، جانتا ہے "۔ معلوم ہوا کہ اس آیت میں اللہ تعالی کے اسماء وصفات کے جاننے کا حکم ہے، نیز اسماء وصفات کا علم کافی شرف ومنزلت کا حامل علم ہے، ان کا علم رکھنے والا دین ودنیا کی خیر وبھلائی سے ہمکنار ہوتا ہے، اس لیے ان اسماء وصفات کے تعلیم وتعلم کا اہتمام لازمی ہے۔

چونکہ جہاد کے لیے مال ودولت بھی ضروری ہے تاکہ جہاد کی تیاری اور لشکر کے کھانے پینے اور کپڑے وغیرہ دیگر ضروریات کا انتظام وانصرام ہوسکے، اسی لیے اللہ تعالی نے تشجیعی انداز میں انفاق پر ابھارا ہے، فرمایا: ﴿مَّن ذَا ٱلَّذِي يُقۡرِضُ ٱللَّهَ قَرۡضًا حَسَنٗا﴾ "ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالی کو اچھا قرض دے "۔ یہ ایک تشجیعی اور ترغیبی انداز ہے: وہ کون ہے جو اللہ کو قرض دے یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ چنانچہ قرض دینے والا بندہ ہے اور اس قرض کو چکانے والی اللہ رب العالمین کی ذات ہے، اور بندے کی طرف سے خرچ کیا ہوا مال بطور قرض کے ہے جس کو لوٹادیا جاتا ہے، لیکن یہاں پر لوٹایا جانا انسانوں کے مابین قرض لوٹانے سے مختلف ہے، کیوں کہ یہ قرض وہ ذات لوٹارہی ہے جو تمام خزانوں کی مالک ہے۔ اور اس قرض کے حکم کو صفت احسان سے متصف کیا: ﴿قَرۡضًا حَسَنٗا﴾ "اچھا قرض" اس سے مراد ایسا قرض ہے جو پوری خوش دلی کے ساتھ دیا جائے۔ اور (حسن) کے لفظ میں اچھائی کی تمام صورتیں شامل

---

(۱) تفسير قرطبي ۳/۱۵٤

ہیں، جن میں نیت واخلاص، مقدار ونوعیت اوراسی طرح ایمان سے بھرپور خوش دلی،اور خرچ کرنے کے اخلاق وآداب سب آجاتے ہیں،اوراحسان کے برعکس تمام اموروا وصاف اور مفاہیم کی نفی ہوجاتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی خرچ کرنے والے کے بدلے کی مقدار بیان کر رہا ہے: ﴿ فَيُضَٰعِفَهُۥ لَهُۥٓ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ﴾" پس اللہ تعالیٰ اسے بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے گا "۔اللہ تعالی نے اس اضافے کی کوئی حد متعین نہیں کی کہ اس کا دوگنا یا تین گنا، بلکہ کئی گنا کا ذکر کیا جس کا شماراللہ تعالی ہی کر سکتاہے۔اس سے جود وکرم اور دینے میں سخاوت نفس کی اہمیت واضح ہوتی ہے ،اور یہ کہ قرض لینے والے کو قرض دینے والے کے ساتھ حسن معاملہ سے پیش آنا چاہیے ،خواہ وقت سے ادائیگی یا مقدار کا معاملہ ہو یاشکر وثنااوراحسان کا۔کیوں کہ یہی اللہ رب العالمین کا طریقہ اور منہج ہے۔

آیت کے اخیر میں اللہ تعالی بہت ہی عظیم امور کو بیان کر رہاہے جن کا تعلق عقیدہ سے ہے،اور جو آدمی کے سلوک وکردار پر اثر انداز ہوتے ہیں ، ارشاد الٰہی ہے : ﴿ وَٱللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾" اللہ ہی تنگی اور کشادگی کرتا ہے اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے "۔یعنی زرق اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے، بطور امتحان اور آزمائش جس سے جس قدر چاہتا ہے روک لیتا ہے ،اور بطورامتحان اور آزمائش ہی جس کو چاہتا ہے وسعت دیتاہے۔اس چیز کی سمجھ سے ایک مومن کے اندر اعتقاد کی قوت،اوراپنے رب پر اعتماد حاصل ہوتاہے،اور زرق کی فراوانی،وسعت اور برکت کے لیے وہ اللہ ہی کی ذات سے مدد طلب کرتاہے کہ اللہ تعالی اس کے لیے حصول رزق کے مسائل کو آسان کردے، ساتھ ہی اللہ تعالی نے جس قدر بھی اس کو عطا کیاہے اس پر خوش دلی کی توفیق اس سے مانگتاہے چاہے رزق کی تنگی ہو یا فراخی، کیوں کہ وہ جانتاہے کہ یہی اللہ تعالی کی منشااور فیصلہ ہے اور جو کچھ اللہ نے فیصلہ کر رکھا ہے اسی میں خیر ہے،اس سے مومن کے سکون واطمینان میں اضافہ ہوتاہے اور جو کچھ اور جتنا کچھ بھی اللہ تعالی نے اس کو عطا کیاہے اسی پر رضامندرہتاہے ،اوراس چیز کا اظہاراس کے اخلاق وکردار سے بھی ہوتا ہے ،اگر رب نے اس کو رزق کی وسعت دی ہے تب بھی اس کے اندر تواضع ہوتاہے وہ اس مال کو خوب خرچ کرتاہے ،اوراگر رزق میں تنگی کی ہے تو صبر کرتاہے اور واویلا نہیں مچاتا۔اس کے بعد آیت ایک پر اثر نصیحت کے ساتھ ختم ہورہی ہے اگرچہ اس کے فوائد ختم نہیں ہوئے ہیں: ﴿ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾"

اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے "۔اس میں دنیاوی زندگی کے اختتام اور اور انتہا کا تاکیدی بیان ہے کہ بالآخر اللہ تعالی ہی کی طرف لوٹنا ہے ،اور یہ موت کے بعد ہونا ہے جب اللہ تعالی ہر ایک سے اس کے عمل کا حساب لے گا اور اسی کے مطابق بدلہ دے گا۔اس نصیحت کے بموجب ایک مومن خیر وبھلائی کی طرف راغب ہوتا اور شر وبرائی سے بچتا ہے۔

معلوم ہوا کہ ایک داعی ،مربی اور ناصح کے لیے قرآن کریم کے وہ دلائل کافی اہمیت رکھتے ہیں جو آدمی کو خیر پر آمادہ کرتے اور برائی سے دور رکھتے ہیں ،اور جو مکارم اخلاق اور محاسن خیر میں اضافے کا سبب ہیں۔الحمدللہ رب العالمین۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلْمَلَإِ مِنۢ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ مِنۢ بَعْدِ مُوسَىٰٓ إِذْ قَالُوا۟ لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ٱبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَٰتِلْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ۖ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِتَالُ أَلَّا تُقَٰتِلُوا۟ ۖ قَالُوا۟ وَمَا لَنَآ أَلَّا نُقَٰتِلَ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَٰرِنَا وَأَبْنَآئِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ ٱلْقِتَالُ تَوَلَّوْا۟ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ وَٱللَّهُ عَلِيمٌۢ بِٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٢٤٦﴾﴾

ترجمہ:

"کیا آپ نے (حضرت) موسیٰ کے بعد والی بنی اسرائیل کی جماعت کو نہیں دیکھا جب کہ انہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ کسی کو ہمارا بادشاہ بنا دیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ پیغمبر نے کہا کہ ممکن ہے جہاد فرض ہوجانے کے بعد تم جہاد نہ کرو، انہوں نے کہا بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے؟ ہم تو اپنے گھروں سے اجاڑے گئے ہیں اور بچوں سے دور کردیئے گئے ہیں۔ پھر جب ان پر جہاد فرض ہوا تو سوائے تھوڑے سے لوگوں کے سب پھر گئے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے (۲۴۶)"۔

یہاں پر ایک دوسرے قصہ کا بیان ہو رہا ہے جس سے دشمن سے مقابلہ کے لیے مومنوں کے عزم وحوصلہ کو تقویت ملتی ہے، فرمایا: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلْمَلَإِ مِنۢ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ مِنۢ بَعْدِ مُوسَىٰٓ إِذْ قَالُوا۟ لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ٱبْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَٰتِلْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ﴾ "کیا آپ نے (حضرت) موسیٰ کے بعد والی بنی اسرائیل کی جماعت کو نہیں دیکھا جب کہ انہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ کسی کو ہمارا بادشاہ بنا دیجئے

تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں " ۔ یہ قصہ اللہ تعالی اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں اور ہر اس آدمی سے بیان کر رہا ہے جس تک قرآن کریم کی یہ آیات پہنچیں اور وہ ان کو سنے۔ یہ موسی علیہ السلام کے زمانہ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت کا قصہ ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ موسی اور عیسی علیہما السلام کے اس درمیانی مدت میں بھی اللہ تعالی نے انبیاء بھیجے۔ ان لوگوں نے اپنے وقت کے نبی سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کا کوئی امیر اور قائد مقرر کر دیں تاکہ اس کے ساتھ رہ کر لشکری امور کی قیادت میں باہم مشورہ کریں اور اللہ کی راہ میں لڑ سکیں۔ یہ قرآنی نص سوالیہ پیرائے میں وارد ہوئی ہے تاکہ قوم بنی اسرائیل کے اس واقعہ کی طرف پوری توجہ مبذول کی جائے ، جس کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے گویا کہ وہ آنکھوں دیکھا واقعہ ہو، کیوں کہ اس واقعہ کو بیان کرنے والی اللہ رب العالمین کی ذات ہے جو ہر چیز کی خالق ومالک ہے، اور اس کی خبر مبنی بر حقیقت ہے جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اس کی حیثیت عینی مشاہدہ کی ہے۔ (ألم تر) کا یہ بھی مفہوم ہے کہ کیا آپ کے علم تک بات نہیں پہنچی ؟۔

قوم بنی اسرائیل کا یہ کہنا: ﴿ٱبۡعَثۡ لَنَا مَلِكٗا نُّقَٰتِلۡ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِۖ﴾ " کہ کسی کو ہمارا بادشاہ بنا دیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں "۔ اس میں مطلوبہ چیز اور اس مطالبہ کا مقصد دونوں امر کا بیان ہے، ان کی طلب یہ تھی کہ ان کا ایک امیر مقرر ہو، اور مقصد اس طلب کا یہ تھا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں ایک قائد اور امیر کا ہونا انتہائی اہم ہے کیوں کہ قیادت بہت ضروری امر ہے تاکہ اس قائد کے ماتحتی میں رہنے والی عوام اس کی تابع فرمان ہو۔ ایسے ہی یہ بھی ضروری ہی کہ لشکر کسی ایک قائد کے ساتھ یک جٹ ہو کر رہیں، اور اس قائد میں بھی قائدانہ صلاحیت ہونی چاہیے تاکہ مقصد کا حصول ممکن ہو سکے، یہ چیز جنگی امور میں اولیت کی حیثیت رکھتی ہے، اور جنگ کے علاوہ پیشہ وارانہ، سماجی اور ادراری امور میں بھی اس کی اسی طرح اہمیت ہے۔ نیز ان لوگوں نے اپنے اس اتحاد اور اجتماع کا ہدف اور مقصد بھی متعین کیا، وہ یہ کہ: ﴿نُّقَٰتِلۡ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِۖ﴾ " تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں"۔ اس لیے ہدف کی تعیین بھی انتہائی درجہ کی اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ فریق العمل اسی پر متحد ہو سکتے ہیں۔ وہ قائد چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، نیز وہ قائد ایک بڑی جماعت کا ہو یا چند لوگوں کا۔ لیکن اس نبی نے ان سے اس طلب کے تئیں پورا اطمینان اور وثوق حاصل کرنا چاہا، تاکہ کسی چیز

کے تعین کے بعد وہ پیچھے نہ ہٹ جائیں: ﴿قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا﴾" پیغمبر نے کہا کہ ممکن ہے جہاد فرض ہوجانے کے بعد تم جہاد نہ کرو "۔اس سے یہ فائدہ اخذ ہوا کہ کسی بھی معاملہ کی پختگی حاصل کرلینی چاہیے اور جن سے کام کرانا ہو متوقعہ خدشات ان کے سامنے رکھنے چاہئیں ،تاکہ جو بات بھی طے پائے درست نتیجے پر ہو۔ ﴿هَلْ عَسَيْتُمْ﴾"کیا یہ ممکن ہے "۔ یہ ایک امکانی سوال ہے تاکہ اگر ان پر قتال فرض کردیا جائے تو ان کی جانب سے بالکل اطمینان رہے۔اس آیت کے مفہوم سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس نبی کو یہ ڈر لاحق تھا کہ کہیں یہ لوگ جہاد فرض ہونے کی صورت میں حکم عدولی نہ کر بیٹھیں اور اللہ تعالی کے حکم کو نہ مانیں، یعنی قتال نہ کریں۔ ان کے نبی کا ان سے یہ کہنا: ﴿إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾" کہ جہاد فرض ہوجانے کے بعد "۔ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ نبی اپنی طرف سے جہاد کی اجازت انہیں نہیں دے رہے تھے، بلکہ ان کے لیے جہاد کی اجازت من جانب اللہ لے رہے تھے۔ ﴿إِن كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾" کہ جہاد فرض ہوجانے کے بعد "۔یعنی جہاد کو فرض کرنے والا اللہ تعالی ہے، کیوں کہ (كُتِبَ) فُرِضَ کے معنی میں ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے یوں جواب دیا کہ ہمارے جنگ نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں بنتی اور جہاد کی خواہش کا سبب بھی بیان کردیا: ﴿قَالُوا وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾" انہوں نے کہا بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے "۔یعنی ان لوگوں نے جہاد نہ کرنے کے سبب کی نفی کی اور اس کے بعد وہ مضبوط سبب بھی بیان کیا جس کی بناپر وہ قتال کرنا چاہتے تھے، وہ سبب یہ ہے: ﴿وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِن دِيَارِنَا وَأَبْنَائِنَا﴾" ہم تو اپنے گھروں سے اجاڑے گئے ہیں اور بچوں سے دور کردیئے گئے ہیں "۔یعنی ان کو اپنے گھر اور اولاد کو چھوڑنا پڑا تھا، معلوم ہوا کہ قتال کے لیے یہ کافی قوی وجہ تھی، اسی لیے ایسے بادشاہ کی تعیین میں رکاوٹ نہیں پیدا ہوئی جس کی سرپرستی میں رہ کر وہ قتال کریں اور اسی کی ماتحتی میں باہم متحد ہوکر رائے ومشورہ کریں۔اس سے یہ فائدہ اخذ ہوا کہ عہد وپیمان کی کافی اہمیت ہے اور کسی قرار کے تمام اسباب وعلل پر گہری نظر ہونی چاہئے تاکہ وہ قرار درست اور کارگر ثابت ہو، ایسے ہی اتفاق واتحاد کی اہمیت بھی مسلم ہے جو ایک قائد کے وجود سے ہی ممکن ہے جس کے تمام لوگ تابع فرمان اور اس کے پاس جمع ہوسکیں۔

آیت کریمہ کے منجملہ فوائد میں سے کلام کی حسن ترتیب بھی ہے کہ سب سے پہلے جہاد کے موانع کی عدم موجودگی پر منع کی نفی کی گئی اس کے بعد اس کی ضرورت کی وجوہات اور اسباب بیان کئے گئے، یہ انتہائی درجہ کی ترتیب کلام کی باریکی ہے اور مختصر ترین عبارت میں فصاحت وبلاغت کی انتہاء ہے۔

اس کے بعد ان پر جہاد فرض کر دیا گیا: ﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ ٱلۡقِتَالُ تَوَلَّوۡاْ إِلَّا قَلِيلٗا مِّنۡهُمۡ﴾ "پھر جب ان پر جہاد فرض ہوا تو سوائے تھوڑے سے لوگوں کے سب پھر گئے"۔ بالآخر ہوا یہی کہ ان کے نبی نے جس چیز کا ان سے عہد وپیمان کیا تھا اس کی مخالفت کر بیٹھے، اور ان کی اکثریت جہاد کرنے سے پھر گئی، اور کچھ ہی لوگ ایسے باقی بچے جنہوں نے دریا پار کیا جس کا بیان ان شاء اللہ عنقریب آرہا ہے، شاید اس میں ایسے لوگوں کا ازالہ اور صفایا کرنا مقصود تھا جو ذلیل اور بزدل تھے، کیوں کہ بسا اوقات یہی صفایا کم تعداد والوں کی قوت اور طاقت کا سبب ہو سکتا تھا اور کمزور لوگوں کی بڑی تعداد چلی جاتی۔ اس میں مومنوں کے لیے درس عبرت ہے کہ وہ لوگ بھی ان بھاگنے والوں کی روش نہ اختیار کریں، بلکہ ان لوگوں کے مثل بنیں اور پیروی کریں جنہوں نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔

آیت کریمہ سے یہ فائدہ ماخوذ ہوا کہ حق کا پیمانہ کثرت تعداد نہیں، بلکہ ہر حال میں حق کے پیروی کرنی چاہیے اگرچہ اس کے ماننے والے کم ہوں۔ اس کے بعد آیت کریمہ کا اختتام اللہ تعالی کے اس فرمان سے ہوتا ہے: ﴿وَٱللَّهُ عَلِيمُۢ بِٱلظَّٰلِمِينَ﴾ " اور اللہ تعالی ظالموں کو خوب جانتا ہے "۔ یعنی جس سے ظلم کا صدور ہوتا ہے اس سے اللہ تعالی کی ذات بخوبی واقف ہے، اس میں ظالموں کے لیے وعید ہے، اور اس امت محمدیہ کے لیے درس ہے کہ وہ اپنے نبی کے ساتھ یک جٹ اور متحد رہیں اور ان ظالموں کی طرح نہ ہو جائیں جنہوں نے قتال کرنے سے اعراض کیا حالاں کہ انہوں نے خود ہی اس کا مطالبہ کیا اور اس کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ قتال سے رخ موڑنے کا یہ رویہ ایک ظالمانہ رویہ اور گنہگاروں کی روش ہے، اور جو جانتے بوجھتے اللہ تعالی کے فرائض ادا نہیں کرتا وہ ظالم اور عند اللہ سزا کا مستحق ہے۔

﴿ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ ٱللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا۟ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ ٱلْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِٱلْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ ٱلْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُۥ بَسْطَةً فِى ٱلْعِلْمِ وَٱلْجِسْمِ ۖ وَٱللَّهُ يُؤْتِى مُلْكَهُۥ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾ ﴾

ترجمہ:

"اور انہیں ان کے نبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنادیا ہے تو کہنے لگے بھلا اس کی ہم پر حکومت کیسے ہو سکتی ہے ؟ اس سے تو ہم بہت زیادہ حقدار بادشاہت کے ہم ہیں، اس کو تو مالی کشادگی بھی نہیں دی گئی۔ نبی نے فرمایا سنو، اللہ تعالیٰ نے اسی کو تم پر برگزیدہ کیا ہے اور اسے علمی اور جسمانی برتری بھی عطا فرمائی ہے ، بات یہ ہے کہ اللہ جسے چاہے اپنا ملک دے، اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے(۲۴۷)"۔

یہاں سے اس قوم کی سرکشی کا ایک اور منظر پیش کیا جارہا ہے: ﴿ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ ٱللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ﴾ " اور انہیں ان کے نبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ بنادیا ہے "۔یعنی اللہ تعالی نے تمہاری مانگ پوری کی اور طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے، لیکن انہوں نے یہاں پر سرکشی یہ کی کہ اپنی عقل اور کوتاہ فہمی کو نقل پر مقدم کرتے ہوئے جاہلانہ فیصلہ سنادیا: ﴿ قَالُوٓا۟ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ ٱلْمُلْكُ عَلَيْنَا ﴾ "کہنے لگے بھلا اس کی ہم پر حکومت کیسے ہو سکتی ہے؟" یہ بات انہوں نے اعتراض کے طور پر کہی ، کیوں کہ وہ طالوت علیہ السلام کے انتخاب اور تعیین سے ایک دم اچنبھے میں آگئے ،اس کے بعد انہوں نے اس اعتراض کا سبب بتلاتے ہوئے کہا: ﴿ وَنَحْنُ أَحَقُّ بِٱلْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ ٱلْمَالِ ۚ ﴾ "اس سے تو ہم بہت زیادہ حقدار بادشاہت کے ہم ہیں، اس کو تو مالی کشادگی بھی نہیں دی گئی "۔ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ بادشاہت کے حقدار تو ہم ہیں، یعنی انہوں نے اس بادشاہت کو اپنا حق سمجھا اور یہ سوچ بیٹھے کہ یہ بادشاہت ان کے گروہ سے باہر نہیں جاسکتی، احقیت کے اس لفظ کے بہت سارے مفاہیم ہیں ، یعنی بادشاہت کے لیے انہی کا انتخاب ہو ، حسب ونسب ، مال ودولت ، جاہ ومنصب اور بھی بہت ساری چیزیں جو ایک آدمی اپنی احقیت اور دوسروں پر برتری کے لیے سوچ سکتا ہے وہ سب اس میں شامل ہیں ،اور یہی چیز انسان کو اللہ کی تقدیر ، حکم ، انتخاب اور ارادے سے

اندھا کر دیتی ہے، بلکہ اس وقت انسان کو دوسروں کی خوبیاں اور صلاحتیں نظر نہیں آتیں، پھر یہ سوچ تمام صلاحتوں کو مار ڈالتی اور ارادوں کو برباد کر دیتی ہیں، اور کبر و غرور کا شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔

اس کے بعد ان کے طالوت علیہ السلام کی بادشاہت کے انکار کی دوسری دلیل اور سبب یہ تھا کہ: ﴿وَلَمۡ يُؤۡتَ سَعَةً مِّنَ ٱلۡمَالِ﴾ "اس کو تو مالی کشادگی بھی نہیں دی گئ "۔ اس سے معلوم ہوا کہ طالوت علیہ السلام کے پاس مال و دولت کم تھی اور ان کے فیصلے کے مطابق بادشاہت اور سرداری کا اصل معیار اور بنیاد مالداری تھی۔ اس سے یہ مستفاد ہوا کہ انسانو ں کے خود ساختہ پیمانے اور ضابطے غلط نتائج پر قائم ہوتے ہیں کیوں کہ یہ ضابطے صرف ظاہری امور کو دیکھ کر وضع کیے جاتے ہیں اور درست اور کمال کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اسی طرح ظالمانہ احقیت کا بول نفس میں کبر و غرور کو جنم دیتا ہے، اور پھر آدمی یہ سوچ لیتا ہے کہ وہی حق پر ہے اور اس گمان کی دلیلیں بھی دیتا ہے، اگرچہ کہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے، نیز اسی ظالمانہ بول کا سہارا لے کر ظالم لوگ صاحب صلاحیت و لیاقت اور اہل فضل افراد و حقیقی مستحقین کو حاشیے پر لگا دیتے ہیں جن کو اللہ تعالی نے کافی حلاحتوں اور مہارتوں سے نوازا ہوتا ہے جو دوسروں کے بالمقابل زیادہ حقدار ہوتے ہیں ، یہ چیز اداراتی و دیگر اعمال میں بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے۔

اللہ تعالی اپنے نبی کی زبانی ان کا رد کر رہا ہے ، فرمان الہی ہے : ﴿قَالَ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصۡطَفَىٰهُ عَلَيۡكُمۡ﴾ " نبی نے فرمایا سنو، اللہ تعالیٰ نے اسی کو تم پر برگزیدہ کیا ہے "۔ پس اللہ تعالی نے انہی کو تمہارے درمیان سے منتخب کیا ہے، (اصطفاء) کا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جس شخصیت کا انتخاب ہوا ہے وہ انہی کے افراد میں سے ہے اور یہ اختیار کچھ ایسے اسباب کی بنیاد پر ہے جس کی جانکاری اور آگاہی لوگوں میں سے کسی کو نہیں، کیوں کہ ان کی عقلوں پر غلط حقداری کے تسلط کا پردہ پڑا ہوا ہے، حالاں کہ صرف اللہ تعالی کا انتخاب ہی سب سے بڑی دلیل کے لیے کافی ہے اور اس معاملہ میں قطعی فیصلہ ہے، لیکن پھر بھی اللہ تعالی مزید اس انتخاب کی اساس بیان کر رہا ہے: ﴿وَزَادَهُۥ بَسۡطَةً فِي ٱلۡعِلۡمِ﴾ "اور اسے علمی برتری بھی عطا فرمائی ہے "۔ یہ اس انتخاب کی دوسری بنیاد ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی چیز کی اہلیت کے لیے علم بہت زیادہ اہم قضیہ ہے اور صاحب علم ہی تقدیم کا اہل ہے، اور کسی چیز کی ذمہ داری میں اسی میدان کے عالم کو دوسروں پر مقدم کیا جانا چاہیے ، تمام مجالات میں کام کی کامیابی کا مرکز

یہی ہے۔اور چونکہ جنگ میں جسمانی قوت و سلامتی کو مرکزی اہمیت حاصل ہے اس لیے اللہ تعالی نے اس انتخاب کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا، فرمایا: ﴿وَزَادَهُۥ بَسۡطَةً فِي ٱلۡعِلۡمِ وَٱلۡجِسۡمِۖ﴾ "اور اسے علمی اور جسمانی برتری بھی عطا فرمائی ہے "۔ یہ اس انتخاب کی تیسری بنیاد ہے، جس کا تعلق جسمانی کمال و قوت اور سلامتی ہے، کیوں کہ جسمانی قوت سے بھی حق کا نفاذ ہوتا ہے اور جسمانی کمال ذمہ داریوں اور اس کے بیچ حائل رکاوٹوں کے لیے سد باب ہے۔اس کے بعد اللہ تعالی نے طالوت علیہ السلام اور ان کے علاوہ کسی کے بھی اختیار کے بارے میں دوٹوک فیصلہ سنادیا، فرمایا: ﴿وَٱللَّهُ يُؤۡتِي مُلۡكَهُۥ مَن يَشَآءُۚ﴾ " بات یہ ہے کہ اللہ جسے چاہے اپنا ملک دے " ۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿قُلِ ٱللَّهُمَّ مَٰلِكَ ٱلۡمُلۡكِ تُؤۡتِي ٱلۡمُلۡكَ مَن تَشَآءُ وَتَنزِعُ ٱلۡمُلۡكَ مِمَّن تَشَآءُ﴾ [سورة آل عمران: ٢٦]۔ "آپ کہہ دیجئے اے اللہ! اے تمام جہان کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دے جس سے چاہے سلطنت چھین لے"۔اس کے ذریعہ اللہ تعالی نے ساری کٹ حجتی اور ہر طرح کے گھمنڈ کا خاتمہ ہی کردیا۔اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی جس کسی کو بھی بادشاہت عطا کرے تو کسی کو کسی سے جھگڑے نے کا حق نہیں ہے اور جس کا کوئی والی اور نگراں ہو تو اللہ تعالی کی رضامندی میں اس کی فرمابرداری اور حکم ماننا واجب ہے۔ یہی اصول ادارتی اور قیادتی امور کے تمام مراتب ودرجات میں بھی کار فرما ہے۔ لہذا جب کسی کو کسی معاملے کا ذمہ دار بنادیا جائے اس سے اختلاف و منازعہ کے بجائے اس کی مدد اور رہنمائی کرنا ضروری ہے،اسی میں سب کی بھلائی ہے۔اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس طرح کے معاملات میں حسب ونسب اور مال ودولت سے صرف نظر کیا جائے، بلکہ ہر ذمہ داری کے لیے مناسب علم والے اور نفسیاتی وجسمانی اعتبار سے باکمال افراد ہوتے ہیں، اور جہالت سے کوئی قیادت اور ادارہ نہیں چل سکتا اور نہ ہی سماج ومعاشرے کے کسی بھی امور کی زمام کار سنبھالی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جسمانی کمال و قوت اور فوجی امور میں برتری کی اہمیت امر مسلم ہے۔

اس کے بعد آیت کریمہ عظیم نصیحت کے ساتھ ختم ہو رہی ہے: ﴿وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٞ﴾ " اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے "۔ اللہ تعالی اپنے علم وفضل وعطا اور قدرت میں کشادگی والا ہے، اور وہ اپنے بندوں کے حالات سے بخوبی واقف ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالی کی ذات ہے جس نے

اپنے رزق کو تم پر کشادہ کیا اور وہ طالوت علیہ السلام کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتا ہے، اسی لیے اس نے تمہارے بیچ ان کو بادشاہت عطا کی، جو کچھ بھی وہ اختیار کرتا اور چنتا ہے وہ اس کے علم میں ہے، چنانچہ کسی کو اس اللہ تعالی کے امر پر اعتراض کا حق نہیں ہے جو عالی اور باکمال صفات سے متصف ہے اور وسعت وکشادگی میں بھی کمال کے اعلی مقام پر فائز ہے جس کو چاہتا ہے فراخی عطا کرتا ہے، جو کچھ اختیار کرتا اور عطا کرتا ہے اس کے متعلق اس کا علم بھی کمال درجے کا ہے۔

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ ءَايَةَ مُلْكِهِۦٓ أَن يَأْتِيَكُمُ ٱلتَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ ءَالُ مُوسَىٰ وَءَالُ هَٰرُونَ تَحْمِلُهُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾﴾

ترجمہ:

"ان کے نبی نے پھر کہا کہ اس کی بادشاہت کی ظاہری نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلجمعی ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کا بقیہ ترکہ ہے۔ فرشتے اسے اٹھا کر لائیں گے۔ یقیناً یہ تمہارے لئے کھلی دلیل ہے اگر تم ایمان والے ہو(۲۴۸)"۔

اس کے بعد ان کے نبی نے ان سے طالوت علیہ السلام کے بادشاہت کے نشانیاں بیان کی:

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ ءَايَةَ مُلْكِهِۦٓ أَن يَأْتِيَكُمُ ٱلتَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ ءَالُ مُوسَىٰ وَءَالُ هَٰرُونَ تَحْمِلُهُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ﴾ "ان کے نبی نے پھر کہا کہ اس کی بادشاہت کی ظاہری نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلجمعی ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کا بقیہ ترکہ ہے۔ فرشتے اسے اٹھا کر لائیں گے"۔ اس سے پتہ چلا کہ حقائق کی تاکید اور اقامت حجت کے لیے دلائل وبراہین کافی اہم ہیں، خاص طور سے جب سرکش لوگوں سے سامنا ہو، تاکہ وہ دلیل کے سامنے سرنگوں ہو سکیں، دلیل ہی کسی چیز کے استحکام اور ثبات کا ذریعہ ہے، اور اسی سے اتحاد واتفاق بھی ممکن ہے اور ایک متحدہ سماج کی تعمیر عمل میں آسکتی ہے، اسی طرح ادارتی اور قیادی امور کی انجام دہی کے وقت تربیتی اور دعوتی اثر میں بھی

دلیل کو کافی اہمیت حاصل ہے کیوں کہ بسااوقات معاملہ کی صحت، یا کسی مطلوبہ بہتر بدل کی تعیین کے لیے دلائل کی ضرورت پڑتی ہے۔

قرآن کریم کا یہ سیاق سچائی اور حقیقت کے ثبوت اور حجت کے طور پر ہے، فرمان باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ ءَايَةَ مُلْكِهِۦٓ أَن يَأْتِيَكُمُ ٱلتَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ ءَالُ مُوسَىٰ وَءَالُ هَٰرُونَ تَحْمِلُهُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ﴾" اس کی بادشاہت کی ظاہری نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے دلجمعی ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کا بقیہ ترکہ ہے۔ فرشتے اسے اٹھا کر لائیں گے"۔یعنی اس کی پہلی نشانی یہ ہے جو صندوق تم سے چھین لیا گیا ہے وہ تمھارے پاس واپس آجائے گا﴿أَن يَأْتِيَكُمُ ٱلتَّابُوتُ﴾ ، دوسری نشانی: یہ ہے کہ اس میں تمہارے لیے سکون واطمینان اور رحمت ہوگی۔ اور سکون کی نعمت کی فضیلت یہ ہے اس سے دل میں قوت، رضا مندی اور ایسی سعادت پیدا ہوتی ہے جو گھبراہٹ اور بے چینی پر قابو پانے کا باعث بنتی ہے، نیز ایمان میں زیادتی ہوتی ہے،اور جزع وفزع نہیں ہوتا ۔سکینت کے اسی نزول کا احسان اللہ تعالی نے اپنے رسول اور مومنوں پر جتلایا ہے، جیسا کہ سورہ فتح میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿هُوَ ٱلَّذِىٓ أَنزَلَ ٱلسَّكِينَةَ فِى قُلُوبِ ٱلْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوٓا۟ إِيمَٰنًا مَّعَ إِيمَٰنِهِمْ﴾ [سورة الفتح: ٤]۔ "وہی ہے جس نے مسلمانوں کے دلوں میں سکون اور اطمینان ڈال دیا تاکہ اپنے ایمان کے ساتھ ہی ساتھ اور بھی ایمان میں بڑھ جائیں"۔ نیز فرمایا:﴿فَأَنزَلَ ٱللَّهُ سَكِينَتَهُۥ عَلَىٰ رَسُولِهِۦ وَعَلَى ٱلْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ ٱلتَّقْوَىٰ﴾ [سورة الفتح: ٢٦]۔ " سو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر اور مومنین پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تقوے کی بات پر جمائے رکھا "۔چنانچہ یہ سکینت بہت بڑی نعمت ہے،اور﴿سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ان پر سکینت کے نزول کے ذریعہ فضل وکرم کی ابتداء اللہ تعالی کی طرف سے ہے۔ تیسری نشانی یہ ہے کہ: ﴿وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ ءَالُ مُوسَىٰ وَءَالُ هَٰرُونَ﴾ اس میں " آل موسیٰ اور آل ہارون کا بقیہ ترکہ ہے"۔ جن میں موسی اور ہارون علیہما السلام کی لاٹھی اور ان کے کپڑے، تورات ہوگی۔ چوتھی نشانی یہ ہے کہ: ﴿تَحْمِلُهُ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ﴾" فرشتے اسے اٹھا کر لائیں گے"۔ابن

عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فرشتے اس صندوق کو آسمان وزمین کے درمیان اٹھائے ہوئے لائے اور اسے لاکر طالوت علیہ السلام کے سامنے رکھ دیا اور یہ سارا منظر لوگوں کی نگاہوں میں تھا۔ سدی فرماتے ہیں کہ وہ تابوت طالوت علیہ السلام کے گھر میں آگیا، یہ دیکھ کر لوگ شمعون علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئے اور طالوت علیہ السلام کی اطاعت تسلیم کرلی(۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کی قدرت بہت عظیم ہے، اور اس کے دلائل و براہین اور نشانیاں ہمہ وقت بالکل کھلی ہوئی، واضح اور روشن ہیں ، اس قوم کو ان کے نبی نے یہ ساری نشانیاں اس لیے بتلائیں تاکہ وہ اس پر ایمان لائیں اور طالوت علیہ السلام کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾ "یقیناً یہ تمہارے لئے کھلی دلیل ہے اگر تم ایمان والے ہو"۔ اس سے یہ فائدہ ماخوذ ہوتا ہے کہ دلائل و براہین اور آیات کا لازمی تقاضا قبول ایمان ہے اور جو شخص ان براہین کے باوجود بھی ایمان نہیں لاتا وہ واقعی منکر و مغرور اور عناد پرست ہے۔

﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (٢٤٩)﴾

ترجمہ:

"جب حضرت طالوت لشکروں کو لے کر نکلے تو کہا سنو اللہ تعالی تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے، جس نے اس میں سے پانی پی لیا وہ میرا نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ میرا ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ لیکن سوائے چند کے باقی سب نے وہ پانی پی لیا، حضرت طالوت مومنین سمیت جب نہر سے گزر گئے تو وہ لوگ کہنے لگے آج تو ہم میں طاقت نہیں کہ جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑیں ، لیکن اللہ تعالی کی ملاقات پر یقین رکھنے والوں

---

(۱) تفسير ابن كثير ٣٠٩/١.

نے کہا بسا اوقات چھوٹی اور تھوڑی سی جماعتیں بڑی اور بہت سی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ پا لیتی ہیں، اللہ تعالیٰ صبر والوں کے ساتھ ہے (۲۴۹)"۔

ان آیات میں طالوت علیہ السلام اور ان کے لشکر کا ایک اور منظر پیش کیا جارہا ہے۔ فرمایا: ﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ﴾ "جب حضرت طالوت لشکروں کو لے کر نکلے تو کہا سنو اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر سے آزمانے والا ہے"۔ اس آیت میں لشکر کے بستی چھوڑ کے دشمن سے مقابلہ کے لیے نکلنے کی شروعات کا بیان ہے، جن کی قیادت ان کے بادشاہ طالوت کر رہے تھے، انہوں نے ان کو پیش آنے والے امتحان اور آزمائش سے باخبر کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کی آزمائش دریا کے پانی سے کرنے والا ہے، اس آزمائش میں ان کے لیے جو کچھ انہیں کرنا ہے اس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي﴾" جس نے اس میں سے پانی پی لیا وہ میرا نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ میرا ہے"۔ پتہ چلا کہ یہ آزمائش ان کے قوت ارادہ اور صبر و تحمل کا امتحان تھا، چنانچہ جو اس پانی سے پی لیتا ہے تو گویا اس پانی کے سامنے اس کا ارادہ کمزور پڑ گیا، ایسا شخص مشکل لمحات میں مزید نافرمانیوں کا مرتکب ہوگا، اور جو پانی پینا ترک کر دیتا ہے تو گویا اس کو اپنے نفس پر پورا کنٹرول ہے اور اس میں مشکلات کو برداشت کرنے اور صبر کرنے کی پوری طاقت ہے ،اس لیے طالوت نے نتیجتاً یہ بات کہی کہ جو اس سے پی لیتا ہے وہ میرے ساتھیوں میں سے نہیں ہے اور نہ ہی میرے حصے کا ہے ،معلوم ہوا کہ صحبت و سنگت ساتھیوں کے لیے باہم جسد واحد کی حیثیت رکھتے ہیں، اور جو ساتھیوں سے الگ ہو گیا تو گویا وہ اس جسم کے ایک ٹکڑے کے مانند الگ ہو گیا جس جسم کی تشکیل رفقاء کے افراد سے ہوئی ہے۔ ﴿فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي﴾" جس نے اس میں سے پانی پی لیا وہ میرا نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ میرا ہے"۔ یعنی جس نے وہ پانی نہیں پیا اس نے حکم کی بجا آوری کی اور وہی میرا ساتھی ہے اور وہ میری اس جماعت کا حصہ ہے۔ (يَطْعَمْهُ) کے معنی چکھنے کے ہیں۔ ہاں اس سے وہ شخص مستثنی ہے جس نے صرف اتنی مقدار میں پیا جتنی مقدار میں پینے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی، فرمایا: ﴿إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ﴾ "ہاں یہ اور بات ہے کہ اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے "۔ اغتراف کہتے ہیں کسی چیز میں سے ہتھیلی یا کسی آلہ سے لینا، اسی لیے کف گیر اور مگّا کو

"مِغْرَفَة" بولتے ہیں۔اس سے یہ فائدہ اخذ ہوا کہ اللہ تعالی جس چیز کا چاہے حکم دے اور ایک مومن پر اس کی فرمابرداری واجب ہے۔اسی طرح اختبار وامتحان پر توجہ کافی اہمیت کی حامل ہے، اور جو چیز جتنی زیادہ اہم ہوگی اس کا امتحان بھی اسی حساب سے اہمیت رکھے گا، کیوں کہ امتحان کے ذریعہ اچھے اور برے کی بخوبی پرکھ ہو جاتی ہے، اور صلاحیتوں کے درمیان فرق بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کون کس کام کے لائق ہے اور کون نہیں ہے، لہذا ایک قائد کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وقتا فوقتا امور ومعاملات کی نگرانی اور لوگوں کی جانچ پڑتال کرتا رہے، یہ ایک ایسی چیز ہے جس سے کوئی بھی ادارہ تمام ضروریات اور لوازم کے سبھی مستویات میں ایک مستحکم اور مضبوط ادراہ ہوتا ہے بلکہ اس سے خاص وعام ہر طرح کی مصلحتیں پوری ہوتی ہیں۔اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قلوب واذہان اور ایمان کے اعتبار سے لوگوں کے مختلف طبقات ہیں، اور اسی طرح اطاعت وفرمابرداری اور اوامر ونواہی کو قبول کر لینے میں بھی سب لوگ ایک معیار کے نہیں ہوتے۔

ارشاد الہی: ﴿فَمَن شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّي وَمَن لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ فَإِنَّهُۥ مِنِّيٓ﴾ " جس نے اس میں سے پانی پی لیا وہ میرا نہیں اور جو اسے نہ چکھے وہ میرا ہے "۔اس فرمان الہی میں دوٹوک فیصلہ سنا کر اصل مقصود سے آگاہ کر دیا گیا ہے اور اس فیصلہ کی بنیاد بھی بتلادی گئی، اسی طرح حالات کے اعتبار سے حوصلہ اور تشجیع بھی کی گئی ہے، چنانچہ "وہ میرا نہیں ہے" اور "وہ میرا ہے" ان الفاظ میں اس امر کی حوصلہ افزائی ہے کہ نیکوکاروں کی صحبت اختیار کرنے میں سبقت کرنی چاہئے اور اپنی خواہشات کے چکر میں ان سے قطع تعلق سے پرہیز کرنا چاہئے۔اس میں صبر کی اور شہوات کے خلاف صبر سے کام لینے کی تشجیع کی گئی ہے، اور یہ کہ ایمان ہی انسانی کردار کو درست رکھتا اور تاریک ترین معاملات میں درستگی کی راہ دیکھاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایمانی تربیت از حد ضروری ہے، اسی سے امت وحکومت اور سماج ومعاشرے کو طاقت وقوت حاصل ہو سکتی ہے ، اور لوگوں کے حقوق کی حفاظت کے ساتھ بہترین طریقے سے ذمہ داریاں نبھائی جاسکتی ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتلاء اور آزمائش انسانی زندگی کا حصہ ہے، اللہ تعالی اسے آزماتا رہتا ہے بھلے ہی وہ اطاعت کی راہ میں ہو، کیوں کہ جن لوگوں نے قتال کرنا قبول کیا تھا وہ بہت کم تعداد میں تھے،

اس کے باوجود پہلی ہی منزل میں ان کی آزمائش کی گئی، لہذا ایک مسلمان کو اچھی طرح یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آزمائش کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالی اپنے بندے سے ناراض ہے، بلکہ اس دنیاوی زندگی میں لوگوں کے ساتھ اللہ کی یہی سنت ہے۔اس لیے کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر اس کے سزاوار یا اللہ تعالی کے نزدیک ناپسند ہونے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے ۔اور ایک مومن ہمیشہ اپنے آپ کو اس چیز کے لیے آمادہ رکھے کہ اللہ تعالی کبھی بھی اس کو آزمائش میں ڈال سکتا ہے چاہے وہ اللہ تعالی کا فرمابردار ہی کیوں نہ ہو، لہذا وہ اللہ تعالی سے عافیت کا سوال کرتا رہے۔

جب وہ لوگ دریا کے پاس پہنچے تو ان کی چھٹائی کا وقت آن پہنچا، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿ فَشَرِبُواْ مِنۡهُ إِلَّا قَلِيلٗا مِّنۡهُمۡ ﴾" لیکن سوائے چند کے باقی سب نے وہ پانی پی لیا"۔یعنی ان کی اکثریت نے پانی پی لیا۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بسا اوقات اکثریت درست راہ پر نہیں ہوتی۔لہذا حق پر وہی ہوں گے جو ہدایت کے پیروکار ہوں، اگرچہ تعداد میں کم ہوں، جیسا کہ اس قوم میں بہت تھوڑے ہی تھے جنہوں نے پانی نہیں پیا۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان کے دریا پار کرکے آگے بڑھنے کا ذکر کر رہا ہے، فرمایا: ﴿فَلَمَّا جَاوَزَهُۥ هُوَ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَهُۥ﴾" حضرت طالوت مومنین سمیت جب نہر سے گزر گئے " یہ اب ان کے دوسرے موقف کا بیان ہے جس میں اس لشکر کی ایمانی قوت کی مزید جانچ پڑتال کا اظہار ہے یہ وہ موقف ہے جس میں انہوں نے اپنے دشمن جالوت کو سامنے دیکھا ،اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿قَالُواْ لَا طَاقَةَ لَنَا ٱلۡيَوۡمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِۦ﴾"وہ لوگ کہنے لگے آج تو ہم میں طاقت نہیں کہ جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑیں "۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی جس کو دیکھ کر طالوت علیہ السلام کی فوج کے ہوش اڑ گئے۔ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ دریا پار کرنے والوں کی کل تعداد چار ہزار تھی، اور ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے پانی پی لیا تھا ، چنانچہ جب انہوں نے جالوت اور اس کے لشکر جو کہ ایک لاکھ کی تعداد میں تھے تو ان میں سے تین ہزار چھ سو تراسی سے زیادہ لوگ پلٹ گئے(۱)۔اور اب ایسی حالت میں فوج دو ٹکڑوں میں بٹ گئی، ایک تو وہ لوگ

---

(۱) تفسير قرطبي ۳/۱٦٦

تھے جنہوں نے کہہ دیا کہ: ﴿لَا طَاقَةَ لَنَا ٱلْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِۦ﴾ " آج تو ہم میں طاقت نہیں کہ جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑیں "۔دوسرا گروہ وہ تھا جن کا ذکر آگے کے اس فرمان میں ہے: ﴿قَالَ ٱلَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَٰقُوا۟ ٱللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةًۢ بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾ " لیکن اللہ تعالی کی ملاقات پر یقین رکھنے والوں نے کہابسا اوقات چھوٹی اور تھوڑی سی جماعتیں بڑی اور بہت سی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ پالیتی ہیں"۔ چنانچہ دوسرے گروہ کے لوگ ایمان کے اعلی مرتبے پر فائز تھے اور انہیں پورا یقین تھا اس بات کا کہ مدد تو اللہ کے پاس سے آنی ہے ،اور اگر وہ قتل بھی کر دیئے گئے تو اللہ تعالی سے شہید بن کر ملاقات کریں گے۔آیت کریمہ میں ظن کے معنی یقین کے ہیں ،يَظُنُّون يعني يَتَيَقَّنُون(١) ۔اس سے مستفاد ہوا کہ ایمان ثبات قدمی کی قوت اور ایمان کی کمزوری شک وشبہ کا سبب ہے اور اس کی بنا پر مختلف قسم کا خوف لگا رہتا ہے ،ایک طرف کثرت تعداد کی ہیبت، دوسری طرف موت اور ناکامی کا ڈر،اور کبھی پیش قدمی سے خوف زدہ رہتا ہے۔ لیکن اس کے بالمقابل ایمان میں ثبات قدمی، بہادری، عمل خیر،انفاق اور پیش قدمی کی قوت وطاقت ہوتی ہے۔اور ﴿يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَٰقُوا۟ ٱللَّهِ﴾ "(جو)اللہ تعالی سے ملاقات پر یقین رکھنے والے ہیں"۔اس جملہ سے معلوم ہوا کہ موت کے بعد آخرت کی زندگی اور اللہ تعالی سے ملاقات پر ان کا ایمان ہوتا ہے ،اور یہ کہ عن قریب اللہ تعالی ان کو اس قتال کا صلہ دے گا۔ یہ چیز عسکری، تربوی، دعوتی، پیشہ وارانہ اور اداری تمام مجالات میں ایمانی تربیت کی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے، جو مومن کے اندر لازوال اور اٹوٹ طاقت فراہم کرتی ہے، بلکہ ایسی طاقت پیدا ہوتی ہے جو تمام تر خطرات اور اشتعال انگیزیوں کو مات دیتی ہے۔

یہ ان کا حسن فہم اور قوت ایمانی تھی کہ انہوں نے نصرت ومدد کا پیمانہ کثرت تعداد کو نہیں بنایا ، بلکہ انہوں نے اس بات پر یقین کیا کہ مدد صرف اللہ تعالی کی تائید سے حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ ان کی زبانی اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿قَالَ ٱلَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَٰقُوا۟ ٱللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةًۢ بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾ " اللہ تعالی کی ملاقات پر یقین رکھنے والوں نے کہابسا اوقات چھوٹی اور تھوڑی سی جماعتیں بڑی اور بہت سی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ پالیتی ہیں"۔ چنانچہ انہوں نے اللہ

---

(١) فتح القدير ١/٢٦٥.

تعالی کی ذات پر اعتماد اور یقین کیا، اور یہی ایک مومن کا عقیدہ ہے کہ غلبہ اور نصرت محض اللہ تعالی کی تائید سے حاصل ہوتی ہے۔ اور ﴿كَم مِّن فِئَةٍ﴾ اس جملہ سے پتہ چلتا ہے چھوٹی جماعتوں کا غلبہ صرف ایک دو بار کا واقعہ نہیں ہے، بلکہ بہت زیادہ ایسے واقعات ہوتے ہیں جن میں چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے، اور یہ سب ﴿بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾ یعنی اللہ تعالی کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہاں پر انہوں نے نصرت کو حکم الہی سے مربوط کر دیا ہے، جس سے ان کے صحیح فہم واعتقاد کی تاکید ہوتی ہے کہ ہر چیز اللہ تعالی کے حکم سے انجام پاتی ہے۔

﴿بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾ کا یہ جملہ ایک مومن کی بہت بڑی عملی اور اعتقادی قوت ہے، اسی کی وجہ سے وہ اللہ تعالی پر کامل توکل اور حکم الہی سے رضامند ہوتا ہے، اسباب بھی اختیار کرتا ہے تو اس کے کار گر ہونے کے لیے حکم الہی کا اعتقاد رکھتا ہے، اور خلاف ارادہ کچھ واقع ہو جائے تو بالیقین پکار اٹھتا ہے کہ اللہ تعالی کا حکم ہی نہیں تھا، کسی شئے میں تردد ہو تو ﴿بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾ سے تقویت حاصل کرتا ہے، کوئی خوف لاحق تو قابو پانے کے لیے ﴿بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾ کا سہارا لیتا ہے، کسی کے ذریعہ اپنی ذلت کا احساس ہو تو ﴿بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾ کے ذریعہ سب کچھ پر سکون کر لیتا ہے، اشیاء محبوبہ کی چمک دمک دیکھ کر پکار اٹھتا ہے: ﴿بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾، اگر وہ محبوب چیز حاصل ہو گئی تو اللہ کا شکر بجالاتے ہوئے گویا ہوتا ہے کہ یہ سب اللہ کے حکم سے حاصل ہوئی ہے۔ گویا کہ ﴿بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾ کی قوت سے ایک مومن کا دل تمام معمولات زندگی مین ہمہ وقت معمور ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں نے کہا: ﴿وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّـٰبِرِينَ﴾ " اللہ تعالیٰ صبر والوں کے ساتھ ہے"۔ یہ ان کے اسی سابقہ علم کی مزید تاکید ہے کہ اللہ تعالی ہی صبر کرنے والے کا مدد و معاون ہے، اور اس کو اللہ تعالی کی تائید و نصرت اور توفیق و قوت حاصل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضروریات کی تکمیل مصائب ومشکلات کے حل اور زندگی کے پیش آمدہ امور کی کامیابی کے لیے صبر ایک مومن کے حق میں اللہ تعالی کی معیت خاصہ کے حصول کا اہم وسیلہ ہے۔

معلوم ہوا کہ ﴿وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّـٰبِرِينَ﴾ کا یہ جملہ مومن کے لیے ایک قاعدہ کلیہ ہے جس کو وہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں اور مصائب و نقصانات کے لاحق ہونے پر استعمال کرتا ہے، چنانچہ جب بھی اس

کو کوئی مشکل درپیش ہوتی ہے تو ارشادالٰہی ﴿وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ﴾ پر عمل پیرا ہو کر مدد حاصل کرتا ہے، کسی کام کی شروعات ہو تو اس کی تکمیل کے لیے ﴿وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ﴾ کا سہارا لیتا ہے، کیوں کہ ہر کام صبر کا متقاضی ہوتا ہے۔ اگر اطاعت کے کاموں کے لیے طبیعت میں گرانی محسوس کرتا ہے تو اسے اللہ تعالی کا فرمان ﴿وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ﴾ یاد آجاتا ہے، اور اگر اس میں کوئی غلط خواہش جنم لیتی ہے تو اس سے بچنے کے لیے ﴿وَٱللَّهُ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ﴾ روبہ عمل لاتا ہے۔ گویا یہ فرمان نصیحت والوں اور اس کے مطابق عمل کرنے والوں کے لیے ایک بڑی قوت ہے، تاکہ شر کا دفاع، خیر کی طلب، غم کا خاتمہ، حزن وملال سے چھٹکارا، سستی اور عاجزی سے نجات غرضیکہ تمام حالات میں انہیں اللہ تعالی کی معیت خاصہ حاصل ہو سکے۔

﴿وَلَمَّا بَرَزُوا۟ لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِۦ قَالُوا۟ رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٢٥٠﴾﴾

ترجمہ:

"جب ان کا جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ ہوا تو انہوں نے دعا مانگی کہ اے پروردگار ہمیں صبر دے ثابت قدمی دے اور قوم کفار پر ہماری مدد فرما (۲۵۰)"۔

اس آیت کریمہ میں طالوت علیہ السلام اور جالوت کے درمیان مقابلے کا منظر پیش کیا جارہا ہے: ﴿وَلَمَّا بَرَزُوا۟ لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِۦ﴾ "جب ان کا جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ ہوا"۔ یہاں سے اب مقابلہ آرائی ہو رہی ہے، چنانچہ جب طالوت علیہ السلام کی فوج قوم عمالقہ کے لیڈر جالوت اور اس کی فوج سے مقابلہ کے لیے میدان کارزار میں آئی تو انہوں نے اللہ سے مدد طلب کی، یہ بھی اللہ تعالی کا ان پر فضل واحسان تھا کہ لشکر جالوت کی ہولناک بھیڑ کے سامنے انہیں اس دعا کی توفیق دی: ﴿قَالُوا۟ رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ﴾ "انہوں نے دعا مانگی کہ اے پروردگار ہمیں صبر دے ثابت قدمی دے اور قوم کفار پر ہماری مدد فرما"۔ ان کی پہلی دعا کہ اے پروردگار ہمیں صبر دے، کیوں کہ دشمن سے مقابلہ کے لیے صبر کی کافی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح آدمی اپنے ہر کام میں صبر کا محتاج ہوتا ہے۔ نیز اس دعا سے یہ مستفاد ہوا کہ ایک مومن اللہ تعالی سے

صبر کی دعا کرتا ہے جیسا کہ ان لوگوں نے دعا کی، یعنی مومن صبر کرتا ہے اور اللہ تعالی سے صبر کی توفیق بھی طلب کرتا ہے، اور وہ خود اعتمادی کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اپنے تمام تر مقاصد میں اللہ تعالی ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔اس کے بعد انہوں نے اللہ تعالی سے ثبات قدمی کی دعا کی: ﴿وَثَبِّتۡ أَقۡدَامَنَا﴾ "ہمیں ثابت قدمی دے"۔ کیوں کہ اندوہناک حوادث میں ثبات قدمی بہت کم بمشکل پائی جاتی ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالی کی توفیق شامل حال ہو۔ دشمن سے جنگ وغیرہ کے وقت ڈٹے رہنا اور راہ فرار نہ اختیار کرنا بہت دل گردے کا کام ہے، یہ محض اللہ تعالی کی اپنے بندے پر نوازش ہوتی ہے ، کیوں کہ اللہ تعالی کی مدد جس کے ساتھ نہ ہو وہ کبھی ثابت قدم نہیں رہ سکتا، وہ تو اللہ تعالی کی ذات ہے جو تلواروں کی جھنکار کے سامنے بھی قلب وجگر اور قدموں میں مضبوطی عطا کرتی ہے۔اس کے بعد انہوں نے اللہ تعالی سے نصرت ومدد کی دعا کی: ﴿وَٱنصُرۡنَا عَلَى ٱلۡقَوۡمِ ٱلۡكَٰفِرِينَ﴾ " اور قوم کفار پر ہماری مدد فرما"۔اس میں مومن کے لیے درس ہے کہ زندگی کے ہر باب میں مدد صرف اللہ تعالی کی جانب سے ہوتی ہے، میدان کارزار میں اس کی مدد صرف ایک باب ہے، لہذا ضروری ہے کہ بندہ مومن اللہ تعالی سے مدد مانگے اور اپنی قوت وطاقت کے متعلق خود اعتمادی کا شکار نہ ہو، کیوں کہ یہ چیز میدان جنگ میں اسے ذلت ورسوائی سے دوچار کرسکتی ہے، چنانچہ مکمل اعتماد اور پورا بھروسہ اللہ تعالی کی قدرت کاملہ اور اس کی نصرت ومدد پر ہونا چاہیے۔

اس سے تمام اوقات میں دعا کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، کیوں کہ مدد صرف اللہ تعالی کی طرف سے ہوتی ہے، ثابت قدمی صرف اللہ تعالی ہی عطا کرتا ہے، صبر کی توفیق بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، خیر کی طلب ہو یا شر وبرائی سے حفاظت ہو سب کچھ اسی ذات واحد کی جانب سے حاصل ہوتی ہے۔

﴿ فَهَزَمُوهُم بِإِذۡنِ ٱللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُۥدُ جَالُوتَ وَءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلۡمُلۡكَ وَٱلۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهُۥ مِمَّا يَشَآءُۗ وَلَوۡلَا دَفۡعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعۡضَهُم بِبَعۡضٖ لَّفَسَدَتِ ٱلۡأَرۡضُ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ ذُو فَضۡلٍ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿٢٥١﴾ تِلۡكَ ءَايَٰتُ ٱللَّهِ نَتۡلُوهَا عَلَيۡكَ بِٱلۡحَقِّۚ وَإِنَّكَ لَمِنَ ٱلۡمُرۡسَلِينَ ﴿٢٥٢﴾ ﴾

ترجمہ:

"چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے جالوتیوں کو شکست دے دی اور (حضرت) داؤد علیہ اسلام کے ہاتھوں جالوت قتل ہوا ، اور اللہ تعالیٰ نے داؤد (علیہ السلام) کو مملکت و حکمت اور جتنا کچھ چاہا علم بھی عطا فرمایا۔ اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر فضل و کرم کرنے والا ہے (۲۵۱) یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم حقانیت کے ساتھ آپ پر پڑھتے ہیں، بالیقین آپ رسولوں میں سے ہیں"۔

یہاں سے اہل ایمان اور کفار کے بیچ معرکہ کے انجام کا منظر نامہ پیش کیا جارہا ہے ، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ ٱللَّهِ ﴾ "اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے جالوتیوں کو شکست دے دی"۔ قرآن کریم میں کفار کے شکست کا اعلان جلد ہی بیان کر دیا گیا، لیکن یہ شکست لشکر طالوت کی طاقت کے بل پر حاصل نہیں ہوئی، کیوں کہ ان کی طاقت فوج جالوت کی طاقت کے برابر نہیں تھی، نہ تو تعداد میں ان کے برابر تھے اور نہ ہی تیاری میں ان کے مثل تھے، بلکہ اس شکست میں محض اللہ رب العالمین کا حکم کارفرما تھا، جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ ٱللَّهِ ﴾ "اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے جالوتیوں کو شکست دے دی"۔ کیوں کہ دشمن کی شکست کے سلسلے میں ان کا اللہ اور طاقتور و غالب ذات کے حکم پر اعتماد تھا، جیسا کہ سابقہ آیت میں ان کا کہنا تھا: ﴿ قَالَ ٱلَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَٰقُواْ ٱللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةًۢ بِإِذْنِ ٱللَّهِ ﴾ " اللہ تعالیٰ کی ملاقات پر یقین رکھنے والوں نے کہا بسا اوقات چھوٹی اور تھوڑی سی جماعتیں بڑی اور بہت سی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غلبہ پالیتی ہیں"۔ لہذا نصرت و مدد نازل کرنے والی صرف اللہ قوی عزیز کی ذات ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ جالوت کے قاتل جانباز کا ذکر کر رہا ہے ، فرمایا: ﴿ وَقَتَلَ دَاوُۥدُ جَالُوتَ ﴾ " اور (حضرت) داؤد علیہ اسلام کے ہاتھوں جالوت قتل ہوا"۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے طالوت علیہ السلام کے لشکر سے نکل کر جالوت کو قتل کر ڈالا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ داؤد علیہ السلام پر احسان جتلاتے ہوئے ارشاد فرما رہا ہے: ﴿ وَءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلْمُلْكَ وَٱلْحِكْمَةَ ﴾ " اور اللہ تعالیٰ نے داؤد (علیہ السلام) کو مملکت و حکمت عطا کی"۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام پر یہ احسان کیا کہ انہیں

طالوت علیہ السلام کے بعد بادشاہت عطا کی، نیز حکمت یعنی نبی شمویل کے بعد ان کو نبوت سے سرفراز کیا[1] ۔ چنانچہ اللہ تعالی نے داؤد علیہ السلام میں بادشاہت اور نبوت دونوں چیزیں جمع کردیں ،مزید برآں یہ بھی فضل وکرم کیا کہ انہیں جتنا کچھ چاہا علم بھی عطا کیا، یعنی ان کو خاص قسم کے علم سے نوازا۔ اس میں یہ تاکید وبیان ہے کہ اللہ تعالی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے بادشاہت عطا کرتا ہے، کیوں کہ دیکھیے کیسے اللہ تعالی نے داؤد علیہ السلام کے لیے بادشاہت اور رسالت کی راہ ہموار کی اور خصوصی علم دے کر ان پر مزید فضل واحسان کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالی دفاع کی حکمت بیان کر رہا ہے : ﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ ٱلْأَرْضُ ﴾" اگر اللہ تعالی بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا"۔یعنی اللہ تعالی اگر ایک گروہ کے ذریعہ دوسرے گروہ کا دفاع نہ کرتا ،جیسا کہ اس نے طالوت کے جہاد اور داؤد علیہ السلام کی شجاعت کے ذریعہ بنی اسرائیل کا دفاع کیا تو لوگ ہلاک وبرباد ہو جاتے[2] ۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک قوم کے دوسرے قوم پر مسلط کرنے میں بھی اللہ تعالی کی عظیم حکمت ہے، اور وہ حکمت یہ ہے کہ دوسرے لوگوں سے شر وفساد کو دور کیا جائے،اس نعمت کا احساس بسا اوقات لوگوں کو ہوتا ہے اور بسا اوقات نہیں ہوتا۔ اس لیے ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں پر گزرنے والے حوادث وواقعات اور جنگی حالات میں فکر وتدبر سے کام لے ،کیوں کہ اس کے ذریعہ سے اللہ تعالی دوسرے مسلمانوں کو عظیم شر وفساد سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔

یہ آیت کریمہ اس دفاعی طریقہ کار کی اس حکمت پر مبنی ہے جس کا بیان ﴿ لَّفَسَدَتِ ٱلْأَرْضُ ﴾ میں کیا گیا ہے ،یعنی یہ باہمی دفاعی سلسلہ نیکوکار کی بقا اور ظالم وفسادی عناصر کے شر وفساد سے اس کی حفاظت کی غرض سے ہے۔ لہذا دفاعی کارکردگی کو صرف مقتولین کی ہلاکت کے نظریے سے نہیں دیکھا جانا چاہیے، بلکہ اس کے دوسرے پہلو پر بھی نظر ہونی چاہیے تبھی جا کر اس نعمت اور حکمت کی

---

(١) تفسير ابن كثير ١/ ٣١٠.

(٢) مرجع سابق.

اصل حقیقت سامنے آئے گی، اور وہ حکمت ہے روئے زمین پر صالحیت اور صالحین کا بقاءااور خیر کے ذریعہ اس روئے زمین کی اصلاح اور لوگوں کے وجود کی حفاظت، اسی طرح زمین سے فتنہ وفساد دور کرکے اچھوں کو باقی رکھنااور فساد پروروں کا خاتمہ۔اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ روئے زمین پر فساداور بگاڑ کا سبب اس پر بسنے والے لوگ ہی ہیں، یہی لوگ اس پر ظلم وزیادتی پھیلاتے ہیں، اور لوگ اگر اچھے ہوں تو زمینی حالات بھی درست رہیں گے۔اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ حق وباطل کے بیچ معرکہ آرائی دائمی امر ہے، اور ایسااس لیے ہے تاکہ فتنہ پرور عناصر کے فساد وطاقت کے سبب نیکوکار عناصر کا خاتمہ نہ ہو۔ لہذا تمام تعریفیں اور شکر وثنا اللہ تعالی کے لیے ہے جو دفاعی طریقہ کار کے ذریعہ صالحین کا بچاؤ کرتا ہے۔

انسان اگر اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس حکمت ربانی کو ساتھ رکھے تو زندگی کے مختلف مقامات میں اس کی مختلف شکلیں اور حقیقتیں کھل کر اس کے سامنے آئیں گی اور اس کو اس کے بہت سارے فائدے ملیں گے، اور زندگی کے بہت سارے مجالات میں وہ مصیبت اور نقصان سے بچ سکے گا، جیسے کہ تجارت اور دواعلاج اور روزی روٹی وغیرہ کے مسائل ہیں ، ایک شخص آتا ہے اور وہ دوسرے کا دفاع کرتا ہے، ایک شخص کے آنے سے دوسرے کو غیر متوقع بھلائی ہاتھ آتی ہے، کسی کے لیے ایسے امور مہیا ہو جاتے ہیں جو اس کے جی میں نہیں کھٹکتے اور پھر اللہ تعالی کے فضل سے بغیر شان وگمان کے اس کو بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے، تو وہ کونسی ذات ہے جو ایک کو دوسرے تک پہنچاتی ہے، یہاں تک کہ تیسرے فریق یا اس سے زیادہ لوگوں کو غیر متوقعہ اللہ کا فضل پہنچتا رہتا ہے، اور بسااوقات کسی کے آنے سے اللہ تعالی دوسرے سے شر کو دور کر دیتا ہے، پاک ہے اللہ تعالی کی ذات، اس کے تدبیر اور اختیارات میں بڑی عظیم حکمتیں ہیں، یہ سب کچھ اللہ تعالی کے فضل وکرم اور رحمتوں کے مظاہر ہیں، جیسا کہ اس نے آیت کے اختتام میں ارشاد فرمایا: ﴿وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ ذُو فَضۡلٍ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾" لیکن اللہ تعالیٰ دنیا والوں پر فضل وکرم کرنے والا ہے"۔ لہذا اللہ تعالی کا فضل وکرم دنیا والوں پر بہت عظیم ہے، کاش کہ انسان غور وفکر سے کام لیتا۔ یہ آیت جن امور کا مطالبہ کرتی ہے ان میں سے توکل علی اللہ اور ہر معاملے میں اللہ سے مدد طلب کرنا ہے، کیوں کہ وہی اپنی حکمت بالغہ ، ارادہ محکمہ اور عظیم طاقت وقدرت کے ذریعہ دفاعی عمل انجام دیتا ہے۔اس آیت کا ایک مومن سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ وہ اپنے بارے میں اور

سماج ومعاشرے کے بارے میں غور وفکر کرے کہ کس خوبی سے اللہ تعالی بعض لوگوں کو بعض سے دفع کرکے دنیاوالوں کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے ،تاکہ فتنہ پرور اور فساد انگیز عناصر کی قوت وکثرت سے روئے زمین فساد کی آماجگاہ نہ بن جائے اور اچھوں کی قلیل تعداد ہلاک وبرباد نہ ہوجائے۔

اس آیت کے من جملہ فوائد میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ آیت اللہ تعالی کے فضل کو بالعموم تمام مخلوقات کے لیے ثابت کر رہی ہے: ﴿وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ ذُو فَضۡلٍ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾" لیکن اللہ تعالیٰ دنیاوالوں پر فضل وکرم کرنے والا ہے"۔

اس کے بعد اللہ تعالی ان سارے واقعات کے بیان کرنے کا مقصد بیان کر رہا ہے: ﴿ تِلۡكَ ءَايَٰتُ ٱللَّهِ نَتۡلُوهَا عَلَيۡكَ بِٱلۡحَقِّ ﴾" یہ اللہ تعالی کی آیتیں ہیں جنہیں ہم حقانیت کے ساتھ آپ پر پڑھتے ہیں"۔یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیتیں ہم بالکل سچائی کے ساتھ آپ سے بیان کر رہے ہیں اور ان آیات میں آپ کی نبوت کا ثبوت موجود ہے: ﴿وَإِنَّكَ لَمِنَ ٱلۡمُرۡسَلِينَ ﴾" بالیقین آپ رسولوں میں سے ہیں"۔اس میں ان تمام لوگوں کا رد ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ تم رسول نہیں ہو ، کیوں کہ یہ تمام واقعات اللہ تعالی کے علاوہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جن کے ساتھ پیش آئے، لیکن یہ سارے واقعات وہ امی نبی دے رہاہے جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس قصہ سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہ دعوت وتربیت کا ایک بہترین وسیلہ اور سرچشمہ ہدایت ہے ،اس کے الفاظ ومضامین معجزہ ہیں،اور اس میں بہت سارے دروس وعبرتیں،اس میں اللہ تعالی کی حکمت، عظیم قدرت اور مخلوقات کی تدبیر میں اس کی سنت کا بیان ہے،اور یہ کہ اللہ تعالی کا غلبہ اپنی تمام مخلوقات پر ہے۔ یہ ساری چیزیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ مومنین قرآن کریم کے مضامین ومشمولات کو تربیتی اور دعوتی طریقہ کار نیز تنظیمی ومنصوبہ بندی اور قانون سازی جیسے امور میں بروئے کار لائیں ، کیوں کہ قرآن ایسے مضامین سے بھرپور ہے جو زندگی کے ہر باب اور موڑ پر سب سے بہتر راستے کی رہنمائی کرتے ہیں۔

﴿ تِلۡكَ ٱلرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلَىٰ بَعۡضٖۘ مِّنۡهُم مَّن كَلَّمَ ٱللَّهُۖ وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجَٰتٖۚ وَءَاتَيۡنَا عِيسَى ٱبۡنَ مَرۡيَمَ ٱلۡبَيِّنَٰتِ وَأَيَّدۡنَٰهُ بِرُوحِ ٱلۡقُدُسِۗ وَلَوۡ شَآءَ ٱللَّهُ مَا ٱقۡتَتَلَ ٱلَّذِينَ مِنۢ بَعۡدِهِم مِّنۢ

بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ ٱلۡبَيِّنَٰتُ وَلَٰكِنِ ٱخۡتَلَفُواْ فَمِنۡهُم مَّنۡ ءَامَنَ وَمِنۡهُم مَّن كَفَرَۚ وَلَوۡ شَآءَ ٱللَّهُ مَا ٱقۡتَتَلُواْ وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿٢٥٣﴾﴾

ترجمہ:

"یہ رسول ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ، ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بات چیت کی ہے اور بعض کے درجے بلند کئے ہیں، اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات عطا فرمائے اور روح القدس سے ان کی تائید کی ، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے بعد والے اپنے پاس دلیلیں آ جانے کے بعد ہر گز آپس میں لڑائی بھڑائی نہ کرتے، لیکن ان لوگوں نے اختلاف کیا، ان میں سے بعض تو مومن ہوئے اور بعض کافر، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے ، لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے(۲۵۳)"۔

قرآن کریم کا سیاق نبیوں کے باہمی تفاضل کے بیان کی طرف منتقل ہو رہا ہے ، فرمایا: ﴿تِلۡكَ ٱلرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلَىٰ بَعۡضٖۘ مِّنۡهُم مَّن كَلَّمَ ٱللَّهُۖ وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجَٰتٖ﴾" یہ رسول ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے ، ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بات چیت کی ہے اور بعض کے درجے بلند کئے ہیں"۔ لہذا اللہ تعالی کے تمام رسول آپس میں ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں اور یہ فضیلت اللہ تعالی کی عطا کردہ ہے، اس میں ان کا اپنا کوئی دخل نہیں، بلکہ وہ صرف اللہ کی ذات ہے، اسی لیے فرمایا: ﴿فَضَّلۡنَا﴾"ہم نے فضیلت دی ہے"، چنانچہ فضیلت دینے کی نسبت اللہ تبارک وتعالی نے اپنی طرف کی۔اس سے معلوم ہوا کہ کوئی بھی رسول جس کسی خاص فضیلت ، خصوصیت، قدرت اور معجزات سے نوازا گیا ہے تو نوازنے والا اللہ تعالی ہے، اور اسی نے تمام رسولوں کے علاوہ اس کو وہ فضیلت عطا کی ہے۔اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ نبیوں کو فضیلت عطا کرنے کا مقام اور حق صرف اللہ رب العالمین کو ہے، اور اس کے علاوہ مخلوقات میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں، بلکہ اس فضیلت پر ایمان لانا اور اسی طرح تسلیم کرنا اور مان لینا ضروری ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

حدیث ہے: "لا تُخَيِّرُوا بَيْنَ الأَنْبِيَاءِ"(١) دیکھو انبیاء میں باہم ایک دوسرے کو فضیلت نہ دیا کرو" روایت کے دوسرے الفاظ یوں ہیں: " لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ أَنبِيَاءِ اللهِ"(٢)۔ اللہ تعالی نے بندوں کو اپنی عبادت کے لیے اس بات کا مکلف نہیں کیا ہے کہ وہ نبیوں کو ایک دوسرے پھر فضیلت دیں، بلکہ تمام نبیوں پر ایمان لانا واجب ہے، نبیوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دینے والا اللہ ہے جس کی حکمت سے وہی واقف ہے ، اور یہ فضیلت دینا صرف اسی اللہ سبحانہ وتعالی کا حق ہے۔

ان من جملہ فضیلتوں میں سے اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: ﴿مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ ٱللَّهُ﴾" ان میں سے بعض وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بات چیت کی ہے"۔ یعنی اللہ تعالی کا کسی نبی سے بات کرنا اس نبی کے لیے فضیلت اور خصوصیت کی بات ہے، جیسا کہ موسی علیہ السلام ہیں جن سے اللہ تعالی ہم کلام ہوا۔ مزید اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَٰتٍ﴾" اور بعض کے درجے بلند کئے ہیں"۔ اس کی دلیل اسراء اور معراج والی وہ حدیث ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر آسمان میں نبیوں کو ان کے مقام مرتبے کے حساب سے دیکھا(٣)۔ عیسی علسہ السلام کے متعلق اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿ وَءَاتَيْنَا عِيسَى ٱبْنَ مَرْيَمَ ٱلْبَيِّنَٰتِ وَأَيَّدْنَٰهُ بِرُوحِ ٱلْقُدُسِ﴾" اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو معجزات عطا فرمائے اور روح القدس سے ان کی تائید کی"۔ یعنی عیسی علیہ السلام کی ایسے معجزات سے تائید فرمائی جو ان کی نبوت کی صداقت کا ثبوت تھے، نیز روح القدس یعنی جبریل علیہ السلام کے ذریعہ بھی ان کی تائید فرمائی۔

ان من جملہ بعض فضائل میں سے ہے کہ ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ اور موسی علیہ السلام کلیم اللہ کے لقب سے سرفراز ہوئے، اور داؤد علیہ السلام کو اللہ نے بادشاہت ونبوت دی اور زرہ سازی کا ہنر دیا ، اور سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولی سکھلائی اور جنوں کو ان کے تابع کر دیا۔ عیسی علیہ السلام کی خصوصیت یہ تھی کہ پیدائشی نابینا اور برص زدہ کو ان کے ہاتھوں شفاء مل جاتی تھی، ان کی ایک خصوصیت

---

(١) صحيح البخاري ٢٧٧/٤ حديث نمبر ٦٩١٦.

(٢) صحيح مسلم ١٨٤٣/٤-١٨٤٤ حديث نمبر ٢٣٧٣.

(٣) صحيح البخاري ١٣٣/١ حديث نمبر ٣٤٩.

یہ بھی تھی کہ لوگ جو کچھ کھائے ہوتے یا گھروں میں ذخیرہ کیے ہوتے اس سے وہ باخبر کر دیتے، اس کے علاوہ دیگر فضائل و معجزات بھی ان کو حاصل تھے۔اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسراء و معراج کی فضیلت سے نوازا گیا ،آپ جن وانس سب کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے، آپ کی امت کو دیگر امتوں پر فوقیت دی گئی ، آپ خاتم النبیین ہیں ، کھانے میں برکت اور آپ کی انگلیوں کے نیچے سے پانی رواں ہوئے، رعب ودبدبہ کے ذریعہ آپ کی مدد کی گئی، اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بھی بہت سارے فضائل ہیں اور یہ سارے فضائل اللہ تعالی کی طرف سے عطا کئے گئے۔

یہ اللہ تعالی کی طرف سے ایک اشارہ ہے کہ بندوں کے باہمی تفاوت وتفاضل کو اسی طریقے پر سمجھنا چاہیے، یعنی لوگوں میں سے بعض کو اللہ نے بعض دوسرے افراد پر اگر کوئی خصوصی برتری عطا کی ہے تو یہ صرف اللہ تعالی کی دین ہے، ان خصوصیات کی بنیاد پر آدمی خود سے دوسروں پر کوئی فضیلت نہیں حاصل نہیں ہو سکتی ، کیوں کہ ان خصوصیات کا عطا کرنے والا تو اللہ تعالی ہی ہے ، لہذا اس بنیاد پر وہ دوسروں پر فخر نہ کرے اور نہ کبر و غرور کا شکار ہو، یہ فضیلت اس کو خود سے نہیں حاصل ہوئی ہے اور نہ ہی اس میں اس کی استطاعت ہے، یہ تو محض اس پر اللہ تعالی کا کرم وانعام ہے جس نے اس کو اپنی نوازشوں کے ذریعہ فضیلت بخشی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام نعمتوں کی نسبت اللہ تعالی ہی کی طرف کرنی چاہئے۔

اور اللہ تعالی نے جب بھی کسی قوم میں اپنے رسولوں کو بھیجا، تو ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ لوگ ان پر ایمان لاتے اور ان کی اتباع کرتے، کیوں کہ اللہ تعالی نے ان نبیوں پر بہت سارے معجزات اور دلائل ظاہر کئے، لیکن قوم کی اکثریت کفر اور بے راہ روی کا شکار ہوئی، اور پھر اس بے راہ روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اختلاف نے جنم لیا اور ان کے دو گروہ ہو گئے ایک مومن اور دوسرا کافر، پھر ہوا یوں کہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے برسرپیکار ہو گئے ،ارشاد ربانی ہے: ﴿ وَلَوۡ شَآءَ ٱللَّهُ مَا ٱقۡتَتَلَ ٱلَّذِينَ مِنۢ بَعۡدِهِم مِّنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ ٱلۡبَيِّنَٰتُ ﴾ " اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کے بعد والے اپنے پاس دلیلیں آ جانے کے بعد ہرگز آپس میں لڑائی بھڑائی نہ کرتے "۔یعنی اگر اللہ تعالی چاہتا ان رسولوں کے ذریعہ دلائل آجانے اور واضح ہو جانے کے بعد قتال نہ کرتے تو ایسا ممکن تھا، کیوں کہ اللہ تعالی کو تمام

قوت وطاقت اور ارادہ کاملہ حاصل ہے ،اور ایسا کرنا اس کی طاقت وقدرت سے ورے نہیں،اس آیت میں اللہ تعالی نے اپنے لیے قدرت اور مشیئت کاملہ ثابت کرکے اپنی ذات سے ہر نقص کی نفی کی ہے۔ لیکن بھیجے گیے نبیوں کے بارے میں اختلاف کے سبب یہ ساری مارکاٹ ہوئی ،فرمایا: ﴿وَلَٰكِنِ ٱخۡتَلَفُواْ فَمِنۡهُم مَّنۡ ءَامَنَ وَمِنۡهُم مَّن كَفَرَۚ﴾" لیکن ان لوگوں نے اختلاف کیا، ان میں سے بعض تو مومن ہوئے اور بعض کافر"۔اس سے یہ فائدہ ماخوذ ہوا کہ ملت میں اختلاف بہت بری چیز ہے اور یہ عداوت ودشمنی اور قتل وغارت گری کا سبب ہے ، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اختلاف کرکے ملت کو بانٹنا انتہائی خطرناک عمل ہے ،اس کے نتیجے میں افکار ونظریات بھی بٹ جاتے ہیں۔اس کے بعد اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَلَوۡ شَآءَ ٱللَّهُ مَا ٱقۡتَتَلُواْ﴾" اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے"۔ یعنی اگر اللہ تعالی کی منشا ہوتی کہ یہ لوگ نہ لڑیں تو ایسا ہو سکتا تھا، اللہ تعالی نے لوگوں کے درمیان اس قتال کے نہ ہونے کے بارے میں اپنی مشیئت اور ارادہ کو ثابت کیا ہے کہ ایسا ممکن ہے ،اور اس کے ذریعہ اللہ تعالی نے اپنی ذات کریمہ سے ہر نقص کی نفی کرتے ہوئے اپنے لیے مشیئت وقدرت کو ثابت کیا ہے ، فرمایا: ﴿وَلَٰكِنَّ ٱللَّهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيدُ﴾" لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے"۔یعنی یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کیوں کہ اللہ تعالی جو چاہتا ہے کرتا ہے، چنانچہ ایک طرح سے ہر چیز سے اس بات کی نفی کردی کہ وہ اللہ تعالی کے ارادہ کے بغیر ہو، لہذا اللہ تعالی کو ارادہ کاملہ حاصل ہے اور کوئی بھی چیز اس کی مشیئت کے بغیر ممکن نہیں، جو بھی چیز موجود صورت میں ہے اگر اللہ تعالی چاہتا کہ وہ چیز نہ ہو تو وہ چیز نہ ہوتی، یا اللہ تعالی کی مشیئت کے مطابق کسی دوسری شکل میں ہوتی۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقۡنَٰكُم مِّن قَبۡلِ أَن يَأۡتِيَ يَوۡمٞ لَّا بَيۡعٞ فِيهِ وَلَا خُلَّةٞ وَلَا شَفَٰعَةٞۗ وَٱلۡكَٰفِرُونَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ٢٥٤﴾

ترجمہ:

"اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہو اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ تجارت ہے نہ دوستی نہ شفاعت ،اور کافر ہی ظالم ہیں"۔

اس کے بعد سیاق قرآنی انفاق فی سبیل اللہ پر آمادہ کرنے کی طرف منتقل ہو رہا ہے، فرمایا: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقۡنَٰكُم ﴾ "اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہو"۔ آیت کریمہ میں خطاب کا آغاز اسلوب ندا سے ہو رہا ہے تاکہ مخاطبین سے جو بات کہی جائے اس کی طرف پوری توجہ دیں، کیوں کہ بات کافی اہم اور ان کی آخرت سے تعلق رکھتی ہے۔

ایمان کے ساتھ ان کو خطاب کرنا یا ندا دینا اللہ تعالی کی طرف سے ان کے لیے بہت عظیم شرف کی بات ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالی ان کے ایمان کا ثبوت فراہم کر رہا ہے، ایک مومن کے لیے اس سے بڑی اور کونسی نعمت ہو سکتی ہے؟ یہ سب کچھ اس لیے ہے تاکہ لوگ اپنی پوری توجہ اس طرف مبذول کر لیں اور اللہ تعالی انہیں ان کے مفاد کی بات بتائے۔ اس سے تربیت کے مجال میں یہ فائدہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک متعلم یا مدعو کو بہتر سے بہتر الفاظ میں پکارا جانا چاہیے، کیوں کہ جب اللہ تعالی اپنے بندوں کو اس عظیم شرف کے ساتھ ندا دے رہا ہے تو بندے اپنے ہی جیسے بندوں کو پکارنے میں اس کا لحاظ کیسے نہ کریں۔

آیت کریمہ میں اللہ تعالی انفاق پر جس اسلوب میں ابھار رہا ہے وہ تین امور پر مشتمل ہے: تشجیع اور حوصلہ افزائی، حکم اور بچاؤ کی ترغیب۔ تشجیع کا اسلوب ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ ﴾ میں مومنوں کو ایمان کے وصف سے ندا دینے میں ہے، اور حکم اللہ تعالی کے فرمان: ﴿أَنفِقُواْ﴾ میں ہے، کیوں کہ اس امر سے ایک مومن کے ارادے کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ پسند کرتا ہے اس میں سے خرچ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض مقاصد کی تکمیل میں سیاق کلام حکم کا محتاج ہوتا ہے، ساتھ ہی پہلے سے تشجیع و تکریم کے اسلوب کا بھی خیال رکھا گیا ہو، جیسا کہ اس آیت میں حکم کے ساتھ تشجیعی عوامل کو بھی بیان کیا گیا ہے ، نیز اس انفاق کی ترغیب بھی دلائی گئی، فرمایا: ﴿مِّن قَبۡلِ أَن يَأۡتِيَ يَوۡمٞ لَّا بَيۡعٞ فِيهِ وَلَا خُلَّةٞ وَلَا شَفَٰعَةٞ ﴾ "اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ تجارت ہے نہ دوستی نہ شفاعت "۔ انفاق کے اس حکم میں مومن سے اس کی ساری جمع پونجی کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس کے پاس موجود رزق کا بہت تھوڑا حصہ خرچ کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے: ﴿أَنفِقُواْ مِمَّا رَزَقۡنَٰكُم ﴾" جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہو"۔ یہ اللہ تعالی کا لطف و کرم اور اعلی منہج اور عظیم حکمت ہے۔ اس

آیت سے یہ مستفاد ہوا کہ بندے کے پاس جو رزق بھی میسر ہے وہ اللہ تعالی کے فضل وکرم سے ہے، کیوں کہ اللہ تعالی آیت میں فرمارہا ہے: ﴿مِمَّا رَزَقۡنَٰكُم﴾" جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے"۔یعنی بندوں کے پاس جو رزق ہے اس کی نسبت اللہ تعالی نے اپنی طرف کی ہے۔

﴿مِمَّا رَزَقۡنَٰكُم﴾" جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے "آیت کے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ ہے کہ جو ہم نے تمہیں دیا ہے وہ سب خرچ نہیں کرنا ہے، بلکہ اس کا کچھ حصہ ہی خرچ کرنا ہے۔ اور یہ بھی اللہ تعالی کا فضل وکرم ہے کہ آیت میں اس نے کوئی مقدار متعین نہیں کی، بلکہ اسے خرچ کرنے والے کی وسعت اور اس کی جود وسخا اور صورت حال کے حساب سے اس کی ضروریات پر چھوڑ دیا۔ اور ﴿مِمَّا رَزَقۡنَٰكُم﴾ اس جملے میں رزق کی تمام اقسام شامل ہیں، اللہ تعالی نے اس کو کسی خاص قسم میں محصور نہیں کیا ہے، تاکہ اس میں اللہ تعالی کی عطا کردہ تمام چیزیں اور ارزاق شامل ہو جائیں مثال کے طور پر علم، مال ودولت، اشیائے خورد ونوش، لباس وپوشاک، چوپائے، جسمانی طاقت، جاہ ومنزلت یہ ساری چیزیں نیز ان کے علاوہ دیگر اشیاء سب اللہ تعالی کے فضل اور رزق میں شامل ہیں۔

پاکیزہ ہے وہ ذات جس کا کلام انتہائی بلیغ انداز میں اپنے تمام مقاصد ومفاہیم پر محیط ہے، جیسا کہ آیت کریمہ ﴿مِمَّا رَزَقۡنَٰكُم﴾ کے اس مختصر جملے میں بہت سارے فوائد اور معانی کا استیعاب کیا گیا ہے، انفاق کے انواع واقسام، مقدار، خرچ کرنے والے کی حیثیت، خرچ کرنے کی جگہ کی ضرورت اور جن پر کیا جائے ان کی صورت حال سب کچھ بیان کر دیا گیا، سبحان اللہ، جس کے کلام کی خصوصیت ہے دوٹوٹ میں پوری بات کہہ دینا، ساتھ ہی انداز بیان کی خوبصورتی اور فصاحت وبلاغت اور دعوت وتربیت کے اعلی اسالیب بھی اس کے کلام کا خاصہ ہیں۔

آیت کریمہ ایک مومن کو پوری سخاوت کے ساتھ خرچ کرنے پر آمادہ کر رہی ہے، اور اس کے لیے اسے قیامت کا دن یاد دلایا جا رہا ہے، فرمایا: ﴿مِّن قَبۡلِ أَن يَأۡتِيَ يَوۡمٞ لَّا بَيۡعٞ فِيهِ وَلَا خُلَّةٞ وَلَا شَفَٰعَةٞ﴾ "اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ تجارت ہے نہ دوستی نہ شفاعت "۔یہ وہ دن ہوگا جس دن بندہ اللہ کے عطا کردہ دنیاوی رزق میں سے کسی چیز کی خرید وفروخت نہیں کر سکے گا کہ اس کے بدلہ میں آخرت کی ضروریات کا سامان یعنی نیکیاں، اعلی درجات اور جنت وغیرہ خرید لے، یا اس کے

بدلے میں جہنم اور اس کے عذاب سے نجات پا جائے، وہاں پر خرید وفروخت کا کوئی مجال نہیں ہوگا: ﴿لَّا بَيۡعٌ فِيهِ﴾ "اس دن میں نہ تجارت ہے"۔ اسی طرح ﴿وَلَا خُلَّةٌ﴾ "نہ دوستی" یعنی کوئی دوستی بھی نفع نہیں دے گی کیوں کہ اس دن ساری دوستیاں ٹوٹ چکی ہوں گی ، نیز اسی طرح : ﴿وَلَا شَفَٰعَةٌ﴾ "نہ شفاعت"۔ چنانچہ کوئی شخص کسی کے حق میں اللہ تعالی کی اجازت کے بغیر شفاعت بھی نہ کر سکے گا ، یعنی کہ حساب کتاب کے اس دن دنیاوی امور کے ذریعہ آخرت کے لیے کسی قسم کے استفادہ کا سلسلہ ختم ہو چکا ہوگا، ہاں ایک مومن نے دنیا میں اپنی آخرت کے لیے جو کچھ کیا ہوگا وہی فائدہ پہنچائے گا۔ لہذا اس آیت میں آخرت کو یاد دلا کر اور تشجیع وتحذیر کے انداز میں موقع کو غنیمت جاننے پر آمادہ کیا جا رہا ہے ، یہ یا دہانی اور اسلوب بیان زندگی کے اوقات کو غنیمت سمجھنے پر آمادہ کرنے والا ہے ، کہ بندہ اس دنیا ہی میں آخرت کے لیے جتنی خرید وفروخت اور لین دین کرنا ہے کر لے۔ لیکن اس سے صرف ایک مومن ہی فائدہ اٹھا پاتا ہے ، لہذا وہ دنیا میں خوب خرچ کرتا ہے تاکہ آخرت میں اس کا نفع اس کے سامنے ہو، چنانچہ اس کے بدلے میں اللہ تعالی اس کے درجات بلند کرتا اور گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ انفاق کا یہ حکم اللہ عزیز وحکیم کی طرف سے ہے اور یہ انفاق کے اہمیت وفضیلت کی دلیل ہے ، جس کا فائدہ خرچ کرنے والے کو آخرت میں ملے گا۔ اس سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ منہج اسلام میں اس انفاق کے ذریعہ سے معاشرتی وابستگی اور افراد سماج کے احوال کی خبر گیری پر کافی توجہ دی گئی ہے تاکہ ایک مومن اپنی حیثیت کے مطابق ہر طرح سے خرچ کر کے سوسائٹی اور سماج کے افراد سے منسلک رہے۔

اس کے بعد آیت کے اخیر میں کفار کا حال بیان ہو رہا ہے، فرمایا: ﴿وَٱلۡكَٰفِرُونَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ﴾ " اور کافر ہی ظالم ہیں"۔ آیت میں ظلم کامل کو کافروں میں محصور کر دیا گیا ہے ، یعنی اس سے بڑا ظالم کوئی نہیں جس کی ملاقات اللہ تعالی سے اس حالت میں ہو کہ وہ کافر ہو، کیوں کہ انہوں نے اپنے اوپر اللہ تعالی کی نعمتوں کے ساتھ ظلم کیا اور اپنے کفر وطغیان کی وجہ سے وہ خود پر ظلم کرنے والے ہیں۔ یہ ایک مومن کے لیے بطور تحذیر ہے کہ وہ ان ظالم کافروں کی روش اختیار کرے۔

﴿ ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلۡحَيُّ ٱلۡقَيُّومُۚ لَا تَأۡخُذُهُۥ سِنَةٞ وَلَا نَوۡمٞۚ لَّهُۥ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلۡأَرۡضِۗ مَن ذَا ٱلَّذِي يَشۡفَعُ عِندَهُۥٓ إِلَّا بِإِذۡنِهِۦۚ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ أَيۡدِيهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيۡءٖ مِّنۡ عِلۡمِهِۦٓ إِلَّا بِمَا شَآءَۚ وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضَۖ وَلَا يَـُٔودُهُۥ حِفۡظُهُمَاۚ وَهُوَ ٱلۡعَلِيُّ ٱلۡعَظِيمُ ٢٥٥ ﴾

ترجمہ:

"اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ اور سب کا تھامنے والا ہے، جسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند، اس کی ملکیت میں زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں ہیں۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کرسکے، وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے مگر وہ جتنا چاہے، اس کی کرسی کی وسعت نے زمین اور آسمان کو گھیر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت سے نہ تھکتا ہے اور نہ اکتاتا ہے، وہ تو بہت بلند اور بہت بڑا ہے (۲۵۵)"۔

یہ آیت الکرسی ہے، اور یہ قرآن کریم کی سب سے افضل آیت ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: "کتاب اللہ کی کون سی آیت سب سے زیادہ عظیم ہے؟" ابی بن کعب نے کہا کہ: اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سوال کئی بار دہرایا، پھر فرمایا: "یہ آیت الکرسی ہے، نیز فرمایا: "اے ابوالمنذر! اللہ کی قسم، یہ علم تم کو مبارک ہو"(۱)۔

اس عظیم آیت الکرسی کا آغاز اللہ تعالی کے اس فرمان سے ہو رہا ہے: ﴿ ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ٱلۡحَيُّ ٱلۡقَيُّومُ ﴾ " اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ اور سب کا تھامنے والا ہے"۔ آیت کا پہلا لفظ ہی لفظ جلالہ "اللہ" ہے، اور اس میں اللہ تعالی کی وحدانیت کا بیان ہے کہ اللہ تعالی ہی معبود حقیقی ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا حقیقی معبود نہیں۔ ﴿ لَآ إِلَٰهَ ﴾ کے لفظ سے اللہ سبحانہ وتعالی کے علاوہ تمام سے معبود ہونے کی نفی کردی گئی ہے، لہذا اللہ عزوجل کے علاوہ کوئی بھی حقیقی معبود نہیں، اور اس کے علاوہ تمام مخلوقات اس سے کمتر ہیں، اس لیے عبادت صرف اسی کی ہونی چاہیے، اور جو اللہ تعالی کے

---

(١) صحيح مسلم ٥٥٦/١ حديث نمبر ٨١٠.

علاوہ کسی اور کی عبادت کرتا ہے وہ اپنے پروردگار اور خالق کا انکار کرتا ہے۔: ﴿ ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ﴾ کے اس جملہ میں عبودیت کو اللہ تعالی کی ذات میں محصور کر دیا گیا ہے ، چنانچہ آسمان وزمین میں اللہ تعالی کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے ، اور وہ ﴿ ٱلۡحَيُّ ﴾ یعنی "زندہ" ہے ، اور دوسرے لوگ موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔ مکمل حیات جاویدانی بھی اللہ تعالی کی ذات کے ساتھ منحصر ہے ، اور جب ایسا ہے تو پھر اللہ تعالی کے علاوہ تمام معبودان باطلہ موت سے دوچار ہونے والے ہیں اگر وہ معبود جاندار ہے ، اور اگر وہ جمادات میں سے ہے تو وہ سب فنا اور ہلاک ہو جائیں گے ، چنانچہ اللہ تعالی کی ذات کے سوا کوئی زندگی موت سے بری نہیں اور نہ ہی کسی شے کا وجود لازوال ہے۔

وہ اللہ: ﴿ ٱلۡقَيُّومُ ﴾ یعنی "سب کا تھامنے والا ہے"، جو سب سے بے نیاز بذات خود قائم ہے، اس کا مطلب ہوا کہ اس کے علاوہ کوئی چیز بذات خود قائم نہیں، بلکہ ہر شئے اپنے وجود وبقا کے لیے ابتداء سے لے کر بڑے ہونے ، حرکات وسکنات ، حیات ، موت وانتہا ، دوبارہ زندگی ، رزق ، صحت وعافیت اور ظاہری وباطنی تمام معمولات زندگی میں اس ذات واحد کی محتاج ہے ، چنانچہ وہی ہر مخلوق کا پیدا کرنے اور وجود بخشنے اور اس کی بقاء کے سامان مہیا کرنے والا ہے۔ اس بابرکت ذات کو: ﴿ لَا تَأۡخُذُهُۥ سِنَةٌ وَلَا نَوۡمٌ ﴾ " نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند "۔ یہ قوت وعظمت اور کمال کی صفت ہے ، کیوں کہ جس کو نیند اور اونگھ آتی ہے وہ کمزوری، تھکاوٹ اور محنت سے دوچار ہوتا ہے، اور یہ سب اللہ تعالی کی مخلوقات کے نقص والے اوصاف ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام مخلوقات اس خالق کائنات کی محتاج ہیں جس کی عظمت وجلالت شان یہ ہے کہ وہ نہ تو اونگھتا ہے اور نہ سوتا ہے ، پاک ہے وہ عظمت والی ذات۔ تعجب ہے پھر کیسے ایک مخلوق اپنی ہی جیسی ناقص الارادہ اور مختلف نقائص سے دوچار مخلوق کے در پر جاتی ہے اور کامل الارادہ ذات کی عبادت سے روگردانی کرتی ہے۔

اس کے بعد اس عظیم آیت میں اللہ تعالی کی عظیم بادشاہت کا بیان ہو رہا ہے: ﴿ لَّهُۥ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلۡأَرۡضِ ﴾ " اس کی ملکیت میں زمین اور آسمانوں کی تمام چیزیں ہیں "۔ جو کچھ بھی اس کائنات میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے ، جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام لوگ اس کے غلام ہیں ، اور غلام پر اپنے مالک کی اطاعت لازم ہوتی ہے ، لہذا کسی کو اس مالک الملک کی مرضی کے خلاف کچھ بھی تصرف کا حق

نہیں ہے اور اسی ذات کو اپنی مملکت میں سارا پاور حاصل ہے، وہ جیسے چاہتا ہے اس میں تصرف کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مملوک اپنی پیدائش، کھانے پینے، صحت وزرق، پیدائش سے لے کر موت تک کا سفر پھر موت کے بعد زندہ اٹھ کھڑے ہونا غرضیکہ ہر چیز میں اپنے مالک کا محتاج ہے۔

اس کے بعد آیت کریمہ میں بندوں پر اللہ تعالی کی سلطنت کے عظیم پاور کا بیان ہو رہا ہے: ﴿مَن ذَا ٱلَّذِى يَشۡفَعُ عِندَهُۥٓ إِلَّا بِإِذۡنِهِۦ﴾ "کون جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے"۔ آیت کے اس جزء میں سوال انکاری کا اسلوب ہے جو اپنے پیرائے میں اللہ تعالی کی کبریائی اور جلالت شان کو بیان کر رہا ہے کہ کون اس بادشاہ اور مقدس ذات کی اجازت کے بغیر اس کے پاس کسی کے لیے سفارش کرنے کی جرأت دیکھا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص اللہ تعالی کے پاس جا کر اس کی اجازت کے بغیر کسی کے حق میں سفارش نہیں کر سکتا کیوں کہ اس کی کبریائی، جلالت وعظمت، اقتدار، قوت وغلبہ اور ہیبت اس قدر ہو گی کہ کوئی اس کی ہمت ہی نہیں کر سکے گا۔ پتہ چلا کہ اس اللہ سبحانہ وتعالی کے سامنے تمام سرداروں کی سرداری اور سفارشیوں کی سفارس ماند پڑ جائے گی چاہے دنیا میں وہ جتنے بھی اعلی مقام ومرتبہ کا مالک رہا ہو ، جب تک اللہ تعالی اپنی مرضی سے جس کو چاہے اجازت نہ دے، اس سے معلوم ہوا کہ بندوں کے مقام ومرتبے انہیں کچھ بھی بے نیاز نہیں کر سکتے الا یہ کہ اللہ تعالی کی اجازت انہیں حاصل ہو جائے۔

اس کے بعد آیت عظیمہ میں اللہ تعالی کے وسعت علم کا بیان ہو رہا ہے جو کہ ہر چیز کو محیط ہے: ﴿يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ أَيۡدِيهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ﴾ "وہ جانتا ہے جو ان کے سامنے ہے جو ان کے پیچھے ہے"۔ یعنی اللہ تعالی کا علم مخلوقات کے آئندہ کے امور پر بھی محیط ہے، لیکن مخلوق کو اپنے مستقبل کی دھاراؤں کا پتہ نہیں، لیکن اللہ تعالی اس مخلوق کے مستقبل میں ہونے والے تمام امور سے باخبر ہے، اسی طرح اس کو مخلوق کے ماضی کے تمام امور سے کی بھی واقفیت ہے، جب کہ مخلوق کا حال یہ ہے کہ وہ خاص اپنے ساتھ بیتے بہت سارے امور کو فراموش کر دیتا ہے۔ اور رہی بات اس کے تمام مخلوقات کی تو وہ سب مل کر بھی اللہ تعالی کے صرف اتنا ہی علم کو جان سکتے ہیں جتنا وہ اپنی مرضی سے عطا کر دے اور بتلادے: ﴿وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيۡءٖ مِّنۡ عِلۡمِهِۦٓ إِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ "اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جتنا

چاہے"۔ چنانچہ مخلوقات کو جو بھی علم و معرفت حاصل ہے وہ اللہ تعالی کے علم کا بہت معمولی حصہ ہے اور وہ بھی اللہ کی مشیئت سے ان کو حاصل ہوا ہے۔ اس سے یہ مستفاد ہوا کہ بندہ اللہ تعالی کے علم اور اس کی حفاظت، فہم و سمجھ اور تعلیم و تعلم میں اس کا محتاج ہے، اس لیے بندے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالی سے طلب علم کی دعا کرتا رہے اور اس علم کے سمجھ کی التجاء بھی اسی اللہ سے کرے، اور جب اس کو کچھ علم حاصل ہو جائے تو اس توفیق اور تعلیم کی نسبت اللہ تعالی ہی کی طرف کرے، چنانچہ یوں کہے کہ یہ فہم و تفسیر اور حفظ استنباط سب کچھ اللہ تعالی کی توفیق سے ہے۔ کیوں کہ اگر اللہ تعالی کا کرم اور اس کی نوازش نہ ہوتی تو تھوڑا بہت جو علم اس کو حاصل ہوا ہے وہ ہرگز نہ ملتا، چاہے وہ شرعی علم ہو یا پیشہ وارانہ اور تجارت یا ان کے علاوہ کسی بھی طرح کے علم کا میدان ہو۔

آیت کریمہ اس بارے میں نص قطعی ہے کہ انسانی علوم کا دائرہ بہت محدود ہے، اور اس کو اتنا ہی علم میسر ہے جو اللہ تعالی کی طرف سے اس کو حاصل ہے، جیسا کہ فرشتوں نے کہا تھا جس کا بیان اسی سورہ کے شروع میں ہے: ﴿سُبۡحَٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ إِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَآۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلۡعَلِيمُ ٱلۡحَكِيمُ﴾ [سورة البقرة:٣٢]۔ "اے اللہ! تیری ذات پاک ہے ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا رکھا ہے، پورے علم و حکمت والا تو تو ہی ہے"۔ اور فرمان الہی: ﴿إِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ سے پتہ چلتا ہے کہ بندے علم کی مقدار میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اللہ تعالی اپنی مشیئت سے کسی کو کوئی علم کسی قدر دیتا ہے او دوسرے کو کوئی دوسرا علم اس سے مختلف مقدار میں دیتا ہے، اسی لیے لوگوں کی درجات بھی مختلف ہیں حتی کہ ہر کوئی ایک دوسرے کا محتاج ہے اور لوگوں کو باہم مشوروں کی ضرورت درپیش ہوتی ہے، اور پھر ایک ہی معاملہ میں لوگوں کی مختلف اور ایک سے بڑھ کر ایک رائیں سننے کو ملتی رہتی ہیں، اور بسا اوقات ایک کم سن ایسی رائے دے دیتا ہے جو بڑوں کے پاس نہیں ہوتی اور اسی طرح کبھی کبھی ابتدائی مرحلہ والا ایسی علمی بات کر دیتا ہے جو اس میدان کے ماہر کے پاس نہیں ہوتی، اسی لیے یہ مثل مشہور ہے: "قَدْ تَجِدُ فِي النَّهْرِ مَالَا تَجِدُهُ فِي الْبَحْرِ" یعنی بسا اوقات ندی سے ایسے قیمتی موتی برآمد ہو جاتے ہیں جو سمندر سے نہیں ملتے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم کے ساتھ باہم مشورہ کیا کرتے تھے اور یہی صحابہ کرام کا بھی معمول تھا وہ بھی ایک دوسرے سے مشورہ لیتے تھے، اور نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے کئی مواقع پر صحابہ کرام کے مشوروں پر عمل بھی کیا،اس کی ایک مثال غزوہ احد کا وہ واقعہ ہے جب کہ آپ نے باہر نکل کر یا مدینہ میں رہ کر دشمن سے مقابلہ کرنے کے متعلق لوگوں سے مشورہ طلب کیا تھا۔

اس کے بعد آیت کریمہ میں اللہ تعالی کے کرسی کی عظمت کا بیان ہے ، جس کی عظمت اللہ تعالی کے عظمت کی دلیل ہے : ﴿ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ ﴾ " اس کی کرسی کی وسعت نے زمین اور آسمان کو گھیر رکھا ہے "۔اور وہی آسمان و زمین کا محافظ ہے : ﴿وَلَا يَـُٔودُهُۥ حِفْظُهُمَا﴾ " اور اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت سے نہ تھکتا ہے اور نہ اکتاتا ہے "۔ یعنی ان کی حفاظت اس کو عاجز اور بوجھل نہیں بناتی، کیوں کہ اس کی ذات باکمال اور کامل قوت وقدرت اور عظمت واستحکام والی ہے جس نے ہر چیز کا انتہائی باریک نظام بنایا ہے اور اس کے حکم کے بغیر ایک لمحہ کے لیے وہ اس نظام سے آگے پیچھے نہیں ہوتے۔ لہذا اللہ تعالی کی اتنی عظیم مخلوقات جب اس کو عاجز نہیں کرتیں تو ان سے معمولی مخلوقات بدرجہ اولی عاجز نہیں کر سکتیں ، اس سے پتہ چلا کہ مخلوق اللہ تعالی کے حفاظت کی محتاج ہے ،اور اس کا تقاضا ہے کہ ایک مسلمان اللہ تعالی سے دعا گو ہو کہ وہ ہر آن اور لمحہ موذی جانوروں اور جن وانس کے شر سے اس کے جان ومال ، دین وعقل اور اہل وعیال اور اس کے تمام امور کی حفاظت فرمائے۔اسی لیے احادیث مبارکہ میں بہت ساری دعائیں اور ذکر واذکار وارد ہیں جنہیں اپنی حفاظت کی غرض سے سونے کے وقت اور صبح وشام میں پڑھنے کا حکم ہے ، کیوں کہ بندہ اپنے رب العامین کی حفظ ورعایت کا بہت ہی زیادہ محتاج ہے۔

اس عظیم آیت کا اختتام اللہ تعالی کے اس ارشاد سے ہو رہا ہے: ﴿وَهُوَ ٱلْعَلِيُّ ٱلْعَظِيمُ ﴾ " وہ تو بہت بلند اور بہت بڑا ہے "۔اس میں اس بات کا بیان ہے کہ اللہ تعالی کی ذات اس کی ہر ایک مخلوق سے بالا تر ہے اور دوسری تمام چیزیں اس کے تابع ہیں ، وہ مکان کے اعتبار سے سب سے بالا تر ہے اور مقام مرتبہ ، اسماء وصفات اور قدرت واحاطہ کے اعتبار سے بھی ، تمام چیزیں اس کے سامنے سرنگوں اور اس کی قدرت واقتدار کے ماتحت ہیں۔اس کی دوسری صفت: ﴿ٱلْعَظِيمُ ﴾ ہے جو عظمت وقوت اور قدرت کی تمام صفات کی جامع ہے ۔اس سے مستفاد ہوا کہ بندہ اللہ تعالی کی عظمت وقدرت کا کافی محتاج ہے تا کہ وہ

اپنے تمام معاملات میں اسی کی طرف رجوع کرے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کی عظمت اور کبریائی چھیننے کی کوشش نہ کرے، کیوں کہ اس عظیم خالق کے سامنے اس کی حیثیت ایک انتہائی کمزور مخلوق کی ہے۔

﴿لَآ إِكۡرَاهَ فِي ٱلدِّينِۖ قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشۡدُ مِنَ ٱلۡغَيِّۚ فَمَن يَكۡفُرۡ بِٱلطَّٰغُوتِ وَيُؤۡمِنۢ بِٱللَّهِ فَقَدِ ٱسۡتَمۡسَكَ بِٱلۡعُرۡوَةِ ٱلۡوُثۡقَىٰ لَا ٱنفِصَامَ لَهَاۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾ ٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ يُخۡرِجُهُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِۖ وَٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ أَوۡلِيَآؤُهُمُ ٱلطَّٰغُوتُ يُخۡرِجُونَهُم مِّنَ ٱلنُّورِ إِلَى ٱلظُّلُمَٰتِۗ أُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِۖ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٥٧﴾﴾

ترجمہ:

"دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت ضلالت سے روشن ہو چکی ہے، اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے(۲۵۶)۔ ایمان لانے والوں کا کارساز اللہ تعالیٰ خود ہے، وہ انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے اور کافروں کے اولیا شیاطین ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں یہ لوگ جہنمی ہیں جو ہمیشہ اسی میں رہیں گے(۲۵۷)"۔

یہاں سے قرآن کا سیاق اسلام قبول کرنے اور اس میں داخلہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے دعوتی منہج کے بیان میں ہے جس کی جانکاری ہر مومن کے لیے ضروری ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَآ إِكۡرَاهَ فِي ٱلدِّينِ﴾ " دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں"۔ آیت کریمہ کا آغاز اس توجیہ وارشاد سے ہے جس میں قبول اسلام کے معاملہ میں کسی پر بھی زور زبردستی کرنے سے روکا گیا ہے کیوں کہ وہ سارے اسباب موجود ہیں جن کی بنا پر کسی سے زبردستی نہیں کی جاسکتی اور ان اسباب کے ہوتے ہوئے ہر شخص کو خود سے اسلام قبول کر لینا چاہیے، کیوں کہ: ﴿قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشۡدُ مِنَ ٱلۡغَيِّ﴾ " ہدایت ضلالت سے روشن ہو چکی ہے"۔ راغب اصفہانی رشد کا معنی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ غیّ کی ضد ہے اور رشد سے مراد ہدایت ہے اور غیّ فاسد عقیدے پر مبنی جہالت کا نام ہے[1]۔ آیت کریمہ میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ جو

(۱) المفردات في غريب القرآن ۱۹٦.

جہالت دخول اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی وہ اب ختم ہو چکی ہے کیوں کہ اللہ تعالی کا دین ہر ایک کے لیے بالکل واضح اور روشن ہو چکا ہے، اور یہ دین اللہ تعالی کے طرف سے نازل شدہ ہے، اس میں وہ سارے دلائل و براہین موجود ہیں جن کے ہوتے اس دین کے بارے میں شک وشبہ اور لاعلمی یا اس دین کے برعکس شرک و کفر سے عدم واقفیت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اور ہدایت ضلالت سے روشن ہو چکی ہے۔

﴿قَد تَّبَيَّنَ ٱلرُّشۡدُ مِنَ ٱلۡغَيِّ﴾ " ہدایت ضلالت سے روشن ہو چکی ہے"۔ اللہ تعالی کے اس فرمان سے یہ مستفاد ہوا کہ جب نیکی کا ظہور ہوتا ہے تو فساد خود بخود واضح ہو جاتا ہے اور پھر حق دوسروں کے لیے روشن ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ منہج اسلام پر قائم صحیح نمونہ مفسدین کے فساد کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے، کیوں کہ موجودہ زمینی حقائق زبانی حقائق کے بالمقابل زیادہ کارگر اور مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالی: ﴿لَآ إِكۡرَاهَ فِي ٱلدِّينِ﴾ " دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں"۔ اس میں دعوت کا ایک اصول متعین کر دیا گیا ہے، جس کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنے قول و عمل سے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کریں، اور جبرا اسلام کو کسی پر تھوپنے کی کوشش نہ کریں، کیوں کہ اسلام کا جوہر اپنے تمام تر دلائل و مناہج سمیت از خود من جانب اللہ ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس میں اس کے بہت سارے دلائل و براہین اور ثبوت موجود ہیں، نیز اس کا اخلاقی اور اجتماعی طرز حیات اور عقائد و عبادات اور معاملات میں اس کے احکامات اور اپنے تمام مشمولات و مضامین اس کے حقانیت کی دلیل ہیں، لہذا دعوت کے لئے اس دین کا صرف واضح بیان ہی اس میں کسی کے خود اپنی رغبت اور پسند سے داخل ہونے کے لیے کافی ہے
۔

اس کے بعد اللہ تعالی نجات کا راستہ بیان کر رہا ہے: ﴿فَمَن يَكۡفُرۡ بِٱلطَّٰغُوتِ وَيُؤۡمِنۢ بِٱللَّهِ فَقَدِ ٱسۡتَمۡسَكَ بِٱلۡعُرۡوَةِ ٱلۡوُثۡقَىٰ لَا ٱنفِصَامَ لَهَاۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾" اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ نجات کا پہلا راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کے سوا تمام جھوٹے معبوں کا انکار کیا جائے: ﴿فَمَن يَكۡفُرۡ بِٱلطَّٰغُوتِ﴾ اللہ تعالی کے علاوہ

جتنے بھی معبود ہیں وہ سب طاغوت ہیں۔ نجات کا دوسرا راستہ اللہ تعالی پر ایمان ہے: ﴿وَيُؤْمِنۢ بِٱللَّهِ﴾ "اللہ پر ایمان لائے" اللہ تعالی پر ایمان ایک مضبوط کڑا ہے کیوں کہ ایمان باللہ کا تقاضا ہے کہ ایک مومن اللہ کی شریعت کا پابند بن کر رہے، اس لیے اس ایمان باللہ کے نتیجہ میں وہ اس مضبوط کڑے کو تھام لیتا ہے، فرمایا: ﴿فَقَدِ ٱسْتَمْسَكَ بِٱلْعُرْوَةِ ٱلْوُثْقَىٰ لَا ٱنفِصَامَ لَهَا﴾" اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا"۔ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی اس نے دین کو پوری مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا ہے، اور اس دین کو مضبوط کڑے سے تشبیہ دی گئی ہے، ایسا مضبوط کڑا جو خود سے کبھی ٹوٹ نہیں سکتا جو انتہائی مضبوط و مستحکم اور قوی ہے اور اس کا جوڑ بھی کافی مضبوط ہے، مجاہد کہتے ہیں کہ العروۃ الوثقی سے مراد ایمان ہے۔ سدی کے نزدیک اس سے مراد اسلام ہے۔ اور سعید بن جبیر اور ضحاک کا کہنا ہے کہ اس سے مراد کلمہ توحید لا الہ الا اللہ ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ العروۃ الوثقی قرآن ہے ، اور سالم بن الجعد سے روایت ہے کہ اس سے مراد الحب فی اللہ والبغض فی اللہ (یعنی اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے نفرت) ہے۔ یہ سارے اقوال درست ہیں ان کے مابین کوئی تعارض و ٹکراؤ نہیں(۱)۔ اور یہ کلام الہی کے عظمت کی دلیل ہے کہ کیسے اس کا کلام ان تمام معانی و مفاہیم کو محیط ہے اور صرف العروۃ الوثقی کا یہ مختصر لفظ ان تمام مفاہیم و معانی کو سموئے ہوئے ہے۔ سبحان اللہ، یقیناً اس کا کلام اپنے مراد و مقاصد کا انتہائی بلیغ اور عظیم الفاظ میں استعاب کئے ہوئے ہے، بندوں کے رب کی اعلی شان کے حساب سے اس کے کلام کے الفاظ بھی اتنے ہی اعلی ہیں، لہذا تمام تعریفیں اور حمد و ثنا اسی اللہ رب العالمین کے لائق ہے۔

اس کے بعد وضاحتی بیان، علم و تعلیم اور عظیم نصیحت کے ساتھ آیت ختم ہو رہی ہے، ارشاد الہی ہے: ﴿وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾" اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ وہ بندوں کی ساری باتیں سنتا اور تمام کارناموں کو جانتا ہے، ایک سمجھدار بندہ صفات الہیہ کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھتا ہے، بنا بریں وہ ہمہ وقت اللہ تعالی کے مراقبہ میں رہتا ہے اور اس کی نافرمانیوں سے بچتے ہوئے اس کی اطاعت کے کام کرتا ہے، کیوں کہ وہ جہاں کہیں اور جس حال میں بھی ہو اللہ تعالی کی ذات اسے سن رہی ہوتی ہے، اور اس سے

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۳۱۹/۱.

صادر ہونے والے تمام اچھے برے امور سے واقف ہوتی ہے، لہذا ضروری ہے کہ بندہ صحیح راہ پر قائم رہے، یہی چیز رحمت الہی، کرم ونوازش اور احسان کا باعث ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اپنے مومن ولیوں کے ساتھ اپنی عنایت اور اصول بیان کررہا ہے اور ساتھ ہی طاغوت کے ہمنوا کفار کے کی روش کو بھی بیان کررہا ہے، تاکہ آدمی دونوں راستوں کے فرق اور ہر راستے کے رخ سے آگاہ ہوجائے، فرمایا: ﴿ٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ يُخۡرِجُهُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ﴾" ایمان لانے والوں کا کارساز اللہ تعالی خود ہے، وہ انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال لے جاتا ہے "۔ اللہ نے یہ واضح کردیا کہ وہ مومنوں کا ولی اور کارساز ہے، اس کی رہنمائی، تائید اور توفیق ان مومنوں کے ساتھ ہوتی ہے، یہاں تک کہ وہ انہیں کفر و شرک اور جہالت وشر کی تمام تاریکیوں سے نکال کر ہدایت، عقیدہ، اخلاق اور شرعی احکامات کے بارے میں اسلام کی روشنی دیکھاتا ہے تاکہ نعمتوں والی جنت تک ان کی رسائی کرائے۔ رہے کفار ومشرکین تو ان کے اولیاء اللہ تعالی کے سوا ان کے جھوٹے معبود ہیں، جیسا کہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ أَوۡلِيَآؤُهُمُ ٱلطَّٰغُوتُ يُخۡرِجُونَهُم مِّنَ ٱلنُّورِ إِلَى ٱلظُّلُمَٰتِ﴾"اور کافروں کے اولیا شیاطین ہیں۔ وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں "۔ اللہ تعالی نے دونوں قسم کے لوگوں کے بیچ مقارنہ کرکے کفار اور ان کے اولیاء جن کی اللہ تعالی کے سوا عبادت کی جاتی ہے کے معاملہ کو بالکل واضح کردیا اور بتلادیا کہ ان کا معاملہ مومنوں کے بالکل برعکس ہے، کیوں کہ ان کے یہ سارے طاغوت ان کو اسلام کی ہدایت وروشنی اور سکون واطمینان سے دور کرکے کفر اور بدبختی کی تاریکیوں میں ڈھکیل دیتے ہیں، اور اس کی وجہ سے وہ مزید بدبختی اور قیامت کے دن کے عذاب تک پہنچ جاتے ہیں، کیوں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے: ﴿أُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِۖ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ﴾" یہ لوگ جہنمی ہیں جو ہمیشہ اسی میں رہیں گے "۔ معلوم ہوا کہ کافروں کا ٹھکانا ہمیشگی کے جہنم ہے اور اس جہنم سے صرف اللہ تعالی کا دین ہی نجات دلا سکتا ہے، اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا دین باعث نجات نہیں ہے۔

اس سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ اللہ تعالی کا دین اپنی کامل شریعت کے ساتھ ایک نور ہے اور یہی نور آخرت کے نور اور اس کی نعمتوں تک لے جانے والا ہے۔ اس کے برعکس کفر تاریکی ہے اور یہ تاریکی

آخرت کی تاریکی اور عذاب الیم تک لے جاتی ہے۔ یقینا مومن ایک عظیم نور میں جیتا ہے اور کافر فکر وطبیعت اور زندگی کی گھٹاٹوپ تاریکی میں۔ اگرچہ بظاہر انہیں دنیاوی آلائش اور لذتیں مل جائیں لیکن ان کی اندرونی کیفیت شقاوت وبدبختی والی اور شکستہ خوردہ رہتی ہے۔

نیز آیت کریمہ کے سیاق اور اس کے منہج ومفاہیم سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ تعلیم، دعوت ، توجیہ وارشاد اور کسی کو قائل کرنے کے لیے دو متضاد چیزوں میں مقارنہ کا طریقہ کار کافی اہمیت کا حامل ہے ، اس سے مقابل کی تصویر کھل کر واضح ہو جاتی ہے اور پوری وضاحت کے ساتھ دونوں چیزوں کی حقیقت سامنے آجاتی ہے ، اور سامنے والا معاملات کو اچھی طرح سمجھ جاتا ہے ، نیز مقارنہ کے اس عمل سے عقل و فکر اور تامل و تمحیص کو جلاء ملتی ہے ، کیوں کہ مقارنہ میں مخاطب کو واضح علم کے ذریعہ اصل حقائق سے روشناس کرانا مقصود ہوتا ہے ، تاکہ اس سے جہالت کا ازالہ ہو اور ہر قسم کے شکوک و شبہات سے پاک وصاف حقیقت کا علم ہو۔

﴿ٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟﴾ " ایمان لانے والوں کا کارساز اللہ تعالیٰ خود ہے"۔ اس جملہ میں ترغیبی پہلو ہے اور اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے جس کا کار ساز اللہ تعالی ہے اور یہ اس کا فضل ہے ، یہ انتہائی اعلی شرف ومنزلت ہے کہ اللہ تعالی اپنی قوت و حفاظت ، ہدایت واقتدار اور رحم وکرم کے ذریعہ مومن کا ولی اور کارساز ہے۔ عملی میدان میں اس سے یہ مستفاد ہوا کہ نصرت وتائید اور ساتھ دینا انتہائی اہمیت رکھتا ہے ، کیوں کہ کسی کا تعاون انسان کو اس کے اپنے عمل کی انجام دہی پر آمادہ کرتا ہے اور کسی طرح کی پسپائی یا شکستہ دلی سے دور رکھتا ہے ، چاہے وہ شر وفساد سے بچاؤ کا مجال ہو یا حصول منفعت کا ، اور چاہے افراد واقسام کے اداراتی امور سے اس کا تعلق ہو یا ان کے علاوہ دیگر امور سے ، کیوں کہ آپسی تعاون میں اللہ تعالی کے حکم سے خیر و بھلائی ہی ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِى حَآجَّ إِبْرَٰهِـۧمَ فِى رَبِّهِۦٓ أَنْ ءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّىَ ٱلَّذِى يُحْىِۦ وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا۠ أُحْىِۦ وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَأْتِى بِٱلشَّمْسِ مِنَ ٱلْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ ٱلْمَغْرِبِ فَبُهِتَ ٱلَّذِى كَفَرَ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿٢٥٨﴾﴾

ترجمہ:

"کیا تونے اسے نہیں دیکھا جو سلطنت پا کر ابراہیم (علیہ السلام) سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑ رہا تھا، جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے، وہ کہنے لگا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ اللہ تعالی سورج کو مشرق کی طرف سے لے آتا ہے تو اسے مغرب کی جانب سے لے آ، اب تو وہ کافر بھونچکا رہ گیا، اور اللہ تعالی ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا (۲۵۸)"۔

قرآن کریم کے اس سیاق میں ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے ساتھ واقع ہونے والے قصوں میں سے ایک قصے کا بیان ہے، یہ وہ قصہ ہے جس میں ایک ظالم وجابر اور سرکش بادشاہ کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کے موقف کو بیان کیا جارہا ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿ أَلَمۡ تَرَ إِلَى ٱلَّذِی حَآجَّ إِبۡرَٰهِـۧمَ فِی رَبِّهِۦۤ أَنۡ ءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلۡمُلۡكَ ﴾ " کیا تونے اسے نہیں دیکھا جو سلطنت پا کر ابراہیم (علیہ السلام) سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑ رہا تھا"۔ یہ آیت کریمہ تقریری سوال کے صیغے کے ساتھ لائق توجہ اسلوب میں وارد ہوئی ہے، اور یہ سوال ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ہونے والے حادثے کے متعلق ہے جس میں بادشاہ وقت نے اللہ تعالی کے وجود کے بارے میں ابراہیم سے بحث ومباحثہ اور کٹ حجتی کی تھی۔ ہوا یوں کہ وہ بادشاہ اپنے علاوہ کسی کے رب کا منکر تھا، اسی واقعہ کا منظر یہاں پیش کیا جارہا ہے ایسے انداز میں کہ گویا تم نے اس واقعہ کو خود دیکھا ہو، کیوں کہ اللہ تعالی کی خبر حقیقت پر مبنی ہوتی ہے اور اس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، اس کی خبر عینی مشاہدہ کا درجہ رکھتی ہے، اور (ألم تر) کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ کیا آپ کے علم میں یہ بات نہیں پہنچی؟۔ یہاں پر توجہ اس لیے مبذول کرائی جارہی ہے تاکہ قرآن کی آیات کا سننے والا ان اخبار کو خود جان جائے اور ابراہیم علیہ السلام اور جابر بادشاہ کے درمیان بحث وتکرار کے ان دلائل وبراہین کے ذریعہ حجت قائم ہو جائے۔

آیت کریمہ کے من جملہ فوائد میں سے یہ بات بھی ہے کہ اللہ تعالی نے اس بادشاہ کو بادشاہت عطا کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے: ﴿أَنۡ ءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلۡمُلۡكَ ﴾ "اللہ تعالی نے اس کو سلطنت عطا کی"۔ پتہ یہ چلا کہ انسان کو کم یا زیادہ جو کچھ بھی میسر ہو وہ سب اللہ تعالی کا عطا کردہ ہے اور سب میں اس کی حکمت ہے جس کو وہی جانتا ہے ، کیوں کہ وہ علیم وحکیم ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالی جس کو

بھی چاہتا ہے نوازتا ہے یہاں تک کہ کافروں اور نافرمانوں کو بھی اللہ تعالی اپنی حکمت اور قدرت سے عطا کرتا ہے ، نیز یہ بھی مستفاد ہوا کہ اللہ تعالی کی کسی پر نوازشوں کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالی اس سے خوش اور رضامند ہے اور اسی کے برعکس اگر کسی کو نہ دے تو یہ اس کے ناراضگی کی دلیل بھی نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالی کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ کسی کو عطا کرتا ہے اور کسی کو محروم رکھتا ہے۔

آیت کریمہ میں اللہ تعالی اس آدمی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرا رہا ہے جس کو اس نے سلطنت عطا کی تھی، کتب تفسیر میں مذکور ہے کہ اس سے مراد سرزمین بابل کا بادشاہ نمرود بن کنعان ہے ۔اور مجاہد کا قول ہے کہ چار لوگوں کو مشرق سے لے کر مغرب تک پوری دنیا کی بادشاہت ملی، ان چاروں میں سے دو مومن تھے اور دو کافر۔ دو مومن سلیمان بن داؤد علیہ السلام اور ذوالقرنین تھے ، اور دو کافر نمرود اور بختنصّر تھے ، واللہ تعالی اعلم (۱)۔ یہ بادشاہ اپنے سوا کسی کو رب نہیں مانتا تھا، یعنی اس بادشاہ کی حالت صرف یہی نہیں تھی وہ کافر تھا بل کہ اس پر کبر وغرور، شر وفساد اور بادشاہت کا گھمنڈ اس حد تک سوار تھا کہ وہ بذات خود رب ہونے کا دعویدار تھا اور یہ کہ اس کے سوا کوئی دوسرا رب نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالی کی عطا کردہ چیزوں پر کبر وغرور اور سرکشی انتہائی خطرناک روش ہے اس سے انسان غرور اور پھر تعلی پر اتر آتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ وہ اپنے تئیں ایسے دعوے کرنے لگتا ہے جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس واقعہ میں اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام نے اسی باطل دعوے کی تردی کی ہے، فرمان الہی ہے: ﴿إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ " جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے"۔ چنانچہ ابراہیم نے اس نمرود کی ربوبیت کا انکار کرتے ہوئے ثابت کیا کہ میرا رب وہ ہے جو ساری اپنی مخلوقات کا یکتا خالق ہے، وہی جلاتا اور مارتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالی کی سب سے واضح تدبیر کا ذکر کیا، لیکن اس بادشاہ نے اس کی تردید کردی اور کہنے لگا: ﴿أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ﴾ " میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں "۔ اس کی مراد یہ تھی کہ وہ جس کو چاہتا ہے قتل کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے زندہ چھوڑ دیتا ہے۔ یہ محض اس کی حیلہ سازی اور عیاری تھی جس کے ذریعہ وہ حقیقی اور مطلوبہ جواب سے کنارہ کھینچ رہا تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بالادستی اور عناد

---

(۱) تفسير ابن كثير ۱/ ۳۲۰.

پرستی اس کا مقصد رہا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ اس قدر حیلہ ساز اور مکار ہوتے ہیں جو اپنی حیلہ سازویوں سے کمزور عقل وفکر کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں ،اس لیے ایک مناظر کے لیے درمیان مناظرہ بہت زیادہ احتیاط اور اللہ تعالی سے استعانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالی نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کی مدد فرمائی اور ابراہیم علیہ السلام نے فورا دوسری دلیل پیش کر دی اور یہ ایسا سلوب تھا جس میں کوئی گڈ مڈ نہیں ہو سکتا تھا، اللہ تعالی ابراہیم علیہ السلام کی زبانی بیان فرماتا ہے: ﴿قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَأْتِى بِٱلشَّمْسِ مِنَ ٱلْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ ٱلْمَغْرِبِ﴾ " ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی طرف سے لے آتا ہے تو اسے مغرب کی جانب سے لے آ"۔ یہ بحث ومباحثہ کا وہ مقام تھا جہاں اب کوئی گڈ مڈ نہیں ہو سکتا تھا۔ ﴿فَبُهِتَ ٱلَّذِى كَفَرَ﴾ " اب تو وہ کافر بھونچکا رہ گیا"۔ چنانچہ اس کی ساری دلیلیں ماند پڑ گئیں اور آگے کچھ نہ بول سکا، کیوں کہ وہ سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کی جگہ کو تبدیل ہی نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ یہ چیز تو تمام لوگوں پر بالکل واضح ہے۔

اس کے بعد آیت کریمہ کے اخیر میں ہر ظالم کا نتیجہ بیان کیا جارہا ہے: ﴿وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّـٰلِمِينَ﴾ " اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا"۔ چنانچہ اللہ تعالی ظالم کو حجت ودلیل کا الہام نہیں کرتا، کیوں کہ اس کے پاس اصلا کوئی دلیل ہی نہیں ہوتی، اور جو چیز سرے سے موجود ہی نہ اس کی ہدایت وتوفیق کی مدد کیسے ممکن ہے۔ ظالم کو ہدایت نہ ملنا ایسا معاملہ ہے جس کے ضمن میں ہر قسم کے ظلم سے بچنا شامل ہے اگرچہ کوئی اپنے ظلم وبربریت کی وجہ سے غالب ہی کیوں نہ ہو لیکن اللہ تعالی اس کو ہدایت نہیں دیتا اور اس کو ایسے مقامات پر ذلیل ورسوا کرتا ہے جس کی کڑواہت نصرت وغلبہ کے موقع پر حاصل ہونے والی مٹھاس سے زیادہ سخت ہوتی ہے اور یہ کڑواہٹ اس کے لیے کافی سخت ہوتی ہے۔ ظلم کے تمام طبقات میں ظالموں کے حوداث وواقعات پر غور کرنے والے کے سامنے اس کی بہت ساری مثالیں ہیں۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ظلام سے اور ظلم کو ہم سے دور رکھے۔

﴿أَوْ كَٱلَّذِى مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِىَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْىِۦ هَـٰذِهِ ٱللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ ٱللَّهُ مِا۟ئَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُۥ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِا۟ئَةَ عَامٍ فَٱنظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَٱنظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ ءَايَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَٱنظُرْ

إِلَى ٱلۡعِظَامِ كَيۡفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكۡسُوهَا لَحۡمٗاۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُۥ قَالَ أَعۡلَمُ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٞ ﴿٢٥٩﴾ ﴾

ترجمہ:

"یااس شخص کے مانند کہ جس کا گزراس بستی پر ہوا جو چھت کے بل اوندھی پڑی ہوئی تھی وہ کہنے لگا اس کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ اسے کس طرح زندہ کرے گا ، تو اللہ تعالیٰ نے اسے مار دیا سو سال کے لیے، پھر اسے اٹھایا، پوچھا کتنی مدت تم پر گزری؟ کہنے لگا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ، فرمایا بلکہ تو سو سال تک رہا پھر اب تو اپنے کھانے پینے کو دیکھ کہ بالکل خراب نہیں ہوا اور اپنے گدھے کو بھی دیکھ، ہم تجھے لوگوں کے لئے ایک نشانی بناتے ہیں تو دیکھ کہ ہم ہڈیوں کو کس طرح اٹھاتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں، جب یہ سب ظاہر ہو چکا تو کہنے لگا میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے(۲۵۹)"۔

یہ بھی ایک مثال ہے جس کا عطف سابقہ مثال پر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ظالم وجابر بادشاہ کو لاجواب کر کے ابراہیم علیہ السلام کی ٹھوس دلائل وبراہین کے ذریعہ سے مدد فرمائی۔ چنانچہ اس مثل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ أَوۡ كَٱلَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرۡيَةٖ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا ﴾" یااس شخص کے مانند کہ جس کا گزراس بستی پر ہوا جو چھت کے بل اوندھی پڑی ہوئی تھی"۔یعنی کیا آپ نے اس جیسے کو دیکھا ہے جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑ رہا تھا ،اوراس وہ شخص جس کا گزرا یک بستی سے ہوا جو اپنے باشندوں سے خالی بالکل ویران پڑی تھی، ﴿خَاوِيَةٌ﴾ کے معنی خالی کے ہیں۔ وہ بستی اپنے جھت کے بل برباد ہو چکی تھی اوراس کے در ودیوار اور چھت سب کچھ گرے ہوئے تھے ،وہ شخص حیران کھڑا اس بستی والوں کے حالات اوراس کی بربادی، دوبارہ پھر سے اس کی تعمیر کی صعوبت کے بارے میں سوچ رہا تھا، وہ بستی جو کبھی عالشان عمارتوں سے معمور تھی اور لوگ اپنی خرید وفروخت اور تعمیر وترقی کے لیے اس میں بود باش کر رہے تھے، لیکن بالآخر وہی بستی ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہو گئی،اس غور فکر کے نتیجے میں وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے متعلق شک وشبہ کا شکار ہو گیا اور کہنے لگا: ﴿ أَنَّىٰ يُحۡيِۦ هَٰذِهِ ٱللَّهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ﴾"اس کی موت کے بعد اللہ تعالیٰ اسے کس طرح زندہ کرے گا"۔اس

شخص کا یہ کہنا کہ اللہ تعالی اسے کیسے زندہ کرے گا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شخص اللہ تعالی پر ایمان رکھتا تھا اور وہ نمرود کی طرح اللہ کا منکر نہیں تھا، البتہ اس نے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت الہی پر شک کیا، اور اسی شک اور احیاء کے بعید سمجھنے کی بنیاد پر اس نے یہ بات کہی تھی۔ ﴿فَأَمَاتَهُ ٱللَّهُ مِاْئَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُۥ﴾ " تو اللہ تعالی نے اسے مار دیا سو سال کے لیے، پھر اسے اٹھایا"۔ جب وہ سیدھا اٹھ کھڑا ہوا تو اللہ تعالی نے فرشتے کے واسطے سے اس سے کہا(۱): ﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتَ﴾ " پوچھا کتنی مدت تم پر گزری"؟ یہ سوال اس سے غور و فکر کرانے اور ماضی کے گزرے واقعات کی یاد لوٹانے کے لیے تھا، کیوں کہ اللہ تعالی نے شروع ہی میں فوراً سب کچھ بتلا نہیں دیا، بلکہ پہلے اس سے سوال کیا، اور اس سوال کرنے میں بہت سارے فوائد ہیں: مثلاً اس کو آگاہی، جواب کے متعلق پوچھے جانے والے کی عاجزی کا بیان، اس کی خود اپنی ذات کے متعلق لاعلمی اور اپنے حالات پر عدم قدرت کا بیان، تاکہ موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر اللہ تعالی کی قدرت کا اس کو علم ہو جائے اور وہ جان لے کہ یہ کام اللہ تعالی کے لیے بہت آسان ہے، اور مخلوق کی عاجزی کا موازنہ خالق کی قدرت سے نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ اس خالق کی ذات بہت عظیم اور قدرت والی ہے، اور مخلوق ہر طرح سے تمام معاملات میں کمزور اور عاجز واقع ہوئی ہے الا یہ اللہ تعالی کی توفیق و مدد اور لطف کرم اس کے شامل حال ہو۔ اسی لیے اس شخص کو اپنے ناقص علم مطابق جو جواب بن پڑا فرشتے کو دے دیا، چنانچہ اس سوال کا جواب میں اس نے کہا: ﴿لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ " ایک دن یا دن کا کچھ حصہ"۔ یعنی موت کی حالت میں اس کی عدم موجودگی اس کے گمان میں ایک دن یا دن کے کچھ حصے سے زیادہ نہیں تھی، یہ اس کا ادھورا اندازہ تھا جس میں اللہ تعالی کی عظیم قدرت اور وسیع علم کامل کی دلیل ہے۔ اب یہاں اللہ تعالی کی طرف سے جواب آرہا ہے تاکہ اس کا گہرا اثر اس کے دل اور حالت پر پڑے: ﴿قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِاْئَةَ عَامٍ﴾ " فرمایا بلکہ تو سو سال تک رہا "۔ حتمی طور پر اس خبر کا اس پر بڑا اثر پڑا ہوگا۔ پھر اللہ تعالی کی طرف سے اس کے لیے بیان کا سلسلہ جاری ہے تاکہ وہ اور اس کے بعد آنے والے دوسرے لوگوں کے لیے یہ واقعہ باعث نصیحت ہو اور بعث و جزاء پر اللہ تعالی کی قدرت کا یقین رکھیں، چنانچہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿فَٱنظُرْ إِلَىٰ

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۳۲۲.

طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ﴾" پھر اب تو اپنے کھانے پینے کو دیکھ کہ بالکل خراب نہیں ہوا "۔اللہ تعالی نے ایک دیکھی جانے والی چیز یعنی کھانے کی طرف اس کی توجہ دلائی جو اتنا لمبا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی بالکل نہیں بدلا،تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ تغیر و تبدیلی کا یہ اصول اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے ،چنانچہ اگر اللہ تعالی کا ارادہ کسی چیز کو ایک لمبی مدت کے باوجود نہ بدلنے کا ہو تو اللہ رب العالمین کی مشیئت سے ایسا بالکل ہو سکتا ہے ،اور وہ چاہے تو دوسری چیزوں کو بدل کر ریزہ بنادے، یہ سب اللہ خالق وعزیز وکریم کی مشیئت پر منحصر ہے۔اس کے بعد اللہ تعالی نے اس شخص کی توجہ اس کے گدھے کی طرف کی، فرمایا: ﴿وَٱنظُرۡ إِلَىٰ حِمَارِكَ ﴾" اور اپنے گدھے کو بھی دیکھ "،جو بوسیدہ اور سڑ گل گیا ہے،اور اس کی صرف ہڈیاں رہ گئی ہیں، یہ موت اور فنا کی قطعی دلیل اس کے سامنے پڑی تھی ، تاکہ بعد میں وہ دیکھے کہ اللہ تعالی کس طرح اس کی آنکھوں کے سامنے اسے دوبارہ زندہ کر رہا ہے اور کیسے اس میں زندگی دوڑ جارہی ہے۔ کھانے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی جب کہ وہ بہت جلد وقت کے ساتھ بدبو دار ہو کر ختم ہو جاتا ہے،اور سورج کی گرمی اور وقت کے گزرتے زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہتا،اس کے برعکس گدھا ممکن ہے سو سال تک زندہ رہ بھی جائے ،چنانچہ دونوں چیزوں میں اللہ تعالی کی تقدیر نے انسان کے عام تصور وگمان کے برعکس کام کیا،تاکہ اس کو اللہ تعالی کی عظیم قدرت کا یقین ہو جائے یہاں تک کہ تخلیق کائنات کے قوانین ونظام جس کو اللہ تعالی نے ہی بنایا ہے اس کی تبدیلی بھی اللہ تعالی کی قدرت میں ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی بیان کر رہا ہے کہ جو کچھ تم سے یا تمہارے لیے ہوا یہ تم سے بعد میں آنے والوں کے لیے بطور عبرت اور نشانی ہے: ﴿وَلِنَجۡعَلَكَ ءَايَةٗ لِّلنَّاسِۖ ﴾" ہم تجھے لوگوں کے لئے ایک نشانی بناتے ہیں "۔تاکہ لوگوں کے لیے موت کے بعد زندہ کرکے دوبارہ اٹھانے پر اللہ تعالی کی قدرت کی یہ ایک نشانی ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالی اس زندہ ہونے والے شخص کی توجہ اس کے گدھے کے زندہ کرنے کے عمل کی طرف دلا رہا ہے جو گدھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے بوسیدہ حالت میں پڑا تھا اور سوائے ہڈیوں کے اس میں کچھ باقی نہیں بچا تھا، فرمایا: ﴿وَٱنظُرۡ إِلَى ٱلۡعِظَامِ كَيۡفَ نُنشِزُهَا ﴾" تو دیکھ کہ ہم

ہڈیوں کو کس طرح اٹھاتے ہیں"۔یعنی زندہ کرنے کے لیے ہم کس طرح سے بعض کو بعض سے جوڑنے کے لیے اوپر اٹھاتے ہیں۔ آیت میں (نشز) کے معنی اٹھانے کے ہیں (۱) ۔یعنی اپنی جگہ سے بکھری ہدیوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر جوڑی جارہی ہیں اور پھر وہ اپنی پرانی ترتیب پر آرہی ہیں۔﴿ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا﴾" پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں"۔ ہدیوں کے اٹھانے اور ترتیب دینے کے بعد اس پر گوشت چڑھے گا، تاکہ اللہ تعالی دوبارہ اس میں زندگی لوٹادے۔﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُۥ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ﴾" جب یہ سب ظاہر ہوچکا تو کہنے لگا میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔ موت کی حالت اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے کے عمل دیکھ کر اس کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا جس میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔﴿قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ﴾" کہنے لگا میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔اس میں اس شخص کی جانب سے ہر چیز کے بارے میں اللہ کی قدرت کاملہ کا اعتراف ہے، اس نے صرف یہ نہیں کہا کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالی زندہ کرنے پر قادر ہے، بلکہ اس کے علم ویقین اور اللہ تعالی کی قدرت پر ایمان کا دائرہ ہر چیز کے لیے وسیع ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ کسی ایک چیز میں اللہ تعالی کی قدرت کے یقین سے دوسری چیزوں پر بھی اس کی قدرت کا یقین ہو جاتا ہے ، جیسا کہ بارش اور پانی کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کرنے کی قدرت کی معرفت سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور بعث ونشور اور ہر چیز پر قادر ہے۔ تعلیم وتربیت اور دعوت کے میدان میں اس چیز کی کافی اہمیت ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالی کی مخلوقات میں پائی جانے والی ان نشانیوں کی طرف متوجہ کیا جائے جن سے بسا اوقات بعض لوگ غافل رہتے ہیں، کیوں کہ یہ بندہ کو اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ اللہ تعالی ہی ہر چیز کا خالق ومالک اور مدبر ہے اور کائنات کی تمام نشانیاں قرآنی آیات کے عین موافق ہیں۔

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّ أَرِنِى كَيْفَ تُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَـٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِى ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ ٱلطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ ٱجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ٱدْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَٱعْلَمْ أَنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦٠﴾﴾

---

(۱) تفسير قرطبي ۳/۱۹۲.

ترجمہ:

"اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے پروردگار مجھے دکھا تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا، جناب باری تعالیٰ نے فرمایا کیا تمہیں ایمان نہیں؟ جواب دیا ایمان تو ہے لیکن میرے دل کی تسکین ہو جائے گی، فرمایا چار پرندلو،ان کے ٹکڑے کر ڈالو، پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو، پھر انہیں پکارو تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے، اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمتوں والا ہے (٢٦٠)"۔

قرآن کے اس سیاق میں احیاء کے ایک اور کارنامے کا بیان ہو رہا ہے جو اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْىِ ٱلْمَوْتَىٰ﴾ " اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا اے میرے پروردگار مجھے دکھا تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا "۔ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مطالبہ کیا کہ مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت کا ان کو مشاہدہ کرائے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ: ﴿أَوَلَمْ تُؤْمِن﴾ " کیا تمہیں ایمان نہیں؟" یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابراہیم علیہ السلام سے سوال تھا، اس پر ابراہیم علیہ السلام گویا ہوئے: ﴿قَالَ بَلَىٰ﴾ "کہا ایمان تو ہے"۔ ابراہیم علیہ السلام کے سوال کے اتنے سے جواب کے ذریعہ ان تمام شبہات کا ازالہ ہو گیا جو کسی کے بھی ذہن میں ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں آسکتے تھے، کیوں کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے خلیل کو احیاء کے عمل کا مشاہدہ یوں ہی کرا دیتا اور ابراہیم علیہ السلام کے مطالبہ کی تحقیق اور ان کے ایمان کو واضح نہ کرتا تو اس مطالبہ اور سوال کا لوگ الگ الگ مطلب نکالتے، اور ابراہیم علیہ السلام کی ایمانی قوت کے بارے میں بہت کچھ سوچنے لگتے۔ ابراہیم علیہ السلام کا قول (بَلَى) یعنی میرا یقین وایمان ہے کہ تو اس پر قادر ہے۔ ﴿وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي﴾ " لیکن میرے دل کی تسکین ہو جائے گی"۔ یعنی سوال اپنے دل کی تسکین کے لیے ہے، اور ایمانی دلائل کے ساتھ عینی اور مشاہداتی دلیل بھی یکجا ہو جائے گی[١]۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے مطالبہ کو قبول کرتے ہوئے فرمایا: ﴿فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ ٱلطَّيْرِ﴾ "چار پرندلو"۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے کسی خاص اور معین قسم کے پرندے کی تحدید نہیں کی، بلکہ جس قسم کا

---

(١) فتح القدير ١٨٢/١.

بھی پرندہ ملے اسے لے لو۔ ﴿فَصُرۡهُنَّ إِلَيۡكَ﴾ "ان کے ٹکڑے کر ڈالو"۔ یعنی ان کو ذبح اور چیڑ پھاڑ کر سب کو خلط ملط کر دو۔ ﴿ثُمَّ ٱجۡعَلۡ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٖ مِّنۡهُنَّ جُزۡءٗا﴾ " پھر ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو "۔ اللہ تعالی کے ان ارشادات اور بالترتیب ابراہیم علیہ السلام جو کچھ انجام دے رہے ہیں، یعنی ذبح کر کے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا تاکہ ہر ایک کے اجزاء ایک جگہ نہ رہیں اور پھر آس پاس کے پہاڑوں پر ان کو الگ الگ رکھنا تاکہ وہ سارے اجزاء ایک دوسرے سے دور ہو جائیں یہ سب محض اس لیے تھا تاکہ اعلی درجے کے معجزے کا ظہور ہو۔ ﴿ثُمَّ ٱدۡعُهُنَّ يَأۡتِينَكَ سَعۡيٗا﴾ " پھر انہیں پکارو تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے "۔ ایسا سب کچھ کرنے کے بعد ابراہیم علیہ السلام ان پرندوں کو آواز دیتے ہیں اور وہ پرندے دوڑتے ہوئے ان کے پاس آجاتے ہیں، اور ان کے دوڑ کر آنے میں مزید قدرت عظیم ہے کیوں کہ بات صرف یہی نہیں کہ ان تمام اجزاء کو زندہ کر دیا اور ان میں دوبارہ زندگی لوٹ آئی، بلکہ زندہ کرنے کی اس تیز رفتاری کو بھی دیکھیں کہ ادھر جیسے ہی ابراہیم علیہ السلام نے ندا لگائی تو ذرا بھی دیر نہیں ہوئی اور وہ تمام پرندہ ہو کر ابراہیم علیہ السلام کی طرف دوڑ پڑے۔ بلکہ اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ابراہیم علیہ السلام ان پرندوں کے سر اپنے پاس رکھے ہوئے تھے، پھر اللہ تعالی نے ان پرندوں کو پکارنے کا انہیں حکم دیا، اور حکم الہی کے مطابق انہوں نے پرندوں کو آواز لگائی، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پنکھ دوسری پنکھ کی طرف، ایک خون دوسرے خون کی جانب اور ایک گوشت دوسرے گوشت کی طرف ان کے تمام اجزاء اڑ رہے اور ایک دوسرے سے مل رہے ہیں یہاں تک کہ تمام پرندے نئے سرے سے کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام کی طرف دوڑ پڑے تاکہ ابراہیم اپنے مطالبہ کا بہترین طریقے سے مشاہدہ کر سکیں، اور وہ تمام پرندے ابراہیم کے پاس آکر ان کے ہاتھ سے اپنا اپنا سر لینے لگے (۱)۔

اس کے بعد آیت اللہ تعالی صفت عزت وحکمت کے بیان کے ساتھ ختم ہو رہی ہے: ﴿وَٱعۡلَمۡ أَنَّ ٱللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٞ﴾ " اور جان رکھو کہ اللہ تعالی غالب ہے حکمتوں والا ہے "۔ (وَٱعۡلَمۡ) کے اس لفظ میں اس علم کی معرفت کا حکم ہے جس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلم کے لیے اللہ تعالی کے عزیز وحکیم ہونے کی

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۳۲۳.

معرفت بہت اہم ہے ،اس سے معرفت اسماء وصفات کی فضیلت کا بھی پتہ چلتاہے، کیوں کہ اسماء وصفات کی معرفت سے ایمان کو تقویت ملتی ہے اور ان کی معرفت نیکی کرنے اور برائی سے اجتناب کا بہت بڑا سبب ہے۔ نیز آدمی کے لیے ان امور کا جاننا ضروری ہے جو اللہ تعالی کے ان اوصاف یعنی عزیز وحکیم پر دلالت کرتے ہیں،اور یہ چیز اللہ تعالی کی آیات کونیہ وشرعیہ میں غور وفکر کرنے سے حاصل ہوگی۔

(العزیز) وہ ہے جس کو کوئی چیز مغلوب نہیں کرسکتی اور نہ کوئی چیز اس کے لیے ممتنع ہے، ہر چیز اس کی تابع فرمان ہے اور جو کچھ وہ چاہے بغیر کسی رکاوٹ کے وہ ہو جاتاہے، کیوں کہ ہر شئے پر اسی کا غلبہ ہے اور وہ اپنے تمام اقوال وافعال اور شرعی احکامات وتقدیری امور میں حکمت والا ہے[1]۔ عزت کا مفہوم ہے مکمل قوت وطاقت اور غالب قدرت یعنی اللہ تعالی اپنے تمام امور پر مکمل طور سے غلبہ رکھتاہے۔اور حکیم کا مطلب اشیاء کو پورے استحکام سے انجام دینے والا، اور حکمت کا مفہوم ہے ہر چیز کو اس کے اصل مقام میں رکھنا ، چنانچہ اللہ تعالی اپنی شریعت اور احکامات میں حکمت والا ہے[2]۔ یہ چیز اس بات کی متقاضی ہے کہ ایک مومن کو صفات الہی کے ان معانی کا احساس وشعور ہونا چاہئے ،اس سے دل میں اللہ تعالی کی توقیر،اس کا خوف، فرمابرداری اور ہدایت یابی کا جذبہ پیدا ہوتاہے اور پھر اسی جذبہ سے اللہ تعالی کی اطاعت عمل میں آتی ہے۔

﴿مَّثَلُ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُمْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنۢبُلَةٍ مِّاْئَةُ حَبَّةٍۗ وَٱللَّهُ يُضَٰعِفُ لِمَن يَشَآءُۗ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦١﴾﴾

ترجمہ:

"جو لوگ اپنا مال اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں، اور اللہ تعالی جسے چاہے بڑھا چڑھا کردے، اور اللہ تعالی کشادگی والا اور علم والا ہے(٢٦١)"۔

(١) مرجع سابق.

(٢) زاد المسير ١/ ٥٠.

یہاں سے قرآن کریم کا سیاق تبدیل ہو رہا ہے ، اور انفاق فی سبیل پر ابھارا جا رہا ہے ، ارشاد الٰہی ہے: ﴿مَّثَلُ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِى كُلِّ سُنۢبُلَةٍ مِّا۟ئَةُ حَبَّةٍ ۗ وَٱللَّهُ يُضَٰعِفُ لِمَن يَشَآءُ ۗ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ﴾ "جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں، اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بڑھا چڑھا کر دے ، اور اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے"۔ اللہ تعالی نے آیت کریمہ کا آغاز ایک مثال سے کیا تاکہ قرآن کریم کے مخاطب کے لیے معنی ومفہوم قریب ہو جائے، آیت کا یہ سیاق مومنوں کے متعلق ہے، کیوں کہ ایمان کے بغیر انفاق کا کوئی عمل قابل قبول نہیں ہے۔ جو شخص اللہ تعالی کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتا ہے اس کو اللہ تعالی نے ایک دانے کی بالی سے تشبیہ دی جس میں سے بہت سارے دانے نکل آتے ہیں ، ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس مثال میں سات سو کی عدد کے ذکر کا دل میں گہرا اثر ہے، کیوں کہ اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ نیکی کرنے والوں کے لیے اللہ تعالی ان کے ان اعمال میں بالکل اسی طرح اضافہ کرتا رہتا ہے جیسے ایک کاشتکار کے ذریعہ عمدہ زمین میں بوئے ہوئے دانوں کو بڑھاتا ہے، اور حدیث میں بھی ہے کہ نیکیاں سات سو گنا تک بڑھائی جاتی ہیں(١)۔

آیت میں وجوب اخلاص کا بیان ہے تاکہ اس انفاق کا نفع ہو، ارشاد الٰہی ہے: ﴿ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ﴾ "جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں"۔ چنانچہ اس آیت میں انفاق کو سبیل اللہ میں محصور کر دیا گیا ہے، اور اس میں ایک ساتھ دو صورتیں بیان کی گئی ہیں، اول یہ کہ یہ مال اللہ تعالی کی راہ میں خرچ ہو، اور دوم یہ کہ یہ خرچ خالص اللہ تعالی کے لیے ہو، کیوں کہ فی سبیل اللہ وہی خرچ مانا جائے گا جو خالص اللہ کے لیے خرچ کیا گیا ہو ، جس میں کوئی ریاکاری یا اس سے کسی ذاتی مصلحت کا حصول مقصود نہ ہو، اسی طرح آیت کریمہ میں خرچ کا مجال بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالی کی راہ میں ہو۔ علامہ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سبیل اللہ میں علوم نافعہ کی ترقی، اللہ تعالی کی راہ میں جہاد اور مجاہدین اور سامان جہاد کی تیاری اور مسلمانوں کے تمام تر مفید اور عمدہ منصوبوں میں خرچ کرنا

---

(١) تفسير ابن كثير ١/٣٢٤.

شامل ہے، اوراس کے بعد اس میں فقیر، مسکین اور محتاج پر خرچ کرنا بھی شامل ہے (۱)۔ یہ آیت انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت واہمیت اوراس کے اجر عظیم کی دلیل ہے۔ اس کی سب سے بڑی فضیلت یہی ہے کہ اس کا اجر وثواب انسانی شمار وتحدید سے کہیں زیادہ ہے ، جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿وَٱللَّهُ يُضَٰعِفُ لِمَن يَشَآءُ﴾ " اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بڑھا چڑھا کر دے "۔ اس میں بڑھانے کی کوئی تحدید نہیں تاکہ یہ اضافہ سات سو سے بھی زیادہ ہو سکے ، یہ اللہ تعالی کے فضل وکرم کی دلیل ہے۔ علماء کی ایک جماعت کا قول ہے کہ اس آیت سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالی جس کے لیے چاہے سات سو گنا سے بھی زیادہ اجر وثواب بڑھادے (۲)۔ آیت کریمہ سے مستفاد ہوا کہ اللہ تعالی جس کے ساتھ فضل وکرم کرنا چاہے تو اس کے فضل وکرم کی کوئی تحدید نہیں۔ اس میں اللہ تعالی کی راہ میں خرچ کرنے والے کی تشجیع وتعریف ہے، کیوں کہ خرچ کا بدلہ اور وہ بھی بڑھا چڑھا کر دینا اس کے اس عمل کی مدح وثنا اور اس کے اس عمل خیر کی حوصلہ افزائی ہے۔ اس کے بعد موقع ومحل کی مناسب سے اللہ تعالی اپنی صفات حمیدہ کے ذریعہ اس فضیلت کی مزید تائید کر رہا ہے، فرمایا: ﴿وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ﴾ " اور اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے "۔ وہ کشادگی والا ہے اپنی بخشش ونوازش میں اور اپنے علم وقدرت میں، اس کی وسعت کا اندازہ کوئی مخلوق نہیں لگا سکتی، اور اپنی عظیم وسعت کی حقیقت سے اللہ تعالی ہی واقف ہے۔

اس سے مستفاد ہوا کہ تربیتی اور اداری اعتبار سے بھلائی کرنے اور خیر کے مجالات میں محنت اور کوشش کی تشجیع کو کافی اہمیت حاصل ہے ، اسی طرح اداراتی وپیشہ وارانہ کاموں میں بھی تشجیع ہونی چاہئے، کیوں کہ تشجیع لوگوں کی مخفی خوبیوں کو اجاگر کرنے کا سب سے کامیاب طریقہ ہے، کیوں کہ تعریف وتشجیع اور بدلہ کی محبت انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔

بالی کے ذریعہ مثال دینے سے زراعت کی فضیلت کا پتہ چلتا ہے، کیوں کہ زراعت میں لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں ، لوگوں کے کھانے کی تمام ضرورتیں اسی سے پوری ہوتی ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ زراعت لوگوں کے سب سے بہترین پیشوں اور

---

(۱) تفسير ابن السعدي ۱/۲۰۹.

(۲) تفسير قطبي ۳/۱۹۸.

ذرائع معاش میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے اس کے ذریعہ سے مثال بیان کی ہے(۱)۔اور نبی صلی اللہ علیہ کی حدیث ہے آپ نے فرمایا: "مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ أَوْ إِنْسَانٌ أَوْ بَهِيمَةٌ إِلَّا كَانَ لَهُ بِهِ صَدَقَةٌ"(۲) (کوئی بھی مسلمان جو ایک درخت کا پودا لگائے یا کھیتی میں بیج بوئے، پھر اس میں سے پرندیا انسان یا جانور جو بھی کھاتے ہیں وہ اس کی طرف سے صدقہ ہے)۔

بالی کے ذریعہ مثال کی تصویر کشی ہمیں یہ بات بتاتی ہے کہ ایک متعلم کے لیے مفہوم کو کیسے قریب کیا جائے اور مطلوبہ صورت کیسے ذہن نشین کرائی جائے اور مناسب مثال کا انتخاب کیسے ہو جس میں صورت، نوعیت، مقدار اور مفہوم کی مماثلت قریب قریب ہو جس سے تصور وخیال کی بلندی وسیع ہو تاکہ مقصد حاصل ہو جائے اور فکر ونظر میں خیر وفلاح کی آمادگی پیدا ہو۔

﴿ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُمْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَآ أَنفَقُواْ مَنًّا وَلَآ أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٦٢﴾ ۞ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَآ أَذًى ۗ وَٱللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ﴿٢٦٣﴾ ﴾

ترجمہ:

"جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ ایذا دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے ان پر نہ تو کچھ خوف ہے نہ وہ اداس ہونگے (۲۶۲)۔ نرم بات کہنا اور معاف کر دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد ایذا رسانی ہو ، اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور بردبار ہے (۲۵۳)"۔

ان آیات میں خرچ کرنے کے آداب بیان کیے جارہے ہیں ، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُمْ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَآ أَنفَقُواْ مَنًّا وَلَآ أَذًى ﴾ " جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ ایذا دیتے ہیں "۔اس آیت میں دوبارہ

---

(۱) تفسير قرطبي ۱۹۸/۳.

(۲) صحيح البخاري ۱۵۲/۲ حديث نمبر ۲۳۲۰.

انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر کر کے اس کی تاکید کی گئی ہے ، ساتھ ہی اس کے آداب بھی بیان کئے گئے ہیں کہ خرچ کرنے کے بعد دیئے جانے والے کے مشاعر کو کسی طرح سے مجروح نہ کیا جائے۔ ﴿مَنًّا﴾ " احسان جتلا کر " بایں طور کہ جس کے اوپر خرچ کیا ہے اس کے سامنے اپنے خرچ کا بار بار ذکر کرے کہ میں نے تم پر اتنا خرچ کیا اور اس پر فخر اور اپنی برتری جتلائے، اس کی وجہ سے صدقہ کئے جانے والے کو نفسیاتی اور حسی طور پر تکلیف ہوتی ہے، اس سے اس کی دل شکنی ہوتی ہے اور وہ شرم سار ہو کر رہ جاتا ہے، اور پھر اس کو فقر و فاقہ اور ضرورت کا احساس ستانے لگتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منہج اسلام ایک اخلاقی، ادب ورحمت ، دوسری کی پردہ پوشی والا منہج ہے ۔ بلکہ اس احسان جتلانے کے شدت اثر کی وجہ سے حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان وارد ہے: "ثَلَاثَةٌ لَا يَنْظُرُ اللَّهُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ قُلْنَا مَنْ هُمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ فَقَدْ خَابُوا وَخَسِرُوا فَقَالَ الْمَنَّانُ وَالْمُسْبِلُ إِزَارَهُ وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ" تین لوگ ایسے ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ (رحمت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا، نہ انہیں (گناہوں سے) پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا'، ہم نے پوچھا: اللہ کے رسول ! یہ کون لوگ ہیں؟ یہ تو نقصان اور گھاٹے میں رہے، آپ نے فرمایا: احسان جتانے والا، اپنے تہبند (ٹخنے سے نیچے) لٹکانے والا اور جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے سامان فروخت کرنے والا)۔ یہ عذاب کی وعید ہے ، جس سے معلوم ہوا کہ خرچ نہ کر کے تکلیف سے رک جانا ایسے صدقے سے بہتر ہے جس میں تکلیف کا پہلو بھی شامل ہو ۔ اس موازنہ میں غور و فکر کرنے والوں کو بہت سارے فوائد ملیں گے۔

اس کے بعد اللہ تعالی دوسرے ادب کا ذکر کر رہا ہے جو احسان جتانے سے زیادہ عام ہے کیوں کہ اس میں احسان جتانے کے علاوہ امور بھی شامل ہیں، اور وہ ہے ایذارسانی ، فرمایا: ﴿ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَآ أَنفَقُواْ مَنًّا وَلَآ أَذًى﴾ " پھر اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ ایذا دیتے ہیں"۔ (أَذًى) میں ایذا رسانی کی وہ تمام شکلیں آجاتی ہیں جن سے خرچ کئے جانے والے کو تکلیف ہو، اور احسان جتانا بھی اس میں داخل ہے، کیوں کہ یہ بھی ایذارسانی کا ایک حصہ ہے، لیکن عام تکلیف کے ساتھ ساتھ اس کا الگ سے ذکر اس لیے کیا گیا کیوں کہ اس کی تکلیف ، ضرررسانی اور خرابی زیادہ شدید ہے۔ اس اسلوب بیان سے یہ

مستفاد ہوا کہ یہاں عام کے ساتھ خاص کے ذکر کرنے کی الگ سے کوئی ظاہری وجہ ضرور ہے کیوں کہ لفظ عام کے مفہوم میں خاص کا لفظ بھی داخل ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ضرور اس لفظ خاص کا کوئی لائق توجہ مفہوم ومقصد ہے اور اسی مفہوم کی اہمیت اور خطرناکی کے پیش نظر اس سے متنبہ کیا جارہا ہے، یا اور کسی بھی مقصد سے جو کلام کے مفہوم وصیاغہ سے پتہ چلتا ہے۔

توجو شخص رضائے الٰہی کے مطابق انفاق کے ان اخلاق وآداب کا پابند ہو تو ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالی کے طرف سے خوش خبری ہے، اور وہ خوش خبر اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: ﴿لَّهُمۡ أَجۡرُهُمۡ عِندَ رَبِّهِمۡ﴾ "ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے "۔اور یہ وہ ثواب ہے جس کے حجم ومقدار کا اندازہ اللہ تعالی کے سوا کوئی بھی نہیں لگا سکتا، کیوں کہ اللہ تعالی کا ثواب بہت عظیم ہے بالخصوص جب کہ اللہ تعالی نے اس ثواب کو(عِندَ رَبِّهِمۡ) کے ساتھ مقید کیا ہے۔۔ لہذا وہی اس ثواب کا کفیل ہے، اور یہ رب کریم سبحانہ وتعالی کی طرف سے عظیم ضمانت ہے۔ نیز ان کے لیے امن وامان کی بھی خوش خبری ہے ،جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ﴾ " ان پر کچھ خوف نہیں ہے "۔اللہ تعالی نے ان سے مستقبل کے امور میں پیش آنے والے خوف کی نفی کی ہے، کیوں کہ خوف کا تعلق مستبقل سے ہوتا ہے۔ان کو تیسری خوش خبری سنائی جارہی ہے: ﴿وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ﴾ " وہ اداس بھی نہیں ہونگے "۔اللہ تعالی نے ان سے ماضی کے معاملات سے حزن وملال کی نفی کی، کیوں کہ حزن کا تعلق ماضی سے ہے جن کو یاد کرکے آدمی افسوس کرتا ہے۔اس طرح سے ان کو سعادت ونیک بختی نصیب ہوگی کہ ان کو کسی طرح کا حزن وملال اور خوف نہ ہوگا،مزید برآں ان کو اللہ تعالی کی طرف سے اجر عظیم اور ثواب جزیل حاصل ہوگا۔اس سے معلوم ہوا کہ مستقبل کا غم اور ماضی کا ملال یہ دونوں چیزیں انسان کی بد بختی کا بڑا سبب ہیں۔اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو ان دونوں چیزوں سے محفوظ رکھے۔

اس کے بعد اللہ تعالی بغیر خرچ کئے بھلی بات کہنے اور تکلیف دے کر خرچ کرنے کے درمیان بطور ترجیح بالکل صحیح اور مناسب موازنہ کر رہا ہے: ﴿قَوۡلٞ مَّعۡرُوفٞ وَمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٞ مِّن صَدَقَةٖ يَتۡبَعُهَآ أَذٗى﴾" نرم بات کہنا اور معاف کردینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد ایذا رسانی ہو "۔اس سے معلوم ہوا کہ بھلی بات ،ایک مسلم کے حق میں دعائیہ کلمات اور ظلم سے عفو درگذر ایسے صدقات سے

افضل اور بہتر ہے جس کے بعد صدقہ کرنے والے کی طرف سے صدقہ کیے جانے والے کو تکلیف پہنچائی جائے۔ اس موازنہ سے مخاطب صحیح اخلاقی طرز عمل سے مستفید ہوتا ہے تاکہ دوسروں کے ساتھ پیش آنے میں اسی اسلامی اخلاق سے خود کی رہنمائی اور تربیت کرے، یعنی کہ کچھ نہ دے کر صرف بھلی بات کہے یہ بہتر ہے کہ خوب نوازے لیکن ساتھ میں کسی طرح کی ایذار سانی بھی کرے۔

اس موازنہ میں ایک مسلم کے لیے یہ تعلیم ہے کہ اعمال میں تفاضل کے طریقہ کار کو سامنے رکھے ، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمال کی قدر ومنزلت بڑھانے میں اخلاق وآداب کا بڑا مقام ہے ، اسی طرح نرم بات اور عفو در گذر کی اہمیت اور ایذار سانی کی خطرناکی کا پتہ چلتا ہے ، حتی کہ اس ایذار سانی کے ساتھ ایک مسلمان اپنی ملکیت کا ایک حصہ نکال کر خرچ کرتا ہے تب بھی اس کی خطرناکی میں کمی نہیں آتی ، ساتھ ہی خرچ کرنے میں ایک نفسیاتی دباؤ بھی رہتا ہے ، کیوں کہ انسان کا اپنی ملکیت میں سے کچھ نکالنا نفس پر شاق گزرتا ہے ،الا یہ کہ اس چیز سے اللہ تعالی جس کو محفوظ رکھے اور سخاوت وکرم کا اس کو عادی بنادے۔

اس کے بعد آیت کریمہ ایک نصیحت کے ساتھ ختم ہو رہی ہے جس میں اللہ تعالی کی دو صفتوں کا بیان ہے : ﴿ وَٱللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ﴾" اور اللہ تعالی بے نیاز اور بردبار ہے "۔چنانچہ وہ اپنی تمام مخلوقات سے بے نیاز ہے اور وہ کسی بھی مخلوق کا محتاج نہیں، اسی طرح وہ اپنے فضل اور قدرت مطلقہ کی وجہ سے بھی بے نیاز ہے، نیز وہ اللہ سبحانہ وتعالی اپنے بندوں پر بہت بردبار ہے، اس لیے وہ انہیں عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنی اسی بردباری اور وسیع مغفرت کی وجہ سے انہیں معاف ودر گذر کرتا رہتا ہے ۔ اگر ایک مومن اللہ تعالی کی صفات میں غور وفکر کرے تو ان صفات عظیمہ واسماء کریمہ کی معرفت کے مطابق اس کا دل اپنے رب کی فرمابرداری میں جھک جائے ،اور اس معرفت کے سبب انفاق میں خوب سخاوت سے کام لے، کیوں کہ جس ذات کی راہ میں وہ خرچ کر رہا ہے وہ بڑی کریم اور بے نیاز ہے ،اور وہ بھی خرچ کرنے والے کو پوری سخاوت سے نوازتا ہے، اسی طرح اس معرفت کے سبب خرچ کرنے والا اپنے خرچ کے سلسلے میں بالکل پر امید اور غیر متردد رہتا ہے ، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ جس کی راہ میں وہ خرچ کر رہا ہے وہ بے نیاز و بردبار ہے، یہ معرفت اس کے لیے انفاق میں جلدی کرنے کا سبب

بنتی ہے کیوں کہ جس کی راہ میں وہ خرچ کر رہا ہے وہ کریم و بے نیاز اور بردبار ہے، اس معرفت کے سبب وفقر و قلت مال سے نہیں ڈرتا کیوں کہ جس کی راہ میں وہ خرچ کرتا ہے وہ بے نیاز و بردبار ہے۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تُبۡطِلُواْ صَدَقَٰتِكُم بِٱلۡمَنِّ وَٱلۡأَذَىٰ كَٱلَّذِي يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِۖ فَمَثَلُهُۥ كَمَثَلِ صَفۡوَانٍ عَلَيۡهِ تُرَابٞ فَأَصَابَهُۥ وَابِلٞ فَتَرَكَهُۥ صَلۡدٗاۖ لَّا يَقۡدِرُونَ عَلَىٰ شَيۡءٖ مِّمَّا كَسَبُواْۗ وَٱللَّهُ لَا يَهۡدِي ٱلۡقَوۡمَ ٱلۡكَٰفِرِينَ ﴿٢٦٤﴾ وَمَثَلُ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمۡوَٰلَهُمُ ٱبۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ ٱللَّهِ وَتَثۡبِيتٗا مِّنۡ أَنفُسِهِمۡ كَمَثَلِ جَنَّةِۭ بِرَبۡوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٞ فَـَٔاتَتۡ أُكُلَهَا ضِعۡفَيۡنِ فَإِن لَّمۡ يُصِبۡهَا وَابِلٞ فَطَلّٞۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾ أَيَوَدُّ أَحَدُكُمۡ أَن تَكُونَ لَهُۥ جَنَّةٞ مِّن نَّخِيلٖ وَأَعۡنَابٖ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ لَهُۥ فِيهَا مِن كُلِّ ٱلثَّمَرَٰتِ وَأَصَابَهُ ٱلۡكِبَرُ وَلَهُۥ ذُرِّيَّةٞ ضُعَفَآءُ فَأَصَابَهَآ إِعۡصَارٞ فِيهِ نَارٞ فَٱحۡتَرَقَتۡۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلۡأٓيَٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾ ﴾

ترجمہ:

"اے ایمان والو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا پہنچا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ شخص جو اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرے اور نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے نہ قیامت پر، اس کی مثال اس صاف پتھر کی طرح ہے جس پر تھوڑی سی مٹی ہو پھر اس پر زوردار مینہ برسے اور وہ اس کو بالکل صاف اور سخت چھوڑ دے ، ان ریاکاروں کو اپنی کمائی میں سے کوئی چیز ہاتھ نہیں لگتی اور اللہ تعالیٰ کافروں کی قوم کو (سیدھی) راہ نہیں دکھاتا(۲۶۴)۔ ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی طلب میں دل کی خوشی اور یقین کے ساتھ خرچ کرتے ہیں اس باغ جیسی ہے جو اونچی زمین پر ہو اور زور دار بارش اس پر برسے اور وہ اپنا پھل دوگنا لاوے اور اگر اس پر بارش نہ بھی پڑے تو پھوار ہی کافی ہے اور اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے(۲۶۵)۔ کیا تم میں سے کوئی بھی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو، جس میں نہریں بہہ رہی ہوں اور ہر قسم کے پھل موجود ہوں، اس شخص کا بڑھاپا آگیا ہو اور اس کے ننھے ننھے سے بچے بھی ہوں اور اچانک باغ کو بگولہ لگ جائے جس میں

آگ بھی ہو، پس وہ باغ جل جائے ، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیتیں بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر کرو(۲۶۶)"۔

قرآن کریم کا سیاق ہنوز انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ کی فضیلت وآداب، ثواب اور اس کے مفسدات کے بارے میں ہی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تُبۡطِلُواْ صَدَقَـٰتِكُم بِٱلۡمَنِّ وَٱلۡأَذَىٰ ﴾" اے ایمان والو اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور ایذا پہنچا کر برباد نہ کرو"۔ آیت کریمہ کے آغاز میں مومنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ندا دی جارہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایمان کے وصف کے ساتھ یہ منادی اور خطاب ان کے لیے عظیم شرف کا مقام ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کا ثبوت فراہم کررہا ہے، لہذا اس نعمت سے بڑی اور کونسی نعمت ہوسکتی ہے۔ یہ منادی اس شخص دل پر کافی اثر انداز ہوتی ہے جس کو اس کے معنی ومفہوم کا شعور احساس ہو۔ یہ منادی ان کی توجہ مبذول کرانے اور ان کی منفعت سے انہیں باخبر کرنے کے لیے ہے۔ اس ندا کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تربیت کے میدان میں ایک متعلم اور مدعو کو سب سے بہتر انداز والفاظ میں پکارنا چاہیے، کیوں کہ جب رب ذوالجلال اپنے بندوں کو اتنے اعلی لقب سے پکار رہا ہے تو پھر بندوں کو اپنے ہی جیسے بندوں کی منادی کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ مومنوں کو یہ تیسری بار مفسدات صدقات سے اپنے صدقات برباد کے نے منع کررہا ہے، تاکہ وہ اپنی محنت کو نقصان دہ اور غیر مفید چیزوں میں ضائع نہ کریں اور پھر اس کے اجر عظیم سے محروم ہوجائیں۔ بار بار تین مرتبہ منع کرنا مومن کے حق میں اس کی شدید سنگینی کی دلیل ہے، لہذا یہ ہر مومن کے لیے سخت تنبیہ اور تعلیم ہے۔ یہ اللہ کی اپنے مومن بندوں کے ساتھ خواہ وہ دینے والا ہو یا لینے والا سب کے حق میں سراپا رحمت ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے دینے والا اپنی نوازشوں کے ثواب سے محروم نہیں ہوتا، اور لینے والا لے کر تکلیف سے محفوظ رہتا ہے اور اس طرح ان کے درمیان الفت ومحبت اور بھائی چارگی کی فضا قائم رہتی ہے۔

جو شخص صدقہ کرکے احسان جتاتا اور تکلیف دیتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے ریاکار کے مشابہہ قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿كَٱلَّذِي يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ ٱلۡأٓخِرِ﴾ "جس طرح وہ شخص جو اپنا مال

لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرے اور نہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے نہ قیامت پر"۔ چنانچہ جو شخص صدقہ دینے کے بعد احسان جتاتااور تکلیف دیتاہے وہ اس آدمی کی طرح ہے جس میں دو دو قباحتیں موجود ہیں ، ایک تو ریاکاری کا قباحت اور دوسرے قیامت کے دن پر عدم ایمان کی قباحت۔ایک قباحت کا تعلق دنیاسے ہے اور وہ ریاکاری ہے،اور دوسری قباحت کا تعلق آخرت سے ہے اور وہ ہے یوم آخرت پر عدم ایمان۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص میں یہ دونوں خصلتیں پائی گئیں تو پھر اس کا عمل برباد ہے کیوں کہ وہ اپنے عمل میں اس ریاکار کی طرح ہوتاہے جس کے وہاں اخلاص نہیں ہوتا نیز اس کی طرح جس کا یوم آخرت پر ایمان نہیں ہوتا، اس کے صدقات وخیرات کا مقصد محض دکھاوا اور لوگوں کے درمیان فخر ومباہات ہوتاہے ، اور وہ یوم آخرت کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، جب کہ یوم آخرت پر ایمان خوف الٰہی کا سبب ہے اور اس کی بدولت انسان کے عمل میں اخلاص وللہیت پیدا ہوتی ہے ، کیوں کہ وہ خود کو اس دن کے لیے تیار کرتاہے۔

اس سے تعلیمی، تربیتی، دعوتی، اور توجیہ وارشاد کے اعتبار سے تشبیہ کی اہمیت معلوم ہوتی، اس سے نہایت آسان اسلوب میں مراد واضح اور مخاطب تک مقصود کی رسائی ہو جاتی ہے۔

صدقات میں ممنوعہ ایذارسانی اور احسان جتانے کی سنگینی کو اللہ تعالیٰ ایک دوسری مثال سے تاکیدا مزید بیان کررہاہے: ﴿فَمَثَلُهُۥ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُۥ وَابِلٌ فَتَرَكَهُۥ صَلْدًا لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا﴾ "اس کی مثال اس صاف پتھر کی طرح ہے جس پر تھوڑی سی مٹی ہو پھر اس پر زوردار مینہ برسے اور وہ اس کو بالکل صاف اور سخت چھوڑ دے ، ان ریاکاروں کو اپنی کمائی میں سے کوئی چیز ہاتھ نہیں لگتی "۔اللہ تعالیٰ نے ایسے صدقات کو جس کے بعد ایذا پہنچائی جائے ایک صاف چکنے پتھر سے تشبیہ دیا جس پر مٹی پڑی ہو اور پھر اس مٹی پر (وابل) موسلادھار بارش ہو جائے، اور وہ بارش اس پتھر کو ایسا چکنا صاف چھوڑ دے گویا اس پر مٹی تھی ہی نہیں۔ایسا ہی معاملہ صدقہ کے ان اعمال کا ہے جو ریاکاری، تعلی، کبر، احسان جتانے اور مختلف قسم کی ایذارسانیوں کے سبب اللہ تعالیٰ کے نزدیک زائل وبرباد اور بالکل نیست ونابود اور ایسے ہو جائیں گے گویا وہ عنداللہ سرے سے ہیں ہی نہیں، اس پر کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا اور نہ ہی خرچ اور صدقہ کرنے والے کو اس کا کوئی فائدہ ہوگا۔اللہ تعالیٰ

ایسے ہی صدقہ کرنے والے کا نتیجہ بیان کر رہا ہے: ﴿لَّا يَقۡدِرُونَ عَلَىٰ شَيۡءٖ مِّمَّا كَسَبُواْ﴾ " ان ریاکاروں کو اپنی کمائی میں سے کوئی چیز ہاتھ نہیں لگتی "۔یعنی جو بھی انہوں نے صدقات کیے ہوں گے سب کا معاملہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا اور وہ اپنے صدقات سے کچھ بھی مستفید نہیں ہو سکیں گے۔ ﴿وَٱللَّهُ لَا يَهۡدِي ٱلۡقَوۡمَ ٱلۡكَٰفِرِينَ﴾ " اور اللہ تعالیٰ کافروں کی قوم کو (سیدھی) راہ نہیں دکھاتا" اور وہ انہیں ایسے کاموں کی توفیق نہیں دیتا جن میں ان کا خیر ہے، اور ایسا اللہ تعالی کے ساتھ ان کے کفر کی وجہ سے ہے۔اس میں کفر اور کفر کی راہوں پر چلنے سے تنبیہ ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی دوسرے قسم کے لوگوں کا تذکرہ کر رہا ہے جو اللہ تعالی کے مخلص بندے ہیں اور اطاعت الٰہی میں انفاق کے تمام اخلاق وآداب کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں، فرمایا: ﴿وَمَثَلُ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمۡوَٰلَهُمُ ٱبۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ ٱللَّهِ وَتَثۡبِيتٗا مِّنۡ أَنفُسِهِمۡ كَمَثَلِ جَنَّةِۭ بِرَبۡوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٞ فَـَٔاتَتۡ أُكُلَهَا ضِعۡفَيۡنِ﴾ " ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال اللہ تعالی کی رضامندی کی طلب میں دل کی خوشی اور یقین کے ساتھ خرچ کرتے ہیں اس باغ جیسی ہے جو اونچی زمین پر ہو اور زور دار بارش اس پر برسے اور وہ اپنا پھل دو گنا لاوے "۔آیت کا آغاز لفظ مثال سے ہو رہا ہے جس سے مخاطب کی پوری توجہ اس مثال کی طرف اور اس کے مقصد اور مضمون و محتوی کی طرف ہو جاتی ہے، چنانچہ اس مثال کے مضامین و مشمولات اللہ تعالی کی مراد بخوبی واضح کر رہے ہیں اور اس کے ذریعہ مخاطب کے لیے معنی ومفہوم کا تصور قریب ہو جا رہا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اپنا مال رضائے الٰہی کی جستجو میں خرچ کرتے ہیں: ﴿ٱبۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ ٱللَّهِ﴾ نیز: ﴿وَتَثۡبِيتٗا مِّنۡ أَنفُسِهِمۡ﴾ " یقین کے ساتھ "یعنی اللہ تعالی کی ذات سے اس بات کا ان کو پختہ یقین ہوتا ہے کہ وہ انہیں اس کا بہترین بدلہ دے گا(۱)۔ چنانچہ خرچ کے تمام مجالات میں ان کے انفاق کے اسباب و وجوہات اسی چیز میں منحصر ہوتے ہیں جو اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ ان کے انفاق کا یہ عمل ہر طرح کے ریاونمود اور ایذار سانیوں سے پاک ہوتے ہیں، کیوں کہ ایک مومن جن حیثیتوں سے خرچ کرتا ہے ان میں ریاکاری، ایذارسانی اور احسان جتانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مومنوں کے ان مخلصانہ اور پر اعتماد خصائص کے حامل صدقات کی مثال ایک باغ جیسی ہے جو زمین کی اونچی جگہ پر

---

(۱) تفسير ابن كثير ۳۲٦/۱.

ہو اور ﴿أَصَابَهَا وَابِلٌ فَـَٔاتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ﴾" زور دار بارش اس پر برسے اور وہ اپنا پھل دو گنا لاوے "،یعنی اس باغ پر خوب بارش برسے اور اس کو سیر اب کرے جس کی وجہ سے دیگر باغات اور درختوں کے مقابلے میں اس باغ میں دگنا پھل پیدا ہوں۔اور اگر زوردار بارش نہ بھی برسے تو پھوار ہی پڑے ،(طلّ) شبنم کی پھوار کو کہتے ہیں: ﴿فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ﴾" اور اگر اس پر بارش نہ بھی پڑے تو پھوار ہی کافی ہے "۔یعنی یہ شبنم اور پھوار پیداوار کے لیے سیر ابی کی ضرورت کو پورا کردے ،یہی حال مومن کے اعمال کا ہے ،وہ کبھی برباد اور رائیگاں نہیں جاتا ، بلکہ اللہ تعالی اس کو قبول کرتے ہوئے ہر عمل کرنے والے کی نیت واخلاص کے اعتبار سے بڑھاتا رہتا ہے ،اسی لیے اس کا فرمان ہے : ﴿وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾" اور اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے "۔یعنی بندوں کا کوئی بھی عمل اس سے مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے(۱)۔

﴿كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ﴾" ایسی باغ جو اونچی زمین پر ہو "۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ انفاق کا یہ عمل دوسروں کے بالمقابل اپنے مقام ومرتبہ اور بلندی میں اس آسودہ باغ کے مشابہ ہے جو زمین کے دوسرے خطوں کے مقابلے میں اونچائی پر واقع ہو۔ سلوک وکردار اور مقاصد وایمانیات کا یہ اعلی مقام کبھی ایذار سانیوں کی پستیوں میں نہیں گرتا، یہ امتنان وایذاء سے پاک وصاف صدقات کے فضل وعظمت کی دلیل ہے ،اور چونکہ باغات میں دلکش مناظر ،خوش بودار فضا اور سرسبز وشاداب چمن ہوتا ہے اسی طرح نفقات وصدقات کی بھی اپنی ایک خوبصورتی ہوتی ہے۔ جس طرح باغ پھل فروٹ اور مختلف قسم کے کھانے فراہم کرتا ہے ،ٹھیک اسی طرح نفقات وصدقات کے بھی مختلف اقسام ومجالات ہیں اور اس کے ثواب کی بھی مختلف صورتیں ہیں ،اس سے خرچ کرنے والے کی مصیبتیں ٹلتی اور گناہ معاف ہوتے ہیں، نیز یہ اس کے رفع درجات اور اجر وثواب کی عظمت کا سبب ہے ،ایک باغ سے جس طرح دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے ،اسی طرح خرچ کرنے والا بھی خیر وبھلائی کے تمام راستوں میں دوسرے لوگوں یہاں تک کہ چوپایوں کو بھی نفع پہنچاتا ہے۔

---

(۱) مرجع سابق.

اس ضرب المثل سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ منہج اسلام ایک مخاطب کی علمی ضروریات کو بہم پہنچانے کے لیے تمام بہتر اور کار آمد تعلیمی و تربیتی اسالیب پر پوری گیرائی سے توجہ دیتا ہے، اور وہ مومنوں کو بھی اپنی طریقہ و منہج اور مقاصد و دوسروں کے افادے کے غرض سے اس تمثیلی اسلوب کو استعمال میں لانے کی تعلیم دے رہا ہے تاکہ اس کے مضامین و تصویر سے اس کے اعلی مفاہیم مخاطب کے ذہن میں راسخ ہو سکیں، نیز مثل میں بہت سارے اخلاق و آداب اور ذہنی تصورات کے پہلو بھی ہوتے ہیں جن سے ایک متعلم کے خیالات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، یقیناً قرآن کریم ایک مکمل درسگاہ ہے۔

قرآنی سیاق مسلسل ایمانی مفاہیم کو مومنوں کے دلوں میں راسخ کرنے کے لیے مختلف تعلیمی وسائل اور مفہوم کو قریب کرنے والے اسالیب کے ذریعہ ان کی توجیہ ورہنمائی کر رہا ہے، تاکہ ان کے اعمال سلامت رہیں اور یہ اعمال اللہ تعالی کے بتائے ہوئے منہج قویم کے مطابق صحیح ڈھنگ سے انجام پا سکیں، چنانچہ اللہ تعالی اپنے مومن بندوں سے مخاطب ہو کر فرما رہا ہے: ﴿ أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُۥ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا ٱلْأَنْهَٰرُ لَهُۥ فِيهَا مِن كُلِّ ٱلثَّمَرَٰتِ وَأَصَابَهُ ٱلْكِبَرُ وَلَهُۥ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَأَصَابَهَآ إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَٱحْتَرَقَتْ ﴾ "کیا تم میں سے کوئی بھی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو، جس میں نہریں بہہ رہی ہوں اور ہر قسم کے پھل موجود ہوں، اس شخص کا بڑھاپا آگیا ہو اور اس کے ننھے ننھے سے بچے بھی ہوں اور اچانک باغ کو بگولہ لگ جائے جس میں آگ بھی ہو، پس وہ باغ جل جائے"۔ اس آیت کریمہ میں ہر خرچ کرنے والے مومن کے لیے بہت ساری ربانی ہدایات و تعلیمات ہیں جو اس آیت کے عظیم معنی و مفہوم میں پائی جاتی ہیں۔

اس تعلیمی خطاب کے آغاز میں انکاری سوال ہے جو عقل کو متحرک کر رہا اور ایسی چیز میں غور فکر کے لیے ابھار رہا ہے جس سے ہر عقل سلیم بچنا چاہتی ہے ، یعنی کہ ایک خرچ کرنے کی حالت ایسی ہو جس کی منظر کشی اس مثال میں کی گئی ہے۔ اس مثال کی شروعات سوالیہ اسلوب میں ہو رہی ہے کہ کیا تم میں سے کوئی چاہے اور پسند کرے گا کہ اس کے پاس ایک ایسا باغ ہو جو بہترین قسم کے کھجور اور انگور کے پھل سے بھرا ہو، بلکہ اس میں ہر طرح کے پھل فروٹ ہوں، اس کے درختوں کے درمیان نہریں بہہ رہی ہوں ، لیکن اس خوبصورت کی تمام تر خوبیوں کے باوجود اس باغ کا مالک بڑھاپے کی زندگی جی رہا ہو،

ساتھ میں اس کے کمزور چھوٹے چھوٹے بچے ہوں ، یعنی اس کی حالت ایسی ہو کہ ایک طرف اس کو بڑھاپے کی مجبوری لاحق ہو اور دوسری طرف اس کی اولاد بھی ابھی کم سن اور کمزور ہو، کمزوری کی ایسی حالت میں اس کے خوبصورت باغ میں اچانک آگ کی آندھی آجائے اور اس کو جلا کر خاکستر کردے تو ایسے میں اس کا افسوس واقعتاً انتہائی شدید اور تکلیف دہ ہوگا۔ امام شوکانی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: یہ مثال ایسے شخص کی ہے جو نیکیاں کرتا ہے لیکن ساتھ ہی میں ایسے کام بھی کرتا ہے جو ان نیکیوں کو برباد کردیں، ایسے اعمال خیر اس کو قیامت کے دن کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے جس وقت کہ اس کو نیکیوں کی سخت ضرورت ہوگی، بالکل اس شخص کی حالت کی طرح جس کے پاس مذکورہ خوبیوں والا باغ ہو اور خود اس کی مذکورہ حالت ہو(۱)۔

اس سے معلوم ہوا کہ کثرت عمل معتبر نہیں ہے، البتہ عمل کا اللہ تعالی کی مرضی اور اس کے بتائے ہوئے طریقے کے موافق ہونا ضروری ہے ، لہذا جو شخص خرچ کرنے میں احکام الہی کا پاس ولحاظ نہیں رکھتا تو یقیناً اس کا یہ عمل اس دن سخت حسرت وندامت کا باعث ہوگا جس دن چھوٹے سے چھوٹے عند اللہ مقبول عمل کی شدید حاجت ہوگی ، اس لیے کسی بھی عمل میں اخلاص وللہیت کے ساتھ ایذارسانی وریاکاری اور احسان جتانے سے اجتناب از حد ضروری ہے جن سے کہ اعمال اکارت وبرباد ہوجاتے ہیں۔

مختلف مثالوں کے ذریعہ بار بار ہدایت وتوجیہ اور بیان اس پہلو کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اور ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس مثال کی طرف خصوصی توجہ دے، کیوں کہ اس مثال میں مذکور حسرت وافسوس جیسی شدید کوئی کیفیت نہیں ہوسکتی جس مثال میں کئی ایک صورتیں جمع ہیں: اعلی قسم کا باغ ہے، اس میں ہر طرح کے پھلوں سے بے نیازی ہے، مالک کی حالت کمزور ہے، اولاد بھی کمزور جو اس لائق نہیں کہ اس باغ کی رکھوالی کرسکے ، پھر اچانک آگ کے ساتھ ایک آندھی چلتی ہے اور اس باغ کو جلا ڈالتی ہے، ایسے میں اس آدمی کے حسرت وافسوس اور تکلیف کا کیا عالم ہوگا، اس کو اپنی اولاد کی ہلاکت کا کس قدر خوف ہوگا ، نیز خود وہ اپنی موجودہ صورت حال سے کتنا خوفزدہ ہوگا ، اس نے اس باغ کے سنوارنے میں جتنی بھی محنت اور مال ودولت خرچ کیا ان تمام کا دوبارہ لوٹ آنا کس قدر مشکل ہے۔ ایسا

---

(۱) فتح القدير ۱/۲۸۸.

ہی حال اس خرچ کا بھی ہے جس میں خرچ کرنے والا اللہ تعالی کے منہج پر نہیں رہتا، چنانچہ اس کا یہ خرچ کرنا قیامت کے دن اس کے لیے حسرت وندامت کا سبب بنے گا کیوں کہ اس نے اپنے انفاق کے عمل کو ریا ونمود، ایذا رسانی اور احسان جتائی وغیرہ کی آگ سے جلایا ہو گا ۔

اس کے بعد اللہ تعالی بندوں پر اس بیان کامل کا احسان جتا رہا ہے: ﴿كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمُ ٱلْـَٔايَٰتِ﴾" اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آیتیں بیان کرتا ہے " ، پس اسی طرح اللہ تعالی کی آیتیں، اس کی مراد اور منہج جس کا بندوں سے مطالبہ ہے واضح ہوتا ہے، اس کے بعد بندوں سے مطلوبہ امر کی ہدایت ہے، فرمان الہی ہے: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ﴾" تاکہ تم غور وفکر کرو"۔ اس توجیہ میں اللہ تعالی کے اوامر ونواہی اور بیان میں غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے، تاکہ انسان اللہ تعالی کی مرضی کے مطابق اس کی شریعت کے دائرے میں رہ کر کوئی بھی عمل انجام دے۔ اس سے اللہ تعالی کی آیات میں غور وفکر کی اہمیت کا ثبوت ملتا ہے جن آیات میں شریعت الہی کی کماحقہ تطبیق کی ہدایات موجود ہیں۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُواْ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِـَٔاخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغْمِضُواْ فِيهِ ۚ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾﴾

ترجمہ:

"اے ایمان والو اپنی پاکیزہ کمائی میں سے اور زمین میں سے تمہارے لئے ہماری نکالی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرو ، ان میں سے بری چیزوں کے خرچ کرنے کا قصد نہ کرو جسے تم خود لینے والے نہیں ہو ہاں اگر آنکھیں بند کرلو تو ، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ بے پرواہ اور خوبیوں والا ہے(۲٦۷)"۔

اس آیت میں بھی انفاق اور اس کے اخلاق وطریقہ کار کے تعلق سے مومنوں کو تعلیم دی جا رہی ہے تاکہ ان کا اور ان کے اعمال کا تزکیہ کرتے ہوئے ان کو دنیا وآخرت کی بھلائی میسر ہو، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ﴾ " اے ایمان والو اپنی پاکیزہ کمائی میں سے اور زمین میں سے تمہارے لئے ہماری نکالی ہوئی چیزوں میں سے

خرچ کرو"۔اس ارشاد ربانی کاآغاز بھی ایمان کے وصف کے ساتھ مومنوں کی منادی سے ہو رہاہے جس کے اعلی معانی اور مفاہیم ہیں اس میں تشجیع کا پہلو ہے،اعلی مراتب بھی اسی کو ملتے جن کے کام اعلی ہوتے ہیں ، لہذا مومنوں کے شایان شان یہی ہی کہ وہ اسی ندا کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انفاق کا عمل انجام دیں جس میں اللہ تعالی اپنے مومنوں کو توجیہی ندا دے رہا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالی اپنے مومن بندوں کو ہدایت کر رہا ہے کہ وہ خرچ کرتے وقت اچھی چیز اختیار کریں اور ردی اور گھٹیا چیزوں سے بچیں: ﴿أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ﴾ " اپنی پاکیزہ کمائی میں سے خرچ کرو"۔ یہ ہدایت نامہ امر کے صیغے کے ساتھ وارد ہوا ہے جس کا تقاضا ہے کہ عمدہ چیز کا اختیار واجب ہے، اسی طرح ﴿مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ﴾ " اپنی پاکیزہ کمائی میں سے " کے اس جملہ میں اجمالا وتفصیلا تمام عمدہ چیزیں شامل ہیں، نیز اس عموم میں ہر نوعیت کی پاکیزہ کمائی اور مقدار شامل ہے، بلکہ پاکیزہ کمائی کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں سب اس میں داخل ہیں اور اس سے وہ ساری کمائی نکل جاتی جو غیر پاکیزہ ہو،اسی طرح آیت میں زمین سے نکلنے والے چیزوں کے نفقات کا بھی ذکر ہے،جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمِمَّآ أَخۡرَجۡنَا لَكُم مِّنَ ٱلۡأَرۡضِ﴾ " اور زمین میں سے تمہارے لئے ہماری نکالی ہوئی چیزوں میں سے"۔تاکہ کمائی کے دونوں ذرائع کی تمام صورتیں اس آیت میں بیان ہو جائیں، زمیں سے نکلنے والی چیزیں جیسے اناج وغلے اور معدنیات وغیرہ، اسی طرح انسان جو خود کماتا ہے جیسے تجارت، ایجادات اور کاریگری وغیرہ۔

اس آیت کے من جملہ اہم فوائد میں سے اس توجیہ وارشاد کی گیرائی ہے جس میں کہ کسب رزق کے تمام تر ذرائع ووسائل کا شمول واحاطہ ہے اور زمین سے حاصل ہونے والی تمام چیزیں بھی اس میں شامل ہیں، خواہ وہ آدمی کی محنت سے حاصل ہوں یا بغیر محنت کے ، جیسا کہ بارش کے ذریعہ بہت سارے پیڑ پودے اللہ تعالی زمین میں اگا دیتا ہے۔ نیز اللہ تعالی کا اپنے بندوں پر یہ بہت بڑا فضل ہے کہ اس نے نفقہ کی مقدار کو آدمی کی خوش طبعی پر چھوڑ دیا ہے، جیسا کہ لفظ طیبات سے پہلے (من) کا حرف وارد ہے، جو تبعیض یعنی جزء پر دلالت کرتا ہے ، فرمایا: ﴿مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ﴾ " اپنی پاکیزہ کمائی میں سے "۔البتہ شریعت اسلامیہ میں زکاۃ کی مقدار متعین ہے۔

﴿وَمِمَّآ أَخۡرَجۡنَا لَكُم مِّنَ ٱلۡأَرۡضِ﴾" اور زمین میں سے تمہارے لئے ہماری نکالی ہوئی چیزوں میں سے "۔اللہ تعالی نے پیڑ پودے اگانے کی نسبت واحد اپنی ذات کی طرف کی ہے ، کیوں کہ کاشتکار محض کھیتی کرتا اور بیج بوتا ہے اور پھر اس کے اگنے کا انتظار کرتا ہے ، وہ صرف اللہ تعالی کی ذات ہے جس کی قدرت اور کمال کاریگری سے وہ بیج ایک حالت سے دوسری حالت میں تحویل ہو کر نمو کے مراحل طے کرتے ہوئے زمین کے باہر آتا ہے ، اور پھر زمین کے اوپر دھیرے دھیرے پروان چڑھتا ہے اور بڑا ہو کر پھل دینے لگتا ہے ، چنانچہ آیت میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالی ہی ان پیڑ پودوں کا خالق اور زمین کے اندر سے نکالنے والا ہے ، اور یہ سب اس کے فضل و کرم کی وجہ سے ہے ، لہذا مخلوقات کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالی کا فضل ہے ، اسی چیز کو اللہ تعالی نے سورہ واقعہ میں یوں بیان کیا ہے : ﴿أَفَرَءَيۡتُم مَّا تَحۡرُثُونَ ﴿٦٣﴾ ءَأَنتُمۡ تَزۡرَعُونَهُۥٓ أَمۡ نَحۡنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ﴿٦٤﴾﴾ [سورة الواقعة:٦٣-٦٤]۔ "اچھا پھر یہ بھی بتلاؤ کہ تم جو کچھ بوتے ہو۔ اسے تم ہی اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں"۔ اور اللہ تعالی نے کمائی کو بندوں کی طرف منسوب کیا ﴿مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ﴾" اپنی پاکیزہ کمائی میں سے "۔ اور زمین سے نکلنے والے چیزوں کو اپنی طرف ، تاکہ یہ پتہ چلے کہ یہ محض اس کا فضل ہے اور بندے اس کی اگا کر زمین سے نکالنے اور اس کو پروان چڑھانے سے یکسر عاجز و مجبور ہیں۔ واقعی یہ بیان کی گیرائی اور رب العالمین کے کلام کی عظمت ہے۔فسبحان الله العظيم وبحمده۔

اس کے بعد اللہ تعالی خرچ کے اختیار کے آداب و اخلاق بیان کر رہا ہے : ﴿وَلَا تَيَمَّمُواْ ٱلۡخَبِيثَ مِنۡهُ تُنفِقُونَ﴾" ان میں سے بری چیزوں کے خرچ کرنے کا قصد نہ کرو"۔ یعنی اس کمائی کی بری چیزوں کے اختیار کی کوشش اور قصد نہ کرو۔ (تَيَمَّمُواْ) کے اس لفظ میں کوشش ، اختیار ، قصد جس کا تعلق نیت سے ہے سب شامل ہیں ، اسی طرح (ٱلۡخَبِيثَ) میں وہ سارے مفہوم داخل ہیں جو اس اختیار کی خرابی پر دلالت کرتے ہیں ، چنانچہ اس واضح لفظ کے ذریعہ کمائی کی تمام بری صورت ، نوعیت اور درجے سے منع کر دیا گیا اور اس ایک لفظ میں متعدد معانی و مفاہیم جمع ہو گئے ، یقینا یہ رب عظیم کا عظیم بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خرچ کرتے وقت اچھی چیز نکالنا اور ایسی بری چیز نکالنے سے بچنا ضروری ہے جسے اگر خرچ کرنے والے کو وہی چیز دی جائے تو وہ خود اس کو نہ لے الا یہ کہ اس میں موجود خرابیوں کو نظر

انداز کرتے ہوئے زبردستی قبول کرلے ،جیساکہ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ﴿وَلَسۡتُم بِـَٔاخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغۡمِضُواْ فِيهِ﴾" جسے تم خود لینے والے نہیں ہو ہاں اگر آنکھیں بند کرلو "۔اس توجیہ میں اللہ تعالی نے خرچ کرنے والے انسان کو اپنی طرف لوٹایا ہے کہ اس موقف کا تصور واحساس وہ خود کرے کہ اگر وہ خراب اور ردی چیز خود اس کو دی جائے تو وہ ہرگز اس کو لینے کے تیار نہیں ہوگا،ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ اس میں موجود خرابیوں کو نظرانداز کرے ،ایسا اللہ تعالی نے اس لیے کیا تاکہ اس کو خرچ کرنے میں اختیار کی اہمیت کا احساس ہو کہ جو چیز تم خود اپنے لیے ناپسند کرتے ہو اس کو دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کرو۔اس سے بطور تعلیم وتربیت یہ مستفاد ہوا کہ ایک معلم ومرشد اور داعی ومربی اور اور اور بالعموم تمام مخاطبین حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے خود کو اسی حالت میں رکھیں جیسی حالت میں وہ کسی کو توجیہہ کرنا چاہتے ہیں،تاکہ تمام زاویوں اور ناحیوں سے معاملہ کی پوری تصویر ان کے لیے واضح ہو جائے،جیساکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:"لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ" (۱) (تم میں کا کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی نہ پسند جو اپنے لیے پسند کرتا ہے)۔

انفاق میں عمدہ،بہتر اور پاکیزہ چیز کے اختیار کی ہدایت "إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّبًا " (اللہ تعالی پاکیزہ ہے اور پاکیزہ چیزوں کو پسند کرتا ہے) کے عین موافق ہے۔اس میں ایک مومن کے لیے سخاوت،کرامت نفس، نفسیاتی محرکات کو قابو میں کرنے نیز اللہ تعالی کی رضا وخوشنودی کی چیزوں کی قربانی اور اپنے نفس کی بخیلی پر انہیں مقدم کرنے کی تعلیم ہے ،جب طبیعت کی اسی کے مطابق تربیت ہوگی اور اسی کا عادی بنایا جائے گا تو ایک وقت آئے گا کہ یہی کردار اس کی سرشت کا حصہ بن جائے گا۔اس آیت کے فوائد میں سے ہے کہ انفاق کے اس ادب میں خرچ کیے جانے والے کو عمدہ وپاکیزہ شئے دے کر خوش کردیا جاتا ہے اور وہ پورے انشراح صدر اور رضامندی سے اسے قبول کرلیتا ہے اور دینے والے کے حق میں اس کے دل سے دعا نکلتی ہے۔صدقہ خواہ زکاۃ ہو یا عام صدقہ اس کی تمام صورتوں میں اس طرز

(۱) صحيح البخاري ۱/۲۱ حديث نمبر ۱۳، مجمع الزوائد ۱/۱۰۰.

تعامل سے صدقہ لینے اور دینے والے کے درمیان سماجی تعلقات اور بھائی چارگی میں اضافہ ہوتا ہے ،اور ایسے صدقات رحم وکرم ، بھلائی ،صلہ رحمی اور اطاعت الٰہی میں رغبت کے سبب ہوتے ہیں۔

آیت کریمہ میں ایک مطلوبہ چیز کا حکم اور دوسری ممنوعہ چیز کی نہی ہے ،امر مطلوب اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: ﴿أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَٰتِ ﴾ "پاکیزہ (چیز) میں سے خرچ کرو"۔اور ممنوعہ چیز کی نہی اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے: ﴿وَلَا تَيَمَّمُواْ ٱلۡخَبِيثَ مِنۡهُ﴾" ان میں سے بری چیزوں کا قصد نہ کرو"۔یہ واضح بیان اس بات کی دلیل ہے کہ بات بالکل واضح ہونی چاہئے تاکہ سامنے والا اس کی عملی تطبیق کی اہمیت کو سمجھے اور اس پر کاربند ہونے کی کوشش کرے۔

اس کے بعد آیت عظیم توجیہ الٰہی کے ساتھ ختم ہوتی ہے: ﴿وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾" اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ بے پرواہ اور خوبیوں والا ہے"۔اس ارشار بانی کا آغاز صیغہ امر کے ساتھ ہوا ہے یعنی" جان لو" کہ اللہ سبحانہ وتعالی بے پرواہ اور خوبیوں والا ہے ،وہ مکمل طور سے بے پرواہ ہے اپنے بندوں سے ،ان کی کمائی سے ، ان کے خرچ سے ،اس کا مفہوم یہ کہ تمہارے اس خرچ کرنے کا اجر وثواب اللہ تعالی کی جانب سے تم ہی کو ملنے والا ہے ،ورنہ اللہ تعالی تو تم سے بالکل بے نیاز وبے پرواہ ہے ،وہ اس بات پر قادر ہے کہ فقیر ومسکین اور محتاج سب کو مالدار بنادے ،لیکن اس کی کمال حکمت کا تقاضا ہے کہ رزق کے اعتبار سے سماج میں ہر طرح اور ہر درجے کے لوگ رہیں۔نیز اللہ تعالی حمید کی صفت سے بھی متصف ہے ،چنانچہ زمین وآسمان ،دنیا وآخرت ہر جگہ اسی کی تعریف ہوتی ہے ،وہ اپنے تمام اقوال وافعال اور شرائع وتقدیرات میں لائق تعریف ہے ،وہ اپنے ارشادات واوصاف اور تمام اشیاء میں تعریف کے لائق ہے۔اگر بندہ اللہ تعالی کے اسماء وصفات کا صحیح ادراک کرلے تو اس کی اطاعت اور اس پر توکل واعتماد ضرور کرے گا۔اللہ تعالی کے فرمان ﴿وَٱعۡلَمُوٓاْ﴾"اور جان لو" اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تبارک وتعالی کے اسماء وصفات کا علم حاصل کرنا ضروری ہے ،اور انہی اسماء وصفات میں سے غنی وحمید بھی ہیں جو اس آیت کریمہ ﴿وَٱعۡلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾ میں وارد ہوئے ہیں۔

﴿ٱلشَّيۡطَٰنُ يَعِدُكُمُ ٱلۡفَقۡرَ وَيَأۡمُرُكُم بِٱلۡفَحۡشَآءِۖ وَٱللَّهُ يَعِدُكُم مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ وَفَضۡلٗاۗ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٞ ٢٦٨﴾

ترجمہ:

"شیطان تمہیں فقیری سے دھمکاتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے ، اور اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علم والا ہے (۲۶۸)"۔

اب یہاں ارشاد قرآنی میں حرص ولالچ اور انفاق کی وجہ سے فقیری کے خوف کے اسباب بیان کیے جارہے ہیں، تاکہ ایک مومن کو ان اسباب کا علم رہے جو اس کو حرص ولالچ اور نفقہ میں کنجوسی اور بخیلی پر آمادہ کرتے ہیں ، چنانچہ اللہ تعالیٰ ان اسباب کو بیان کرکے ان خرابیوں کو ختم کرنا چاہتا ہے تاکہ ایک مومن اپنی جمع پونجی میں سے پورے اطمینان کے ساتھ عمدہ اور بھلے طریقے سے خرچ کرے، ارشاد ربانی ہے: ﴿ ٱلشَّيْطَٰنُ يَعِدُكُمُ ٱلْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِٱلْفَحْشَآءِ ۖ وَٱللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴾ "شیطان تمہیں فقیری سے دھمکاتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے ، اور اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علم والا ہے"۔ آیت کے شروع میں خوف کے اسباب بیان کیے گئے جو انفاق کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں ، اور یہ انسان کے دل میں پیدا ہونے والے شیطانی وسوسے ہیں: ﴿ ٱلشَّيْطَٰنُ يَعِدُكُمُ ٱلْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِٱلْفَحْشَآءِ ﴾ "شیطان تمہیں فقیری سے دھمکاتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے "۔ یعنی وہ لوگوں میں وسوسہ ڈال کر انہیں فقیری اور غربت کا خوف دلاتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں خرچ کرنے سے باز آجائیں اور انفاق میں یا بہتر وپاکیزہ چیز اختیار کرنے میں تردد کرنے لگیں، اور بسا اوقات مال کی قلت کے ڈر سے سرے سے خرچ کرنا ہی چھوڑ دیں ، اور اگر خرچ کریں بھی تو اپنے پاس کی سب سے خراب چیز نکالنے کی کوشش کریں ، اس امید سے کہ عمدہ اور اچھے مال سے نفع زیادہ ہوگا اس لیے اس کو اپنے پاس رکھ لیں ، اسی لیے آدمی فقیری کے ڈر سے صدقہ میں گھٹیا مال دیتا ہے اور جو عمدہ اور بہتر مال اپنے پاس روکے رکھتا ہے اس سے مالداری کی امید لگائے بیٹھا رہتا ہے، چنانچہ اس کا اصل سبب شیطان ہے جو اس کو فقیری سے دھمکاتا ہے: ﴿ يَعِدُكُمُ ٱلْفَقْرَ ﴾ "وہ تمہیں فقیری سے دھمکاتا ہے"۔

اور جہاں تک فواحش ومنکرات اور بے حیائیوں کا تعلق ہے تو وہ اس کا حکم دیتا ہے: ﴿ وَيَأْمُرُكُم بِٱلْفَحْشَآءِ ﴾ " اور وہ تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے "، وہ ان منکرات کو خوب مزین

کر کے اوران تک پہنچنے کے اسباب مہیا کرا کر ان منکرات کے ارتکاب کی دعوت دیتا ہے، انہی من جملہ منکرات وبے حیائیوں میں سے بخیلی اور کنجوسی بھی ہے، ساتھ ہی وہ ان اسباب کو خوب مزین کرتا ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی جان ومال سے فواحش ومنکرات کے ارتکاب پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ شیطان کی یہ صفت کہ ﴿وَيَأۡمُرُكُم بِٱلۡفَحۡشَآءِ﴾ "وہ تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے "، اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا تسلط ان فواحش کے حکم کی حد تک پہنچا ہوا ہے، اس میں ایک مومن کے لیے تنبیہ اور تحذیر ہے کہ وہ شیطان کے اثر ورسوخ اور اس کی عداوت ودشمنی کی حد سے آگاہ رہے ، جس کا تقاضا ہے کہ مومن ہر آن ولمحہ خصوصا شیطانی آماجگاہوں کے پاس اس سے اللہ تعالی کی پناہ مانگے۔

البتہ اللہ تعالی مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے: ﴿وَٱللَّهُ يَعِدُكُم مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ وَفَضۡلًاۗ وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ﴾ " اور اللہ تعالیٰ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے ، اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علم والا ہے "۔ چنانچہ اللہ تعالی وعدہ کرتا ہے اور اس کا وعدہ حق ہے اپنی مغفرت کا نیز رزق کا۔ اور (فضل) کا لفظ امام شوکانی کے بقول یہ ہے کہ جو انہوں نے خرچ کیا ہے بعد میں اس سے بہتر ان کو ملے، لہذا اللہ تعالی ان کو رزق کی کشادگی عطا کرتا ہے اور آخرت میں اس سے کہیں زیادہ اور بہتر واعلی نعمت سے نوازے گا[1]۔ اللہ تعالی کا یہ وعدہ ایک مومن کو بھلائی، انفاق اور سخاوت پر آمادہ کرتا ہے، کیوں کہ اس کو فقیری کا کوئی خوف نہیں ہوتا، بلکہ اسے مالداری اور فضل الہی کی امید ہوتی ہے، نیز وہ خرچ کرنے کے لیے رزق کا عمدہ حصہ منتخب کرتا ہے، کیوں کہ اس کا اجر وثواب اس کو اپنے رب کریم سے لینا ہوتا ہے۔

اس کے بعد موقع ومقام کی مناسبت سے آیت کا اختتام یوں ہو رہا ہے: ﴿وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ﴾ " اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علم والا ہے " ، اللہ تعالی وسعت والا ہے اپنی نوازشات وعطیات اور علم وقدرت میں، کوئی مخلوق اللہ سبحانہ وتعالی کی وسعت کا اندازہ نہیں لگا سکتی اور نہ اس کی حقیقت جان سکتی ہے، یہ صرف وہی جان سکتا ہے۔ اور اللہ تعالی علم والا ہے وہ بندوں کے تمام اعمال سے بخوبی واقف ہے، وہ کیا دیتا ہے، کیسے دیتا ہے، کس چیز میں سے دیتا ہے اور کس نیت سے دیتا ہے سب کچھ اس کے علم میں ہے، اور اس کے علم سے کوئی چیز مخفی اور ڈھکی چھپی نہیں ہے، لہذا ضروری ہے کہ ایک مومن اللہ تعالی

---

(١) فتح القدير ١/٢٨٩.

کے اس مقام و مرتبے اور عظیم نوازشات کالحاظ کرتے ہوئے کوئی عمل انجام دے۔ان مفاہیم سے یہ فائدہ ماخوذ ہوا کہ موقع و محل کی مناسبت سے توجیہہ وارشاد کے اخیر میں اللہ تعالی کے اسماء وصفات کے ذریعہ نصیحت کی جانی چاہیئے، کیوں کہ اسماء وصفات کا علم مومن کو خیر پر آمادہ کرنے اور شر سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾﴾

ترجمہ:

"وہ جسے چاہے حکمت اور دانائی دیتا ہے اور جو شخص حکمت اور سمجھ دیا جائے وہ بہت ساری بھلائی دیا گیا ، اور نصیحت صرف عقلمند ہی حاصل کرتے ہیں(٢٦٩)"۔

اس کے بعد اللہ تعالی حکمت اور صاحب حکمت کی فضیلت و خصوصیت بیان کر رہا ہے ، نیز یہ کہ وہی اللہ حکمت ودانائی عطا کرنے والا ہے ،فرمایا: ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ "وہ جسے چاہے حکمت اور دانائی دیتا ہے اور جو شخص حکمت اور سمجھ دیا جائے وہ بہت ساری بھلائی دیا گیا "۔آیت کریمہ کے ابتداء میں یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالی ہی حکمت دینے والا ہے،اس کی کوئی مخلوق کسی کو یہ حکمت نہیں عطا کر سکتی ، حتی کہ خود اپنے لیے حکمت کے حصول کی اس میں استطاعت نہیں ، اس حکمت سے نوازنے والی صرف اور صرف اللہ تعالی کی ذات ہے۔ ﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ﴾ اس جملہ میں حکمت کی نوازش کو اللہ سبحانہ وتعالی کی ذات میں منحصر کر دیا گیا ہے،لہذا کسی کی استطاعت میں نہیں کہ وہ اسے اپنے لیے اختیار کر لے یا کسی دوسرے کو دے سکے،ہاں صرف اللہ تعالی اپنی مشیئت و مرضی سے جس کو نوازنا چاہے اسے نواز دے۔﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ﴾ " وہ جسے چاہے حکمت اور دانائی دیتا ہے "۔اس سے مستفاد ہوا کہ جو حکمت ودانائی کا خواہشمند ہو تو اس کے طلب میں وہ اللہ تعالی کے حضور پہلے دعا اور اس اطاعت کا التزام کرے اس کے بعد حکمت کے اسباب و عوامل کو بروئے کار لائے۔

حکمت کا معنی ومفہوم: حکمت کے بہت سارے معانی ہیں: نبوت، فہم قرآن، علم، فقہ، قول کی درستگی، اللہ تعالی کے دین میں زہد وورع، خوف الہی، دین کا شعور وفہم، علم وعمل(۱)، سنت، یہ تمام چیزیں حکمت کے مفہوم میں آتی ہیں۔امام کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حکمت کے مفہوم میں جمہور کا قول راجح ہے کہ حکمت کا مفہوم نبوت کے ساتھ نہیں، بلکہ اس کا مفہوم بہت عام اور وسیع ہے، ہاں حکمت کا سب سے اعلی درجہ نبوت ہے(۲)۔ حکمت کے مفہوم کے ان مختلف مفاہیم سے معلوم ہوا کہ حکمت کا لفظ بہت سارے عظیم فضائل وخصائص اور معانی کو شامل ہے، لہذاانسان قرآن کریم کے بلاغت بیان پر غور کرے کہ کیسے حکمت کے ایک لفظ میں اتنی ساری خیر کی تمام انواع واقسام کااستیعاب ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی صاحب حکمت کے مقام ومرتبے کو بیان کررہاہے، فرمایا: ﴿وَمَن يُؤْتَ ٱلْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ "اور جو شخص حکمت اور سمجھ دیا جائے وہ بہت ساری بھلائی دیا گیا" اس میں حکمت کا مقام بیان کیا گیاہے وہ یہ کہ جواس کو پالے اس نے بہت ساری بھلائی پالی، کیوں کہ حکمت اطاعت اور رضائے الہی کے مطابق عمل تک لے جاتی ہے اور پھر یہ صاحب حکمت اہل جنت کے زمرے میں شامل ہو جاتاہے۔اس حکمت کے ذریعہ فہم وفراست کو جلاملتی ہے، عقل کے دروازے کھلتے ہیں، عزائم کی بلندی عطاہوتی ہے، رزالتوں سے حفاظت ہوتی ہے، اعلی منازل کا حصول ہوتا ہے، جہالت وغلطی دور ہوتی ہے، حق اپنا اصل مقام حاصل کرتا ہے، لوگوں کو ترقی ملتی ہے، اعلی اخلاق وآداب کا ظہور ہوتاہے، اور صاحب حکمت لوگوں میں محبوب اور بہت سارے دوسرے لوگوں پر مقدم ماناجاتاہے، کیوں کہ اس میں بہت ساری خوبیاں جلوہ گرہوتی ہیں، ﴿وَمَن يُؤْتَ ٱلْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ "اور جو شخص حکمت اور سمجھ دیا جائے وہ بہت ساری بھلائی دیا گیا"۔

لہذا حکمت کی تلاش اوراس کے حصول کی سعی پیہم میں اللہ سے دعا، اس کی اطاعت میں محنت اور اس تک پہنچنے کے اسباب کو بروئے کار لانا ضروری ہے اور اس کے حصول کا سب سے اہم سبب کتاب وسنت کا علم اوراس کے مطابق عمل کی کوشش ہے۔

(۱) زاد المسير ۲۸۰/۱ ، وتفسير ابن كثير ۳۲۹/۱.

(۲) تفسير ابن كثير ۳۲۹/۱.

آیت کے اخیر میں ایک نصیحت ہے جو غور وفکر اور نصیحت والوں کے لیے اللہ تعالی کی طرف سے ایک غنیمت ہے ،فرمایا: ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّآ أُوْلُواْ ٱلْأَلْبَٰبِ﴾" اور نصیحت صرف عقلمند ہی حاصل کرتے ہیں"۔ چنانچہ موعظت و نصیحت سے وہی شخص مستفید ہوتا ہے جس کے پاس صحیح عقل ہو اور بات کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔

﴿وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُم مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُهُۥ ۗ وَمَا لِلظَّٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ إِن تُبْدُواْ ٱلصَّدَقَٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا ٱلْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّـَٔاتِكُمْ ۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٧١﴾﴾

ترجمہ:

"تم جتنا کچھ خرچ کرو یعنی خیرات اور جو کچھ نذر مانو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں (۲۷۰)۔ اگر تم صدقے خیرات کو ظاہر کرو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر تم اسے پوشیدہ پوشیدہ مسکینوں کو دے دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے ، اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کی خبر رکھنے والا ہے(۲۷۱)"۔

سابقہ آیات کے بعد اس آیت کریمہ میں مخاطبین سے لوگوں کے نفقات کے متعلق اللہ تعالی کے وسیع وعریض علم کا بیان ہے ،ارشاد ہے: ﴿وَمَآ أَنفَقْتُم مِّن نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُم مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُهُۥ﴾ "تم جتنا کچھ خرچ کرو یعنی خیرات اور جو کچھ نذر مانو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے"۔ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالی کو بندوں کے خرچ کئے ہوئے نفقات کا مکمل علم ہے خواہ وہ کم ہوں یا زیادہ، چھوٹے ہوں یا بڑے ،اور خواہ وہ حقیر ہوں یا عمدہ اور اچھے ہوں یا خراب، اللہ تعالی ان سب کو اپنے احاطہ علم میں لیے ہوئے ہے۔ اور آدمی کو اس بات کے جاننے کا فائدہ کہ اس کے نفقہ اللہ تعالی کے احاطہ علم میں پرورش پاتا ہے یہ ہے کہ پھر وہ اپنے تمام قسم کے نفقات میں اپنے آپ کا مراجعہ اور محاسبہ کرتا رہے گا۔

اسی طرح آیت کریمہ میں اللہ تعالی کے ان اعمال صالحہ کے متعلق علم کا بھی بیان ہے جو آدمی خود سے اپنے آپ پر لازم کرلیتا ہے جو کہ اس پر لازم وواجب نہیں تھے مثلا نذر وغیرہ، فرمایا: ﴿أَوْ نَذَرْتُم

﴿مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَعْلَمُهُۥ﴾ " اور جو کچھ نذر مانو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے"۔اس میں سے کوئی بھی چیز اللہ تعالی پر مخفی نہیں ہے، لہذا مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالی کی منہیات سے دور رہے، مثال کے طور پر ردی اور خراب چیز خرچ نہ کرے ، کیوں کہ اگر ایسا کرتا ہے تو خرچ کرکے بھی خود پر ظلم کر رہا ہے، کیوں کہ اس نے اللہ تعالی کی مرضی کے برعکس خرچ کیا، اللہ تعالی نے اسی ظلم سے ڈراتے ہوئے فرمایا: ﴿وَمَا لِلظَّـٰلِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ﴾" اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں"۔یعنی ان ظالموں کا کوئی مددگار نہیں جو انہیں اللہ تعالی کے عذاب سے بچا سکے۔اس میں ظالموں کے لیے شدید ترین وعید ہے۔

ہاں البتہ اخلاص کے ساتھ عمدہ مال نکالنا اور کوئی ریاکاری، ایذا رسانی اور احسان نہ جتانا خرچ کرنے والے کے حق میں بہت عظیم خیر ہے ، اللہ تعالی اس کو شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے اس کے اجر وثواب میں خوب اضافہ کرتا ہے، وہ لوگوں کی نظر میں اور جن پر خرچ کرتا ہے وہ لوگ اس کی نظر میں محبوب ہو جاتے ہیں کیوں کہ اس کی وجہ سے ان کو خوش دلی ملی ہوتی ہے اور لوگ اس کے حق میں دعا گو ہوتے اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور محبت کرتے ہیں اور اس طرح دونوں طرف سے افراد سماج کے مابین اجتماعی تعلقات بحال رہتے ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالی صدقات ظاہر کرنے اور پوشیدہ رکھنے کے متعلق حکم اور اس بنیاد پر مرتب ہونے والے اجر وثواب کو بیان کر رہا ہے، ارشاد ربانی ہے: ﴿إِن تُبْدُوا۟ ٱلصَّدَقَـٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ﴾" اگر تم صدقے خیرات کو ظاہر کرو تو وہ بھی اچھا ہے"۔ ظاہری صدقات کی یہ مدح وتعریف ہے۔ ﴿وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا ٱلْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾" اور اگر تم اسے پوشیدہ پوشیدہ مسکینوں کو دے دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے " یہ پوشیدہ صدقات کی مزید تعریف ہے۔علامہ ابن السعدی رحمہ اللہ تعالی فرماتے ہیں: قواعد شرعیہ مصلحت کی رعایت پر دلالت کرتے ہیں، چنانچہ جب امید ہو کہ دوسرے لوگ بھی اس کے اقتداء میں نیک کام کرنے لگیں گے اور اس کے لیے طبیعتوں میں نشاط آئے گا تو ایسی صورت میں اظہار عمل زیادہ بہتر ہے(١)۔اللہ تعالی نے اظہار واخفاء دونوں صورتوں کی تعریف کی ہے ، نیز اللہ

---

(١) تفسير ابن السعدى ١/٢١٥.

تعالیٰ ظاہر کرنے والے کی نیت سے بخوبی واقف ہے ، ممکن ہے اس کی نیت لوگوں کو اقتداء پر آمادہ کرنا ہو اور اس وجہ سے اس کی فضیلت بڑھ سکتی ہے۔

آیت صدقہ کے تین فوائد بیان کئے گئے ہیں : اللہ تعالی کی طرف سے تعریف ﴿فَنِعِمَّا هِيَ﴾ "وہ بھی اچھا ہے" ، صدقہ کرنے والے کے لیے خیر کا حصول: ﴿فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ " یہ تمہارے حق میں بہتر ہے " ، اور گناہوں کی معافی ﴿وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ﴾ " وہ تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا "۔اس کے بعد آیت کا اختتام عظیم موعظت سے ہو رہا ہے: ﴿وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ " اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال کی خبر رکھنے والا ہے " ، وہ تمہارے خرچ کی نوعیت، مقدار، خوبی، خرابی ہر اعتبار سے باخبر ہے، بلکہ اس کو خرچ کرنے والے کی نیت واسباب کا بھی پتہ ہے ، بندے کا کوئی عمل اس سے مخفی اور پوشیدہ نہیں۔انسان اگر اس کو اچھی طرح سے سمجھ لے اور خرچ کے وقت اللہ تعالی کے علم کا پورا یقین ہو تو یہ چیز اس کو مراد الٰہی کے کمال تک پہنچا دے گی۔

﴿لَّيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۗ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٢﴾﴾

ترجمہ:

"انہیں ہدایت پر لا کھڑا کرنا تیرے ذمہ نہیں بلکہ ہدایت اللہ تعالیٰ دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تم جو بھلی چیز اللہ کی راہ میں دو گے اس کا فائدہ خود پاؤ گے۔ تمہیں صرف اللہ کی رضامندی کی طلب کے لئے ہی خرچ کرنا چاہیے تم جو کچھ مال خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا ، اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا (٢٧٢)"۔

قرآن کریم کا سیاق غیر مسلموں پر خرچ کرنے کے بیان کی طرف منتقل ہو رہا ہے، آیت کے ابتداء میں ہدایت وتوفیق کے متعلق یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ ہدایت دینا کسی مخلوق کے ہاتھ میں نہیں ہے، فرمایا: ﴿لَّيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ " انہیں ہدایت پر لا کھڑا کرنا تیرے ذمہ

نہیں بلکہ ہدایت اللہ تعالیٰ دیتا ہے جسے چاہتا ہے"۔اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے کہ ہدایت توفیق کے آپ مالک نہیں ہیں اور نہ آپ پر یہ فرض ہے،اے نبی! آپ کی ذمہ داری صرف توجیہ وارشاد اور بیان کی ہے، رہی بات ہدایت توفیق کی تو یہ اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے، لوگوں کو ہدایت دینا آپ پر واجب نہیں ہے۔اس کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ذمہ داری اور لوگوں کی ہدایت کا غم دور کیا گیا ہے جس کی آپ کو شدید خواہش تھی، جیسا کہ آپ کے متعلق ایک دوسری آیت میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿حَرِيصٌ عَلَيۡكُم بِٱلۡمُؤۡمِنِينَ رَءُوفٞ رَّحِيمٞ﴾ [سورة التوبة:١٢٨]۔"جو تمہارے فائدے کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں، ایمان داروں کے ساتھ بڑے شفیق اور مہربان ہیں"۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ دوسرے لوگ خواہ جتنا بھی اصرار اور جتن کرلیں وہ بدرجہ اولی کسی کو ہدایت نہیں دے سکتے، البتہ دعا ، توجیہ وارشاد اور اسوہ حسنہ یہ ساری چیزیں غیر مسلموں کے دخول اسلام کا سبب بن سکتی ہیں۔دعوت الی اللہ کے میدان میں ایک داعی کے لیے یہ عظیم فائدے والی بات ہے۔اس سے یہ معلوم ہوا کہ لوگوں میں اسلام کے منہج واصول اور محاسن ومقاصد بیان کرکے اللہ کے دین کی رہنمائی کے اسباب اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالی دعا کرتے رہنا بھی اہم اور ضروری ہے، جیسا کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی "اللهم أَعِزَّ الإِسْلَامَ بِأَبِي جَهْلِ بْنِ هِشَامٍ أَوْ بِعُمَرَ، فَأَصْبَحَ فَغَدَا عُمَرُ عَلَى رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم فَأَسْلَمَ"(١) ۔(اے اللہ! تو ابوجہل بن ہشام یا عمر میں سے کسی ایک کے ذریعہ اسلام کو عزت اور غلبہ نصیب فرما، چنانچہ صبح ہوتے ہی عمر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آکر اسلام قبول کرلیتے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ دوس کے لیے دعا فرمائی: "اللهم اهْدِ دَوْسًا وَائْتِ بِهِمْ"(٢) ۔(اے اللہ قبیلہ دوس والوں کو ہدایت دے اور انہیں میرے پاس بھیج دے"۔

(١) سنن الترمذي ٥/٥٧٧ حديث نمبر ٣٦٣٨ و ٣٦٨١.

(٢) صحيح البخاري ٢/٣٤١ حديث نمبر ٢٩٣٧.

تفاسیر میں وارد ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں کو ان سے اسلام قبول کرانے کی غرض سے صدقہ دینا بند کر دیا تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی(۱)۔ کیوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا کہ صدقہ صرف مسلمانوں کو دیا جائے لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مانگنے والوں کو صدقہ دینے کا حکم دے دیا خواہ وہ کسی دین سے تعلق رکھنے والا ہو(۲)۔ اس سے معلوم یہ ہوا کہ منہج اسلام منہج ربانی ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے اپنے رسول کے اس اجتہادی حکم کی موافقت نہیں کی، نیز یہ بھی مستفاد ہوا کہ دین اسلام مسلم وکافر سب کے لیے باعث رحمت ہے، اور منہج اسلام غیر مسلموں کو اس دین کی رواداری اور صداقت اس دین کے اختیار پر آمادہ کرتی ہے۔ اور یہ تبھی ممکن ہے جب اس دین کو کائنات کے خالق ومالک کی طرف ہونا تسلیم کیا جائے۔

اس کے بعد آیت کریمہ میں چندان امور کا بیان ہو رہا ہے جن کا تعلق لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے خدشات سے ہے کہ اس انفاق اور خرچ کے بدلے میں ان کو کیا ملنے والا ہے ، چنانچہ یہ آیت مومن کو یہ بتلا رہی ہے کہ وہ جو کچھ دوسروں پر خرچ کر رہا ہے اس کا نفع اسی کو ملنے والا ہے: ﴿وَمَا تُنفِقُوا۟ مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ﴾ "اور تم جو بھلی چیز اللہ کی راہ میں دوگے اس کا فائدہ خود پاؤگے " ، یعنی اس کا اجر وثواب اسی کو ملنے والا ہے۔ ایک منفق اس دنیا میں دوسروں پر جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کا ثواب اور بدلہ دنیا اور آخرت میں اسی کو ملنے والا ہے، دنیا میں اس کا بدلہ برکت، دفع ضرر اور کثرت رزق کی شکل میں اور آخرت میں مغفرت اور بلندئ درجات کی شکل میں، اور اللہ تعالی کا فضل وکرم لا محدود ہے۔ اس آیت میں انفاق کو لفظ خیر سے مقید کیا گیا ہے ﴿مِنْ خَيْرٍ﴾ تاکہ اس سے ردی اور گھٹیا چیز نکل جائے کیوں کہ ایسی چیزوں کا شمار خیر میں نہیں ہوتا۔ اس میں مومن کی حوصلہ افزائی مقصود ہے کہ وہ اپنے پاس کی عمدہ چیز خرچ کرے۔ آگے اللہ تعالی اصلاح نیت کے متعلق ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ٱبْتِغَآءَ وَجْهِ ٱللَّهِ﴾ " تمہیں صرف اللہ کی رضامندی کی طلب کے لئے ہی خرچ کرنا چاہیے"۔ یہ ہدایت ربانی ہے کہ تمہارے خرچ کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہونا چاہئے، اور اس کے علاوہ

---

(۱) تفسیر جلالین ٤٦.

(۲) تفسیر ابن کثیر ٣٣١/١.

کوئی دوسرا مقصد یعنی ریاکاری اور دیکھاوا وغیرہ نہ ہو۔ مزید اس سے ایک دوسری صورت کا بھی ازالہ ہوتا ہے، مثلاً بسا اوقات خرچ کرنے کے بعد دل میں ایسے خدشات جنم لیتے کہ یہ خرچ تو صحیح جگہ پر نہیں ہوا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: جب تم رضائے الٰہی کے لیے دے رہے ہو تو پھر تم کو اس کی پرواہ نہیں ہونی چاہیے کہ وہ لینے والا اس کا کیا کرتا ہے، کیوں کہ ایک صدقہ دینے والے نے جب اللہ کی خوشنودی کے لیے صدقہ دے دیا تو اب اس کا اجر اللہ تعالی کے پاس مسلم ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ حقیقت میں اس نے کسی نیک آدمی کو دیا ہے یا فاسق وفاجر کو اور وہ مستحق تھا یا نہیں، اس کو اپنی نیت کے حساب سے اجر وثواب مل جانا ہے(۱) ۔ یہ شریعت اسلامیہ کی نزاکت اور انسانی طبیعت کے خدشات اور دقائق پر اس کی عنایت کی مثال ہے جو اس شریعت کے من جانب اللہ ہونے کا پختہ ثبوت ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی اس صدقہ کے مکان ومحل کی مزید تاکید کر رہا ہے کہ یہ صدقہ اللہ تعالی کے وہاں بالکل محفوظ جگہ پر ہے جہاں خرچ کرنے والے کے ساتھ حق تلفی کا کوئی خدشہ نہیں، فرمایا: ﴿وَمَا تُنفِقُوا۟ مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ﴾ " تم جو کچھ مال خرچ کروگے اس کا پورا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا ، اور تمہارا حق نہ مارا جائے گا "۔ یعنی خرچ کرنے والے کے خرچ میں عند اللہ کوئی حق تلفی نہیں ہوگی۔ یہ مزید تاکید ہے کہ خرچ کرنے والے کا مال اللہ تعالی کے وہاں ہر طرح کے ضیاع سے محفوظ ہے۔

﴿لِلْفُقَرَآءِ ٱلَّذِينَ أُحْصِرُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِى ٱلْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ ٱلْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ ٱلتَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُونَ ٱلنَّاسَ إِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنفِقُوا۟ مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٌ ﴿٢٧٣﴾﴾

ترجمہ:

"صدقات کے مستحق صرف وہ غربا ہیں جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے، جو ملک میں چل پھر نہیں سکتے، نادان لوگ ان کی بے سوالی کی وجہ سے انہیں مالدار خیال کرتے ہیں، آپ ان

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۳۳۱.

کے چہرے دیکھ کر قیافہ سے انہیں پہچان لیں گے وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے ، تم جو کچھ مال خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ اس کا جاننے والا ہے(۲۷۳)"۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی مومنوں کی پہلی جماعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سوال سے پرہیز کی کیفیت بیان کر رہا ہے جو ہر دور میں ہر سماج کے لیے بطور نمونہ ہے ، فرمان الٰہی ہے :﴿ لِلْفُقَرَآءِ ٱلَّذِينَ أُحْصِرُوا۟ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ ﴾" صدقات کے مستحق صرف وہ غربا ہیں جو اللہ کی راہ میں روک دیئے گئے "۔ آیت کریمہ کے اس اسلوب میں توجہ دلائی گئی ہے کہ ان فقراء کا دھیان رکھا جائے جو اللہ کے راستے میں لگے ہیں اور اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کما نہیں سکتے : ﴿ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِى ٱلْأَرْضِ ﴾"جو ملک میں چل پھر نہیں سکتے "۔ان سے روئے زمین میں چلنے پھرنے کی نفی کی گئی ہے ،یعنی وہ لوگ فی سبیل اللہ مشغول ہونے کی وجہ تجارت اور کام وغیرہ کی غرض سے کہیں جا نہیں سکتے۔اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں سے سوال نہ کرنے والے محتاجوں کی یاد دہانی اور ان کی طرف توجہ دلانے کے ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ ایسے ضرورت مند بہتر طریقے سے کما نہیں سکتے۔اس سے معلوم ہوا کہ سماج میں ایسے فقراء اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں جنہیں کوئی نہیں جانتا اور ان کے احوال کی عدم جانکاری کی وجہ سے لوگ ان کی طرف توجہ نہیں دے پاتے۔ نیز اس سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ فقیر اپنی فقیری کی وجہ سے ملامت کا مستحق نہیں ہے کیوں کہ کبھی تو فقیری اس کی ذاتی مجبوری کی وجہ سے ہوتی ہے کبھی فکری مجبوری کی وجہ سے اور کبھی ہنر کی مجبوری ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جس سے وہ اپنی ضروریات پوری کر سکے، لہذا مالدار شخص کو ان امور سے آگاہ رہنا چاہیے تاکہ فقیر کے بارے میں بے جا بدگمانی کا شکار ہو کر اس کو سستی وکاہلی اور کام چوری کا طعنہ نہ دے، بلکہ اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کی موجودہ حالت بدل جائے اور وہ کمانے دھانے لگے تو اس کی مدد اور رہنمائی کرے۔اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ مالداروں کو فقیروں کے احوال سے باخبر کرتے رہنا چاہئے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ لوگ حسن عمل میں مختلف ہیں، چنانچہ بعض خود کو اللہ تعالی کے راستے میں رکھنا پسند کرتے ہیں، مثال کے طور پر علم کے میدان میں، ایسا شخص اپنا تمام تر وقت اسی

میں صرف کرتا ہے،اس میں دوسری کوئی صلاحیت نہیں ہوتی اور بسااوقات ایسا شخص ضروریات زندگی کے وہ سامان مہیا نہیں کر پاتا جن کے ذریعہ وہ دوسروں سے بے نیاز ہو سکے، لہذا جس اللہ نے ایک مالدار کو مالداری اور کمانے کے ہنر دیا اور حصول رزق کے اسباب ووسائل میسر کیے اسی اللہ نے اس شخص کو بھی علم کی راہ میں لگایا تاکہ اس کی زندگی اللہ تعالی کی راہ میں بسر ہو اور اسلام کے سرحدوں میں سے ایک سرحد کو دشمنوں سے محفوظ رکھے۔

آگے آیت میں اللہ تعالی ان فقراء کے اوصاف بیان کرتے ہوئے خرچ کرنے والوں کو متوجہ کرے رہا ہے، ان کی صفت ایسی ہے کہ ﴿يَحْسَبُهُمُ ٱلْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ ٱلتَّعَفُّفِ﴾" نادان لوگ ان کی بے سوالی کی وجہ سے انہیں مالدار خیال کرتے ہیں"۔یعنی ان کی حقیقی حالت سے لاعلم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خوشحال اور دوسروں کے نفقات سے بے نیاز ہیں، وجہ یہ ہے کہ وہ خود کو سوال کرنے سے بچائے رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ کسی ایسی چیز کا اظہار تک نہیں کرتے جن سے ان کی فقیری اور محتاجی کا پتہ چل سکے، ہر معاملہ میں ان کی یہی اعلی صورت حال ہے،اس لیے ان کی صورت حال سے صرف وہی واقف ہو سکتا ہے جو ان کے اندرونی احوال سے پہلے سے باخبر ہو۔قرون اولی کے مسلمانوں کی یہ تصویر بعد کے فقراء ومساکین کے لیے ایک درس اور نمونہ ہے۔

ان کی ایک اور صفت اللہ تعالی بیان کر رہا ہے جس سے بعض لوگ انہیں لوگوں کے درمیان پہچان سکتے ہیں، فرمایا:﴿تَعْرِفُهُم بِسِيمَٰهُمْ﴾" آپ ان کے چہرے دیکھ کر قیافہ سے انہیں پہچان لیں گے"،یعنی ان کے فقیری کی علامت ان پر ظاہر ہونے والی محتاجی کی صفت ہے، لہذا اے مخاطب اور خرچ کرنے والے تم انہیں ان پر ظاہر فقر کی علامتوں سے پہچان جاؤ گے مثلا جسمانی تھکاوٹ جس سے کہ فقیر وغنی اور مریض وصحت مند کا پتہ چل جاتا ہے،اور اسی طرح ان کی تواضع اور خاکساری جو ان کے جسم اور معاملات سے ظاہر ہوتی ہے اس سے بھی ان کی فقیری کا پتہ چلتا ہے، ہاں ان کی ذات وشخصیت سے ان کی فقیری ظاہر نہیں ہوتی جیسا کہ ان کا وصف بیان کیا گیا کہ: ﴿يَحْسَبُهُمُ ٱلْجَاهِلُ أَغْنِيَآءَ مِنَ ٱلتَّعَفُّفِ﴾"نادان لوگ ان کی بے سوالی کی وجہ سے انہیں مالدار خیال کرتے ہیں"۔ چنانچہ ان کی دو عظیم تصویر پیش کی گئی ہے،ایک تصویر تو ان کی تعفف کی ہے جس کی وجہ

سے ان کی حالت سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا سوائے اس کے جو پہلے سے ان کے احوال سے باخبر ہو، دوسری صورت وہ ہے جس کو سمجھدار لوگ بھانپ لیتے ہیں: ﴿تَعۡرِفُهُم بِسِيمَٰهُمۡ﴾ "آپ ان کے چہرے دیکھ کر قیافہ سے انہیں پہچان لیں گے"۔ یہ اللہ رب العالمین کی جانب سے ان برگزیدہ شخصیات کا عمیق تجزیہ ہے جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان کے نذرانے پیش کئے۔

آگے اللہ تعالی مزید ان کے احوال بیان کر رہا ہے: ﴿لَا يَسۡـَٔلُونَ ٱلنَّاسَ إِلۡحَافٗا﴾" وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے " ، وہ لوگوں سے سرے سے سوال نہیں کرتے، اس لیے سوال میں ضد کا صدور بھی ان سے نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ سوال سے پرہیز کرنے والے ہیں اور کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کرتے بلکہ دوسروں کو اپنے فقر و محتاجی کا احساس تک نہیں ہونے دیتے۔ یہ ان کی ایسی اعلی صفات ہیں کہ آدمی ان کی تعظیم و تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آیت میں (الحاف) سے مراد الحاح (یعنی ضد) ہے۔ چنانچہ انہیں جتنی بھی شدید ضرورت ہو پھر بھی ان کی طرف سے کبھی سوال کا اظہار نہیں ہوتا۔ رضی اللہ تعالی عنہم۔

من جملہ فوائد میں سے قرآن کریم میں ترکیب الفاظ کی خوبصورتی ہے، اس کی ایک مثال یہ آیت کریمہ ہے۔ ان آیات کے الفاظ و تراکیب کی خوبصورتی ملاحظہ ہو ﴿لَا يَسۡتَطِيعُونَ ضَرۡبٗا فِي ٱلۡأَرۡضِ﴾، ﴿يَحۡسَبُهُمُ ٱلۡجَاهِلُ أَغۡنِيَآءَ مِنَ ٱلتَّعَفُّفِ﴾، ﴿تَعۡرِفُهُم بِسِيمَٰهُمۡ﴾ ، ہر لفظ اپنی جگہ پر اس قدر واضح ہے کہ عقلیں حیران ہو جائیں، بلکہ ہر جملہ اپنے حسن ترکیب اور دقت تعبیر سے ذہن کو خیرہ کر رہا ہے، اور ہر آیت کے سامنے قلمیں ششدر اور اس جیسی خوشنمائی سے عاجز ہیں، لفظ کے ہر معنی و مفہوم کے ارد گرد علماء اور فقہاء مزید سے مزید علمی سیر ابی حاصل کرتے ہیں، اور علماء کے علاوہ عام انسان بھی قرآنی آیات کی ان نصوص کو پڑھتا اور سنتا ہے تو وہ بھی اس کے عام مراد الہی کو بہ آسانی سمجھ جاتا ہے۔ سبحان اللہ یہ قرآن کریم کی معجزاتی خصوصیت ہے۔

اس کے بعد آیت اس بیان کے ساتھ ختم ہو رہی جو خرچ کرنے والے کے مزید اطمینان قلب کا باعث ہے ، فرمایا: ﴿وَمَا تُنفِقُواْ مِنۡ خَيۡرٖ فَإِنَّ ٱللَّهَ بِهِۦ عَلِيمٌ﴾" تم جو کچھ مال خرچ کرو تو اللہ تعالی اس کا جاننے والا ہے "۔ اللہ تعالی نے آیت میں نفقہ کو خیر سے جوڑا ہے تاکہ اس سے

ان تمام نفقات کی نفی ہو جائے جو رضائے الٰہی کے لیے نہیں ہیں: ﴿وَمَا تُنفِقُواْ مِنْ خَيْرٍ﴾ لہذا جس نفقہ میں خیر کا پہلو شامل نہیں وہ اس فضیلت سے خارج ہے، اور اللہ تعالی ہر چھوٹے بڑے اور کم وزیادہ اور مقدار نفقات سے باخبر ہے، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ نفقہ اللہ تعالی کی رضا کے لیے ہے یا ریاء ونمود کے لیے ، لہذا جو اللہ ان تمام امور سے باخبر ہے وہی عنقریب خرچ کرنے والے کو اس کے اس خرچ اور عمل کا بدلہ بھی دے گا۔

﴿ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُم بِٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٤﴾﴾

ترجمہ:

"جو لوگ اپنے مالوں کو رات دن چھپے کھلے خرچ کرتے ہیں ان کے لئے ان کے رب تعالیٰ کے پاس اجر ہے اور نہ انہیں خوف ہے اور نہ غمگینی"۔

اللہ تعالی صدقات کے اجر وثواب اور بدلے کی مزید تاکید کر رہا ہے کہ اس کا اجر وثواب بہت عظیم ہے اور ان کو کسی قسم کا خوف وغم بھی نہیں ہوگا، فرمایا: ﴿ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَٰلَهُم بِٱلَّيْلِ وَٱلنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ "جو لوگ اپنے مالوں کو رات دن چھپے کھلے خرچ کرتے ہیں ان کے لئے ان کے رب تعالیٰ کے پاس اجر ہے اور نہ انہیں خوف ہے اور نہ غمگینی"۔ یہ اللہ تعالی کی جانب سے ان کی مدح وتعریف کی جارہی ہے جو اللہ کی راہ میں رضائے الٰہی کی خاطر اپنے مال دن ورات ہر وقت اور چپکے کھلے ہر حالت میں خرچ کرتے ہیں، اس میں اہل وعیال پر خرچ کرنا بھی شامل ہے جیسا کہ بخاری ومسلم کی حدیث ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: " إِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللَّهِ إِلَّا أُجِرْتَ عَلَيْهَا، حَتَّى مَا تَجْعَلُ فِي فَمِ امْرَأَتِكَ"(١) (بے شک تو جو کچھ خرچ کرے اور اس سے تیری نیت اللہ کی رضا حاصل کرنی ہو تو تجھ کو اس کا ثواب ملے گا۔ یہاں تک کہ اس پر بھی جو تو اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے)۔

---

(١) صحيح البخاري ١/٣٥ حديث نمبر ٥٦ و صحيح مسلم حديث نمبر ١٦٢٨.

فرمان الٰہی: ﴿ ٱلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمۡوَٰلَهُم بِٱلَّيۡلِ وَٱلنَّهَارِ ﴾" جو لوگ اپنے مالوں کو رات ودن خرچ کرتے ہیں" اس میں تعدد نفقہ اور اس نفقہ کو مختلف اوقات میں باستمرار مستحقین پر خرچ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔اور ﴿ سِرًّا وَعَلَانِيَةً ﴾" چھپے کھلے "میں انفاق کی کیفیت کا بیان ہے یعنی بعض انفاق پوشیدہ اور بعض علانیہ طور پر کرتے ہیں۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ صدقہ علانیہ طور بھی کرنا جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات یہ دوسروں کے لیے اقتداء اور تقلید کا سبب بھی ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اس سے ریاونمود مقصود نہ ہو۔اس کے بعد ارشاد باری ہے : ﴿فَلَهُمۡ أَجۡرُهُمۡ عِندَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ﴾"ان کے لئے ان کے رب تعالیٰ کے پاس اجر ہے اور نہ انہیں خوف ہے اور نہ غمگینی"۔یعنی ان اوصاف سے متصف خرچ کرنے والوں کا اجر وثواب اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، ﴿عِندَ رَبِّهِمۡ ﴾"ان کے رب کے پاس" یہ ان کے عظیم شرف ومقام کی دلیل ہے کہ ان کا انعام اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، نیز ﴿وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ ﴾" انہیں کوئی خوف نہیں ہے"یعنی مستقبل کے امور کے تئیں وہ اپنے رب کے پاس بالکل امن وامان میں ہوں گے ، اور ﴿ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ﴾ "وہ غمگیں بھی نہیں ہوں گے"یعنی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے سابقہ امور کا عند اللہ انہیں کوئی غم بھی نہیں ہوگا ، کیوں کہ وہاں قیامت کے دن نقصان اٹھانے والے لوگ بھی ہوں گے ، جیسا کہ سورہ مریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے : ﴿وَأَنذِرۡهُمۡ يَوۡمَ ٱلۡحَسۡرَةِ إِذۡ قُضِيَ ٱلۡأَمۡرُ وَهُمۡ فِي غَفۡلَةٖ وَهُمۡ لَا يُؤۡمِنُونَ﴾ [سورة مريم:٣٩]۔ تو انہیں اس رنج وافسوس کے دن کا ڈر سنا دے جب کہ کام انجام کو پہنچا دیا جائے گا اور یہ لوگ غفلت اور بے ایمانی میں ہی رہ جائیں گے"۔

تربیتی پہلو سے بھی اس کا فائدہ ہے کیوں کہ اس سے واجبات کی کما حقہ ادائیگی کرنے والے کی تشجیع اور انعام دینے کی اہمیت واضح ہوتی ہے کیوں کہ یہ چیز آدمی کو بدخوئی، خباثت نفس اور فکری آلودگی سے دور رکھتی ، نیز عمل کی مزید بہتر ادائیگی پر آمادہ کرتی ہے۔اس سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ عمدہ صدقہ وتفقات کی تربیت، دوسروں کے احوال کی خبر گیری خاص طور پر ان حاجت مندوں کے احوال کی خبر گیری ضروری ہے جو سوال سے گریز کرنے والے ہیں۔

﴿ٱلَّذِينَ يَأۡكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِي يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيۡطَٰنُ مِنَ ٱلۡمَسِّۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمۡ قَالُوٓاْ إِنَّمَا ٱلۡبَيۡعُ مِثۡلُ ٱلرِّبَوٰاْۗ وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْۚ فَمَن جَآءَهُۥ مَوۡعِظَةٞ مِّن رَّبِّهِۦ فَٱنتَهَىٰ فَلَهُۥ مَا سَلَفَ وَأَمۡرُهُۥٓ إِلَى ٱللَّهِۖ وَمَنۡ عَادَ فَأُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِۖ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ ﴿٢٧٥﴾ يَمۡحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰاْ وَيُرۡبِي ٱلصَّدَقَٰتِۗ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾﴾

ترجمہ:

"سود خور لوگ نہ کھڑے ہونگے مگر اسی طرح جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خبطی بنا دے ، یہ اس لئے کہ یہ کہا کرتے تھے کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے ، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام، جو شخص اللہ تعالیٰ کی نصیحت سن کر رک گیا اس کے لئے وہ ہے جو گزرا ، اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے ، اور جو پھر دوبارہ (حرام کی طرف) لوٹا، وہ جہنمی ہے، ایسے لوگ ہمیشہ ہی اس میں رہیں گے(۲۷۵)۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقہ کو بڑھاتا ہے ، اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے اور گناہگار سے محبت نہیں کرتا(۲۷۶)"۔

نفقات فی سبیل اللہ کے متعلق مسائل کے واضح بیان کے بعد سیاق قرآنی سود کے مسائل کی طرف منتقل ہو رہا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ٱلَّذِينَ يَأۡكُلُونَ ٱلرِّبَوٰاْ لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ ٱلَّذِي يَتَخَبَّطُهُ ٱلشَّيۡطَٰنُ مِنَ ٱلۡمَسِّ﴾ " سود خور لوگ نہ کھڑے ہونگے مگر اسی طرح جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خبطی بنا دے "۔ آیت کی ابتداء سودی لین دین کی شدید ترین قباحت بیان کر کے ہوئی ہے کہ جو لوگ سودی کاروبار میں ملوث ہے ان سود خوروں کی قیامت کے دن ایسی حالت ہو گی کہ اس دن وہ اپنے قبروں سے اس شخص کی طرح اٹھیں گے جس کو شیطانی حملے کا دورہ پڑا ہو اور وہ عالم مدہوشی و دیوانگی میں اٹھ کھڑا ہونا چاہتا ہو، یقیناً یہ بہت بری کیفیت ہو گی(۱)۔ دنیا میں بھی اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے اس کیفیت سے وہ مختلف نہیں، حرص و طمع اور دیدہ دلیری کی وجہ سے اور منافع و کمانے کے چکر میں جلد بازی کا شکار اور منافع کے فوت ہو جانے کے خوف اور گھبراہٹ میں

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۳۳۴.

مدہوش دیوانوں کی طرح پھرتا رہتا ہے، اوراس کی لالچ اس کے پورے بدن اور فکر کو بری جلد بازی کے ذریعہ بے چین کئے رہتی ہے جس کے اثرات اس کے اعضاء وجوارح پر یوں عیاں ہوتے ہیں گویا اس پر جن وشیطان کا حملہ ہو۔

یہ قبیح تصویر ایک مسلمان کے لیے باعث تحذیر ہے تاکہ سود خوری کے سبب اس کی بھی یہی خوفناک حالت نہ ہو جائے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مسلمان کو اس کے برعکس عمل کی روش اختیار کرنی لازم ہے، چنانچہ اس کی کمائی کے تمام ذرائع جائز اور صحیح ہوں اور ان تمام چیزوں سے دور رہے جنہیں اللہ تعالی نے حرام کیا ہے، جیسے ربا، حرام چیزوں کی خرید وفرخت یا خرید وفروخت کے حرام وسائل وغیرہ۔

سود کی قباحت کی وجہ سے آیت کریمہ کے آغاز ہی میں اس کی انتہائی قبیح تصویر پیش کی گئی ہے، کیوں کہ اس آیت نے سودی لین دین کو کھانے سے تعبیر کیا ہے نیز اس کھانے کے اثر کو بھی بیان کیا ہے، فرمایا: ﴿يَأْكُلُونَ ٱلرِّبَوٰا۟﴾ "جو سود کھاتے ہیں"۔ مراد اس سے سود کا کاروبار اور لین دین رکھنا ہے، اور آیت میں کھانے کا ذکر خصوصی طور پر اس لیے کیا گیا ہے کیوں کہ انسان کے مال ودولت کا سب سے اہم مقصد کھانا ہی ہوتا ہے اور یہ چیز اس کی شدت حرص پر دلالت کرتی ہے (۱)۔

سود کی تعریف: نقد یا کھانے کی اشیاء کی اس کی ہم جنس کے ساتھ مقدار میں اضافہ کرکے خرید وفروخت کرنا، یا قرض کی مدت میں اضافہ کرکے قرض سے زیادہ اصول کرنا(۲)۔

لفظ (یأکلون) کا انتخاب اس کی قباحت بیان کرنے کے لیے ہے، جس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کسی چیز کی توصیف وتحریر میں ایسے الفاظ کا انتخاب ہونا چاہیے جن سے اس امر کی صحیح اور مناسب تصویر واضح ہو جائے تاکہ اس لفظی سیاق کا نفس پر گہرا اثر ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے حلت سود پر ان کی کٹ حجتی بیان کی: ﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوٓا۟ إِنَّمَا ٱلْبَيْعُ مِثْلُ ٱلرِّبَوٰا۟﴾ "یہ اس لئے کہ یہ کہا کرتے تھے کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے"۔ ان لوگوں نے سود

---

(۱) تفسیر قرطبي ۳/۲۲۹.

(۲) تفسیر جلالین ۴۷.

کو تجارت کے بالکل ہو بہو قرار دیا، اور یہ تشبیہ اور قیاس کی بنا پر نہیں ہے، کیوں کہ اگر قیاس کی بنا پر ہوتا تو وہ یوں کہتے کہ ربا بھی تو تجارت کی طرح ہے ، لیکن انہوں نے اس کے برعکس کہا کہ ﴿إِنَّمَا ٱلۡبَيۡعُ مِثۡلُ ٱلرِّبَوٰاْ﴾" تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے "،تاکہ یہ ایسی دلیل ہو جوان کے مقصد کی تائید کرے کہ جب سود بھی تجارت ہی کے مانند ہے تو ایک چیز حلال اور دوسری چیز حرام کیوں؟ یہ اللہ تعالی کی شریعت پر اعتراض کی قبیل سے ہے(۱) ۔اور احکام الٰہی پر اسی اعتراض کو دلیل بنا کر انہوں نے سود کو حلال گردانا۔ اس سے واضح ہوا کہ راہ راست سے منحرف اپنے انحراف کے جواز کی دلیلیں تلاش کرتا ہے ،ایک طرف تو پہلے اپنے لیے ملامت نفس سے بچاؤ کے بہانے ڈھونڈتا ہے اور دوسری طرف سادہ لوح لوگوں کو احکام شریعت سے غافل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور تیسری طرف دوسروں کی اپنی روش پر بہکاتا ہے۔ اسلام کے جادہ حق سے انحراف برتنے والوں کا یہی طریقہ کار رہا ہے کیوں کہ وہ بھی ہمیشہ اپنی خواہشات اور مقصد برآری کے جواز کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہوا و ہوس اور شیطان کے غلبہ سے اللہ تعالی کی پناہ۔

ایک مسلمان اللہ تعالی کے احکامات کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے، ان پر کوئی اعتراض کرتا ہے نہ اعتراض کرنے کی سوچتا ہے اور اس جانب ہوا و ہوس اور شیطان کے لیے کوئی راہ نہیں چھوڑتا، کیوں کہ شان الٰہی یہ ہے کہ اس سے اس کے افعال کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا ، اور نہ اس کے احکامات پر کسی کو اعتراض کا حق حاصل ہے ، چنانچہ اللہ تعالی اپنی مرضی سے کسی چیز کی حلت و حرمت کا حکم دیتا ہے، فرمایا: ﴿وَأَحَلَّ ٱللَّهُ ٱلۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ ٱلرِّبَوٰاْ﴾" حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام"۔

اس کے بعد آیت کریمہ میں سود میں گرفتار شخص کا علاج اور اس سے چھٹکارا پانے کا راستہ نکالا گیا ہے ، ارشاد باری تعالی ہے : ﴿فَمَن جَآءَهُۥ مَوۡعِظَةٞ مِّن رَّبِّهِۦ فَٱنتَهَىٰ فَلَهُۥ مَا سَلَفَ وَأَمۡرُهُۥٓ إِلَى ٱللَّهِ﴾" جو شخص اللہ تعالیٰ کی نصیحت سن کر رک گیا اس کے لئے وہ ہے جو گزرا ، اور اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہے "۔یعنی جس تک ربا کے متعلق حرمت کا حکم پہنچ گیا اور اس شرعی حکم

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/ ۳۳٤.

پہنچنے کی صورت میں باز آگیا تو گزشتہ معاملات اور سودی لین دین معاف ہیں(۱)۔اوراس کے عفوودر گزر اور سزا کا معاملہ اللہ تعالی کے سپرد ہے، آیت کریمہ میں ﴿وَأَمۡرُهُۥٓ إِلَى ٱللَّهِۖ﴾ کے بہت سارے مفاہیم ہیں اور ان مفاہیم میں متعدد امور کا استیعاب ہے ، کیوں کہ (وَأَمۡرُهُۥٓ) میں "ہ" کی ضمیر کا مرجع کئی چیزیں ہوسکتی ہیں۔(۱) یہ ضمیر ربا کی طرف لوٹ رہی ہے ،یعنی ربا کی حرمت کے نفاذ وغیرہ کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ (۲) یہ ضمیر (ماسلف) کی طرف لوٹ رہی ہے ، اور مفہوم یہ کہ جو کچھ ماضی میں ہوا اس کی معافی کا معاملہ اللہ تعالی کے ذمہ ہے ، باز آنے والے سے ذمہ داری ساقط ہے۔(۳) یہ ضمیر سود والے شخص کی طرف لوٹ رہی ہے ،اور ایسی صورت میں آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اس سود سے باز آنے والے شخص کا معاملہ اللہ تعالی کے حوالے ہے کہ وہ اس کو سود سے باز رہنے پر ثابت قدم رکھتا ہے ، یا دوبارہ سود کے گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے(۲)۔ان مفاہیم سے یہ مستفاد ہوا کہ قرآن کریم کی تفسیر علمائے راسخین کا کام ہے جو عربی زبان کے ماہر، دلائل کے راجح ومرجوح، ناسخ ومنسوخ اور خاص وعام کا عالم ہو، ان تمام کی جانکاری کے بغیر کوئی بھی قرآن یا اس کے کسی حصہ کی تفسیر کی جسارت نہ کرے۔

اللہ رب العالمین کی جانب سے نصیحت آجانے کے بعد بھی اگر کوئی سودی معاملات میں پڑتا ہے اور سود کو تجارت کے مشابہ بتا کر اپنے لئے سند جواز فراہم کرتا ہے تو اللہ تعالی نے ایسے شخص کے لیے ہمیشہ جہنم میں رہنے کی وعید سنائی ہے، فرمایا: ﴿وَمَنۡ عَادَ فَأُوْلَٰٓئِكَ أَصۡحَٰبُ ٱلنَّارِۖ هُمۡ فِيهَا خَٰلِدُونَ﴾ " اور جو پھر دوبارہ (حرام کی طرف) لوٹا، وہ جہنمی ہے، ایسے لوگ ہمیشہ ہی اس میں رہیں گے "۔ یعنی جو دوبارہ اس کا ارتکاب کرے تو وہ سزا کا مستحق ہے کیوں کہ اس پر حجت قائم ہو چکی ہے۔ یہ سودی معاملات پر شدید طور سے ڈانٹنا اور خوف دلانا ہے اور یہ ایک ہیبت ناک وعید ہے ، مقصد یہ ہے کہ آدمی اس سے بچے اور دور رہے اور موت اور اللہ تعالی کے سامنے پیشی سے پہلے سود کے فعل قبیح سے توبہ کرلے ۔اللہ تعالی ہمیں اور تمام مسلمانوں کی سود جیسے گناہ سے اور تمام ایسے گناہ سے محفوظ رکھے جو رضائے الٰہی کے خلاف ہیں۔

---

(۱) مرجع سابق.

(۲) تفسير قرطبي ۳/۲۳٤.

اس کے بعد سود کے ساتھ اللہ تعالی اپنے کارنامے کو بیان کر رہا ہے: ﴿ يَمۡحَقُ ٱللَّهُ ٱلرِّبَوٰاْ ﴾ " اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے "۔ یعنی اس کو کم کرتا اور اس کی برکت کو سلب کر لیتا ہے اور جب اس سے برکت ہی ختم کر لی گئی تو پھر اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ جاتی اور نہ آدمی کے لیے اس میں کوئی سعادت ہے ، خواہ بظاہر لوگوں کی نگاہ میں اس کے بہت ساری کمائی حاصل ہو، کیوں کہ اس سے برکت چھین لی گئی ہے اور ایسی کمائی میں آدمی کے لیے کوئی لذت اور فائدہ نہیں ہوتا، اس کے حصول میں آدمی خود کو محض تھکاتا ہے۔ لیکن صدقات کا معاملہ اس کے برعکس ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ وَيُرۡبِي ٱلصَّدَقَٰتِ ﴾ "اور وہ صدقہ کو بڑھاتا ہے " ، دنیا میں اس کی خوب برکتیں ہوتی ہیں اور آخرت میں بھی اس کا اجر و ثواب بڑھا چڑھا کر ملے گا۔ آیت میں ایک دوسرے کے برعکس دو چیزوں کے مابین موازنہ کیا گیا ہے، ان میں سے ایک چیز آدمی کی نگاہ میں زیادہ دیکھتی ہے لیکن حقیقت میں وہ نقصان ہے، اور دوسری چیز صدقہ ہے جو بظاہر تو مال میں نقص ہے لیکن در حقیقت دنیا میں اس کے برکت کی زیادتی اور آخرت میں اجر و ثواب کی زیادتی ہے۔ سود حریص لوگوں کی پہچان اور صدقات اہل جود و سخا کی علامت ہے، دونوں بالکل الگ الگ زاویے میں ہیں، نہ تو دونوں کی صورت ایک ہے، نہ دونوں کا اثر ایک ہے اور نہ دونوں کا نتیجہ ایک ہے اور یہ دو متضاد چیز مومن کے سامنے ہے اور اسی میں اس کا امتحان ہونا ہے اور حقیقی مومن اپنے افعال و کردار میں صدقہ کو ترجیح دیتا ہے اور سودی معاملات سے دور رہتا ہے۔

اس دو متضاد چیز کے موازنہ سے دونوں کی خصوصیات واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس سے تفکیر کو جلا ملتی اور تعلم و استفادہ کے اسباب و عوامل میں اضافہ ہوتا ہے ، صحیح و سالم اور سقیم و علیل میں فرق، غلط اور درست کی پرکھ، حق و باطل اور خیر و شر میں تمیز اور ایک ذی شعور و عقلمند کو واقفیت ہو جاتی ہے کہ اس کو کیا اختیار کرنا ضروری ہے۔

اس مقارنہ سے قرآن کریم کی منہجیت بخوبی واضح ہوتی ہے جس میں شعوری صلاحتیوں کو تفکیر اور موازنہ کے ذریعہ ابھارا گیا ہے تاکہ وہ اچھے برے کی تمیز کر سکے، اور اس کو قرآن نے نہایت بلیغ اور حسین پیرائے میں بیان کیا ہے جو کہ سید المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالی کی جانب نازل کیا گیا ہے۔

اس کے بعد دلوں کو جھنجھوڑ دینے والی نصیحت کے ساتھ آیت اختتام پذیر ہوتی ہے: ﴿وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾" اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے اور گنہگار سے محبت نہیں کرتا"۔اللہ تعالی اپنی محبت کی ہر ناشکرے اور گنہگار سے اس کے فسق وفجور کی وجہ سے نفی کر رہاہے ،اور (اثیم) کی صفت بطور مبالغہ اور تاکید کے ہے، کیوں کہ (کفّار) کے لفظ میں بھی اثم یعنی گناہ کا معنی پایا جاتاہے۔علامہ ابن السعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کَفَّار وہ شخص ہے جو اللہ کے نعمتوں کی ناشکری کرے اور اپنے رب کے احسانات بھلادے اور اس کی معصیت پر اصرار کر کے گناہ کا مرتکب ہوتا رہے[1]۔

محبت الٰہی کی نفی مومن کے دل کو تڑپادیتی ہے کیوں کہ حب الٰہی کی وجہ سے اس کا شوق ہوتا ہے کہ اللہ تعالی بھی اس سے محبت کرے اور ناشکرے اور گنہگار کی صفات سے ڈرتاہے۔ابن کثیر رحمہ اللہ کَفَّار اور اثیم کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یعنی اللہ تعالی دل کے ناشکرے اور قول وفعل کے گنہگار سے محبت نہیں کرتا، ایک سود خور اپنے لیے اللہ تعالی کی تقسیم کردہ حلال چیز پر راضی نہیں ہوتا اور کمائی کے شرعی طور پر جائز ذرائع پر اکتفاء نہیں کرتا اور لوگوں کے مال باطل طریقے سے حاصل کرنے کی کوشش میں لگارہتاہے، لہذا وہ خود پر ہونے والی نعمتوں کا منکر اور ظالم وگنہگار ہے جو لوگوں کا مال باطل طریقے سے کھاتاہے[2]۔ اس آیت میں قلبی طور پر جوش دلایا گیاہے تاکہ مومن ربا اور ربا کے علاوہ ہر اس چیز سے دور رہے جس سے اللہ تعالی نے اپنی محبت کی نفی کی ہے۔

﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ لَهُمۡ أَجۡرُهُمۡ عِندَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُونَ ٢٧٧﴾

ترجمہ:

"بیشک جو لوگ ایمان کے ساتھ (سنت کے مطابق) نیک کام کرتے ہیں نمازوں کو قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب تعالیٰ کے پاس ہے ان پر نہ تو کوئی خوف ہے، نہ اداسی اور غم (۲۷۷)"۔

---

(۱) تفسیر ابن السعدی ۱/۲۱۸.

(۲) تفسیر ابن کثیر ۱/۳۳۸.

قرآن کے اس سیاق میں اللہ تعالی کے اطاعت گذار بندوں کی تعریف کی جارہی ہے اور اس تعریف کے ذریعہ اطاعت گذار اور نافرمان کے درمیان تفریق ہورہی ہے، فرمایا: ﴿إِنَّ ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَأَقَامُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَوُاْ ٱلزَّكَوٰةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ "بیشک جو لوگ ایمان کے ساتھ (سنت کے مطابق) نیک کام کرتے ہیں نمازوں کو قائم رکھتے ہیں اور زکٰوۃ ادا کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب تعالیٰ کے پاس ہے ان پر نہ تو کوئی خوف ہے، نہ اداسی اور غم"۔ اللہ تعالی نے اپنے ان بندوں کی مدح وثنا کی ہے جو ایمان والے ہیں، اور سب سے پہلے ایمان کا ذکر کیا کیوں کہ ایمان کو تمام عبادات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے اور یہیں سے اسلام اور عبادت کی شروعات ہوتی ہے اور منہیات سے اجتناب میں اس کا مرکزی کردار ہے اور انہی منہیات میں سے سود بھی ہے۔ اس کے بعد دوسری صفت یہ ذکر کی کہ وہ لوگ عمل صالح کرتے ہیں، اور صالحات کے لفظ میں وہ تمام اعمال شامل ہیں جنہیں اللہ تعالی پسند کرتا اور جن سے خوش ہوتا ہے، اور یہ لفظ ان تمام برے اعمال کی ضد ہے جو غضب الہی کا باعث ہیں جن میں سے سود بھی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے نماز اور زکاۃ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا حالانکہ یہ دونوں لفظ صالحات میں داخل ہیں ، ایسا ان کے شرف ورتبہ اور قدر ومنزلت کے بیان کے لیے نیز بطور تنبیہ اور آگاہی ہے۔ چنانچہ ان کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، اور نماز فحش ومنکرات سے روکتی ہے اور سود بھی کھلا ہوا منکر ہے۔ چوتھی صفت: وہ زکاۃ دیتے ہیں، اور زکاۃ انفاق اور سخاوت ہے اور یہ ایک ایسی عبادت ہے جو سود سے دوری کا سبب ہے کیوں کہ سود لالچ اور کنجوسی کا دوسرا نام ہے۔ لہذا اللہ تعالی کے ان بندوں کا اجر وثواب یہ ہے کہ: ﴿لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ " ان کا اجر ان کے رب تعالیٰ کے پاس ہے ان پر نہ تو کوئی خوف ہے، نہ اداسی اور غم"۔ یعنی یہ لوگ عند اللہ ماجور ہوں گے ، اللہ تعالی کی جانب سے ان کو امن وامان حاصل ہے، قیامت کے دن کی ہولناکیوں سے وہ خوفزدہ نہیں ہوں گے اور مطلوبہ عمل میں ان سے اگر کوئی کمی رہ گئی ہوگی تو اس کا ان کو افسوس نہیں ہوگا اس لیے کہ اگر حسرت ہو تو یہ قیامت کے دن ان کے غم کا باعث ہوگا کیوں کہ اس دن لغزشوں کی اصلاح اور روش کی درستگی ممکن نہیں ہوگی۔ البتہ آیت کریمہ میں مذکور اوصاف کے حامل کا ان سب چیزوں سے سامنا نہیں ہوگا کیوں کہ انہوں نے اللہ رب

االعالمین کی اطاعت وفرمابرداری میں زندگی گزاری ہوگی۔سوداور سودخوروں کے احوال ذکر کرنے کے بعد یہ بیان ربانی اس لیے ہے تاکہ ایک باشعوراور عقلمند دونوں انجام میں موازنہ کرسکے ایک انجام یہ ہے کہ :﴿ وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴾" اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے اور گناہگار سے محبت نہیں کرتا"۔اور دوسرا انجام: ﴿ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾" ان کا اجر ان کے رب تعالیٰ کے پاس ہے ان پر نہ تو کوئی خوف ہے،نہ اداسی اور غم"۔اس سے معلوم ہوا کہ ایمانی اور تعبدی اصولوں کے تحت تاثیر و تصحیح اور فکری بے راہ روی کی اصلاح میں اسلوب موازنہ کو کافی اہمیت حاصل ہے،قرآن کریم کی سابقہ آیات سے اسی منہج کی تائید ہوتی ہے۔

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِيَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓاْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُواْ فَأْذَنُواْ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ۖ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ وَٱتَّقُواْ يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى ٱللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾ ﴾

ترجمہ:

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو(۲۷۸)۔اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ ، ہاں اگر توبہ کرلو تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے(۲۷۹)۔اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی چاہیے اور صدقہ کرو تو تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم میں علم ہو(۲۸۰)۔اور اس دن سے ڈرو جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤگے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا(۲۸۱)"۔

ان آیات کے سیاق میں پند ونصیحت کے ذریعہ دوبارہ توجیہی حل بیان کیا جارہا ہے تاکہ درست انتخاب کو مقدم کیا جائے ،ارشاد باری تعالیٰ ہے :﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِيَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓاْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾" اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو اگر تم سچ

سچ ایمان والے ہو" ، لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے آیت کا آغاز اسلوب ندا کے ذریعہ ہوا ہے تا کہ مخاطب آگے کہی جانے والی بات کو بغور سنے اور امر و نہی اور توجیہ و تحذیر ہر اعتبار سے اس میں آئندہ کے کلام کی اہمیت کا احساس پیدا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس خطاب میں ان کی جلیل القدر صفت کا ذکر کر رہا ہے اور وہ ایمان کی صفت ہے: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ﴾" اے ایمان والو"۔ اور جس کو اتنے جلیل القدر اوصاف سے مخاطب کیا جا رہا ہے تو ہونا یہی چاہئے کہ وہ بھی پکارنے والے کی پکار پر فرمابرداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورے اہتمام اطاعت کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو جائے، اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ پکارنے والا اللہ رب العالمین ہے اور وہ انہیں ایسی صفت سے پکار رہا ہے جس کا تقاضا ہے کہ مضمون خطاب سے سر موانحراف نہ کیا جائے۔ اس ندا کے بعد تقویٰ اختیار کرنے کی بات کہی جا رہی ہے: ﴿ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ﴾" اللہ تعالیٰ سے ڈرو"۔ ان دو لفظوں میں بہت عظیم باتیں کہی گئی ہیں، یعنی تم اللہ سے ڈرو، اس کی سلطنت سے ڈرو، اس کے عقاب سے ڈرو، اس کی قدرت سے ڈرو ، اس کے رحمت وثواب کی امید رکھو، اس کی اطاعت میں اور منہیات کو چھوڑنے میں جلدی کرو، کلمے دو ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں بہت ساری اعلیٰ نصیحتیں ہیں۔ ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَذَرُواْ مَا بَقِيَ مِنَ ٱلرِّبَوٰٓاْ ﴾" اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو"۔ یعنی موجودہ جو کچھ سود رہ گیا ہے اس کو ابھی سے چھوڑ دو اور ہر قسم کا سود چھوڑ دو خواہ زیادہ دینے کا وعدہ ہو چکا ہو یا صرف ابھی نیت رہی ہو، ان بقیہ سود کی رقم میں سے کچھ بھی نہ لو بلکہ وہیں کے وہیں رک جاؤ، بالکل یہ آخری اور قطعی حکم ہے۔ ﴿إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ﴾" اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو "۔ یہ شرط ایمان حقیقی کی تاکید کے لیے ہے اور سود سے باز آجانا قوت ایمانی کی دلیل ہے، اسی طرح سود نہ چھوڑنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا شمار ان لوگوں کے ضمن میں ہوگا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَٱللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾" اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے اور گناہگار سے محبت نہیں کرتا"۔

فرمان الٰہی: ﴿إِن كُنتُم مُّؤۡمِنِينَ﴾ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان معصیت سے بچنے کا سبب ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا يَزْنِي الزَّانِی حِينَ يَزْنِی وَهُوَ مُؤْمِنٌ"(١) (زنا کرنے والا

---

(١) صحيح البخارى ٢/٢٠١ حديث نمبر ٢٤٧٥.

جب بھی زنا کرتا ہے تو اس وقت وہ مومن نہیں رہتا) اور ایمان کی کمزوری معصیت سے پرہیز میں مانع ہے ، خاص طور پر کبیرہ گناہوں سے پرہیز میں ، چنانچہ ضعیف الایمان نفسانی خواہشات اور شہوت پرستی کے غلبہ کی بناپر برائیوں سے نہیں بچ پاتا، کیوں کہ برائیوں پر کنٹرول ایمان ہی کی بدولت ممکن ہے۔اس سے ایمان کی اور ایمانی تربیت کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے، نیز آدمی کو ہمہ وقت ان اسباب کو اختیار کرنا چاہیے جن سے ایمان کو تقویت حاصل ہو۔

اس کے بعد ان لوگوں کے احوال کا بیان ہو رہا ہے جو ان ربانی ارشادات و توجیہات اور پند و نصائح کو بروئے کار نہیں لاتے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا۟ فَأْذَنُوا۟ بِحَرْبٍ مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ ﴾ " اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ "۔ یہ اس کے لیے شدید ترین دھمکی ہے جو برائی اور حدود اللہ کی پامالی پر بضد رہتا ہے اور سود کے متعلق حکم الہی کی جانکاری ہو جانے کے باوجود باز نہیں آتا، اس کا یہ عمل اللہ تعالی سے جنگ مول لینا ہے کیوں کہ سود عذاب الہی اور برکت کے ختم کا سبب ہے ، چنانچہ کس میں دم ہے کہ اللہ تعالی اور اس کے رسول سے جنگ کا سامنا کرے۔ یہ سود کے قباحت کی دلیل ہے نیز یہ سود اللہ تعالی کی حرام کردہ امور میں سے مبغوض ترین چیز ہے۔ لفظ (حرب) عام ہے، اس میں ہر قسم کی جنگ شامل ہے جو انسان کے وہم و گمان سے باہر ہے۔

البتہ اگر انسان توبہ کرلے تو اس کا معاملہ الگ ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا رشاد ہے: ﴿ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ ﴾ " ہاں اگر توبہ کرلو تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے "۔ معلوم ہوا کہ سود سے دست برداری کا پہلا مرحلہ توبہ ہے اور یہ توبہ کے اہمیت کی دلیل ہے۔ اور توبہ کا مفہوم یہ کہ اپنے کئے پر ندامت اور شرمندگی ہو، دوبارہ وہ گناہ نہ کرنے کا عزم مصمم کرے اور سود میں ملوث موجودہ حالت سے دست بردار ہوتے ہوئے اصل مال پر اکتفاء کرے: ﴿ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَٰلِكُمْ ﴾ " ہاں اگر توبہ کرلو تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے "۔ یعنی سود سے دست برداری کے بعد طریقہ کار یہ طے پایا کہ صرف رأس المال یعنی اصل مال تمہارا ہوگا اور سود کا اضافی مال لینا تمہارے لیے جائز نہیں ہے ، اس حکم میں نہ تو تمہارے ساتھ ظلم ہے اور نہ ان کے ساتھ جن سے تمہارا معاملہ ہے: ﴿ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴾ " نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے " لہذا

دونوں جانب عدل وانصاف ہے۔اگر قرضدار تنگ دستی میں ہے تواس کے ساتھ طرز تعامل کا قاعدہ بھی متعین ہے، فرمان الٰہی ہے: ﴿وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ﴾ "اور اگر کوئی تنگی والا ہو تو اسے آسانی تک مہلت دینی چاہیے" ،اللہ تعالی نے قرض خواہ کو قرض دار کے ساتھ شفقت ونرمی برتنے کی ہدایت کی ہے کہ آسانی میسر ہونے تک وہ اس کو مہلت دے اور اس طرح دونوں کے مابین رحم وکرم کا معاملہ ہو۔اس کے بعد اللہ تعالی قرض خواہ کے حق میں بہتر اور افضل کی ہدایت کرتے ہوئے فرماتا ہے :﴿وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ﴾" اور صدقہ کرو تو تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے"۔یعنی قرض دینے والے کو دو اختیارات حاصل ہیں: یا تو آسانی ہونے تک قرض دار کو مہلت دے ، یا قرض سے دست بردار ہو کر اس کو صدقہ کردے،اور یہی دوسرا اختیار قرض دار کے حق میں زیادہ بہتر ہے،اگرچہ بظاہر اس سے رأس المال میں کمی ہوگی مگر اللہ تعالی کے وہاں تنازل کرنے والے کے لیے اسی میں زیادہ خیر وبھلائی کا پہلو ہے، کیوں کہ جب اللہ تعالی کہہ رہا ہے کہ وہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے تو حقیقت میں وہی بہتر ہے اس کا کوئی دوسرا معنی اور مطلب نہیں ہوسکتا ، حصول برکت کے سبب وہ بہتر ہے اور اللہ تعالی کی جانب سے اجر وثواب کے اعتبار سے بہتر ہے، قرض خواہ کے لیے قرض دار کی محبت اور اس کے لیے دعا نیز قرض دار کی پریشانی دور کرنے کی وجہ سے بہتر ہے، لہذا اس کو اس قرض سے تنازل کے ایسے بے شمار فوائد حاصل ہوں گے جنہیں اللہ تعالی ہی جانتا ہے جس نے ایسا کرنے کی ہدایت اور تفصیل بیان کی۔

اس سے قرض کے مسائل کے تمام جوانب ومتعلقات اور اسالیب ومقاصد کے حلول کا طریقہ واضح ہوگیا،اور اس طریقہ کار کو اپنا کر بے شمار خیر وبھلائی کا حصول ممکن ہے۔

اس کے بعد ایک عظیم الشان نصیحت کے ساتھ سود کا موضوع ختم ہو رہا ہے: ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ "اور اس دن سے ڈرو جس میں تم سب اللہ تعالی کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا"۔آیت کریمہ کا آغاز ان امور کی توجیہ اور آگاہی سے ہوا ہے جن سے عقل وشعور بیدار اور ایک مومن کے قلب وجگر کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے،اس میں حساب وکتاب اور جزاء وسزا کے دن اللہ تعالی کی طرف لوٹنے کی یاددہانی کرائی گئی ہے جہاں ہر شخص کو اچھا برا پورا بدلہ دیا جائے گا،

کسی پر ظلم نہ ہوگا اور مکمل عدل وانصاف کے ساتھ حساب وکتاب اور جزاء وسزا کا معاملہ ہوگا۔ اے ارحم الراحمین! تو ہمارے ساتھ اپنے فضل اور رحم وکرم کا معاملہ فرما۔ اس سے رجوع الی اللہ، حساب وکتاب اور تقوی کے حکم کی نصیحت کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، کیوں کہ ایسی نصیحتوں کا کافی اثر ہوتا ہے۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى فَٱكۡتُبُوهُۚ وَلۡيَكۡتُب بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبُۢ بِٱلۡعَدۡلِۚ وَلَا يَأۡبَ كَاتِبٌ أَن يَكۡتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ ٱللَّهُۚ فَلۡيَكۡتُبۡ وَلۡيُمۡلِلِ ٱلَّذِي عَلَيۡهِ ٱلۡحَقُّ وَلۡيَتَّقِ ٱللَّهَ رَبَّهُۥ وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـٔٗاۚ فَإِن كَانَ ٱلَّذِي عَلَيۡهِ ٱلۡحَقُّ سَفِيهًا أَوۡ ضَعِيفًا أَوۡ لَا يَسۡتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهُۥ بِٱلۡعَدۡلِۚ وَٱسۡتَشۡهِدُواْ شَهِيدَيۡنِ مِن رِّجَالِكُمۡۖ فَإِن لَّمۡ يَكُونَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٞ وَٱمۡرَأَتَانِ مِمَّن تَرۡضَوۡنَ مِنَ ٱلشُّهَدَآءِ أَن تَضِلَّ إِحۡدَىٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحۡدَىٰهُمَا ٱلۡأُخۡرَىٰۚ وَلَا يَأۡبَ ٱلشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُواْۚ وَلَا تَسۡـَٔمُوٓاْ أَن تَكۡتُبُوهُ صَغِيرًا أَوۡ كَبِيرًا إِلَىٰٓ أَجَلِهِۦۚ ذَٰلِكُمۡ أَقۡسَطُ عِندَ ٱللَّهِ وَأَقۡوَمُ لِلشَّهَٰدَةِ وَأَدۡنَىٰٓ أَلَّا تَرۡتَابُوٓاْ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَٰرَةً حَاضِرَةٗ تُدِيرُونَهَا بَيۡنَكُمۡ فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ أَلَّا تَكۡتُبُوهَاۗ وَأَشۡهِدُوٓاْ إِذَا تَبَايَعۡتُمۡۚ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٞ وَلَا شَهِيدٞۚ وَإِن تَفۡعَلُواْ فَإِنَّهُۥ فُسُوقُۢ بِكُمۡۗ وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَۖ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱللَّهُۗ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٞ ﴿٢٨٢﴾﴾

ترجمہ:

"اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو، اور لکھنے والے کو چاہیے کہ تمہارا آپس کا معاملہ عدل سے لکھے، کاتب کو چاہیے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے پس اسے بھی لکھ دینا چاہیے، اور جس کے ذمہ حق ہو، وہ لکھوائے اور اپنے اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے اور حق میں سے کچھ گھٹائے نہیں، ہاں جس شخص کے ذمہ حق ہے وہ اگر نادان ہو یا کمزور ہو یا لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی عدل کے ساتھ لکھوادے اور اپنے میں سے دو مرد گواہ رکھ لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کر لو تاکہ ایک کی بھول چوک کو دوسری یاد دلادے، اور گواہوں کو چاہیے کہ وہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں اور قرض کو جس کی مدت مقرر ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو لکھنے میں کاہلی نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات بہت انصاف والی

ہے اور گواہی کو بھی درست رکھنے والی ہےاور شک و شبہ سے بھی زیادہ بچانے والی ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ معاملہ نقد تجارت کی شکل میں ہو جو آپس میں تم لین دین کر رہے ہو توتم پر اس کے نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں۔ خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ مقرر کرلیا کرو، اور (یاد رکھو کہ) نہ تو لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے نہ گواہ کو ، اور اگرتم یہ کرو تو یہ تمہاری کھلی نافرمانی ہے، اللہ سے ڈرو اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"۔

صدقات وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ ، سودی لین دین کی حرمت اور شدید نہی کے متعلق مختلف آیات اور پراثر اور عظیم مقامات میں وضاحت وبیان کے بعد قرآن کریم کی سب سے طویل آیت کے ذریعہ قرض کے لین دین اور خرید وفروخت وغیرہ کے معاملات میں لوگوں کے لیے مصلحت آمیز امور کے تعلق سے خطاب ہورہاہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيۡنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٖ مُّسَمّٗى فَٱكۡتُبُوهُۚ﴾" اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کروتواسے لکھ لیا کرو"۔ مومنوں کو ندادے کر آیت کریمہ کی شروعات ہورہی ہے: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ﴾" اے ایمان والو!" یہ اپنے مومن بندوں کے لیے اللہ کی پکار ہے ، اور یہ بندوں کے لیے ندائے الٰہی لوگوں کے باہم دیگر پکار کی طرح نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسی پکار ہے جو ٹھہر کر سوچنے اور یکسوئی اور خموشی کے ساتھ کلام الٰہی کی آواز کی پیروی اور توجہ پر آمادہ کرتی ہے، اور ایمان کی صفت سے ان کو متصف کرنااور مومن کانام دیناان کی مدح وثناء اور اللہ تعالی کی طرف سے ان کے ایمان کاثبوت فراہم کرناہے اور یقینایہ بہت عظیم شرف کی بات ہے جس کاشکر واجب ہےاوراس کا تقاضا ہے کہ پورے ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے مکمل دھیان کے ساتھ اس پکارنے والے اللہ کی پکار سنی جائے ۔اور جب اللہ سبحانہ وتعالی کا اپنے بندوں کے ساتھ یہ اسلوب ہے تو بندوں کے باہمی گفتگو میں بھی اسی عمدہ اسلوب کااہتمام کرتے ہوئے لوگوں کو بہتر اسماء والقاب کے ساتھ اچھے انداز میں پکارنا چاہیے ، نیز گفتگو کا آغاز عمدہ ہو اور مخاطب اور سننے والے کو مقصد خطاب کے لیے تیار کرلیا جائے ، کیوں کہ لوگوں کے دلوں میں ان عوامل واسباب کا اچھااثر ہوتاہے۔

مومنوں کی اس منادی کے بعد اللہ تعالی کا ارشاد ہوتا ہے: ﴿إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَٱكْتُبُوهُ﴾" جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو "۔ اللہ تعالی قرض کے لین دین اور معاہدے کی تدوین وکتابت کی ہدایت کر رہا ہے، یعنی مقدار قرض، ادائیگی کا وقت اور قرض کے متعلق دیگر تمام امور قلمبند کر لیے جائیں، قرض کے لیے اللہ تعالی نے ایک عام لفظ استعمال کیا ہے﴿إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ﴾" جب تم آپس میں ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرو" ، تاکہ قرض کی تمام انواع واقسام اس میں شامل ہو جائیں، چنانچہ اس میں قرض، سامان کی قیمتیں، ٹھیکیداری، اداشدہ اور باقی ماندہ پیسوں کی تفصیل وغیرہ اس حکم میں داخل ہیں اور ﴿إِذَا تَدَايَنتُم﴾ میں قرض کی تمام صورتوں کا استیعاب ہے، اسی طرح ﴿فَٱكْتُبُوهُ﴾"تم اسے لکھ لیا کرو"یعنی مدت، تعداد ، مقدار، اور کیفیت وغیرہ جو کچھ معلوم ہو سب لکھ لو۔ یہ قرآن کریم کے الفاظ کی عظیم بلاغت ہے جن میں مراد الہی کی تمام صورتوں کا استیعاب ہے۔ اس حکم الہی سے لوگوں کی صلح وآستی کی حفاظت مقصود ہے تاکہ بھول چوک، خوف، وفات یا قرضی لین دین کے دیگر اسباب اختلاف کی بنیاد پر ان کے درمیان کسی طرح کا تقطع تعلق اور جھگڑا نہ ہو۔ یہ اللہ تعالی کی نعمت عظیمہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے مصالح عامہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی رہنمائی فرمائی۔

اس کے بعد اللہ تعالی اس خط وکتابت کے عناصر ومحاور بیان کر رہا ہے: ﴿وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِٱلْعَدْلِ﴾" اور لکھنے والے کو چاہیے کہ تمہارا آپس کا معاملہ عدل سے لکھے "، اللہ تعالی نے ہدایت کی کہ ان امور قرض کو لکھنے کی ذمہ داری ایسے کاتب کے سپرد کی جائے جو لکھنے میں حق وانصاف کا لحاظ رکھے اور قیمت یا مدت وغیرہ میں کسی طرح کی کمی زیادتی نہ کرے۔ عدل کی اس شرط سے صفت عدل اور اسی ضمن میں امانت داری کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بھی مستفاد ہوا کہ کار گزاروں کے انتخاب میں انصاف پسند کی رعایت کافی اہم ہے، کیوں کہ ایسے ہی لوگ فرائض کی انجام دہی میں لوگوں کے حقوق کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انصاف پسند لوگوں کا انتخاب ایک واجبی حکم ہے جس کی بجاآوری ضروری ہے۔ اور چونکہ کتابت علم کا متقاضی ہے اس لیے اس میں علم اور عالم کی اہمیت

وفضیلت کا ثبوت بھی ہے ساتھ ہی اس کی ذمہ داری بھی بنتی ہے کہ وہ اپنے عمل کو استطاعت کی حد تک کماحقہ انجام دے۔

خط وکتابت کے متعلقہ عناصر میں سے اگلا عنصر اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے :﴿ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ ٱللَّهُ ﴾"کاتب کو چاہیے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے "۔ چنانچہ کاتب پر لازم ہے کہ جب اس سے لکھنے کا مطالبہ کیا جائے تو وہ انکار نہ کرے ،اور جس طرح اللہ تعالی نے اس کو علم کی نعمت دے کر فضیلت عطا کی تو وہ بھی اس علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں بخیلی نہ کرے۔اس آیت سے معلوم ہوا کہ علم محض اللہ کا عطیہ ہے ،کیوں کہ ﴿ كَمَا عَلَّمَهُ ٱللَّهُ ﴾" جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے "اس آیت میں اس کے علم کے حصول کی نسبت اللہ تعالی کے لیے خاص کی گئی ہے ، اور یہ علم اللہ کی نعمت ہے جسے اللہ تعالی بندے کو اپنے فضل و کرم سے عطا کرتا ہے۔آیت کریمہ سے یہ بھی فائدہ حاصل ہوا کہ جس کسی کو دوسروں کے مقابلے میں کوئی خاص فضیلت حاصل ہو تو اس فضیلت سے دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے انکار نہ کرے ،بلکہ لوگوں کے مطالبہ کو قبول کرے اور جس طرح اللہ تعالی نے اس پر احسان کیا ہے تو وہ بھی دوسروں کے ساتھ اس احسان کرتے ہوئے بخیلی سے باز رہے ،اسی طرح اگرامت کے حق میں نفع بخش کسی ایسے عمل کی ادائیگی کا اس سے مطالبہ کسی جائے جس کو اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہ کر سکتا ہو تو اس کو ضرور وہ عمل انجام دینا چاہیے کیوں کہ اللہ تعالی نے اس کو علم دے کر اس پر انعام کیا ہے اور یہ تعلیم اس پر اللہ تعالی کی نعمت ہے اور اس نعمت میں اسے دوسروں کے ساتھ بھی بخیلی نہیں کرنی چاہیے ،بلکہ اللہ تعالی بطور تاکید کاتب سے دوبارہ کہہ رہا ہے :﴿ فَلْيَكْتُبْ ﴾" پس اسے بھی لکھ دینا چاہیے "، یہ تاکیدی حکم ہے یعنی اس ذمہ داری کی ادائیگی اس پر واجب ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی قرض کے مضامین کو کاتب سے املاء کرانے والے کے متعلق دقیق ہدایات جاری کر رہا ہے :﴿ وَلْيُمْلِلِ ٱلَّذِى عَلَيْهِ ٱلْحَقُّ ﴾"اور جس کے ذمہ حق ہو، وہ لکھوائے "۔یعنی قرض کی مقدار اور ادائیگی کی مدت وغیرہ کے مضمون کی کتابت وہ شخص کرائے جس کے ذمہ حق ہے،اس تعیین کا عظیم فائدہ ہے،کیوں کہ اس کے ذریعہ گویا وہ کاتب کی لکھے مضمون،اس پر گواہوں کی گواہی کا وہ

خود قرار کرنے والا تسلیم کیا جائے گا کیوں کہ اسی کی لکھوائی ہوئی بات پر گواہی لی گئی ہو گی، اور وہ لکھوانے والا لکھے ہوئے مضمون کا مکمل پابند ہو گا۔ نیز اس کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ طرفین کے درمیان اس بات کو لے کر اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی کہ املاء کون کرائے۔ اس میں املاء کی ذمہ داری کا بیان ہے جس سے یہ فائدہ ماخوذ ہوا کہ ادارتی طور پر اس ذمہ داری کی تعیین میں کار گزار کی صلاحیت کا لحاظ ضروری ہے اور اس تعلق سے کسی خارجی قوت کا اعتبار نہ کیا جائے اور تعیین کے دوران اس کی اچھی کار کردگی کو پیش نظر رکھا جائے جو سود مند ثابت ہو سکے اور نظام بہتر رہے، اور اس تعلق سے شخصی برتری کو کبھی ترجیح نہ دی جائے ، جیسا کہ قرض کے معاملہ میں قرض دینے والا برتر ہوتا ہے لیکن املاء کرانے کا حق اس کو نہیں دیا گیا، تاکہ اس کے ذریعہ بنیادی مصلحت حاصل ہو سکے اور قرض دینے والا قرض دار کے اقرار سے مستفید ہو کیوں کہ یہ بات تو ثابت شدہ ہے کہ قرض دار کے اس اقرار سے قرض دینے والا ہی مستفید ہو سکتا ہے اور اسی میں اس کی مصلحت ہے ، اسی طرح قرض دار کا یہ اقرار قرض خواہ کے حق کا ثبوت ہے ، اور اگر اسی کے برعکس قرض دینے والا قرض دار سے اپنے قرض کا اقرار کرے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیوں کہ قرض دار اس کا انکار بھی کر سکتا ہے یا کوئی اور بہانا بنا سکتا ہے، اس لیے قرض دینے والے کو اپنے قرار کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

اس کے بعد اس توجیہِ ربانی کے ضمن میں تقوی کا حکم ہے: ﴿وَلْيُمْلِلِ ٱلَّذِى عَلَيْهِ ٱلْحَقُّ وَلْيَتَّقِ ٱللَّهَ رَبَّهُۥ﴾ "اور جس کے ذمہ حق ہو، وہ لکھوائے اور اپنے اللہ تعالیٰ سے ڈرے جو اس کا رب ہے "۔ یہ قرض دار کو حکم ہے کہ وہ املاء کے امور یعنی ادائیگی کی مدت، مقدار، نوعیت، تعداد اور کتابت قرض کے متعلق جملہ امور میں اللہ تعالی سے ڈرے ، اور تقوی کی یہ نصیحت اس کے حق میں یا اس کے علاوہ دوسرے کے حق میں بلکہ تمام مسلمانوں کے حق میں سب سے بہتر اور جامع نصیحت ہے۔

اس کے بعد اس نصیحت پر عطف کرتے ہوئے ہر طرح کی حق تلفی سے منع کیا جا رہا ہے: ﴿وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا﴾ " اور حق میں سے کچھ گھٹائے نہیں "یعنی اس حق میں سے کچھ بھی کم نہ کرے تاکہ قرض دینے والے کا حق ہر طرح کی کمی اور نقصان سے محفوظ رہے۔ اس سے معاملات میں تقوی کی اہمیت نیز حق تلفی، خط و کتاب اور لوگوں حقوق کے ساتھ کھلواڑ کرنے سے پرہیز کی اہمیت معلوم ہوتی ہے ، اور

اس ہدایت ربانی کے فوائد کا دائرہ تنظیمی، توظیفی اور جملہ ادارتی امور تک وسیع ہے، فیضیاب اور فیض رساں دونوں قسم کے لوگوں کی مصلحت اسی ہدایت ربانی میں ہے، اسی طرح جو لوگ بھی مصالح عامہ کا عمل انجام دیتے ہیں ان کے لیے بھی یہ توجیہہ الہی نہایت مفید ہے۔ اس سے نصیحت کی اہمیت اور اداری ہدایات میں اس کے بالغ اثر اور اصحاب قلم وقرار کے سامنے اس کے استحضار کی اہمیت واضح ہوتی ہے کیوں کہ یہ بہت اہم ذمہ داری ہے۔ اس کے بعد لین دین کے متعلق ممکنہ احتمالات کا اللہ تعالی حل اور علاج بیان کر رہا ہے: ﴿فَإِن كَانَ ٱلَّذِى عَلَيۡهِ ٱلۡحَقُّ سَفِيهًا أَوۡ ضَعِيفًا أَوۡ لَا يَسۡتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ﴾ "ہاں جس شخص کے ذمہ حق ہے وہ اگر نادان ہو یا کمزور ہو یا لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو"، اس آیت کریمہ میں قرض دار یعنی جس کے ذمہ حق ہے اس کے تعلق سے ممکنہ احتمال کا ذکر ہے کہ بسا اوقات وہ نادان ہو سکتا ہے جو مال کی حفاظت اور اس میں درست طریقہ سے تصرف کا اہل نہیں ہوتا یا ایسا بھی ممکن ہے کہ صغر سنی یا بوڑھاپے کے سبب اتنا کمزور ہو کہ املا نہ کرا سکے یا کسی بھی رکاوٹ کی وجہ سے اس میں املاء کرانے کی استطاعت نہ ہو ﴿أَوۡ لَا يَسۡتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ﴾ "یا لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو" صغر سنی اور بوڑھاپا ان دو رکاوٹوں کے خصوصی ذکر کے بعد اس کے بعد کے جملہ میں ہر طرح کی رکاوٹ کو شامل کر لیا گیا کیوں کہ ان دونوں کی صراحت اور وضاحت زیادہ اہم تھی اور پھر بعد کے جملہ میں ایک عمومی بات کہی گئی تاکہ اس میں گونگا پن، زبان کی عدم جانکاری، یا صحیح غلط میں تمیز کی عدم صلاحیت جیسے امور کا استیعاب ہو جائے۔ اس طرح کے احتمالات ادارتی امور میں کافی مفید ثابت ہوتے ہیں، بالخصوص جب کوئی نظام اور لائحہ عمل تیار کرنا ہو، ایسے وقت میں ممکنہ احتمالات کی طرف توجہ اور ان کی رعایت کافی اہمیت رکھتی ہے تاکہ کوئی ایسا موڑ نہ آئے کہ جہاں اس سوسائٹی کے افراد اور ذمہ دار کا اختلاف ہو جائے۔ لوگوں کی مصلحتوں کی رعایت میں یہ باریکی یقینا منہج اسلام کے گیرائی کی دلیل ہے جس میں افراد کے تمام تر مصالح کا استیعاب ہے اور یہ ایک ایسا نظام و قانون ہے جن میں ایک سے ایک باریکیاں ہیں جن تک کسی فرد بشر کی رسائی اللہ تعالی کی توفیق کے بغیر ناممکن ہے۔ آیت کریمہ کے فوائد میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے بندوں کے شرعی نظام کی پوری ذمہ داری اپنے تئیں لے رکھی ہے اور اس نے اس کی ساری تفصیلات اور اصول و قواعد خود وضع کئے ہیں تاکہ بندوں کی انفرادی واجتماعی، معاشرتی اور پیشہ وارانہ امور، خرید و فروخت اور

اجرت کے مسائل اور روز مرہ کے دیگر نشاطات کی تمام ضروریات پوری ہوسکیں۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

اس کے بعد اللہ تعالی عقد کے تعلق سے ان احتمالات کا حل نکال رہا ہے کہ اگر قرضدار کے اندر مندرجہ بالا رکاوٹوں میں سے کوئی رکاوٹ پائی جائے تو اس کا کوئی نائب بنا دیا جائے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُۥ بِٱلْعَدْلِ﴾ "اس کا ولی عدل کے ساتھ لکھوادے" یعنی اس کے معاملات کا ذمہ دار اس کا قائم مقام ہو، چاہے باپ، یا جس کو وصیت کی گئی ہو، یا مترجم وغیرہ، تاکہ اس نقصان کی تلافی ہوسکے اور اس کو کوئی ضرر نہ لاحق ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ میں بندوں کے معاملات پر پوری عنایت وتوجہ اور ان کی حفاظت ہے اور ظلم وزیادتی اور حق تلفی کے تمام ممکن دروازے بند کردیئے گئے ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ غافل ونادان کی غفلت ونادانی اور کمزور کی کمزوری وغیرہ کا ناجائز فائدہ اٹھا کر نقصان پہنچانا حرام ہے۔ اس سے کمزوروں پر حق ولایت کا ثبوت ملتا ہے، اور ولیوں پر بھی کمزوروں کے حقوق کی حفاظت لازم اور کسی طرح کی زیادتی یا کوتائی ناجائز ہے، وہ دنیا وآخرت دونوں میں ان حقوق کا جواب دہ ہے، دنیا میں عدالت کے سامنے اور آخرت میں اللہ سبحانہ وتعالی کے سامنے۔ اللہ تعالی نے ولی کو ہدایت کی کہ وہ پورے عدل وانصاف کے ساتھ املاء کرائے: ﴿فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُۥ بِٱلْعَدْلِ﴾ "اس کا ولی عدل کے ساتھ لکھوادے"، عدل سے مراد انصاف ہے، یعنی وہ اس اعتبار سے املاء کرائے کہ نہ ماتحت کو کوئی نقصان ہوا اور نہ ہی قرض دینے والے کو، کیوں کہ عدل کا تقاضا ہے کہ دونوں طرف نقصان نہ ہو۔

اس کے بعد اللہ تعالی عقد کے خط وکتابت کی مزید پائیداری اور استحکام کے لیے اس پر گواہ مقرر کرنے کی ہدایت کررہا ہے، فرمایا: ﴿وَٱسْتَشْهِدُوا۟ شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ﴾ "اور اپنے میں سے دو مرد گواہ رکھ لو"، آیت میں مرد کہا گیا ہے، یعنی آزاد مسلمانوں میں سے غیر بالغ اس کے گواہ نہیں بن سکتے، اسی طرح ﴿مِن رِّجَالِكُمْ﴾ "اپنے میں سے دو مرد" کی قید سے معلوم ہوا کہ اپنے جان پہچان کے ہوں اور غیر معروف نہ ہوں، تاکہ جب بھی ضرورت پڑے وہ حاضر ہوسکیں، یہ ایک نظام ہے کہ غیر معروف مردوں کا انتخاب سے بچا جاسکے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گواہی کے وقت ان کو بلانا مشکل ہو جائے۔ یہ شریعت اسلامیہ کے دقت نظام کی دلیل ہے، اور یہی منہج ہر نظام سازی کے وقت ملحوظ رکھنا چاہئے چنانچہ

کسی بھی معاملہ کی نظام سازی کے وقت اس معاملہ کی تمام باریک تفصیلات کا مطالعہ اور علم رکھنا ضروری ہے تاکہ اس نظام سازی میں کوئی خلل اور کسی حقوق کی پامالی نہ ہو اور وہ نظام ہر طرح سے کار آمد ثابت ہو، کیوں کہ نظام اور لائحہ عمل جن کا تعلق مصالح مرسلہ سے ہے ان کی تیاری میں یہ چیز ایک قاعدہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد اس گواہی کے مزید استحکام اور حفاظت کے لیے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَٱمْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ ٱلشُّهَدَآءِ﴾ "اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہوں میں سے پسند کرلو"۔ اس میں پیش آمدہ خدشہ کا حل اور گواہی میں وسعت اور گنجائش کا بیان ہے کہ اگر دو مرد بطور گواہ نہ لاسکیں تو ایک مرد اور ایسی دو عورتوں کو گواہ مقرر کرلیں جن پر تمہارا اتفاق اور رضامندی ہو۔ یہ ایک موقع ہے کہ پہلے ہی سے گواہوں کے تعلق سے اتفاق ہونا چاہیے تاکہ دل میں کسی طرح کا بغض اور کینہ یا بعض گواہوں کے بارے میں کسی بھی وجہ سے کوئی شک وشبہ نہ رہنے پائے، اور ان تمام گواہوں پر آپسی رضامندی اصل بنیاد ہو، قرض دار اور قرض خواہ کے مابین خط وکتابت میں یہی عدل وانصاف ہے۔ چنانچہ سارے ایسے احتمالات جن سے انسان دوچار ہونے سے پہلے متنبہ نہیں ہوتا اللہ تعالی نے پہلے ہی سے ان احتمالات سے آگاہ اور انتہائی باریکی کے ساتھ ان تمام امور کا نظام مقرر کردیا ہے۔ سیاست شرعیہ کے پہلو سے اگر دیکھا جائے تو اس کے بہت سارے عظیم فائدے ہیں، جن میں مصالح محققہ کی رعایت، عدل کا قیام، اور ظلم وزیادتی اور غلطی سے بچاؤ کے طریقے وغیرہ امور شامل ہیں۔

اس کے بعد ایک مرد کے مقابلہ میں دو عورت کو رکھنے کا سبب اللہ تعالی بیان کررہا ہے: ﴿أَن تَضِلَّ إِحْدَىٰهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَىٰهُمَا ٱلْأُخْرَىٰ﴾ "تاکہ ایک کی بھول چوک کو دوسری یاد دلادے"، یعنی پوری گواہی ہی بھول جائے یا اس کے بعض پوائنٹ بھول جائے تو دوسری والی اس بھولی چیز کو اسے یاد دلادے۔ اللہ تعالی نے مرد کی گواہی کو عورت کی یاددہانی کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ عورت کے لیے عورت ہی کی یاددہانی متعین کی کیوں کہ گواہی کا حصہ دونوں کے مابین مشترک ہے اور دونوں کے درمیان باہمی گفتگو اور تبادلہ خیال میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، بلکہ یہ چیز ایک مرد اور ایک عورت کے بیچ مکمل

طور سے مشکل ہے ، چنانچہ ایک گواہ عورت دوسرے کے ساتھ گفتگو اور تبادلہ خیال کرکے بغیر کسی رکاوٹ کے اس کو وہ گواہی یاد دلاسکتی ہے ، نیز چونکہ عورتیں غالباً قرض اور خرید وفروخت کے معاملات کی مردوں کی طرح عادی نہیں ہوتیں اور ایک مرد میں ان امور کے تمام پوائنٹ کو سمجھنے کا ملکہ ہوتا ہے اور اس طرح کے امور اس کے لیے ایک عام سی بات ہوتی ہے ، اسی لیے عورت کو یاد لانے کے لیے ایک دوسری عورت کا ہونا ضروری ٹھہرا ، اس سے ان تمام تاویلات کی نفی ہو جاتی ہے جن سے عورت کے ایمان وعقل وغیرہ کی کمی ظاہر ہوتی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالی گواہوں کا فرض منصبی بیان کر رہا ہے : ﴿وَلَا يَأْبَ ٱلشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُواْ﴾ " اور گواہوں کو چاہیے کہ وہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں "۔ یہ گواہوں کو ہدایت دی جارہی ہے کہ ان کو جب شہادت پر بلانے کی بات پکی ہو جائے تو وہ آنے سے انکار نہ کریں۔ حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ایک ساتھ دونوں باتیں بیان کی گئی ہیں ، ایک تو یہ کہ جب وہ گواہ بنانے کے لیے بلائے جائیں تو انکار نہ کریں ، دوسرے یہ کہ گواہ بننے کے بعد جب گواہی دینے کے لیے بلائے جائیں تو انکار نہ کریں(۱)۔ چنانچہ جب گواہ کو کتابت اور قرض کے لین دین کے وقت حاضری کا مطالبہ کیا جائے تو وہ انکار نہ کرے ، اسی طرح جب کوئی اختلاف وغیرہ کی صورت پیش آجائے اور ثبوت کے طور اس کو بلایا جائے تو بھی انکار نہ کرے۔

اس کے بعد سیاق قرآنی اسی قرض کے عقد کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور اس کی قلت و کثرت کے اعتبار سے ہدایت دی جارہی ہے ، ارشاد الہی ہے : ﴿وَلَا تَسْـَٔمُوٓاْ أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰٓ أَجَلِهِۦ﴾ "اور قرض کو جس کی مدت مقرر ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو لکھنے میں کاہلی نہ کرو "۔ اللہ تعالی سستی کرنے سے منع کر رہا ہے ، یعنی لکھنے میں اور لین دین کی پختگی میں کسی طرح کی اکتاہٹ اور کاہلی کا مظاہرہ نہ کرو۔ آیت کریمہ میں صغیر یعنی چھوٹی رقم کو بڑی رقم سے پہلے ذکر کرکے توثیق کی اہمیت پر توجہ دلانا مقصود ہے ، یہاں تک کہ ایسی چیزوں میں بھی ثبوتوں کا پاس ولحاظ کرنا چاہیے جنہیں آدمی عموما معمولی سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دیتا ، کیوں کہ اختلاف اور جھگڑا جس طرح ایک بڑی چیز کو بنیاد بنا

---

(۱) تفسير قرطبي ٣/٢٥٧.

کر ہو سکتا ہے تو اسی طرح معمولی چیزوں کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے، اور چھوٹی رقم کو پہلے ذکر کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ عموما لوگ لین دین میں معمولی رقم کو حقیر سمجھ کر اہمیت نہیں دیتے، اور آدمی اس معمولی چیز کی ادائیگی کو بھول جاتا ہے پھر بسا اوقات طرفین کے بیچ اس کا نتیجہ بھیانک موڑ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ قرآن کریم کی عنایت ودقت تعبیر ہے، یہاں تک کہ الفاظ کی تقدیم وتاخیر میں بھی حکمت ہے، اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ قرآن اس اللہ سبحانہ وتعالی کی جانب سے ہے جو اپنی مخلوقات سے مکمل طور سے باخبر ہے۔
اسی طرح اس ارشاد ربانی میں وقت مقررہ کی بھی تاکید ہے ﴿إِلَىٰٓ أَجَلِهِۦ﴾ "جس کی مدت مقرر ہے" یعنی آپسی اتفاق سے اور لکھ کر ضبط کر لیا جائے۔ اس سے مستفاد ہوا کہ ادارتی، پیشہ وارانہ، ٹھیکہ داری جیسے امور میں ماتحتوں کے مابین تمام توجیہات وہدایات کتابی طور پر محفوظ ہونا فائدے سے خالی نہیں اسی طرح تمام کام کرنے والوں کے بیچ بھی، تاکہ ذمہ داروں کے مابین ذمہ داری کی ادائیگی کو لے کر کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہو، کہ کس کی کتنی ذمہ داری ہے اور کب کیا کرنا ہے، اور تاکہ لوگوں کے حقوق بھی محفوظ رہیں اور کسی طرح کی سماجی بغض وکینہ پروری کا ماحول نہ بنے اور معاشرے کی آپسی الفت ومحبت قائم ودائم رہے جس کا ہر معاشرے اور جماعت میں پایا جانا شریعت اسلامیہ کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذمہ دار لوگ تمام متعلقہ امور، صلاحیت اور ذمہ داریوں کو کتابی شکل میں محفوظ رکھیں تاکہ مصلحتیں غالب ہوں اور فساد وبگاڑ سے بچا جا سکے۔

اس کے بعد اللہ تعالی چھوٹے بڑے ہر قرض کو لکھ لینے کا سبب بیان کر رہا ہے: ﴿ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ ٱللَّهِ﴾ "اللہ تعالی کے نزدیک یہ بات بہت انصاف والی ہے"۔ یعنی چھوٹا بڑا ہر طرح کا قرض لکھ لینا ہی اللہ تعالی کے نزدیک زیادہ انصاف والی بات ہے اس کی دلیل: ﴿وَأَقْوَمُ لِلشَّهَٰدَةِ﴾ "اور یہ گواہی کو بھی درست رکھنے والی ہے"۔ یعنی گواہی کے لیے زیادہ صحیح اور حفاظت والی ہے چنانچہ اس قرض کے لین دین کی توثیق سے صرف قرض لینے اور قرض دینے والے ہی مستفید نہیں ہوتے، بلکہ اس کا فائدہ گواہی اور گواہوں کو بھی پہنچتا ہے، کیوں کہ ایسا کر لینے میں گواہی محفوظ ہو جاتی ہے اور گواہوں کے لیے یہ بھی مناسب چیز ہے، اور اس کے لکھ لینے سے شک وشبہ بھی باقی نہیں رہتا، اس لیے فرمایا: ﴿وَأَدْنَىٰٓ أَلَّا تَرْتَابُوٓا۟﴾ "اور شک و شبہ سے بھی زیادہ بچانے والی ہے"۔ لہذا لکھ لینا حفاظت اور ثبوت

کے زیادہ قریب اور شک وشبہ سے دور ہے، چنانچہ یہ باہمی شک وشبہ سے بچاؤ کا ذریعہ ہے کیوں کہ شکوک وشبہات ہی اختلاف اور لڑائی جھگڑے کو جنم دیتے ہیں، اور شریعت اسلامیہ ان تمام راستوں پر قدغن لگادینا چاہتی ہے جو لڑائی جھگڑے اور اختلاف کا سبب بنتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے آپسی الفت ومحبت کی فضا قائم رہے جس کی تاکید شریعت اسلامیہ میں ہے اور اختلافات وتنازعات کے تمام اسباب کا خاتمہ ہو۔ اس سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ شریعت اسلامیہ دقیق تر حقوق کی حفاظت کرتی ہے، نیز منہج ربانی میں محبت والفت کے تمام وسائل وذرائع کا مکمل اہتمام اور اختلاف وتنازع کے تمام صورتوں اور حالتوں تر قدغن لگاتی ہے، اور جو چیز اللہ تعالی کو مرغوب ہے اس چیز کی رغبت دلا کر مومنوں کو آمادہ کیا گیا ہے تاکہ کوئی کاہلی اور انحراف نہ کرے: ﴿ذَٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِندَ اللَّهِ﴾ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات بہت انصاف والی ہے "۔

چونکہ کبھی کبھی لوگوں کے مابین تجارتی امور بہت جلد بازی میں انجام پاتے ہیں اور ایسے حالات میں خط وکتابت کا عمل مشکل ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالی نے ایسے حالات کو صراحت کے ساتھ مستثنی کر دیا، فرمایا: ﴿إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ﴾ "ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ معاملہ نقد تجارت کی شکل میں ہو جو آپس میں تم لین دین کر رہے ہو "۔ یعنی جب ہاتھوں ہاتھ لین دین کا معاملہ ہو تو ایسی صورت میں نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ اس وقت نہ لکھنے میں کوئی خدشہ نہیں(۱)۔ ﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا﴾ " تم پر اس کے نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں"۔ اللہ تعالی نے عدم کتابت کی صورت میں گناہ کی نفی کردی، کیوں کہ ایسی صورت میں قرض اور بقایا کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور ہاتھوں ہاتھ سارے معاملات طے پاجاتے ہیں۔ ﴿تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ﴾ یعنی تم ہاتھوں ہاتھ باہم قیمت اور سامان کے مالک ہو جاتے ہو۔

آگے آیت کریمہ میں خرید وفروخت میں گواہی کا حکم بیان کیا جارہا ہے: ﴿وَأَشْهِدُوٓاْ إِذَا تَبَايَعْتُمْ﴾ " خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ مقرر کرلیا کرو"۔ اللہ تعالی خرید وفروخت کے باب میں گواہ متعین کرنے کا حکم دے رہا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کے نزدیک

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/ ۳٤٤.

یہ حکم بطور استحباب ہے واجب نہیں(۱)۔ یہاں پر علماء کرام کی فکری نتائج کے ذریعہ ان کی فقہی کاوشوں کا پتہ چلتاہے، یعنی کتاب سنت رسول کی نصوص جن میں آپ کے افعال بھی شامل ہیں کو جمع کرے انہوں نے یہ حکم فقہی نکالا کہ یہاں پر صیغہ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب پر دلالت کرتا ہے اور اس کی دلیل حدیث رسول ہے۔ یہ فقہ بلا شبہ وسعت خیالی کا نتیجہ ہے جو کہ عقل انسانی کو ایک عام سوچ سے نکال کر فکر و نظر اور تدبر کی گیرائی تک لے جاتی ہے، جو بھی اس آیت کریمہ کے فقہی احکام و مضامین کا مطالعہ کرے گا تو فقہاء کرام کی نصوص کتاب وسنت کی دقت فہمی کے سامنے اس کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گی۔ کسی بھی جملے میں ضمیر کو تمام احتمالی وجوہات کے ساتھ جوڑنا، مفاہیم ودلالات کا ہر طرح سے استیعاب، مراد ومقاصد کی سمجھ ان تمام امور پر مطلع ہو کر آدمی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ قرآن کریم کو اس کی عام فہم سے نکال کر نتائج واستنباط کی گیرائی تک لانے میں علماء امت کا بہت بڑا کردار ہے۔ ﴿وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ﴾ "اور (یاد رکھو کہ) نہ تو لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے نہ گواہ کو"۔ اس کا پہلا معنی تو یہ ہے کہ کاتب ایسی چیز نہ لکھے جو اس کو املاء نہیں کرائی گئی ہے اور گواہ گواہی میں کمی بیشی نہ کرے۔ اور دوسرا معنی یہ ہے کہ کاتب لکھنے سے انکار نہ کرے اور نہ گواہ گواہی دینے سے۔ اس کا تیسرا معنی یہ ہے کہ گواہ کو گواہی کے لیے اور کاتب کو لکھنے کے لیے ان کی مشغولیت کے وقت میں نہ بلایا جائے اور جب معذرت کریں تو زبردستی کر کے تکلیف نہ دی جائے اور نہ ان سے ایسی کوئی بات کہی جائے جس سے ان کو تکلیف ہو مثلا کہا جائے کہ تم لوگ اللہ تعالی کے حکم کی مخالفت کر رہے ہو یا اسی طرح کی دوسری باتیں(۲)۔ آیت کے ان تمام احتمالی صورتوں اور اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے درست مفاہیم اخذ کرنے کا یہی فائدہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ نصوص قرآن کی اعلی بلاغت ہے کہ اس کے ایک کلمہ یا جملہ میں بہت سارے معانی کا احاطہ ہوتا ہے اور تمام معانی قریب قریب اور کافی دقیق ہوتے ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں گزر چکی ہیں او آئندہ بھی آئیں گی۔

---

(۱) مرجع سابق.

(۲) تفسير قرطبي ۳/۲٦۱-۲٦۲.

اس کے بعد آیت کریمہ عظیم نصیحت کے ساتھ ختم ہو رہی ہے: ﴿وَإِن تَفۡعَلُواْ فَإِنَّهُۥ فُسُوقُۢ بِكُمۡۗ﴾ "اور اگر تم یہ کرو تو یہ تمہاری کھلی نافرمانی ہے"۔ یعنی اگر تم اوامر کی مخالفت یا منہیات کا ارتکاب کرو تو یہ تمہاری نافرمانی ہے اور یہ تمہاری ذات کے ساتھ پیوست ہے اس سے تم خود کو الگ نہیں کر سکتے (۱)۔ فسق کہتے ہیں اطاعت سے نکل جانا۔ اس کے ذریعہ بلاشبہ اللہ تعالی کے اوامر و نواہی کی مخالفت سے خوف دلانا مقصود ہے، اس لیے پوری سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ ﴿وَٱتَّقُواْ ٱللَّهَۖ﴾ " اللہ سے ڈرو " اور اس کا خوف اور دھیان رکھو اور اس کے اوامر کو بجا لاؤ اور منہیات سے پرہیز کرو۔ اس کے بعد ارشاد ربانی ہے: ﴿وَيُعَلِّمُكُمُ ٱللَّهُۗ﴾ " اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے "، یعنی تماری مصلحت کے امور تم کو سیکھا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اللہ تعالی ہی ہے جو اپنے بندوں کو یہ صریح علم دے رہا ہے اور وہی ہے جو تمام دیگر نفع بخش علوم سیکھاتا ہے، وہی اپنے بندوں کو مستقبل کی ضروریات کی تعلیم اور رہنمائی نیز اس کے حصول کے راستے آسان کرتا ہے، لہذا اللہ تعالی کی شکر گذاری اور علم و فضل کے اس احسان کے بدلے تقوی کا التزام ضروری ہے تاکہ مزید اللہ تعالی کا فضل و کرم، علم و برکت اور ہدایت و رحمت حاصل ہو، کیوں کہ تقوی حصول علم کا اہم سبب و وسیلہ ہے۔ آگے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٞ﴾ "اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"، وہ اپنے بندوں کو اور ہر چیز کو جانتا ہے، اس پر کوئی چیز مخفی نہیں، یہ اس عظیم آیت کا آخری ٹکڑا ہے، اسی کے ساتھ یہ آیت مکمل ہو جاتی ہے۔

﴿وَإِن كُنتُمۡ عَلَىٰ سَفَرٖ وَلَمۡ تَجِدُواْ كَاتِبٗا فَرِهَٰنٞ مَّقۡبُوضَةٞۖ فَإِنۡ أَمِنَ بَعۡضُكُم بَعۡضٗا فَلۡيُؤَدِّ ٱلَّذِي ٱؤۡتُمِنَ أَمَٰنَتَهُۥ وَلۡيَتَّقِ ٱللَّهَ رَبَّهُۥۗ وَلَا تَكۡتُمُواْ ٱلشَّهَٰدَةَۚ وَمَن يَكۡتُمۡهَا فَإِنَّهُۥٓ ءَاثِمٞ قَلۡبُهُۥۗ وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ عَلِيمٞ ٢٨٣﴾

ترجمہ:

"اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو رہن قبضہ میں رکھ لیا کرو، ہاں آپس میں ایک دوسرے سے مطمئن ہو تو جسے امانت دی گئی ہے وہ اسے ادا کر دے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۳٤٤.

جو اس کا رب ہے۔اور گواہی کو نہ چھپاؤاور جو اسے چھپالے وہ گناہ گار دل والا ہے ، اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے(۲۸۳)"۔

یہاں سے فرید وفروخت کرنے والے کی ایک دوسری حالت کے متعلق ہدایت دی جاری ہے ، ارشاد فرمایا:﴿وَإِن كُنتُمۡ عَلَىٰ سَفَرٍ﴾"اوراگر تم سفر میں ہو" یہ خرید وفرخت کرنے والوں کے من جملہ احوال میں سے ایک ممکنہ حالت کا بیان ہے اور وہ سفر کی حالت ہے،اس سے یہ فائدہ اخذ ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں انسانیت کو درپیش تمام حالات اور وجوہات کی تہہ تک کی ہدایات موجود ہیں، اس سے یہ بات متحقق ہے کہ مسائل ومعاملات میں یہ دقت وگیرائی وحی الٰہی کے بغیر ممکن نہیں، کیوں کہ ان ہدایات میں ان متوقع امور وحالات کا بھی استیعاب ہے جو خرید وفرخت کرنے والے کو کبھی درپیش ہو سکتے ہیں اور پھر ایسے حالات میں ان کو مشکل کا سامنا کرناپڑ سکتا ہے:﴿وَإِن كُنتُمۡ عَلَىٰ سَفَرٖ وَلَمۡ تَجِدُواْ كَاتِبٗا﴾ "اوراگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ"۔ یہ ایک متوقع صورت حال ہے جس کی قرآن کریم میں ہدایت ہے ، یعنی جب خرید وفروخت کا معاملہ مکمل یا بعض حصہ کے ادھار سے طے پائے اور کوئی لکھنے والا یا لکھنے کے وسائل یعنی قلم وکاغذ وغیرہ وہاں پر مہیانہ ہوں تو ایسی حالت میں اللہ تعالی اپنے بندوں کو رہن رکھنے کی ہدایت کررہاہے، فرمایا:﴿فَرِهَٰنٞ مَّقۡبُوضَةٞ﴾"تم رہن قبضہ میں رکھ لیا کرو"اور یہ رہن کتابت کے قائم مقام ہوگا، بایں طور کہ صاحب حق کو بطور رہن کوئی چیز قبضے میں دی جائے اور یہ رہن میں رکھا ہوا سامان بیچنے والے کے پاس اس سامان کی ضمانت کے طور پر ہوگا جو اس نے خریدنے والے کو بیچا ہوا ہے گویا خریدار اب ایک قرض دار ہے۔ اس سے معلوم ہوا کی بیع وشراء کے مسائل کو شریعت اسلامیہ نے انتہائی باریکی سے حل کیاہے کیوں کہ روزمرہ کی زندگی میں بیع کے مسائل کافی اہم ہیں اور سفر وحضر ہر جگہ پیش آسکتے ہیں،اور ایسا ممکن ہے کہ ان حالات میں قیمت کی مکمل رقم یااس کا بعض حصہ میسر نہ ہواور کسی وجہ بطور ثبوت اس کو کتابی شکل بھی نہ دی جاسکتی ہو،ایسے حالات میں خرید وفرخت کرنے والے کی مصلحت موقوف نہیں ہوجاتی بلکہ یہاں بھی صاحب حق کے حقوق کی ضمانت دے کر دونوں کی مصلحت پوری ہوجارہی ہے۔

اس حکم میں بھی ایک استثنائی صورت ہے جو اللہ تعالی کے اس فرمان میں بیان کی گئی ہے: ﴿فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا﴾ "ہاں آپس میں ایک دوسرے سے مطمئن ہو"۔یعنی دونوں جانب سے امن واطمینان حاصل ہو اور صورت حال لائق اعتماد ہو تو بائع و مشتری دونوں کو نہ لکھنے کی اور رہن نہ رکھنے کی اجازت ہے۔اور خرید وفروخت کے دونوں فریق کو وفاداری کی ہدایت کی جارہی ہے: ﴿فَلْيُؤَدِّ ٱلَّذِى ٱؤْتُمِنَ أَمَٰنَتَهُۥ﴾ " تو جسے امانت دی گئی ہے وہ اسے ادا کر دے "۔قرض دار کو ہدایت ہے کہ وہ قرض خواہ کو قرض ادا کردے،اس آیت میں اللہ تعالی نے خریدار یا قرضدار کو مؤتمن یعنی امانت رکھنے والا کہا ہے: ﴿ٱلَّذِى ٱؤْتُمِنَ﴾ " جسے امانت دی گئی ہے"،امانت دینے والے یعنی بیچنے والے صاحب حق نے جسے امانت سونپی ہے۔ ﴿ٱؤْتُمِنَ﴾ فعل ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔اور اللہ تعالی نے دَین یعنی قرض کو امانت سے موسوم کیا ہے (أَمَٰنَتَهُۥ)، قرض کی اس سے بلیغ تعبیر نہیں ہوسکتی، اس تعبیر کا مفہوم اس کی ادئیگی پر آمادہ کررہا ہے گویا کہ اس امانت دینے والے نے اس کو ایک امانت دی ہے لہذا اس کو بھی بدلے میں وہ امانت ادا کردینی چاہیے، یعنی ایک امانت سونپے گئے شخص کے لیے یہی زیب دیتا ہے کہ امانت دینے والے کی امانت بخوبی ادا کردے۔اس کے بعد اللہ تعالی تقوی کا حکم دے رہا ہے: ﴿وَلْيَتَّقِ ٱللَّهَ رَبَّهُۥ﴾ "اور وہ اللہ تعالی سے ڈرتا رہے جو اس کا رب ہے"۔ چنانچہ قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں اللہ تعالی سے ڈرے۔ اللہ تعالی نے مخاطب کے لیے تقوی کے اس حکم میں لفظ جلالہ (اللہ) اور (رب) دونوں کو جمع کیا ہے، اور رب ہی مالک ہے، یعنی وہ اس اللہ سے ڈرتا رہے جو اس کا اور اس کے تمام امور کا مالک ہے، اور اللہ تعالی کی حکم عدولی سے بچے۔ یہ بیان کی گیرائی اور انتہائی درجہ کی مؤثر نصیحت ہے ۔ تمام تعریف اس اللہ تعالی کے لیے ہے جس نے قرآن کریم کی نعمت سے نوازا اور اس کا علم دیا اور علم حاصل کرنے کی نعمت دی نیز ہر طرح کی ظاہری و باطنی نعمتیں عطا کی۔

آیت میں بقیہ نصائح کا ذکر ہورہا ہے، ارشاد ربانی ہے: ﴿وَلَا تَكْتُمُوا۟ ٱلشَّهَٰدَةَ﴾ "اور گواہی کو نہ چھپاؤ" گواہ کو گواہی چھپانے سے روکا گیا ہے، یا تو گواہی سرے سے چھپالے یا گواہی دینے سے انکار کرے تاکہ گواہی کا مضمون پوشیدہ رہ جائے تو جو ایسا کرتا ہے اس پر وہی حکم لاگو ہوگا جسے اللہ تعالی آگے آیت میں بیان کررہا ہے: ﴿وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُۥٓ ءَاثِمٌ قَلْبُهُۥ﴾ "اور جو اسے چھپالے وہ گنہگار دل والا

ہے"۔ سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یعنی وہ فاجر دل والا ہے[1]۔ چنانچہ وہ فجور کی صفت سے متصف ہے، اور قلب کا خصوصی ذکر اس لیے ہے کیوں کہ امانت داری کا مرکز دل ہی ہے، وہیں سے امانت کا صدور ہوتا ہے یا امانت کی کمزوری اور چھپا لینے کی جگہ بھی وہی ہے۔ یہ دلیل ہے کہ گواہی وغیرہ کی امانت کا ضیاع دل سے ہے اور دل سے امانت کا ضیاع فجور قلب اور تقوی سے دوری کی دلیل ہے، اور گواہی وغیرہ کی امانت کی ادائیگی دل کے تقوی کی دلیل ہے اور انسان کے اندر کا یہی دل امانت کا ملجا وماوی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالی کے مقام علم کو اجاگر کر کے نصیحت کی گئی ہے: ﴿وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ "اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے"۔ اس پر بنی نوع انسان اور دوسری مخلوقات کا کوئی عمل مخفی نہیں ہے، اس کا تقاضا ہے کہ مخاطب اس بات سے بچے کہ اللہ تعالی کو اس کے کسی گناہ اور برائی کا علم ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو اپنے اچھے برے احوال کے متعلق اللہ کے علم کا شعور احساس رہنا چاہئے، جب یہ شعور واحساس ہو گا تو بندہ اطاعت الہی سے قریب اور معصیت سے دور رہے گا، اور جب بھی اس کے دل میں حکم عدولی کا کھٹکا پیدا ہو گا تو فوراً اپنے متعلق اللہ تعالی کا علم اس کو یاد آجائے گا۔

فرمان الہی: ﴿وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ "اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے"۔ سلوک و کردار کا ایک اہم قاعدہ وضابطہ ہے، جب کبھی اس کے جی میں معصیت کا خیال آئے گا تو وہ خود سے گویا ہو گا: ﴿وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ "اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے"۔ اگر کہیں کوتائی کا ارادہ ہوا تو خود کو مخاطب ہو گا ﴿وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ "اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے"۔ اگر بھلائی کا ارادہ کیا تو اس سے خود کو تقویت پہنچانے اور اس ارادے کی تکمیل کا حوصلہ پانے کے لیے ﴿وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ "اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے"۔ کا سہارا لے گا، اور اگر خیر کے کام کے متعلق شش وپنج میں مبتلا ہے تو ﴿وَٱللَّهُ بِمَا تَعۡمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ "اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے"۔ اس کی تشجیع کا سامان ہو گا۔ چنانچہ یہ فرمان الہی باذن اللہ خیر پر آمادہ کرنے اور معصیت سے بچنے کے لیے ایک مضبوط قاعدہ ہے۔

---

(١) تفسير ابن كثير ١/٣٤٥.

بیع وشراءاور قرض کے لین دین کے مسائل کے بیان میں یہ اہتمام ربانی بیع وشراءاور اس راہ میں روئے زمین پر دوڑ دھوپ کے فضیلت کی دلیل اور تشجیع ہے، کیوں کہ اس کی منفعت ومصلحت سب کو حاصل ہے اور اس کے ذریعہ سب ایک دوسرے سے فائدے اٹھاتے ہیں، بلکہ یہ آپسی تعارف، الفت ودوستی اور صدقات وخیرات کا ذریعہ بھی ہے جو اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب ہے۔ اسی طرح اس میں کام کرنے کی اہمیت اور بے روزگاری وبیکاری کے مذمت کی دلیل ہے۔ منہج اسلام مصلحتوں کی بحالی کے لیے انسانی صلاحیتوں کو استعمال میں لانا چاہتا ہے اور اپنے نہایت عمدہ اور دقیق احکامات وقوانین کے ذریعہ ان صلاحیتوں کے استعمال کو منظم اور مستحکم کرتا ہے، جیسا کہ قرآن کریم کی سب سے طویل سورہ کی سب سے طویل آیت خرید وفروخت، قرض اور سفر وحضر میں رہن کے مسائل پر مشتمل ہے۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

﴿لِلَّهِ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلْأَرْضِ ۗ وَإِن تُبْدُوا۟ مَا فِىٓ أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ ٱللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُ ۗ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٨٤﴾ ءَامَنَ ٱلرَّسُولُ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِۦ وَٱلْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِۦ ۚ وَقَالُوا۟ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ ٱلْمَصِيرُ ﴿٢٨٥﴾ لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا ٱكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ إِن نَّسِينَآ أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِۦ ۖ وَٱعْفُ عَنَّا وَٱغْفِرْ لَنَا وَٱرْحَمْنَآ ۚ أَنتَ مَوْلَىٰنَا فَٱنصُرْنَا عَلَى ٱلْقَوْمِ ٱلْكَٰفِرِينَ ﴿٢٨٦﴾﴾

ترجمہ:

"آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کا حساب تم سے لے گا، پھر جسے چاہے بخشے جسے چاہے سزا دے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے (۲۸۴)۔ رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے اتری اور مومن بھی ایمان لائے یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اس کے رسولوں میں سے کسی میں ہم تفریق نہیں کرتے، انہوں نے کہہ دیا

کہ ہم نے سنااور اطاعت کی، ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے رب اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے(۲۸۵)۔ اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، جو نیکی وہ کرے وہ اس کے لئے اور جو برائی وہ کرے وہ اس پر ہے، اے ہمارے رب اگر ہم بھول گئے ہوں یا خطا کی ہو تو ہمیں نہ پکڑنا اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو اور ہم سے در گزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تو ہی ہمارا مالک ہے، ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا فرما(۲۸۶)"۔

اس سورہ مبارکہ کا سیاق اللہ تعالی کی بادشاہت، مسائل ایمان، مغفرت اور انعام کے بیان کی طرف منتقل ہو رہا ہے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے: ﴿لِلَّهِ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلْأَرْضِ﴾ "آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے"، یہ اللہ تعالی کی طرف سے اس بات کا اثبات اور بیان ہے کہ آسمانوں اور زمین اور ان میں جو بھی چیز ہے وہ سب تخلیق، ملکیت، تصرف، علم اور احاطے کے اعتبار سے اسی کی ہے، حتی کہ انسان اپنے دل میں جو کچھ دوسروں سے چھپائے رکھتا ہے یا جو کچھ ظاہر کرتا ہے وہ سب اللہ تعالی کے احاطہ اور علم میں ہے اور اللہ تعالی اس کا حساب لے گا، اللہ علیم حکیم فرماتا ہے: ﴿وَإِن تُبْدُوا۟ مَا فِىٓ أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ ٱللَّهُ﴾ "تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ اس کا حساب تم سے لے گا"، اس میں اللہ تعالی کے علم، حساب وکتاب، یوم آخرت، اللہ تعالی کی باشاہت کا ثبوت ہے، نیز یہ کہ وہی پیدا کرنے والا ہے، اسی کو تصرف کا حق حاصل ہے، اور اس کے علم سے مخلوق کا کوئی راز پوشیدہ نہیں ہے، وہ منافقین کے باطن سے خوب واقف ہے جو کہ بظاہر تو ایمان کا اقرار کرتے ہیں لیکن اندر کفر چھپائے پھرتے ہیں، اللہ تعالی خوب جانتا ہے کہ عمل صالح کی ادائیگی میں کس کی بری نیت ہے، اس کو معلوم ہے کہ کون ریا و نمود کے مقصد و ارادے سے نیک عمل کرتا ہے، اور اس کو بھی جانتا ہے جس کے دل میں نیکی کا ارادہ تھا لیکن کر نہ سکا اور جس کی پہلے سے اطاعت کی نیت نہیں تھی لیکن پھر اسباب بھی آڑے آ گئے، جیسا کہ وہ شخص جو رات میں سوئے اور وقت پر نماز ادا کرنے کی پہلے ہی سے نیت نہ ہو اور پھر آنکھ بھی نہ کھلے اور سو یارہ جائے، غرض یہ کہ اللہ تعالی سے دلوں کا کوئی راز مخفی نہیں خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ اس میں ایک مومن کے لیے تاکید ہے کہ وہ اللہ تعالی کا بندہ اور اسی

کی ملکیت ہے،اور جن چیزوں کا انسان مالک ہے اس میں اس کو صرف تصرف کا حق حاصل ہے کیوں کہ وہ سب کچھ اپنے پیچھے چھوڑ دینے والا ہے اور اگر نہیں بھی چھوڑتا تو وہ چیزیں اس سے ختم ہو جاتی ہیں، بلکہ ان میں اس کی اپنی مرضی کی تدبیر بھی نہیں چلتی اور جب تک علم و حکمت والے اس کے مالک حقیقی اللہ سبحانہ تعالی کی تدبیر ساتھ نہ دے ہلاکت خیزی اور نقصانات سے اپنی ملکیت کی حفاظت سے عاجز ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر شخص کی خود اس کی ذات، اس کی سامان ملکیت اور اشیاء منفعت سب مالک حقیقی سبحانہ وتعالی کی محتاج ہیں، لہذا اللہ تعالی کی اطاعت، اس کی نافرمانی سے اجتناب، اس سے دعا واستغاثہ اور اس پر توکل لازم ہے۔

اس کے بعد آیت کریمہ میں بیان کیا جارہا ہے کہ عفو ومغفرت بھی اللہ تعالی کی ملکیت ہے: ﴿ فَيَغۡفِرُ لِمَن يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُۗ ﴾ "پھر جسے چاہے بخشے جسے چاہے سزا دے"، چنانچہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے بخش دے، مغفرت کا حق اسی کو حاصل ہے، اور جس کو چاہے سزا دے، سزا کا بھی حق اسی کو حاصل ہے، اس کے حکم پر کوئی اعتراض کرنے والا نہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، فرمایا: ﴿ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيۡءٖ قَدِيرٌ ﴾ " اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔ اس میں اللہ کی مغفرت کا اثبات ہے، اور یہ کہ بندہ جتنا بھی گناہ کرلے اگر اللہ تعالی اس کو معاف کرنا چاہے تو معاف کر دیتا ہے، کیوں کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ چیز مومن کو اللہ تعالی سے طلب مغفرت کا تقاضا کرتی ہے، جب اللہ تعالی کی شان یہ ہے کہ وہ جس کو چاہے معاف کردے تو مومن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے چاہے اس سے کتنا ہی گناہ سرزد ہوا ہو۔ فرمان الہی: ﴿ لِمَن يَشَآءُ ﴾ " جسے چاہے" اس بات کی دلیل ہے کہ اختیارات اللہ سبحانہ وتعالی ہی کے لیے ہیں، یہ بندہ کے سلوک و کردار کے درستگی کا سبب ہے کیوں کہ جب اس کو یہ علم نہیں کہ ایا وہ ان لوگوں میں سے جنہیں اللہ تعالی اپنی مرضی سے معاف کردے یا ان لوگوں میں سے ہے جن کو معاف نہیں کرے گا تو وہ خوب اللہ تعالی کی بندگی کرے گا اور اس کی مغفرت کا طالب ہوگا، نیز نافرمانیوں اور برائیوں سے اجتناب کرے گا اور اللہ تعالی کی نافرمانی میں مبتلا نہیں رہے گا۔ شریعت میں ایسی نصوص موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالی کی رحمت ومغفرت کی صفت زیادہ

غالب ہے، جیساکہ حدیث قدسی ہے: "أَنَا عِندَ ظَنِّ عَبْدِي بِي ، وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي"(١) (اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوتا ہوں اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں)۔

اس آیت کریمہ کے نزول کا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر کافی اثر پڑا ، وہ بہت پریشان ہوگئے کیوں کہ اس میں دل میں آنے والے خیالات کے محاسبہ کی بات کہی گئی ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ سے مروی ہے وہ بیان فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ﴿ لِّلَّهِ مَا فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي ٱلْأَرْضِ ۗ وَإِن تُبْدُوا۟ مَا فِىٓ أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ ٱللَّهُ ۖ فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُ ۗ وَٱللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴾ کی یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بہت پریشان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور گھٹنوں کے بل گرپڑے اور کہنے لگے اے اللہ کے رسول ہمیں نماز، روزہ، زکاۃ، جہاد اور صدقات کا حکم ہوا وہ ہماری طاقت میں تھا اور ہم نے حتی المقدور کیا اور اب جو یہ آیت نازل ہوگئی ہے اس کے برداشت کی طاقت ہم میں نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کیا تم یہود ونصاری کی طرح یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہم نے سنا اور نہیں مانا، تمہیں چاہئے کہ تم یوں کہو: ہم نے سنا اور مانا، اے ہمارے رب ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور ہمیں تیری طرف لوٹنا ہے"، چنانچہ صحابہ کرام نے اسے تسلیم کیا اور زبان پر یہ کلمات جاری ہو گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے یہ دونوں آیتیں نازل فرمائی: ﴿ ءَامَنَ ٱلرَّسُولُ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِۦ وَٱلْمُؤْمِنُونَ ... ﴾ اور ﴿ لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا ٱكْتَسَبَتْ ﴾(٢)۔

ان دونوں آیتوں سے ان کو اطمینان ہوا، جیسا کہ اللہ تعالی ان میں فرمارہا ہے: ﴿ ءَامَنَ ٱلرَّسُولُ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِۦ وَٱلْمُؤْمِنُونَ ﴾ "رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس کی طرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے اتری اور مومن بھی ایمان لائے" ، اللہ تعالی نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان وتصدیق میں مومنوں کو بھی شریک کیا اور ایمان وتصدیق میں ان کے نبی کے ساتھ ان کی شرکت ان کے لیے انتہائی

---

(١) صحيح البخاري ٣٨٤/٤ حديث نمبر ٧٤٠٥.

(٢) تفسير ابن كثير ٣٤٥/١-٣٤٦.

شرف کی بات ہے، اور یہ اللہ تعالی کی اپنے مومن بندوں کے ساتھ عنایت اور کرم فرمائی ہے کہ اس نے ان کے احساس غم کو دور کیا۔ چنانچہ اللہ تعالی نے اپنے نبی پر جو کچھ نازل فرمایا سب پر وہ لوگ ایمان لائے: ﴿كُلٌّ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِۦ وَكُتُبِهِۦ وَرُسُلِهِۦ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِۦ﴾ "یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اس کے رسولوں میں سے کسی میں ہم تفریق نہیں کرتے"۔ یہ ان کے ایمان کا ثبوت ہے، اور ان چیزوں پر ایمان لانا ہر مسلمان پر اور جو بھی اسلام میں داخل ہونا چاہئے اس پر واجب ہے۔ ﴿وَقَالُوا۟ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ "انہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی"۔ یہی ایک مومن کا شیوہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے سامنے سمع وطاعت کا سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اس کے کسی امر و نہی کے مقابل اپنی رائے اور خواہش کو نہیں آنے دیتا، بلکہ شریعت کے ہر حکم پر ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ کی پکار ہوتی ہے۔

چنانچہ ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ "ہم نے سنا اور اطاعت کی"۔ ایک مسلمان کا قاعدہ ہے، جب بھی اللہ تعالی کے اوامر میں سے کسی امر کے بارے میں دل میں کوئی غلط وسوسہ پیدا ہو تو پکار اٹھتا ہے: ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ "ہم نے سنا اور اطاعت کی"۔ اگر جن وانس کی طرف سے اس کو کوئی بہکانے کی کوشش کرے تو کہتا ہے: ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ "ہم نے سنا اور اطاعت کی"۔ اگر کتاب وسنت کے خلاف کچھ سنتا ہے تو اللہ کی پناہ طلب کرتے ہوئے گویا ہوتا ہے: ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ "ہم نے سنا اور اطاعت کی"۔ اگر شریعت الہی میں لوگ اختلاف وتنازع پر اتر آئیں تو ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ "ہم نے سنا اور اطاعت کی" کے اس فرمان الہی سے اللہ کے لیے بدلہ لیتا ہے۔ گویا اللہ تعالی کا یہ فرمان اس کے لیے ایسی طاقت ہے جسے شریعت الہی کے ہر مخالف کے خلاف استعمال کرتا ہے۔

اسی طرح ایک مومن کی یہ دعا ہوا کرتی ہے: ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ ٱلْمَصِيرُ﴾ "ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے رب! اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے"۔ یعنی اس سے جو گناہ اور کوتاہی سرزد ہو جاتی ہے اس پر اللہ تعالی سے مغفرت طلب کرتا ہے، اس بات کا اعتراف اور یقین رکھتے ہوئے کہ لوٹنا اللہ تعالی ہی طرف ہے، نصیحت پکڑنے والوں کے لیے یہ بھی ایک قوت ہے، کیوں کہ جب بھی اس کو اپنی کوتاہی کا احساس ہو گا پکار اٹھے گا: ﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ ٱلْمَصِيرُ﴾ "ہم تیری

بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے رب! اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے"۔ اور اگر اس سے کوئی گناہ ہو گیا تو یہ فرمان اس کو یاد آجائے گا اور دعا گو ہو گا ﴿ غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيۡكَ ٱلۡمَصِيرُ ﴾ "ہم تیری بخشش طلب کرتے ہیں اے ہمارے رب! اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹنا ہے"۔

اس کے بعد فرمان باری تعالی ہے: ﴿ لَا يُكَلِّفُ ٱللَّهُ نَفۡسًا إِلَّا وُسۡعَهَا ﴾ "اللہ تعالی کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"۔ چنانچہ یہ اللہ سبحانہ وتعالی کی رحمت ہے کہ شریعت میں ایسی چیزوں کا مکلف نہیں بنایا گیا جو طبیعت پر شاق گزرے اور انسانی طاقت سے باہر ہو، یہ اس کی رحمت ہی ہے کہ بندوں کو مختلف حالات کے مطابق رخصتیں دی گئی ہیں، مثال کے طور پر مریض کو رمضان میں روزہ نہ رکھ کر بعد میں قضاء کی رخصت، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے مجبور کو بیٹھ کر نماز پڑھنے کی رخصت، زکات میں مال کا چالیسواں حصہ دینا، نماز میں بھول چوک ہونے پر سجدہ سہو وغیرہ۔ پس اللہ تعالی کی رحمت ہی ہے کہ کسی پر بھی ایسے احکامات لازم نہیں کئے جو اس کی قدرت وطاقت میں نہ ہو، اور اللہ تعالی ہر ایک مخلوق کی قوت سے واقف ہے، ایک مریض میں جتنا کرنے کی طاقت واستطاعت ہے وہ اللہ تعالی کو معلوم ہے اسی طرح مالدار و فقیر، خوفزدہ اور مامون ان میں سے ہر کوئی فرائض و مستحبات میں اطاعت الہی کی کس قدر اور کس صورت و کیفیت میں استطاعت رکھتا ہے سب اللہ تعالی جانتا ہے اس پر کوئی چیز پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے۔ آگے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَعَلَيۡهَا مَا ٱكۡتَسَبَتۡۗ ﴾ "جو نیکی وہ کرے وہ اس کے لئے اور جو برائی وہ کرے وہ اس پر ہے"۔ معلوم ہوا کہ انسان جو کار خیر انجام دیتا ہے وہ اسی کے فائدے کے لیے ہے اور اس کا اجر وثواب اسی کو ملنے والا ہے، نیز جو برائی کرتا ہے اس کا وبال اسی پر ہے اس پر اس کی باز پرس ہو گی اور اسی حساب سے وہ سزا کا مستحق ہو گا۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالی نے اپنی ذات سے سرے سے ظلم کی نفی کی ہے اور ایک انسان کے علم میں یہ بات ہو گی تو وہ ضرور خود کو گناہوں سے بچائے گا اور خیر کے کاموں میں مشغول ہو گا۔

آیت کریمہ میں ایک فائدے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے لفظ اکتساب کے ساتھ خیر یا اثم کا ذکر نہیں کیا، کیوں کہ یہ اکتساب و عمل یا تو کرنے والے کے لیے خیر ہو گا تو اس کا نتیجہ اس کے حق میں بہتر ہو گا یا یہ اکتساب و عمل گناہ ہو گا تو اس کا نتیجہ اس کے اوپر بطور وبال ہو گا، اس لیے یہاں پر لفظ خیر یا اثم کے

صراحتاً ذکر کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، اور یہ قرآن کریم کا حسن بیان اور دقت تعبیر ہے کہ جن الفاظ کی ضرورت نہیں اسے ذکر نہیں کرتا۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے مومنوں کو ایک جامع دعا سیکھائی: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَآ إِن نَّسِينَآ أَوۡ أَخۡطَأۡنَا﴾ "اے ہمارے رب اگر ہم بھول گئے ہوں یا خطا کی ہو"۔ یہ بھول چوک اور غلطی کے سبب سرزد ہونے والے گناہوں سے معافی کی طلب ہے، اور یہ اللہ تعالی کے لطف وکرم کی مثال ہے کیوں کہ انسان سے غلطی کا صدور ہونا ہی ہوتا ہے اور بھول چوک بھی اس کا عارضہ ہے جس کی وجہ سے اطاعت کے کام اس سے چھوٹ جاتے ہیں اور تقرب الی اللہ کے اعمال میں سبقت کرنے میں کمیاں رہ جاتی ہیں، لہذا اللہ جل جلالہ نے طلب مغفرت کی ہدایت کی اور پھر تکالیف شرعیہ کی گرانی میں تخفیف کے لیے دعا کی رہنمائی فرمائی: ﴿وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَآ إِصۡرٗا كَمَا حَمَلۡتَهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبۡلِنَاۚ﴾ "اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا"، یعنی ہم پر اتنا بوجھ نہ ڈال جس کو ہم اٹھانہ سکیں، جیسا کہ گذشتہ قوموں پر شاق احکامات فرض کئے گئے تھے۔ ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِۦ﴾ "اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو" پس تو ہم پر دشوار گذار احکامات، مصائب وآلام کا بوجھ نہ ڈال، یعنی ہم کو ایسی آزمائشوں سے دوچار نہ کر جن کی ہمیں طاقت نہ اور جنہیں ہم برداشت نہ کر سکیں۔ یہ ہر مصیبت اور آزمائش سے بچنے کی عظیم دعا ہے۔

رب العالمین کی جانب سے مومنوں کو اس دعائے عظیم کی تعلیم اس کے رحمت کی دلیل ہے، نیز یہ کہ اللہ تعالی اپنے بندوں کو مشقت میں نہیں ڈالنا چاہتا اور نہ کسی بلاء اور مصیبت میں رکھنا چاہتا ہے، اس کو تو اپنے بندوں کی دعائیں، مانگیں اور گریہ وزاریاں محبوب ہیں۔ ﴿وَٱعۡفُ عَنَّا وَٱغۡفِرۡ لَنَا وَٱرۡحَمۡنَآ﴾ "اور ہم سے در گزر فرما اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر"۔ ﴿وَٱعۡفُ عَنَّا﴾ "ہم سے در گزر فرما" یعنی ہمارے گناہوں سے اور ہم کو اس پر سزا نہ دے[(١)]۔ ﴿وَٱغۡفِرۡ لَنَا﴾ "اور ہمیں بخش دے"، غفر کے معنی ستر یعنی چھپانے کے ہیں ، اور مغفرت سے مراد گناہ کو چھپانا[(٢)]۔ اور اللہ تعالی کی مغفرت کا مطلب یہ ہے

---

(١) فتح القدير ١/٣٠٨.

(٢) مرجع سابق .

کہ وہ بندے کو ادنی عذاب سے بھی محفوظ رکھے[1]، بایں طور کہ گنہگار سے گناہ کو بالکل مٹادے۔﴿وَٱرۡحَمۡنَآ﴾ "اور ہم پر رحم کر" یعنی ہم پر فضل واحسان اور انعام کر، نیز تیری توفیق سے ہم کسی دوسری گناہ کے مرتکب نہ ہوں۔﴿أَنتَ مَوۡلَىٰنَا﴾ "تو ہی ہمارا مالک ہے" تو ہی ہمارا ناصر و مددگار ہے اور تجھ پر ہی ہمارا توکل ہے۔﴿فَٱنصُرۡنَا عَلَى ٱلۡقَوۡمِ ٱلۡكَٰفِرِينَ﴾ "ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا فرما"۔ یعنی ان لوگوں پر تو ہماری مدد فرما جو تیرے دین، تیری وحدانیت اور نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے منکر ہیں، اور ان کے مقابل دنیا وآخرت کا انجام ہمارے حق میں نصیب فرما[2]۔ یہ آیت اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالی ہی (عفو) ہے، وہی درگذر کرتا ہے اور اسی سے عفو ودرگذر کی دعا ہونی چاہیے، کسی دوسرے سے نہیں، وہی (غفور) ہے جو بخشتا ہے، لہذا بخشش کی طلب اسی سے ہو، وہی (رحمن) ہے جو لوگوں پر رحم کرتا ہے اور رحمت کی دعا اسی سے کرنی چاہیے، اور وہی مدد کرتا ہے لہذا تمام امور میں نصرت ومدد اسی سے طلب کی جائے۔

اس آیت کریمہ کے فوائد میں سے جامع دعاؤوں کی تعلیم ہے، اور اللہ تعالی کی اپنے بندوں کے ساتھ عظیم رحمت ہے کہ اس نے ان کو دنیا وآخرت کی بھلائی کے لیے جامع، بہترین اور کامل دعاؤوں کے ذریعہ دعا کرنے کی کیفیت بتائی۔ ان دونوں آیتوں کے فضائل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان وارد ہے کہ "الآيَتَانِ مِن آخِرِ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مَن قَرَأَهُمَا فِي لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ" [3] (سورہ البقرہ کے آخر کی دو آیتیں جو شخص رات میں پڑھتا ہے وہ اس کے لیے کافی ہو جاتی ہیں)۔ ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "أُعْطِيتُ خَوَاتِيمَ سُورَةِ الْبَقَرَةِ مِن بَيْتِ كَنزٍ تَحْتَ الْعَرْشِ لَمْ يُعْطَهُنَّ نَبِيٌّ قَبْلِي "[4] (مجھ کو عرش کی نیچے ایک خزانے والے گھر سے سورہ بقرہ کی آخری آیتیں دی گئیں اور یہ آیتیں مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں)، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لَا يُقْرَآنِ

---

(١) المفردات في غريب القرآن ٣٦٢.

(٢) تفسير ابن كثير ٣٥١/١.

(٣) صحيح البخارى ٩٣/٣ حديث نمبر ٤٠٠٨.

(٤) مسند أحمد ٢٧٤/٣٥ حديث نمبر ٢١٣٤٥.

فِي دَارٍ ثَلَاثَ لَيَالٍ فَيَقْرُبُهَا شَيْطَانٌ"(١) (جس گھر میں لگاتار تین رات یہ دونوں آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو شیطان اس گھر کے قریب نہیں جاتا)۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

اللہ تعالی کے فضل سے پہلا جزء مکمل ہوا

ان شاء اللہ اس کے بعد اس کا دوسرا جزء ہوگا

(١) ترمذي ١٤٧/٥ حديث نمبر ٢٨٨٢.